PAGES MISSING WITHIN THE BOOK ONLY

TEXT CUT WITHIN THE BOOK ONLY

UNIVERSAL
LIBRARY

OU_224229

UNIVERSAL
LIBRARY

OSMANIA UNIVERSITY LIBRARY

Call No. ن گ ا ر - خ ن ا ک ۹۱۵ ک ۳۰ ۵ Accession No. ۶۸ ۶۶۱ جلد نمبر

Author نیاز فتحپوری

Title نگار

This book should be returned on or before the date last marked below.

Vol. 42

Nos. 1 - 6 October 1988

July - Dec. 1985

نگار

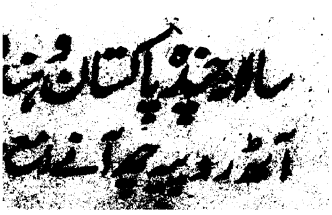

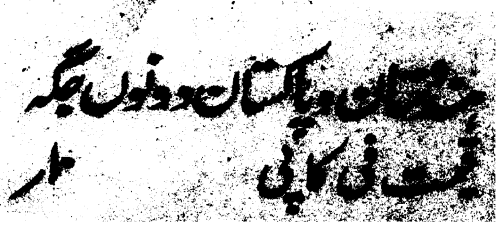

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو رتبۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس آڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے آڈیشنوں میں نہ تھے اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا ہر افسانہ ہر جو اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس آڈیشن میں نئے افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے آڈیشن میں نہ تھے

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴ سالہ دور تصنیف و تحقیق کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے، جس میں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے بہت بلند انشائیاں اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشا لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنہیں حضرت نیاز کی افسانوں نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات کا

مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ و کرامت (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) الواح لوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس ہارون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) ہاروت (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) کوہ (۱۵) لقمان (۱۶) عالم برزخ (۱۷) یاجوج ماجوج (۱۸) ہاروت ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود و غیرہ

ضخامت ۲۲۰ صفحات کاغذ سفید دبیز

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے

ترغیبات جنسی یا شہوانیات (مجلد)

اس کتاب میں نجاشی کی تمام نظر کی اور غیر نظری نظموں کے حالات پر تنقیدی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط سائنٹفک محققانہ تبصرہ کیا ہے کہ نجاشی دنیا میں کب کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ عرب علم نے اسکے رواج میں کس مدد کی اس کتاب میں آپکو بہت سے واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ایڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۶ء

"خدا نمبر"

(مع متعدد تصویروں، نقوش اور خاکوں کے)

چھ حصوں میں تقسیم ہوگا:۔

حصۂ اول : مذہب کا خیال کب اور کیوں پیدا ہوا اور عہدِ تاریک سے گزر کر نیم مہذب اقوام نے خدا کا تصور کس کس طرح کیا۔

حصۂ دوم : ملل قدیمہ اور سامی اقوام میں، مصری، بابلی و آشوری، فنیقی، یہودی، عیسائی مذاہب اور اسلام کا تقابلی مطالعہ

حصۂ سوم : آریہ مذاہب میں یونانی، رومی، ٹیوٹانی، کیلٹی، فارسی، ہندو، بودھی، جینی اور سکھ اقوام نے خدا اور مذہب کو کس نقطۂ نگاہ سے دیکھا۔

حصۂ چہارم : امریکہ کی مایا اور دوسری غیر مہذب اقوام نے خدا کو سمجھنے کی کیا صورتیں اختیار کیں۔

حصۂ پنجم : عقل و مذہب کی جنگ، روایت و درایت کا تصادم اور الحاد و لامذہبیت کا ارتقاء

حصۂ ششم : تمام ابواب پر مفصل تبصرہ۔

منیجر نگار

بعض کمیاب کتابیں

(ان کتابوں پر کمیشن نہیں ملے گا)

دول الاسلام - شمس الدین - - - - ۱۵۰ء

ذیل الانبا فی طبقات الاطبا - ابی العباس احمد ۲ جلد ۵۰ء

الحفظ - ۴ حصے - شمس الدین ابی عبداللہ ذہبی - ۵۰ء

الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب - حصص بن یوسف ۴۰ء

تاریخ الخلفاء - جلال الدین سیوطی - - - - - - ۷ء

تاریخ ابوالفداء - ۴ حصے - عماد الدین اسماعیل ابی الفدا - ۳۵ء

وفیات الاعیان تاریخ ابن خلکان - ۲ جلد قاضی احمد ابن خلکان ۱۰۰ء

فتوح الشام - ابوعبداللہ واقدی - - - - - - - - ۷ء

عقد الفرید ۳ جلدیں - شہاب الدین احمد - - - - ۱۵۰ء

صواعق محرقہ " - - - - - - - - ۴ء

شرح نہج البلاغۃ - ابی الحدید المعتزلی - ۲ جلد مطبوعہ ایران ۱۰۰ء

دیوان حسان بن ثابت - - - - - - - - ۴ء

العقد الثمین - طرفہ و زہیر امرالقیس ---- ۲ے
دیوان ابوالعتاہیہ - ابواسحٰق اسمٰعیل ---- ۱۰ے
شرح دیوان الحماسہ - ۲ حصص - شارح ابی زکریا یحییٰ -- ۲۵ے
شرح مقامات حریری - ۲ حصص - شارح ابی عباس احمد ۳۵ے
دیوان متنبی مع شرح - مترجمہ ذوالفقار علی ---- ۱۰ے
القاموس - ۴ حصے - مجدالدین محمد ---- ۴۰ے
مجمع البحرین - ۴ حصے - فخرالدین ---- ۳۵ے
گلستانِ ہند - درگا پرشاد ---- ۱۵ے
جہاں کشائے نادری مصور مرزا مہدی خاں ---- ۲۰ے
جہانکشائے نادری ---- ۳ے
سفرنامہ شاہ ایران - مصور (یورپ) ---- ۲۰ے
انفاس العارفین - شاہ ولی اللہ ---- ۲ے
تذکرہ خزینۃ الاصفیا - غلام سرور ---- ۲۵ے
گلستانِ عبرت - کرم خوردہ - عبدالرحمٰن ---- ۲۰ے
تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ---- ۳ے
صبح گلشن (تذکرہ) علی حسن خاں ---- ۲۵ے
وقائع نعمت خانِ عالی انشا حسن و عشق ---- ۵ے
جذب القلوب الی دیار المحبوب مصنفہ شیخ عبدالحق - قلمی مکتوبہ - ۳۵ے
تاریخ مشتمل بر حالات نادشاہ - قلمی ---- ۱۰ے
انتخاب سیر البلاد - قلمی ---- ۲۵ے
کلیات قاآنی - مزا حبیب شیرازی ---- ۲۵ے
کلیات جامی - عبدالرحمٰن ---- ۳ے
کلیات ظہیر فاریابی ---- للعہ
کلیات اسمٰعیل اصفہانی ---- ۳ے
دیوان حافظ - مطبوعہ بمبئی ---- ۱۰ے
دیوان عرفی - جمال الدین ---- للعہ
دیوانِ نعمت خان عالی ---- ۵ے
دیوان ہلالی محشی ---- ۵ے
دیوانِ مظہر جانجاناں ---- ۳ے
ہربانِ قاطع - محمد حسین مطبوعہ ٹائپ ---- ۲۰ے

قاطع برہان - میرزا اسداللہ خاں ---- ۵۰ے
غیاث اللغات ---- ۱۵ے
منتخب اللغات ---- مفت
تاج التواریخ - ۳ جلد مرتبہ نصرت علی ---- ۵۰ے
تاریخ الاسلام - محمد احسان اللہ ---- ۱۵ے
تواریخ ڈھاکہ مصور - رحمان علی ---- ۱۵ے
تاریخ فرشتہ - ۲ جلد - محمد قاسم ---- ۲۵ے
تذکرہ بہار گلشن کشمیر ۲ جلد مصور (تذکرہ شعراء کشمیری پنڈتان) ۵۰ے
نگارستان فارس - محمد حسین آزاد ---- ۳ے
تذکرہ گل رعنا - عبدالحی ---- ۱۵ے
تذکرہ سخن شعراء - عبدالغفور ---- ۱۲ے
تذکرہ سراپا سخن - میر محسن علی ---- ۱۵ے
تذکرہ کاملانِ رامپور - احمد علی خاں ---- ۱۵ے
صحیفہ زریں - مرتبہ نولکشور پریس ---- للعہ
البرامکہ - محمد عبدالرزاق ---- ۱۵ے
کلیات میر - مطبوعہ قدیم ---- ۱۰ے
دیوان ولی - مرتبہ حیدر ابراہیم ---- ۳ے
دیوانِ شرف - آغا ہجو ---- ۲ے
کلیات سودا - میرزا رفیع ---- ۳ے
دیوان تسلیم - منشی امیر اللہ ---- للعہ
کلیات نظیر اکبر آبادی ---- ۵ے
کلیات ناسخ - شیخ امام بخش ---- ۳ے
مراۃ الغیب - امیر مینائی ---- ۵ے
محامد خاتم النبیین " ---- للعہ
گلدستہ - مرزا محمد ہادی عزیز ---- للعہ
قصائد عزیز " ---- للعہ
کلیات ناسخ - شیخ امام بخش ناسخ قلمی ---- ۵۰ے
سیرۃ النعمان - شبلی نعمانی ---- ۵ے
واقعات انیس - میر مہدی حسن ---- ۲ے
روح نظیر - مرتبہ محمد محمود ---- ۵ے

نگار بک ایجنسی لکھنؤ

افسوس ہے کہ پریس کا موٹر خراب ہوجانے کی وجہ سے پرچہ آٹھ دن کی تاخیر سے نکل رہا ہے - منیجر نگار

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی آٹھ روپیہ چودہ آنے میں وی - پی ہوگا جس میں

نگار

کہ آپ کا چندہ جولائی میں ختم ہوگیا اور اگست کا "نگار" سالنامہ ۱۹۵۶ء کی قیمت (مع مصارف رجسٹری) بھی شامل ہے

اڈیٹر : نیاز فتحپوری

جلد ۶۸ | فہرست مضامین جولائی ۱۹۵۵ء | شمار ۱

ملاحظات ۳
اثر لکھنوی کی غزل گوئی ..... پروفیسر ارشد کاکوی ۵
فن تحریر کی تاریخ ..... محمد اسحاق صدیقی ۱۲
حضرت جوش ملیح آبادی کا ایک طنزیہ شاہکار ..... جوش ۱۵
میر کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی ..... ڈاکٹر گیان چند جین ۱۸
گاہے گاہے باز خواں ۲۶
مشاعرۂ نگار ۲۹
منظومات ..... فضا ابن فیضی، ارشد کاکوی، ساقی جاوید، عزمی ترمذی ۳۱
تتمہ سالنامہ ۱۹۵۵ء ..... ۱ — ۲۴

ملاحظات

پاکستان — سرزمین اغلاط و اضداد

حکومت کی مثال ایک ایسی ترازو کی سی ہے جس کے دونوں پلڑے برابر رہیں اور پاکستان کے کسی سکہ میں ترازو کا نشان بھی شاید اسی حقیقت کے ظاہر کرنے کے لئے تجویز کیا گیا ہے۔ لیکن خود وہاں کے اندرونی حالات کیا ہیں اور پاکستان کی کشتی کس ڈانوا ڈول حالت میں ہے اس کا اندازہ آپ کو ذیل کے بعض واقعات سے ہوسکتا ہے :

لاہور فیڈرل کورٹ کے اصرار و مشورہ پر پاکستان میں دستوری اسمبلی کا انتخاب آخر عمل میں آہی گیا اور تاریخ انتخاب میں یہ بالکل پہلا واقعہ ہے کہ دو تین ہفتوں کے اندر ہی انتخابی کارروائی کے تمام منازل اتنی آسانی سے طے کرلئے جائیں۔ چنانچہ پنجاب کے بعض اخباروں نے اس طلسمی انتخاب کا پردہ فاش کیا ہے ظاہر کیا ہے کہ قانون، اخلاق اور انسانیت کا کوئی پہلو ایسا نہیں جسے موجودہ برسر اقتدار پارٹی نے اس انتخاب میں پامال نہ کیا ہو۔ اور پھر بھی وہ کھلی ہوئی اکثریت حاصل کرنے قاصر رہی - اس لئے ہوسکتا ہے کہ کسی شکست خوردہ پارٹی یا امیدوار کی طرف سے یہ سوال اٹھایا جائے اور موجودہ دستوری اسمبلی پھر معطل کردی جائے کیونکہ جسٹس کیانی اس سے قبل کھلے الفاظ میں ظاہر کرچکے ہیں کہ اگر دستوری اسمبلی کے انتخاب میں ناجائز دباؤ سے کام لیا گیا اور عوام کی صحیح نمایندگی اسے حاصل نہ ہوئی تو وہ کالعدم متصور ہوگی۔

زیادہ زمانہ نہیں گزرا جب مسٹر فضل الحق کو مسٹر محمد علی نے "غدار" ظاہر کرکے ان کے خلاف قانونی اقدام کا بھی ارادہ ظاہر کیا تھا اور مشرقی بنگال میں گورنر راج قائم کردیا گیا تھا تاکہ فضل الحق وزارت نہ بنا سکیں، لیکن جب محمد علی اسمبلی کے لئے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر مشرقی بنگال سے کھڑے ہوئے، تو وہاں نہ گورنر راج باقی رہا نہ فضل الحق کی غداری، بلکہ وہاں کی وزارت فضل الحق پارٹی کے سپرد کردی گئی اور اسی کے ساتھ یہ بھی یقین دلایا گیا کہ مشرقی بنگال کی خود مختاری کو کرنسی، دفاع اور خارجہ سیاست کی حد تک وسیع کردیا جائے گا، وہاں پارلیمنٹ کا اجلاس بھی باری باری ہوگا اور وہاں کی زبان کو بھی اردو کے متوازی سرکاری زبان قرار دیا گیا۔

پاکستان کا وجود اس سے قبل عبارت تھا صرف ایک غیر منقسم وحدت سے، لیکن اب وہ مشرقی و مغربی دو حصوں میں تقسیم ہوگا اور دونوں حصوں میں توازن

قایم رکھنے کے لئے وہی اصول پیش نظر ہیں، جو دو مختلف حکومتوں میں بقاء توازن کے لئے ضروری سمجھے جاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ پالیسی مغربی بلاک کی تحریک سے اختیار کی گئی ہو تاکہ اس طرح مغربی پاکستان ممالک عرب کے دفاعی منصوبہ میں ترکی و عراق کے ساتھ وابستہ رہے اور مشرقی پاکستان مشرقی جنوبی ایشیا کے دفاعی منصوبہ کا مرکز بن سکے یعنی پاکستان کا مغربی بلاک روس کے دباؤ کو کم کرے اور مشرقی پاکستان چین کے اثر یت کو۔ پاکستان کی تقسیم دو دحدتوں میں اگر محض اقتصادی وانتظامی مصالح کے بنیاد پر ہوتی تو مغربی پاکستان کی رائے عامہ غالباً اسے قبول کر لیتی، لیکن چونکہ مشرقی بنگال اب وہی حیثیت حاصل کرنا چاہتا ہے جو کسی وقت عہد مغلیہ میں بنگال کے گورنر کو حاصل تھی، اس لئے پاکستان کے استحکام کو یقیناً اس سے صدمہ پہونچے گا اور اسی لئے مغربی پاکستان کے بعض مقتدر اخبارات اس تقسیم کے سخت مخالف ہیں۔

لاہور کا روزنامہ "ملت" لکھتا ہے کہ: "مسٹر محمد علی محض ذاتی اغراض کی بنا پر حق پارٹی کے ساتھ مل کر پاکستان کی مرکزیت کو کمزور کر رہے ہیں اور حق پارٹی کے جو معاملات انھوں نے تسلیم کئے ہیں وہ پاکستان کے دونوں حصوں کے درمیان ایک وسیع خلیج حایل کر دینے والے ہیں"۔

کراچی کے روزنامہ انجام نے مسٹر محمد علی سے استعفے کا مطالبہ کیا ہے کیونکہ انھوں نے دو قومی زبانیں تسلیم کرکے نہ صرف قایداعظم کی مخالفت کی ہے بلکہ پاکستان کی وحدت کو بھی مجروح کر دیا ہے۔

مسٹر سہروردی، جن توقعات کے ساتھ پاکستان کی کابینہ میں شریک ہوئے تھے وہ پوری نہ ہو سکیں اور دستوری اسمبلی کے انتخاب کے بعد وزارت عظمیٰ کا خواب، خواب پریشاں ہو کر رہ گیا۔ اس لئے عوامی لیگ کے سرخیل مسٹر سہروردی ایک مخالف محاذ بنانے پر آمادہ ہے اور کہہ رہے ہیں کہ "روس، محمد علی کو کئی بار دعوت دے چکا ہے اور انگلر امریکی امداد جلد نہ ملی تو وہ روس سے معاملہ کرنے کے لئے طیار ہیں"۔ اس سے سہروردی کا مقصود غالباً یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ محمد علی کی طرف سے امریکہ کو بدظن کر دیں اور اسے اپنا طرفدار بنا کر پاکستان کی وزارت عظمیٰ تک پہونچ جائیں۔

پاکستان میں یہ تضاد صرف سیاسیات ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کا دائرہ معاشرت واخلاق اور مذہب وثقافت تک وسیع ہے۔ ایک طرف ملائیت و اسلام دوستی کا یہ زور کہ ۱۴ کالجوں کے ایک اسکول کو ۳۰۰ مولویوں نے پتھراؤ کرکے عمارت کو مسمار کر دیا۔ دفتر جلا ڈالا، لائبریری کی کتابیں پھاڑ ڈالیں محض اس تصور پر کہ وہاں کے ایک ڈرامہ میں جو اسکواڈ فٹ کی فراہمی کے لئے کیا گیا تھا لڑکیوں نے بھی شرکت کی تھی، دوسری طرف اخلاق اسلامی کی توہین کا جو عالم ہے اسکے "مسلمان" اخبار کی زبانی سن لیجئے۔ وہ لکھتا ہے کہ: "شام کے وقت کراچی میں بیشمار لڑکے آپ کو ایسے نظر آئیں گے جو ہر خوش پوش نوجوان کے پاس جاکر پوچھتے پھریں گے کہ: "آپ کو پنجابی، سندھی، پارسی، بنگالی، سرحدی، عیسائی لڑکیوں میں کونسی لڑکی کس عمر، کس قیمت اور کس معیار کی درکار ہے"۔

ہفتہ وار ماحول (کراچی) رقمطراز ہے کہ: "کراچی کے ہوٹلوں میں وہ کمرے جو فیملی کے لئے مخصوص ہیں، روزانہ شام کو بن بیاہے جوڑوں سے آباد ہو جاتے ہیں اور صبح کو پھر دوسرے جوڑے کے لئے خالی کر دئے جاتے ہیں۔ شام کے وقت کراچی کی ہر تاریک گلی محلی ہوا فضا حسن ومحبت کی فضا میں تبدیل ہو جاتی ہے اور ہر کاروبار عشق نہایت آزادی سے شروع ہو جاتا ہے۔ یہاں تک کہ گورنر جنرل کے قصر سے ملی ہوئی کشادہ زمین بھی اس شر سے بے بہرہ نہیں"۔

روزنامہ انجام کراچی لکھتا ہے کہ: "حیدر آباد میں ۲۵۰ باغ بطقہ خوبصورت قایم ہیں، لیکن ان کے علاوہ دوسرے مقامات پر بھی ہزاروں عورتیں جھونپڑے سے لیکر قیمتی محلات تک کی رہنے والیاں اپنے جسم کا سودا کرنے کے لئے ہر وقت طیار رہتی ہیں"۔

یونو اردو اب بھی سارے ہندوستان کی زبان ہے اور یہ پہلے بھی تھی، لیکن تقسیم ہند کے بعد پاکستان کو وہ ایک مخصوص ترکہ یا ورثہ کی صورت میں ملی جس کے بقاء و تحفظ کی ذمہ داری قایداعظم نے بھی اپنی اور یہ بات طے کر دی تھی کہ پاکستان کی ملکی و قومی زبان اردو ہوگی، لیکن اب وہاں دو قومی زبانیں ہیں ایک اردو اور دوسری بنگالی جس کے معنی یہ ہیں کہ نصف بلکہ نصف سے کچھ زیادہ آبادی کی زبان اردو نہ رہے گی، پھر اس کو بھی جانے دیجئے اور فرض کر لیجئے کہ اردو کو صرف مغربی پاکستان ہی کی قومی زبان دینا منا سب ہے، تو بھی پاکستان کے ارباب اقتدار سے یہ سوال کیا جا سکتا ہے کہ اسکے بقاء و تحفظ اور نشر و اشاعت کے لئے انھوں نے اب تک کیا کیا اور انگریزی کی جگہ لینے کیلئے اردو کو دفتری زبان بنانے کے لئے کیا اقدامات عمل میں آئے۔ جبکہ ہندوستان جس کی قومی زبان ہندی ہے، یہاں کی انجمن ترقی اردو کو سالانہ ۴۰ ہزار کی مستقل امداد دے رہا ہے، متعدد ادبی رسائل اور اشاعتوں کے علاوہ یہاں مقتدر کمیٹی ہے اور آئے دن تصانیف پر ہزار ہا روپیہ سالانہ کے انعامات دے رہا ہے۔

ہمیں پاکستان کی اس زبوں حالی کو دیکھ کر اہل پاکستان سے زیادہ افسوس ہوتا ہے، کیونکہ ہندوستان کے مسلمانوں کو اپنی قومی و اجتماعی سربلندی پر فخر کرنے کا موقع اسی وقت مل سکتا ہے جب دنیا کی حکومتوں میں پاکستان کا سر ہمیں اونچا نظر آئے۔

آثر لکھنوی کی غزل گوئی

تارِ تارِ جاں ہے لبریزِ نوائے آشنا آشنا ہوں تو اثر سازِ شکستِ دل سے ہم (آثر لکھنوی)

آثر لکھنوی عالم بھی ہیں، ادیب بھی اور شاعر بھی۔ اُن کی ان تینوں حیثیتوں کا تجزیہ کرنے کے بعد ان کی شخصیت کا تنوع اور اس کی ہمہ گیری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ وہ محقق بھی ہیں اور ناقد بھی۔ افسانوں اور ڈراموں سے بھی انھیں شیفتگی ہے اور خالص علمی اور فنی مباحث میں بھی اُن کے فیصلے "حرفِ آخر" کی حیثیت رکھتے ہیں اور اگر آپ صرف اُن کی شاعری ہی کو لیجئے تو وہ ہر صنف پر یکساں قدرت رکھتے ہیں۔ انھوں نے طویل نظمیں بھی لکھی ہیں اور مختصر نظمیں بھی۔ رباعیات و قطعات کی بھی خاصی تعداد موجود ہے۔ بنگلا اور انگریزی کی متعدد نظموں کے منظوم و منثور ترجمے بھی کئے ہیں۔ دو ایک مثنویاں بھی لکھی ہیں اور چند ہندی مثنویوں کے ترجمے بھی کئے ہیں اور غزلوں کا تو اُن کے یہاں ایک بڑا سرمایہ ہے۔ ذیل میں اُن کی مطبوعہ تصانیف نظم و نثر کی ایک فہرست پیش کی جاتی ہے۔ ان کے علاوہ تقریباً اسی قدر تصانیف غیر مطبوعہ ہیں:۔

نظم :-
(۱) اثرستان ——— پہلا مجموعۂ کلام
(۲) بہاراں ——— دوسرا مجموعۂ کلام
(۳) لالہ و گل ——— رباعیات و قطعات کا مجموعہ
(۴) نغمۂ جاوید ——— بھگوت گیتا کا مکمل منظوم ترجمہ (مع شرح)
(۵) رنگ بسنت ——— مختلف زبانوں کی منقاولات کا منظوم ترجمہ
(۶) نرنگاری بیگم ——— ایک فرانسیسی مزاحیہ ڈرامے کا منظوم ترجمہ
(۷) ہلاک فریب ——— ایک یونانی ڈرامے کا ترجمہ

نثر :-
(۸) انیس کی مرثیہ نگاری ——— ایک انتقادی جائزہ
(۹) مطالعۂ غالب ——— انتخاب کلام غالب مع مقدمہ و شرح (بعض اشعار)
(۱۰) مزا میر - (دو جلدوں میں) - انتخاب کلام میر مع مقدمہ و شرح (بعض اشعار)
(۱۱) اثر کے تنقیدی مضامین ——— تنقیدی مقالوں کا مجموعہ
(۱۲) جہان بین ——— تنقیدی مقالوں کا مجموعہ

ان کے علاوہ نثر میں "اردو زبان کی ترتیبِ نو" اور نظم میں "سہ سیر چشمانِ کشمیر" کے عنوان سے ان کی دو مستقل تصانیف الحمرا (لاہور) میں مسلسل شایع ہوتی رہی ہیں۔

اثر صاحب کے نثری کارناموں کا بیشتر حصہ بھی شاعری اور شاعروں سے متعلق ہے اس لئے مجھے کہ لینے دیجئے کہ ان کی بنیادی حیثیت ایک شاعر کی ہے۔ ایسے شاعر کی جسے فن اور عروض پر قابلِ رشک قدرت حاصل ہے اور جس کی زبان و بیان اور رنگ و آہنگ میں ایک [illegible] ہے۔ انکی غزلیں محض کتابوں سے اور بول چال سے نہیں سیکھی بلکہ انھوں نے بڑی بڑی متداول [illegible] کو گھول کر پیا ہے۔ مقامی بولیوں اور محاوروں پر اُن کی نظر بڑی گہری ہے اور جہاں تک وسعتِ مطالعہ کا تعلق ہے آثر صاحب اس دور کے چند جمیع المطالعہ لوگوں میں شمار کئے جانے کے مستحق ہیں۔ عربی، فارسی، اردو کے علاوہ سنسکرت سے بھی کسی حد تک واقف ہیں اور انگریزی کا مطالعہ بھی خاصہ وسیع ہے۔ آثر صاحب اپنے

تنقیدی مقالوں کی گرم بازاری کے پیش نظر بحیثیت ایک نقاد کے بڑی شہرت حاصل کر چکے ہیں - ہاں ان کی شاعری پر کم توجہ دی گئی ہے، چنانچہ میں اس وقت اثر صاحب کی غزلیہ شاعری کے بارہ میں مختصراً اپنے خیالات کا اظہار کروں گا -

آج سے کوئی بیس بائیس سال قبل نیاز صاحب نے اثر صاحب کے تقریباً ڈیڑھ سو منتخب اشعار کا ایک گلدستہ اپنے مقدمہ کے ساتھ بنام "گلہائے جعفری" شایع کیا تھا - اس کے علاوہ نظامی بدایونی نے جو بدایوں کے مشہور اخبار "ذوالقرنین" کے اڈیٹر تھے اثر صاحب کی غزلوں کا ایک انوکھا انتخاب پیش کیا تھا - انوکھا اس طرح کہ انھوں نے پچاس مطلع لئے تھے، پچاس درمیانی شعر اور پچاس مقطع - اور سنئے وہ ہر روز اپنے اخبار کا اداریہ اثر صاحب کے ایک شعر سے شروع کرتے اور انھیں کے ایک شعر پر ختم کرتے، گویا وہ اثر صاحب کے اشعار سے سیاسی اور سماجی کام لیتے تھے - کہنے والے کہتے ہیں کہ اُن کا اداریہ اشعار کی شرح معلوم ہوتا تھا - کوئی ڈیڑھ سال اُدھر نیاز صاحب نے نگار میں اثر صاحب کے کلام کا ایک اور انتخاب شایع کیا تھا - مولوی اختر نہری نے بھی اثر صاحب کی شاعری پر دو ایک مقالے لکھے تھے جو میری نظر سے نہیں گزرے -

اثر صاحب کا دوسرا مجموعۂ کلام "بہاراں" جو میرے پیش نظر ہے اُن کی سوا چار سو غزلوں اور ڈیڑھ سو متفرق اشعار پر مشتمل ہے - ان کا پہلا مجموعۂ کلام "اثرستان" بھی خاصہ ضخیم اور بھاری بھرکم ہوگا اس لئے کہ بہاراں (دیوان دوم) میں اثرستان (دیوان اول) کا ایک انتخاب بھی شامل ہے جو سوا سو صفحات کو محیط ہے - "بہاراں" کے بعد بھی اثر صاحب برابر کہتے رہے ہیں اور اگر انھیں یکجا کیا جائے تو خاصہ ضخیم تیسرا دیوان مرتب ہو سکتا ہے - دیکھئے اس کی اشاعت کی نوبت کب تک آتی ہے -

میرا اثر صاحب سے غائبانہ تعارف ان کی تنقیدوں سے ہوا اور میں نے اُن کے بیسیوں مضامین پڑھ ڈالے - اتنا تو مجھے معلوم تھا کہ اثر صاحب شاعر بھی ہیں - پُرگو بھی اور قادرالکلام بھی، لیکن چونکہ اثر صاحب کو اپنے وطن لکھنؤ سے عشق کی حد تک لگاؤ ہے اور وہ کسی سے لکھنؤ کی زبان یا اس کی روایات کے خلاف ایک لفظ بھی نہیں سُن سکتے میں نے اپنے طور پر یہ سوچ رکھا تھا کہ اثر صاحب کی شاعری بھی لکھنوی مزاج کی شاعری ہوگی یعنی وہاں خارجیت کا عنصر زیادہ ہوگا، صنایع بدایع کی کثرت ہوگی، محاوروں کا استادانہ استعمال ہوگا، روزمرہ کی کھپت ہوگی - آرایشیں ہوں گی، قافیہ پیمائی ہوگی، الفاظ کا کوہ رکھ رکھنداؤ ہوگا - اُن کی چار غزلوں کو ادھر اُدھر رسالوں میں دیکھ کر مجھے اس کا تو اندازہ ہو گیا تھا کہ اثر صاحب قادرالکلام قسم کے بزرگ شاعر ہیں لیکن اُن کی شاعری کی اثر آفرینی کی طرف سے میں بدگمان سا ہو چلا تھا کہ ایک دن میرے ایک دوست نے مجھے اثر صاحب کا یہ شعر سنایا ؎

ہم اپنے حالِ پریشاں پہ مسکرائے تھے زمانہ ہو گیا یوں بھی تو مسکرائے ہوئے

تو مجھے اپنی رائے میں ایک ارتعاش سا محسوس ہوا اور اس کے بعد میں نے اثر صاحب کی تقریباً ایک ہزار غزلیں چھان ڈالیں - اس مقالہ کو اسی مطالعہ کا ردِعمل سمجھئے -

میں نے اوپر عرض کیا ہے کہ اثر صاحب کے مزاج میں بڑا تنوع اور ان کی شخصیت میں بڑی رنگارنگی ہے اور آپ جانتے کہ صنفِ غزل بذاتِ خود "جامِ جہاں نما" ہے، چنانچہ ظاہر ہے کہ اثر صاحب کی رنگا رنگ متنوع شخصیت کو اپنے اظہار کے لئے کتنا وسیع میدان ہاتھ آیا ہوگا - ان کی غزلیہ شاعری بھی اُن کی ہمہ جوہمہ گیر فطرت کی آئینہ دار ہے - جہاں تک ناز و نیاز کی داستانوں کا تعلق ہے انھیں تو ہونا ہی چاہئے تھا، چنانچہ وہ ہیں اور اپنی تمام نزاکت و لطافت کے ساتھ ہیں - اس کے علاوہ اثر صاحب کے یہاں انسانی نفسیات کا مطالعہ بھی ملتا ہے تصوف کی دھوپ چھاؤں بھی ہے - منظر نگاری بھی ہے - اخلاقی نکات بھی ہیں، فلسفیانہ خیالات بھی ہیں - غرضکہ ایک پختہ شعور انسانی سے وابستہ داخلی اور خارجی محرکات کے وہ تمام عناصر موجود ہیں جو آدمی کو انسان اور انسان کو شاعر بنا دیتے ہیں -

نیاز صاحب کا اپنے متعلق یہ قول کہ جتنا اُنس انھیں لکھنؤ سے ہے اتنا ہی اختلاف یہاں کی شاعری سے اثر صاحب پر بھی صادق آتا ہے اثر صاحب کے کلام میں لکھنوی طرزِ سخن کی بوقلمیں نہیں کے برابر ہیں - ابتذال اور سوقیانہ پن شاید اُن کے یہاں بالکل نہیں ملے گا - بے کیف اور بے رنگ

اشعار تو آپ کو ملیں گے لیکن اُن کی بے کیفی اور بے رنگی کا سبب منفی ہے مثبت نہیں یعنی یہ کہ اس میں کچھ نہیں ہے نہ یہ کہ اس میں بہت کچھ ہے۔ لکھنوی شاعری میں جو جوڑ توڑ، داؤں پیچ، اور توڑ مروڑ والی فضا عموماً ملتی ہے اس فضا سے آثر صاحب کا کلام پاک ہے اور انکے کلام کا بیشتر حصہ داخلی کیفیات کا حامل ہے۔ تو پھر کیا سبب ہے کہ ان کی شاعرانہ حیثیت کو نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس کے مختلف اسباب ہیں۔ ایک سبب تو یہ ہے کہ آثر صاحب کی تنقید نگاری بہت سے لوگوں کے لئے ناقابل برداشت رہی ہے اور ادبی حلقہ اُن کی سخت گیری کی بنا پر اُن کی طرف سے ارادتاً اغماض برتنے لگا ہے۔ تنقید اور تحقیق کی دُنیا میں کم سواد لوگ جب اُن کے سامنے ٹھہر نہ سکے تو انتقاماً انھوں نے آثر صاحب کی شاعری کو نظرانداز کرنے کی کوشش کی۔ دوسرا سبب آثر صاحب کی "پرگوئی" ہے۔ انھوں نے محض "موزونیٔ طبع" کے بل پر بھی شاعری کر کے اپنے کلام کی ضخامت بڑھائی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اُنکے اچھے، تیز اور پیارے اشعار بھی دب دبا کر رہ گئے۔ زیادہ کہنا کوئی کمال کی بات نہیں - بادہ نوشی کا معیار "کم کم خوری" ہے، اور حسنِ خرام عبارت ہے "آہستہ خرامی" سے۔ اسی اصول کو شاعری میں برتنا چاہئے۔ آثر صاحب شاید لکھنوی تکلفات اور محاسی سکھ رکھاؤ کے پیشِ نظر زیادہ کہنے پر مجبور ہوئے ہوں۔ بہرحال بھرتی کے اشعار اُن کے یہاں کثرت سے ملتے ہیں۔ تیسرا سبب یہ ہے کہ انھوں نے خالص لکھنوی اشعار کہکر بھی کچھ لوگوں کو بدگمان کیا ہے۔ اُن کا شعری مزاج لکھنوی نہیں لیکن لکھنوی مزاجِ شاعری سے اُن کا ایک لازمی سا رشتہ رہا ہے اور کبھی کبھی انھوں نے ایسے اشعار بھی کہہ دئے ہیں ؎

چلا چل اے دل سنا ہے قاتل نے تیغ کھینچی فلاں پھینکا — لہو سے تر ہے زمین ایسی کہ پاؤں سب کے پھسل رہے ہیں
اتنے ہی میں تنے لگیں پلکوں کی سنانیں — اور ابروؤں نے نیچے تن تن کے سنبھالے
اثر کو وہ خنجر سے دھمکا رہے ہیں — وہی اپنے سائے سے ڈر جانے والے

اس قسم کے اشعار کم اور بہت کم سہی مگر ہیں۔ ان کے علاوہ کبھی کبھی آثر صاحب اشعار میں کسی خاص محاورے، فقرے یا مقامی بولی کو محفوظ کر دینے کی خاطر فکر کرتے ہیں مثلاً ؎

آہ کیوں دُور دُور پھرتے ہو، — ہم میں تم میں سقا ہیل میل کبھی
ایک مدت سے خشک ہیں آنکھیں، — یا کبھی دو گھڑے برستے تھے،

اِن دونوں اشعار میں "اشک و آہ" کی کیفیت پر دو الفاظ مسلط ہیں اور یہ بالکل شاعر کی نمایاں کوشش معلوم ہوتی ہے۔ آثر صاحب نت نئی زمینوں کی تلاش و جستجو میں بھی رہتے ہیں، اس قسم کی کاوشوں میں داخلیت کا عنصر لگ بیٹھتا بھی ہے تو نمایاں نہیں ہونے پاتا لیکن ان تمام باتوں کے باوجود مجموعی طور پر آثر صاحب کی شاعری پُر اثر اور پاکیزہ ہے۔ اُن کے یہاں اچھے اور پیارے اشعار تو خیر کافی تعداد میں ملجاتے ہیں تیر و نشتر کی بھی اُن کے یہاں کمی نہیں۔

آثر صاحب اپنی جن خصوصیات کی بنا پر مشہور ہیں ان میں ان کی میر پرستی بھی ہے۔ میر کی حمایت میں وہ کئی بڑے ہنگامہ آفریں ادبی معرکے لڑ چکے ہیں اور میر کے خلاف وہ کچھ نہیں سُن سکتے۔ ظاہر ہے کہ اُن کی میر پرستی کا اثر اُن کی شاعری پر پڑنا لازمی تھا، چنانچہ پڑا۔ میر کی سی خستگی و شکستگی اور خلش و تپش تو آثر صاحب کے یہاں بہت ڈھونڈنے کے بعد کہیں کہیں ملے گی لیکن دل میں اثر کرنے والے سادے اشعار بغیر تلاش کئے ملجاتے ہیں۔ اُن کے یہاں سوز و گداز بھی ہے اور لب و لہجہ کی دردمندی بھی۔ میر کی سی وہ تیز داخلیت اور وہ تیز نشتریت آثر صاحب کے یہاں ملے بھی تو کیسے ملے۔ میر کا ماحول، اُن کے خاندانی حالات، اُن کا فطری مزاج، اُن کا عاشقانہ المیہ، اُن کی تنگدستی و زبوں حالی غرض جعفر علی خاں آثر کو نہیں ملی۔ ان کو جاہ و ثروت، عزت و شہرت، اطمینان و دولت سبھی کچھ ملا۔ لہٰذا آثر صاحب کے یہاں ان کے ممدوح شاعر میر کے نقوش کی تلاش ہی ضروری نہیں۔ یہی کیا کم ہے کہ آثر صاحب کی طبیعت و فطرت کا خاص رنگ اور اُن کی اپنی خلش و تپش، آسودگی و سرشاری کے بظاہر تمام وسایل کے باوجود اُن کے فن میں اُتر ہی گئی۔ میر کے بعد آثر صاحب غالب کے قایل ہیں اور میرا خیال ہے کہ انھوں نے میر اور غالب دونوں کے اسلوبِ سخن کو اپنے جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنایا ہے اور اس طرح کہ اُن کی اپنی شخصیت و انفرادیت نمایاں رہی ہے۔ نیاز صاحب کے اس خیال سے کہ میر و مرزا

دونوں کا رنگ اثرؔ صاحب کے یہاں تکمیل کے ساتھ پایا جاتا ہے، اتفاق کرنا ہی ہوگا۔ اثرؔ صاحب کا ایک شعر ہے اور اسے نظر باقی شعر سمجھئے:

تیرِ دِ غالب سے اثرؔ ہے گرمیِ بزمِ سخن وہ خدائی کر گیا اور یہ پیمبر ہو گیا،

اسی غزل میں غالب کا رنگ بھی دیکھ لیجئے۔ کتنا نمایاں ہے ؎

شوخیِ جلوہ دم آرایشِ گیسو نہ پوچھ آئینہ اک پیکرِ رگ ہائے جوہر ہو گیا

ویسے اثرؔ صاحب کا کلام "علوۂ صد رنگ" ہے۔ غالب کی معنی آفرینی بھی یہاں ملے گی اور میر کی الماس کی اور جانگداذی بھی۔ مجموعی طور پر اثرؔ صاحب کی شاعری سادگی و پرکاری کا امتزاج ہے۔

جہاں تک میرؔ کے اثر کا تعلق ہے یہ اثر دانستہ بھی ہے اور غیر دانستہ بھی۔ مثلاً ان کا یہ شعر دیکھئے:

کاہشِ انتظار نے مارا، اپنی بھی اب خبر نہیں آتی

یہ کیفیت اثرؔ صاحب کی اپنی ہو تو ہو، ذہن فوراً میرؔ کی طرف منتقل ہو جاتا ہے۔

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو دیر سے انتظار ہے اپنا

بہرکیف اب اس بحث کو جانے دیجئے۔ اب دیکھئے کہ اثرؔ صاحب کے یہاں کیسے کیسے لطیف و نازک اشعار موجود ہیں۔ محبت کی نازک اور سچی کیفیات کے بڑے دلپذیر و دلنواز نقوش اُن کے کلام میں بکھرے پڑے ہیں ان میں "جذبات نگاری" بھی ہے اور "مرقع کشی" بھی "ادا شناسی" بھی ہے اور "شوخیِ بیان" بھی ؎

نظر سوئے زمیں ہے گوشۂ دامن ہے ہاتھوں میں معاذ اللہ کوئی کیا کہے ایسے پشیماں کو،

کاہیکو ایسے ڈھیٹ تھے پہلے جھوٹی قسم جو کھاتے تھے غیرت سے آجاتا پسینہ آنکھ نہ ہم سے ملاتے تم

تا صد پیام ان کا نہ کچھ دیر ابھی سُنا رہنے دے محوِ لذتِ ذوقِ خبر مجھے

کیوں پیار سے دیکھا دلِ مجروح اثرؔ کو یہ لطف و کرم پہلے تو اس پر نہ ہوا تھا

حیران تم ابھی تھے بے تاب تم ابھی ہو سچ سچ اثرؔ بتاؤ دل آیا کس حسیں پر

چہرے کا رنگ دیکھئے آئینے میں اثرؔ کہتے چلے ہیں دردِ دل اس بے وفا سے آپ

میں کیا سناؤں دردِ محبت کا ماجرا حد ہو گئی کہ تم سے شکایت نہیں رہی،

خیر یہ کیا تھی کہ راتوں کی نیند لوٹ لی وہ مست آنکھیں وہ فرمائشیں نسانے کی

زیادہ مثالیں غیر ضروری ہیں۔ مذکورۂ بالا اشعار سے کیفیتِ محبت اور اس کی نفسیاتی صداقت چھلک رہی ہے۔ بالکل بولتے ہوئے جذبات و احساسات ہیں۔ یہ اشعار شاعر کے "راہِ محبت" سے گزرنے کی دلیل ہیں۔ امیدوں کی روشنی، ناامیدیوں کے سائے، نازِ حسن و نیازِ شوق۔ محبوب کی تصویر، بزمِ یار کے نقشے۔ سبھی کچھ تو ہے۔ کیفیاتِ محبت کا ذکر اس پیرائے میں کرتے ہیں کہ اثرؔ صاحب کی شاعری کے خلوص کا قائل ہو جانا پڑتا ہے۔ خاموشی سے دل میں اُتر جانے والے اشعار کو بھی دیکھئے۔ ان کی سادگی اور گھلاوٹ ظاہر ہے ؎

رات کو ایسی ہوک دل میں اُٹھی اک گرہ رہ گئی جہاں دل تھا

عشق سے لوگ منع کرتے ہیں جیسے کچھ اختیار ہے اپنا،

وہ بات پوچھ لے تو بڑی بات ہے اثرؔ بیٹھے ہیں آپ شکووں کا دفتر لئے ہوئے

لہو بدن میں رہا اور نہ آنکھ میں آنسو اب اس کے بعد کلیجہ تھا اگر دُعا کرتے

سعیِ مشکور کو تدبیر کہا سعیِ ناکام مقدر ٹھہری

نہ چھیڑئے گا نہ بولے گا کہ اب ہے کچھ دن سے اور عالم جسے رُلاتے تھے آپ منہ سکر اثرؔ وہ پہلا اثرؔ نہیں ہے

ہائے کیا چیز ہے محبت بھی ۔۔۔ دل کسی حال میں بُرا نہ ہوا
دور سے گاہ گاہ ایک نگاہ ۔۔۔ اس کو بھی مدتِ مدید ہوئی
دلِ غمدیدہ کانپ کانپ اُٹھا ۔۔۔ یاس کے بعد جب امید ہوئی
حیف نہ آئے، تم نے نہ دیکھا تاروں کی آنکھ جھپکتی رہی ۔۔۔ فوکِ مژہ پر آخرِ شب تک بوند لہو کی جھلکتی رہی
وضع بھی کوئی شے ہے آخر دل کو اثر سمجھانا تھا ۔۔۔ در سے کسی کے اک بار اُٹھکر کاش دوبارہ نہ جاتے تم
اُن کی حسرت نہ پوچھ جو تارے ۔۔۔ دامنِ صبح میں بکھر جائیں
رہے گا یہ تم سے گلہ عمر بھر ۔۔۔ تامل کیا پھر تلطف کیا

ایسے کئی اشعار اور ہیں جن کے بغیر اُردو شاعری کا انتخاب مکمل نہ ہوگا۔ ان تمام اشعار میں بلا کی جانگدازی ہے۔ یہاں میر کا رنگ ہے لیکن اس رنگ کا آب و تاب اور چمک دمک اثر صاحب کے خونِ دل کی ممنون ہے۔ یہ اثر آفرینی یونہی نہیں آئی۔ یہ وہی "عطیۂ خاص" ہے جو میر کو قدرت نے بخشا تھا ؎

شعر آخر کہ ہے عطیۂ خاص ۔۔۔ اثر اعجاز میر کامل تھا

اب ذرا ان اشعار کو بھی دیکھتے چلئے جن میں "لطفِ زبان" ہے۔ یہ اثر صاحب کی خاص روش ہے۔ بڑے مزے میں بڑی گہری باتیں کہہ جاتے ہیں ؎

کسی بیکس کا دل دکھانے سے ۔۔۔ کیا ملا آپ کو بھلا کہئے
دھوئیے جان سے اب ہاتھ اثر ۔۔۔ کیجئے اور محبت کیجئے
شکوے تھے صرف لذتِ گفتار کیلئے ۔۔۔ مٹ جاؤ روٹھتے نہیں بیکار کیلئے
اثر زار سے یہ بیزاری ۔۔۔ اک نظر دیکھنا بھی شاق ہوا

ایسے پیارے اور نازک اشعار جن کی لطافتِ بیان اور صداقتِ کیفیت پر وجد آتا ہے کے ساتھ اس قسم کے اشعار جن میں محض "مبالغہ آرائی" ہے، بہت گراں گزرتا ہے مثلاً ؎

لے جائیں ہاتھوں ہاتھ فلک جسکی لاش کو ۔۔۔ ایسا اب اس نگاہ کا گھایل کہیں نہیں
تیغ رکتی ہے تو دم رکتا ہے ۔۔۔ کون کہتا ہے رعایت کیجئے

ایسے اشعار کو دیوان میں نہیں ہونا چاہئے تھا۔ ان سے غزل کی مجموعی فضا اور ہم رنگی پر بُرا اثر پڑتا ہے۔ نازونیاز کی داستانوں کے علاوہ بھی اثر صاحب کی غزلوں میں بہت کچھ ہے جس سے ان کے رجحانات و نظریات کی نقاب کشائی ہوتی ہے۔

ان کے کلام سے اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ تصوف سے اثر صاحب کو خاصہ شغف رہا ہے اور اُن کے کلام کا "متصوفانہ" رنگ محض روایاتی اور مستعار نہیں۔ تصوف اور شاعری کا ساتھ جتنا عام ہے اتنی ہی قدر ان دونوں کی صحیح "نباہ" بہت مشکل ہے۔ میں تو اس حد تک کہنے کو طیار ہوں کہ اصغر گونڈوی نے بھی شعر اور تصوف کی ترتیب سے جو بادۂ سخن طیار کی تھی وہ "دو آتشہ" نہ ہوسکی۔ اثر صاحب کے کلام کا متصوفانہ رنگ دلکش اور دلنواز ہے۔ صرف اسی ایک شعر کو لے لیجئے:

میں سمجھتا ہوں تری جلوہ گری کا منشا ۔۔۔ لطف ہے ساغرِ لبریز کے چھلکانے میں

خیال کی عظمت، وسعت اور بیان کی نزاکت و لطافت ظاہر ہے۔ متصوفانہ اشعار کی خوبی کا راز یہ ہے کہ وہ خالص متصوفانہ خیال کے حامل ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر ایک وسیع معنی رکھتے ہوں اور یہ چیز اُس وقت ہاتھ آتی ہے جب شاعر "مسایلِ تصوف" کا کتابی تجزیہ کرنے کی بجائے اپنی ہستی کو مشاہدہ و مطالعۂ کائنات میں گم کردے اور تب اس کے قلم سے جو بات نکلے گی اُن میں آسمان کی بلندی کے ساتھ ہی ساتھ بادلوں

کی نمی و تازگی اور شفق کی رنگینی و سرخی بھی ہو گی۔ خالی خولی ٹھیٹھ اور دقیق اشعار کسی پیشہ ور (Professional) صوفی کی شخصیت کو بے نقاب کرتے ہیں جو چُن چُن کر تصوف کے مسئلوں کو اصطلاحات و تلمیحات اور بھاری بھرکم الفاظ کی مدد سے منظوم کر دیتا ہے۔ اس کا شعر ممکن ہے تصوف کے مسئلہ کی تشریح ہو جائے لیکن شعر اُسے بہرحال نہیں کہا جائے گا۔

مجھے ذاتی طور پر اس موضوع کے متعلق زیادہ معلومات نہیں۔ میں نے نہ تو صوفیائے کرام کی صحبت پائی ہے نہ کتب تصوف کا مطالعہ کیا ہے، لیکن اس حد تک ضرور واقف ہوں کہ عام طور سے شیعہ حضرات کو تصوف سے بے بہرہ قرار دیا جاتا ہے۔ اگر یہ خیال درست ہے تو مجھے حیرت ہے کہ اثر صاحب کے کلام میں یہ رنگ اتنا نمایاں کیوں ہے اور پھر یہ کہ انھوں نے اپنی اُس شخصیت کو بھی جو شاعر ہے برقرار رکھا ہے اور رموز و معارف کی پردہ کشائی کے لئے جو لب و لہجہ اور رنگ و آہنگ اختیار کیا ہے وہ یکسر شعر و نغمہ ہے۔ یہی "بادۂ تصوف" کی دو آتشگی جس میں رند و ساقی دونوں کی نگاہوں کا سرور و خمار موجود ہے۔ اثر صاحب کے کلام میں متصوفانہ اشعار کی کمی نہیں۔

برگِ گل پر قطرۂ شبنم، اُس پہ شعاعِ مہر مبیں — تیرے نثارے حسنِ تصور میری نظر تصویر ہوئی

مطلب نکالے خاک اشارات سے کوئی — عالم تمام خواب ہے وہ بھی خیال کا

میرا وجود میری حقیقت کا آئینہ — میری نمود ؟ ایک کرشمہ خیال کا

نظارہ تیرے شوق میں غرقِ نشاط ہے — ہر جنبشِ نگاہ چمن ہے جمال کا

ان اشعار کے بعد اب مزید حوالے کی نہ گنجایش ہے نہ ضرورت۔ اُن کے چند نظریاتی اشعار سے شاعر کے مسلک کی نشاں دہی ہوتی ہے ؎

مجلسِ وعظ سے اک رند یہ کہتا اُٹھا — کافر اچھے ہیں دل آزار مسلمانوں سے

یا رائے کفر و دیں ہے مسلکِ اہلِ نظر — ماسوائے عشق ہے جو کچھ وہ ہے باطل مجھے

تفریقِ مذاہب سے کیا کام اثرؔ مجھ کو — اک سجدے سے مطلب ہے کعبہ ہو کہ بتخانہ

کچھ اور نیک و بد کی حقیقت نہیں اثرؔ — انسان آئینہ ہے خود اپنے خیال کا

"رہ و رسمِ عاشقی" کے یہ اسرار شاعر کی شخصیت کو جلوہ گر کرتے ہیں۔

اثر صاحب کے کلام کی ایک اور نمایاں خصوصیت رہی جاتی ہے۔ پہلے اثر صاحب کا ایک شعر سُن لیجئے:

جامِ خالی کو چھلکتے کبھی دیکھا ہے اثرؔ — شعر میں جوش کہاں دل میں اگر جوش نہیں

اثر صاحب کا دل فطرتاً کیف و نشاط کی آماجگاہ ہے اور ان کے دل کی یہ شادابی پوری طرح اُن کے اشعار میں جلوہ گر ہے۔ اُن کے اکثر اشعار میں وہی شگفتگی اور وہی شادابی و زندگی ہوتی ہے جو تازہ کھلے ہوئے پھول میں ہوتی ہے اور وہ اپنے اشعار کی مدد سے ایک شاداب تصویر کھینچ کر رکھ دیتے ہیں۔ منظر نگاری آپ کو تمام شاعروں کے یہاں ملے گی لیکن یہ منظر نگاری غزل کے اشعار میں صرف تشبیہ و استعارہ تک محدود رہتی ہے۔ میرؔ خیال ہے کہ انشائے علاوہ اگر کسی شاعر نے مناظرِ فطرت کو بحیثیت مناظر غزل کے اشعار میں پیش کیا ہے تو وہ اثر صاحب ہیں۔ ایک شعر ایک تمہید کے ساتھ سنئے یونانیوں نے سورج (Phoebus) کو رتھ میں سوار دکھایا ہے جسے سفید گھوڑے کھینچ رہے اور گلاب کے پھولوں کی بارش ہو رہی ہے۔ اب اثر صاحب کا ایک شعر سنئے۔ محبوب سے خطاب ہے۔ کہتے ہیں ؎

ہاں جلوہ گر ہو تجھ پہ پنکھا در کے واسطے — صبح دمیدہ پھول بھرے ہے کنار میں

کیا تصویر ہے۔ ہاں تو اب غزل میں عروسِ فطرت کی ضیا پاشیاں دیکھئے:

پھولوں سے لپک رہی ہیں شاخیں — خوشبو سے مہک رہا ہے گلشن

رقصاں ہے نسیم برگِ گل پر — شبنم میں ہے گھنگھروؤں کی چھن چھن

غنچوں کے بدن میں سنسنی ہے — مستی میں چھوا صبا نے دامن

اس رنگِ خاص کے بعد ان اشعار کو بھی دیکھئے :

جہاں پلکوں کے سائے میں ہزاروں فتنے سوتے تھے — وہیں فطرت نے چپکے سے نگاہِ شرمگیں رکھدی
جس طرح ماہتاب ہو آغوشِ بحر میں — یوں دل کسی کے حسن سے معمور ہوگیا
وہ رات کا سناٹا وہ امڈے ہوئے آنسو — چڑھتی ہوئی ندی تھی بڑھتا ہوا دریا تھا
وہ تراشباب کہ الحذر وہ ترا خرام کہ الاماں ، — نہ یہ رنگ چھلکے بہار سے نہ یہ کیف ٹپکے شراب سے
دمِ واپسیں نہ حیا کرو کہیں یہ نہ اس کا نتیجہ ہو — کرو یاد جب گئے وقت کو تو حجاب آئے حجاب سے
دل صد پارہ سے یوں اُلجھی ہے وہ شوخ نگاہ — جیسے سورج کی کرن پھول پہ مائل ہو جائے
پیغام یہ کس کو جاتے ہیں معلوم تو ہو دیوانے اثر — تو خاک پہ بیٹھا کیا لکھتا اور لکھ کے مٹایا کرتا ہے
ادا ہے یاد ترے مسکرا کے آنے کی — اور اس کے بعد وہ دامن چھڑا کے جانے کی

اِن تمام اشعار میں ایک تصویر ہے جس میں خارجی محرکات اور داخلی کیفیات کا دلکش امتزاج پایا جاتا ہے۔

اثر صاحب زندگی کے حقائق کی طرف سے بھی غافل نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ان کا کلام "غمِ روزگار" کے اثر سے بالکل محروم ہے اور اُن کے یہاں ایسا کوئی جذبہ نہیں ملتا جو زندگی کے مادی نظریوں پر مبنی ہو اور اُس میں ہم اپنے نقوشِ حیات دیکھیں۔ اثر صاحب کو اس بات کا اعتراف ہے کہ :

اپنی بساط بھر تو بہت سعی کی مگر ، — مانوس دل ہوا نہ غمِ روزگار سے

اس شعر میں شاعر نے جس خلوص کا ثبوت دیا ہے اس کی مثال نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے لیکن جو لوگ محض ان نقوش کے فقدان کے باعث اثر صاحب کے کلام کی ہمہ گیری کے منکر ہیں وہ غلطی پر ہیں کیونکہ یہ ضرور نہیں کہ شاعر اپنے ماحول اور زمانے کے تمام اثرات کو قبول کرے، پھر بھی اس عالمگیر حقیقت سے انکار کیونکر ممکن ہے کہ ناتمامی اور ناآسودگی بہرحال رہتی ہے اور عمر کے آخری لمحوں تک رہتی ہے کچھ رند ایسے بھی ہوتے ہیں جو الطافِ ساقی پر مطمئن نہیں ہوتے۔ روشؔ صدیقی کا یہ شعر سنئے :

مہرباں پایا ہے جو ساقی محفل کو روشؔ — اب یہ ضد ہے کہ ہر اک جام ہمیں تک پہونچے

اثر صاحب کے یہاں بھی ناتمامی اور ناآسودگی کا یہ جذبہ کسی نہ کسی طرح اُن کی زندگی میں داخل ہو ہی جاتا ہے۔ وہ کہتے ہیں اور غلط نہیں کہتے کہ :

بہار اور پھر ایسی بہار ، حسرت ہے — ہر ایک شاخ پر اپنا ہی آشیاں ہوتا

یہ انسانی فطرت کا ایک المیہ ہے اور یہی المیہ انسانی وجود کا سب سے بڑا ثبوت بھی۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ اثر صاحب کے یہاں کثرت سے ایسے اشعار مل جائیں گے جس میں اُن کے عہد اور اُن کے ماحول کے نقوش ملتے ہیں ؎

جب مخالف چلے چمن کی ہوا ، — منہ گلوں کے نہ کیوں اُتر جائیں
حاصلِ زیست ہے وہی لمحہ — جس میں ہم کوئی کام کر جائیں

اب اس شعر میں زندگی سے متعلق شاعر کا نقطۂ نظر دیکھئے :

اپنا بننا ، اپنا مقدر ، کیکے ہمت ہار گئے — ہم نے کی تذلیلِ عمل کی ، ہم سے عجل تدبیر ہوئی

آپ نے اثر صاحب کی شاعرانہ شخصیت کا مطالعہ کر لیا اور آپ اس نتیجہ پر پہونچے ہوں گے کہ اثر صاحب کی شاعری حیات و کائنات کا ایک زندہ اور متحرک مطالعہ ہے۔ ان کا پورا کلام پڑھنے کے بعد ہمارے سامنے ایک شخصیت جس کے سینے میں فطرت نے ایک دھڑکتا ہوا دل اور آنکھوں میں متجسس نگاہیں دی اور اس کے دیدۂ دل کی کارفرمائیاں اس کے اشعار میں محفوظ ہوگئی ہیں ؎

کیا شخص اثرؔ بھی تھا سمجھا نہ کوئی اب تک — عاشق تھا کہ شاعر تھا دیوانہ کہ دانا تھا

انکی عاشقی و شاعری تو دونوں مسلّم ہی ہیں، دیوانگی اور دانائی بھی انکی شاعرانہ شخصیت کے عناصر ہیں اور ان عناصر کا ثبوت آپ کو ان کے کلام سے ملیگا جو کبھی "والہانہ" بھی ہے اور "عارفانہ" بھی۔

فنِ تحریر کی تاریخ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

سلافی رسوم خط (SLAVONIC. ALPHABETS)

زبان ــــ سلافی، ہندیورپی زبان کی وہ شاخ ہے جس میں روس، پولینڈ، زیکوسلواکیہ، یوگوسلاویہ، بوہیمیا اور بلغاریہ وغیرہ کی زبانیں شامل ہیں۔

قدیم سلافی سے مراد وہ ادبی زبان ہے جسے سینٹ سرل (پیدائش ۸۲۶ء متوفی ۸۶۹ء) اور سینٹ میتھوڈیس (پیدائش ۸۱۵ء متوفی ۸۸۵ء) اور اُن کے شاگردوں نے اپنی تحریروں میں استعمال کیا تھا۔ یہ دونوں بھائی سیلونیکا کے یونانی تھے۔ جنھوں نے سلافی نسل کے لوگوں میں عیسائی مذہب کی تبلیغ کی ان میں سینٹ سرل بڑا عالم اور ادیب تھا۔ اُس کا اصلی نام کونسٹانٹائن تھا۔

قدیم سلافی قوم مقدونیہ میں سلونیکا (Salonica) کے نزدیک اور قرب وجوار کے علاقوں میں آباد تھے۔ ان کی زبان جو بعد ازاں کلیسا کی زبان بن گئی موجودہ بلغاری زبان سے قریبی رشتہ رکھتی تھی۔ اب یہ ایک مُردہ زبان ہے سوائے اس کے کہ وہ کلیسا میں عبادت کے موقع پر استعمال کی جاتی ہے۔ اس کے اور بھی کئی نام ہیں جیسے کلیسائی سلافی، قدیم کلیسائی سلافی، پینونی سلافی (Pannonian) لیکن یہ سب غیر نشفی بخش ہیں۔

قدیم ترین سلافی دستاویزیں دسویں صدی کے آخر اور گیارھویں صدی عیسوی کی ہیں۔ یہ مذہب سے متعلق ہیں۔ ایک کتبہ جو تکفین و تدفین سے متعلق ہے ۹۹۳ء کا ہے۔

سلافی رسوم خط میں دو خاص تھے سرلک (Cyrllic) اور گلاگولیٹک (Glagolitic) ان کے حروف کی شکلیں، انکے نشوونما کی تاریخ اور کسی حد تک حروف کی تعداد مختلف تھی۔ لیکن ان میں یہ مشابہت ضرور ہے کہ دونوں ہی سلافی زبان کی کثیر آوازوں کو پورے طور سے ادا کرنے پر قادر تھے اور کل یورپی رسوم خط کے مقابلہ میں ان میں حروف کی تعداد زیادہ تھی۔

ان دو رسوم خط کی قسمتیں بھی جدا رہی ہیں، سرلک دُنیا کے تین وسیع الاستعمال خطوں میں سے ایک بن گیا (دوسرے عالمگیر خطوط رومن و عربی ہیں) جبکہ اس کے پیشرو یعنی گلاگولیٹک خط کی جگہ لاطینی خط نے لے لی اور اب وہ محض ایک ادبی عجوبہ ہے۔

سرلیک خط (CYRILLIC)

دسویں صدی عیسوی کے یونانی کے بڑے حروف پر مبنی تھا چنانچہ دونوں کے ہیئتی حروف کی صورتیں، آوازیں اور اُن کی عددی قیمتیں مشابہ ہیں سلافی زبان کی جن آوازوں کے لئے یونانی خط میں علامات مخصوص اُن کے لئے نئے نشان وضع کئے گئے۔ ان میں سے بعض یونانی حروف میں خفیف سی تبدیلیاں کرکے بنائے گئے، بعض دو دو حروف کو ملا کر اور بعض گلاگولیٹک خط سے لئے گئے۔ جن کا اندازہ معلوم ہے ممکن ہے وہ من مانی ایجاد ہوں۔

(سرلک خط کا موجد سینٹ سرل) (St. Cyril) تھا لیکن اس نے کل ۳۸ حروف خود ایجاد کئے تھے جن کی تعداد بعد میں بڑھکر ۴۳ تک پہونچ گئی۔

ترویج ــــ سلافی لوگوں میں فنِ تحریر کا رواج مذہب کے ساتھ ہوا (عربی اور آرامی خط کی بعض دوسری شاخوں کے بارے میں بھی یہی بات کہی جاسکتی ہے) مشرقی اور مغربی کلیسا کی تقسیم نے رسم خط کے لحاظ سے سلافی لوگوں کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا۔ جو لوگ کیتھولک (Catholic) مذہب

کے ماننے والے ہیں اُن کا رسم خط رومن ہے (کروآٹی گلاگولیٹک خط کو چھوڑ کر جو بہت اہم نہیں) اور جو مشرقی یا یونانی (Orthodox) کلیسا سے تعلق رکھتے ہیں اُن میں سریلک خط کا رواج ہے۔ روسی، یوکرانی (Ukranian) بلغاری اور سرب لوگوں نے مشرقی یا یونانی کلیسا کے ذریعہ عیسائی مذہب قبول کیا تھا (جس کا سرور بطریق قسطنطنیہ تھا) اس لئے اُن میں یونانی سے ماخوذ سریلک خط کا رواج ہوا جس میں بعد ازاں مقامی تبدیلیاں ہوئیں۔ رومانی (Rumanian) زبان کے لئے بھی یہی خط اختیار کیا گیا لیکن بعد میں ترک کر دیا گیا (ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۲۵)

یوگوسلاویہ، زیکوسلووا کیہ، پولینڈ اور روسا ٹیہ (چیکی کے علاقے) کے لوگوں نے رومن کیتھولک مذہب کو قبول کیا تھا اس لئے اُن میں لاطینی خط کا رواج ہو گیا۔

یہ ایک دلچسپ بات ہے کہ سرب کروآٹی (Serbian Croatian) ایک ہی زبان ہے لیکن سرب لوگوں کا مذہب یونانی کلیسا سے تعلق رکھتا ہے اور کروآٹی لوگ کیتھولک مذہب کے ماننے والے ہیں لہٰذا ان کے رسم خط بھی جدا ہیں۔

سریلک رسوم خط میں سب سے اہم روسی خط ہے۔ جسے بہت سی اقوام نے اپنا لیا ہے۔ جیسے:

(۱) زیرین (Zyryans) یا سیرین (Syryians) لوگوں نے (جنھیں اب کومی (Komi) کہتے ہیں) جو شمالی مشرقی روس میں آباد ہیں ان کی تعداد تقریباً ۲۵۰۰۰۰ ہے اور زبان فنو اگری (Finno Ugrian) ہے۔

(۲) ووٹیاک (Votiaks) نے جو نمبر ۱ سے رشتہ رکھتے ہیں اور تعداد میں تقریباً ۷۵۰۰۰۰ ہیں، یہ ویاٹکا (Vyatka) کے علاقہ میں آباد ہیں

(۳) موردوا (Mordva) نے (جنھیں مورڈوین بھی کہتے ہیں) فنو اگری زبان بولنے والوں میں ان کی تعداد سوویٹ روس میں سب سے زیادہ ہے۔ یہ والگا (Volga) کے وسطی صوبوں اور قرب و جوار کے علاقوں میں جانبِ جنوب و مشرق آباد ہیں۔

(۴) ووگل (Voguls) جو یورال کے پہاڑوں پر آباد ہیں۔

(۵) چوواش (Chuvash) نے جو ایک اہم قبیلہ ہے اس کی زبان ترکی کی ایک بولی ہے جو فنو اگری سے کافی متاثر ہے۔ یہ لوگ زیادہ تر اُس علاقہ میں آباد ہیں جو سُرا (Sura) کے دائیں کنارے اور والگا کے بیچ میں ہے ان کی یو، ایس، آر (U.S.S.R) میں اپنی خود مختار جمہوری حکومت ہے۔

(۶) اوسیٹ (Osete) نے جن کی تعداد تقریباً ۱۵۰۰۰۰ ہے یہ وسطی کاکیشش میں، تفلیس (Tiflis) کے شمال میں آباد ہیں۔ یہ لوگ قدیم سرماٹی (Sarmatian) اور الانی (Alani) لوگوں کی اولاد ہیں۔ ان کی زبان ایرانی کی ایک شاخ ہے جسے پہلے پہل اٹھارھویں صدی کے آخر میں قلمبند کیا گیا۔ لکھنے کے لئے سریلک خط کا استعمال کیا گیا لیکن بہت سی آوازیں ایسی تھیں جن کے لئے روسی خط میں نشانات نہ تھے اس لئے نئی علامات وضع کی گئیں۔ کچھ عرصہ میں بہت سے لاطینی حروف داخل ہو گئے اور آج کل زیادہ تر روسی خط کام میں آتا ہے۔ سریلک اوسیٹ خط ۴۶ حروف پر مشتمل ہے۔

روسی خط کی اصلاح سلافی رسوم خط کا شمار دنیا کے مکمل ترین خطوں میں ہوتا ہے لیکن اُن میں بہت زیادہ حروف کام آتے تھے جن میں سے بعض کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے روسی خط کی اصلاح کی ضرورت انقلاب کے بہت پہلے سے محسوس کی جا رہی تھی۔ متعدد اکاڈمیوں اور سائنسی اداروں نے اپنی اصلاحی تجویزیں پیش کیں۔ جنھیں کیرنسکی (Kerenski) نظام کی تحت رواج دیا گیا (مجموعہ قوانین و فرامین نمبر ۳۰۰ مورخہ ۱۰/۱۷ اکتوبر ۱۹۱۸ء) جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے غیر ضروری حروف متروک ہو گئے۔

بُک وٹسا (Bukvitsa) ڈلماٹیا اور بوسنیا (یوگوسلاویہ کے علاقوں) کے کیتھولک سلیو لوگ کچھ عرصہ تک وہ خط استعمال کرتے رہے جو بُک وٹسا کہلاتا ہے یہ قدرے ترمیم شدہ سریلک خط تھا جو کسی قدر گلاگولیٹک خط سے متاثر ہوا تھا۔

(باقی) محمد اسحاق صدیقی

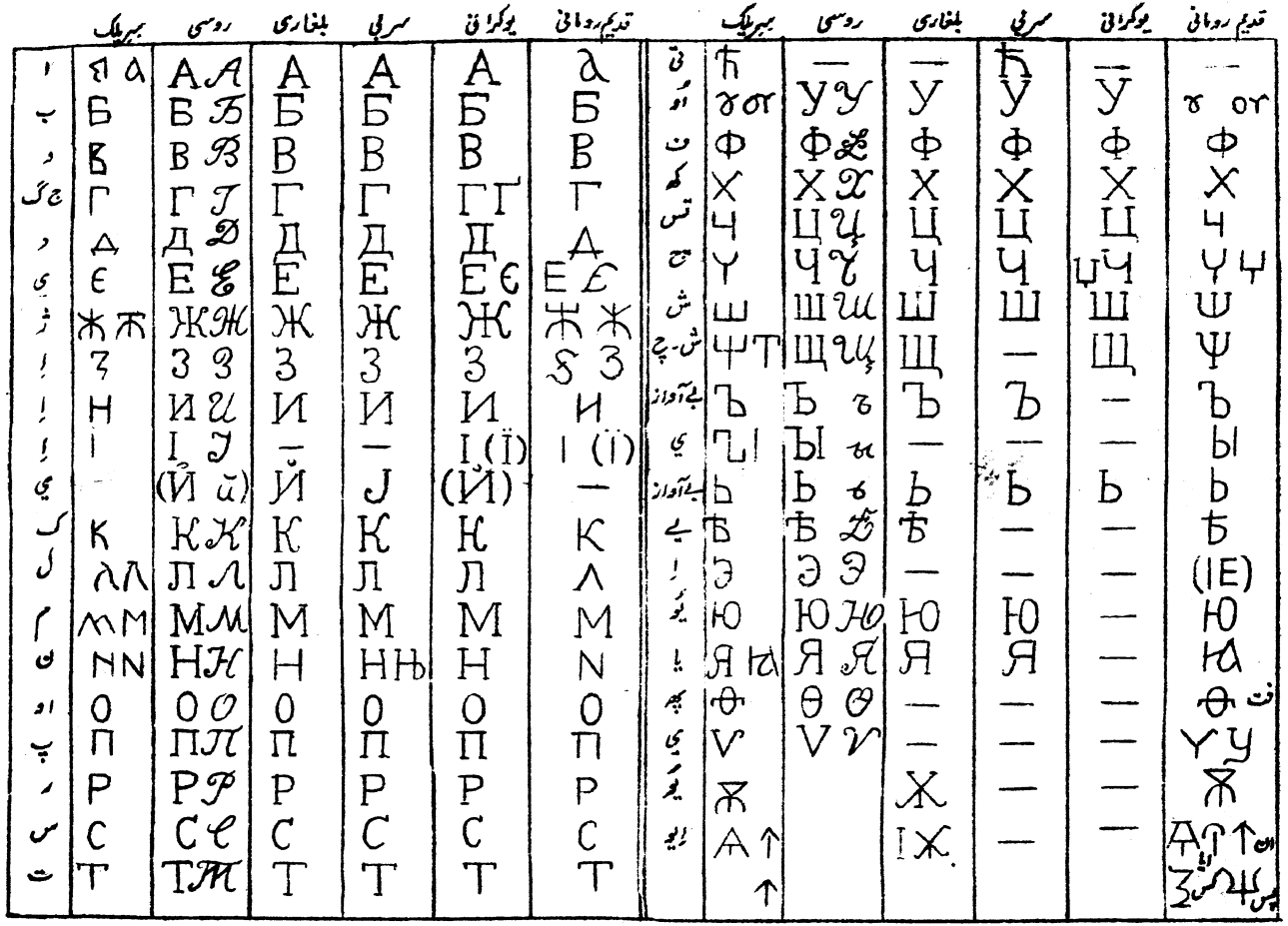
قدیم رومانی
یونکرانی
سربی
بلغاری
روسی
بیرلیک
قدیم رومانی
یونکرانی
سربی
بلغاری
روسی
بیرلیک
ا
ب
د
ج گ
ذ
ز
ژ
ا
ای
ی
ک
ل
م
ن
او
پ
ر
س
ت
ف
ق
او
ف
خ
چ
ت س
چ
ش
ش-چ
بے آواز
ی
بے آواز
بے
ا
یو
یا
پھ
ی
یو
ایو

حضرت جوش ملیح آبادی کا ایک طنزیہ شاہکار

نثر میں جواہر ریزیوں کا ایک عدیم المثال نمونہ

روح وہی ایک ہے پاک و شرافت مآب
نظم میں زیرِ حجاب، نثر میں ہے بے نقاب

پہلی جولائی ۵۵ء کی ڈاک سے مجھے ایک لفافہ ملا جس پر میرا پتہ:
نیاز محمد خاں فتحپوری - دفتر نگار ... لکھنؤ
درج تھا۔

دیکھ کر حیرت ہوئی کیونکہ مجھے "نیاز محمد" کے نام سے پکارنے والوں میں اب میری صرف بڑی بہن باقی رہ گئی ہیں جو یہاں نہیں پاکستان میں ہیں۔

لفافہ کھولا تو ایک مضمون نظر آیا جس کے آخر میں جناب جوش کے دستخط ثبت تھے۔ اس کو پڑھکر حیرت مسرت میں تبدیل ہوگئی، کیونکہ مضمون کیا تھا ایک آبشار جواہر تھا اور بے اختیار سعدی کا یہ شعر زبان پر آگیا:

لبت بدیدم و لعلم بیو فتاد از چشم
سخن بگفتی و قیمت برفت لو لو را

لیکن اسی کے ساتھ اس بات کا افسوس بھی ہے کہ ہم اپنی کم مائگی کے باعث شایانِ شان اسکی داد نہ دے سکے۔

نہیبات کہ چونتو شاہبازے
تشریف دہد در آشیانم

ہمیں امید ہے کہ حضرت جوش آیندہ بھی اپنے "افشاء عالیہ" اور "افکار نادرہ" سے اسی طرح "نگار" کو زیرِ بارِ کرم فرماتے رہیں گے۔

من چہ در پائے تو ریزم کہ خوراے تو بود
سرنہ چیزے ست کہ شائستۂ پائے تو بود

نیاز

ہمارے سپاہیوں میں، یادش بخیر، ایک تھے، ستر بہتر برس کے ناتواں، لیکن ہلا کے تیکھے اور کڑوے، نومسلم ٹھاکر "اللہ بخشے" ہدایت اللہ خاں - اور ہمارے قرابت داروں میں ایک تھے نوجوان قوی ہیکل اور قیامت کے ظرافت پسند خلیل اللہ خاں۔

خلیل اللہ خاں آج بھی زندہ ہیں، لیکن چونکہ اُن کی وہ ظرافت باقی نہیں رہی ہے جو روتوں کو ہنسایا کرتی تھی، اور اِس بناء پر وہ اب: "وہ دن گئے جب خلیل خاں فاختہ اُڑایا کرتے تھے" کے زُمرے میں آچکے ہیں، اس لئے "ایک تھے خلیل خاں ـــــ" چنانچہ ایک روز، سرِیعُ الاشتعالی ہدایت اللہ خاں کے غیظ و غضب کا تماشا دیکھنے کی خاطر، اُن کے ہمسائے کے ایک سپاہی نے اُن سے کہا "ہدایت اللہ خاں تمھاری مونچھوں سے تو چنگاریاں اُڑا کرتی ہیں، تمھیں اپنے پوتے کی بھی کچھ خبر ہے؟"

"ہم رے پوتے کی کیا بات کرت ہو" (ہمارے پوتے کی کیا بات کرتے ہو) ہدایت اللہ خاں نے، خوخیا کر جواب دیا اِس پر اُس سپاہی نے، اپنی آنکھوں کو ایک خاص انداز سے گھُما کر کہا کہ "خلیل خاں تمھارے پوتے کو "بڑے باغ" کو ہَوا کھلاتے پھرتے ہیں"۔

"ہم رے پوتے کا؟" (ہمارے پوتے کو!!) ہدایت اللہ نے، تین بَل کھا کر کہا، اور اُن کی سفید داڑھی کے بال، سیاہی کے کانٹوں کی طرح یکایک کھڑے ہوگئے۔

ابھی اُن کے اعصاب کی کھولن کم نہیں ہونے پائی تھی، اور اُن کے چہرے کی جھُرّیاں آپس میں گتھی ہوئی تھیں کہ اتفاق سے خلیل خاں محل کے پھاٹک پر نمودار ہوئے اور ہدایت اللہ خاں نے، جوانوں کی سی چستی کے ساتھ، سیدھا کھڑے ہوکر خلیل خاں سے، اپنے ہونٹ چباتے ہوئے پوچھا کہ: "کھلیل کھاں ہم تم سے یو پوچھت ہیں کہ یو تم کا ہم رے کالے پوتے ہیں کا آوت ہے کہ تم اُس سمار کو باگن کی ہَوا کھلات پھرت ہو" (خلیل خاں ہم تم سے یہ پوچھتے ہیں کہ یہ تم کو ہمارے کالے پوتے میں کیا نظر آتا ہے کہ تم اُس سمار کو باغوں باغوں کی ہَوا کھلاتے پھرتے ہو)

اور قبل اِس کے کہ 'مُسکراتے ہوئے، خلیل خاں کچھ جواب دیں، ہدایت اللہ خاں نے، اپنے سوکھے ہاتھ میں لاٹھی بلند کرلی۔ یہ دیکھتے ہی دوسرے سپاہی اور خدمت گار دوڑے، اور ایک نے اُن کی لاٹھی پکڑ کر کہا "گھانس کھاگئے ہو ہدایت اللہ خاں، اگر خاں صاحب بہادر کو خبر ہوگئی تو جانتے ہو کہ اس بُڑھاپے میں تمھاری کیا گت بنا دی جائے گی"

غرض کہ اُس روز کا یہ ہنگامہ رفت و گزشت ہوگیا۔ لیکن ناعاقبت اندیش و کینہ پرور بوڑھا ٹھاکر، بھول جانے یا معاف کردینے والا انسان نہیں تھا۔

چنانچہ اس واقعہ کے دوسرے ہی دن وہ بوڑھا، رینگتا اور لاٹھی ٹیکتا ہوا "بڑے باغ" پہونچکر "گاڑے" پر بیٹھ گیا ـــــ اور جب، اپنی بڑی بڑی مونچھوں کے ساتھ، خلیل خاں، حسبِ دستور، ہدایت اللہ خاں کے "کالے" پوتے کو لئے ہوئے، بڑے باغ میں نمودار ہوئے تو اِس برجھائے ہوئے بوڑھے نے ڈپٹ کر آواز دی کہ "ٹھاڑ ہوجاؤ کھلیل کھاں، بڑے جی وَٹ ہو تو آؤ، اور دُوئی دُوئی ہات کرلیو" (کھڑے ہو جاؤ خلیل خاں، بڑے بہادر ہو تو آؤ، اور دو دو ہات کرلو)

دادا کا یہ تھرتھراتا نعرۂ جنگ سنتے ہی اُن کا پوتا تو، غزالِ وحشی کی طرح، چوکڑیاں بھرتا ہوا، بھاگ کھڑا ہوا، اور خلیل خاں نے قریب آکر، مُسکراتے ہوئے کہا "ہدایت اللہ خاں، تم بوڑھے آدمی ہو، میں تم پر کیا ہات اُٹھاؤں، ہاں تم اپنا حوصلہ نکال لو"۔

"اچھا، بڑے جوان بَنت ہو" (اچھا بڑے جوان بنتے ہو) کہکر ہدایت اللہ خاں نے اپنی داڑھی دانتوں میں دبالی اور اپنی پوری جسمانی و روحانی طاقت کے ساتھ یہ ٹھیں کرکے بھرپور لاٹھی ماری کہ پہلی ہی ضرب میں خلیل خاں کا کھیجا بہتا نظر آئے گا۔

اس "بے پناہ" ضرب کو، بڑی ہی آسانی کے ساتھ، اپنی لاٹھی پر روک کر، خلیل خاں نے کہا "فِش!"
اِس غیر متوقع حیرتِ ذلّت آمیز سے بِل بِلاکر ہدایت اللہ خاں نے "پھِس پھِس کیا کرت ہے اور لے" (فِش فِش کیا کرتا ہے اور لے) کا نعرہ بلند کرکے، دوسری لاٹھی ماری
خلیل خاں نے اس وار کو بھی روک کر کہا "فِش"
اے پھِس پھِس کا کرت ہے اور لے"۔ کھٹاخ: "فِش"
اے پھِس پھِس کا کرت ہے اور لے"۔ کھٹاخ: "فِش"
اے پھِس پھِس کا کرت ہے اور لے"۔ کھٹاخ: "فِش"
الغرض خلیل خاں کی "فِش" اور ہدایت اللہ خاں کی "پھِس پھِس کا کرت ہے اور لے" نے اِس قدر طول کھینچا کہ ہدایت اللہ خاں کا دَم پھُول گیا، اِس دَم پھولنے میں بھی، آخری بار "پھِس ....پھِس ..... کا ... کرت ہے" کہہ کر وہ بیچارے دھڑام سے گر پڑے، اور بے ہوش ہوگئے۔
مُقابلہ تو دلِ ناتواں نے خوب کیا!
سُنتے ہیں تاریخ اپنے کو دُہرایا کرتی ہے۔ چنانچہ بالکل اُسی طرح ایک فتح پوری نیاز محمد خاں عرف "نگار" ایک ملیح آبادی شبیر حسن خاں، عرف "نگار باز" بھی پچیس تیس برس تک یہی "فِش" اور "پھِس پھِس کا کرت ہے اور لے" کا کھیل کھیل کر ابھی چند ماہ ہوئے کہ فارغ ہوئے ہیں۔
اور اس وقت صورت حال یہ ہے کہ نئے فتح پوری ہدایت اللہ خاں، انتقاد کے "بڑے باغ" میں چاروں خانے چت بے ہوش پڑے ہوئے ہیں، اور نئے ملیح آبادی خلیل خاں "شکر خورے کو شکر، اور موذی کو ٹکر" کی زندہ مثال بنے ہوئے، فتح پوری کی زرد رو شہرتِ انتقاد کو، ہدایت اللہ خاں کے "کالے پوتے" کی طرح "باغوں باغوں" کی ہوا کھلاتے پھر رہے ہیں۔

جاہلانہ انتقاد ——— مُردہ باد!
غیظِ ناتوانی ——— مُردہ باد!
اِحساسِ کم تری ——— مُردہ باد!
بُغضِ لِلّہی ——— مُردہ باد!

اور

پھِس پھِس کا کرت ہے، اور لے" مُردہ باد!!

والسّلام
جوشؔ

میر کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی

انجمن ترقی اُردو (ہند) علی گڑھ کے کتب خانہ میں مجھے میر کی ایک غیر مطبوعہ مثنوی نظر آگئی - انجمن کے اُردو مخطوطات کی مفصل فہرست محمد ابرار حسین صاحب فاروقی ایم - اے نے مرتب کی ہے - فہرست مرتب کرنے میں موصوف نے یقیناً عرق ریزی سے کام لیا ہے لیکن افسوس ہے وہ میر کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ مثنویوں میں امتیاز نہ کر سکے - کتب خانہ میں ایک نسخہ موسومہ بہ مثنویات میر ہے جس میں میر کی حسب ذیل مثنویاں شامل ہیں

۱ — دریائے عشق
۲ — شعلۂ عشق - (اس کے درمیان کے چند اوراق غائب ہیں)
۳ — ہجو خانۂ مصنف
۴ — جوشِ عشق
۵ — ہماری زیر بحث مثنوی - ناقص الآخر
۶ — جوشِ عشق - میر

درمیان میں ایک اور غیر متعلق مثنوی گرداب لکھنوی کی بھی اس جلد میں شامل ہے -

کاتب نے اپنا نام نہیں ظاہر کیا لیکن اس نے یہ سب مثنویاں نصیر الدین حیدر کے عہد میں شعبان ۱۲۵۱ھ میں لکھی تھیں - اکثر مثنویوں کا نام بھی دیا ہے - لیکن زیر بحث مثنوی میں صفحے کے اوپر ایک کونے پر صرف "مثنوی تصنیف میر صاحب" تحریر ہے - نظم میں کل ۱۶۴ اشعار ہیں - آخری دو شعر یہ ہیں :

یہ ہے میر وہ عشق خانہ خراب — کہ جی جلے ہمارے ہیں یہاں بے حساب
محابا کسو کا اسے کچھ نہیں — رہا ہے محابا سدا ہر کہیں

اس کے بعد کا ورق غائب ہے - صفحے کے نیچے ترک کے الفاظ ہیں "نہیں اس کی" یعنی اگلے صفحے کا پہلا شعر نہیں اس کی سے شروع ہوگا - قصہ ختم ہو گیا ہے اس لئے خاتمے کے طور پر غالباً آٹھ دس شعر اور رہے ہوں گے - مرتب فہرست اس مثنوی کے بارے میں لکھتے ہیں :

"مثنوی عشقیہ مگر ناقص الآخر ہے اس لئے اس قصہ کا نام نہ معلوم ہو سکا کاتب اس کا بھی وہی ہے جو سابقہ مثنویوں کا ہے خط شکستہ آمیز"

مرتب چونکہ مثنویاتِ میر کے بارے میں زیادہ واقفیت نہیں رکھتے اس لئے ان کی تحریر سے کوئی نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا - وہ میر کی سب سے زیادہ مشہور مثنوی "دریائے عشق سے" بھی شناسا نہیں - لکھتے ہیں :

"یہ مثنوی بھی ایک عشق و محبت کا افسانہ ہے - مصنف نے اس قصہ کا کوئی نام نہیں لکھا بلکہ مثنوی کی پیشانی پر صرف یہ لکھا ہوا ہے :

"قصہ عاشق شدنِ جوانے بر عورتے تصنیفِ میر"

اس کے بعد مثنوی کے آغاز کے چند شعر درج کر کے قصہ کا خلاصہ لکھتے ہیں لیکن نہیں جانتے کہ یہ میر کی بہترین مثنوی "دریائے عشق" ہے - غرض فہرست سے زیر بحث مثنوی کے بارے میں کوئی رہبری ممکن نہ تھی -

مثنوی زیر بحث میر کی تصنیف ہے اس میں کوئی شک و شبہ نہیں - مثنوی کے آخر میں میر کا تخلص موجود ہے - ابتدا میں کاتب نے

"مثنوی تصنیفِ میر صاحب" لکھ دیا ہے۔ مثنوی کی کتابت میر کے انتقال کے بعد چوتھائی صدی کے اندر اندر ہوئی ہے۔ ابتدا میں وہی عشق کے اوصاف کا بیان اور وہی سچے پاکیزہ عشق کا المیہ نتیجہ۔ انجام میں پہلے عاشق کی موت اور اس کے بعد معشوق کا جان دینا۔ وصل بعد مرگ۔ فریقین کی لاش کا اس طرح چسپاں ہونا کہ جدا نہ ہو سکیں جیسا کہ دریائے عشق میں ہوا ہے۔ خاتمے پر عشق کے بارے میں مائی اشعار۔ مثنوی کی زبان ہر اعتبار سے میر کی ہے۔ غرض مثنوی کا ہر شعبہ اور ہر مصرع پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ میں میر کی تصنیف ہوں۔ پوری مثنوی کی فضا میں وہی شستگی و پرشستگی۔ سوز و گداز۔ بے کسی و بے چارگی۔ وہی دھیما پن ہے جو میر کا مزاج ہے۔ قصے کا خلاصہ یہ ہے:

ایک جوان کسی اجنبی شہر میں جا کر سرائے میں ٹھہرا۔ وہاں بیمار ہو گیا۔ علاج سے فایدہ نہ ہونے پر اس نے علاج ترک کر دیا اور دیوانہ وار رہنے لگا۔ اتفاق سے اسی سرائے میں ایک قافلہ آ کر ٹھہرا جس میں ایک پری صفت لڑکی بھی تھی۔ اس لڑکی کے ماں باپ نہیں تھے۔ لڑکی کی اس شہر میں شادی ہونا تھی جس کے بعد داماد و عروس دائیں لڑکی کے شہر میں چلے جاتے۔ جوان لڑکی پر عاشق ہو گیا۔ ایک روز لڑکی نے ہاتھوں پر مہندی لگائی اور اپنے ہاتھوں کو دیوار پر چھاپ دیا۔ شادی کے دن قریب آنے پر قافلہ اٹھ کر شہر میں چلا گیا۔ ہجر میں جوان کی حالت ابتر ہو گئی ایک روز مہترانی نے اس سے کہا کہ تیرا حجرہ بہت گندہ ہو گیا ہے۔ تو چند روز کے لئے اس حجرے میں چلا جا جہاں وہ رشکِ ماہ رہتی تھی تاکہ میں تیرا حجرہ بھی جھاڑ کر صاف کر دوں۔ وہ اس حجرے میں منتقل کیا گیا جہاں اسے دیوار پر وہ نقش نظر آئے۔ اس کو وحشت ہونے لگی۔ بیمار پڑ گیا اور آخر کار مر گیا۔

شادی کے بعد لڑکی اور اس کا شوہر لڑکی کے شہر جانا چاہتے تھے۔ لڑکی نے کہا چلو پہلے اسی سرزمین ٹھہریں۔ شوہر نے بازو کھنچا چاہا۔ لیکن لڑکی نہ مانی آخر دونوں سرائے میں آ کر ٹھہر گئے۔ سرائے میں جذبۂ عشق سے لڑکی کی حالت زار ہونے لگی۔ اس نے مہترانی سے پوچھا کہ وہ جوان کہاں ہے مجھے اس کی شکل ہر طرف نظر آتی ہے۔ مہترانی نے کہا وہ تو تیرا شہید ہو گیا۔ لڑکی نے کہا یہ راز کسی سے نہ کہنا مبادا میرے شوہر کو بدگمانی ہو۔ مجھے اس کی تربت پر لے چل۔ مہترانی اسے قبر پر لے گئی۔ لڑکی جونہی تربت پر پہونچی قبر شق ہو گئی، لڑکی قبر میں داخل ہو کر لاش سے بغل گیر ہو گئی اور اسی عالم میں انتقال کر گئی۔ قبر پھر بند ہو گئی۔ مہترانی روتی پیٹتی شوہر کے پاس گئی وہ بھی نالاں کناں قبر پر آیا۔ قبر کو کھدوا کر دونوں کو واصل دیکھا۔ ایک نئی قبر میں دفن کر دیا اور شوہر اس شہر سے کہیں نکل گیا۔

قصہ سیدھا سادہ ہے۔ آخری واقعہ قصہ کو فوق الفطرت افسانوں میں شامل کر دیتا ہے۔ میر اپنی بعض مثنویوں کے انجام کو تاثر پیدا کرنے کی کوشش میں غیر فطری بنا دیتے ہیں۔ شاید یہ اس عہد میں غیر فطری معلوم نہ ہوتا ہو جب اردو غزل کے انداز کے عشق کا رواج تھا۔ در اصل میر کے یہاں قصے کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی وہ تو محض ایک قالب ہوتا ہے جس پر وہ اپنے جذباتِ عشق کا تار و پود چست کرتے ہیں۔

اس مثنوی کی زبان میر کی دوسری عمدہ مثنویوں سے کم چست ہے بعض بعض مصرع بہت ڈھیلے ہیں۔ ہاں شدتِ جذبات کے اعتبار سے یہ کسی مثنوی سے کم نہیں اوصافِ عشق کا ہمہ گیر تخیل دیکھئے

نہ ہو عشق تو اُنس باہم نہ ہو — نہ ہو درمیاں یہ تو عالم نہ ہو
نہیں اس سے خالی جہاں میں بشر — سبھوں میں ہے ساری یہی فتنہ گر
کسو دل میں جا کر ہوا درد یہ — کسو پیر سے کو کر گیا زرد یہ
کہیں عشق و عاشق ہے معشوق ہے — کہیں خالق و خلق مخلوق ہے
یہی عشق خلوت میں وحدت کے ہے — یہی عشق پردے میں کثرت کے ہے

عشق کا یہ وہی تصور ہے جو میر کو اپنے والد سے ملا جو میر نے ذیل کے شعر میں بیان کیا ہے:

یارب کوئی تو واسطہ سرگشتگی کا ہے — اک عشق بھر رہا ہے زمین آسمان میں

اور جو بعد میں کچھ اور منزہ ہو کر اقبال کے یہاں ظاہر ہوا۔ اسی مثنوی میں اوصافِ معشوق میں ایسے ستھرے اور عمدہ تراکیب کے شعر

بھی ملجاتے ہیں :

کہیں سبزے میں چشمک گل ہوا — کہیں نالۂ زار بلبل ہوا
کہیں سرو بر چیدہ دامن ہے یہ — کہیں قمری کا طوقِ گردن ہے یہ

لڑکی کا سراپا اس شاعرانہ انداز میں بیان کیا ہے :

ع کہ شعلہ خرابی کنِ شہر تھا

صفا سے وہ رخسار آئینہ دار — دکھائی دے منھ ان میں ہوتے دوچار
گل اندام گل پیرہن گل بدن — دلارام و دلچسپ و دلکش سخن
بہت نازک اندام و شیریں کلام — قد و قامت اس کا قیامت تمام

مندرجۂ بالا شعر دیکھ کر میر حسن کا یہ شعر یاد آتا ہے :

قد و قامت آفت کا ٹکڑا تمام — قیامت کرے جس کو جھک کر سلام

ذیل کے اشعار میں تشبیہات ملاحظہ ہوں :

اگر ہنستی آئے ہے وہ کامنی، — تو یوں دانت چمکے ہیں جوں دامنی (بجلی)
نہالِ قد اس کا تھا گلبن مثال — کفِ پا تھا گل برگِ پائے نہال

پہلے شعر کے قوافی اور دوسرے شعر میں گلبرگِ پائے نہال سے تشبیہ قابلِ غور ہیں - شاعر ہجر زدہ مسافر کا بیان ایسے سیدھے اور پر اثر انداز میں کرتا ہے کہ : ——— اس کی اُداس بھی صورت نگاہوں کے سامنے آجاتی ہے -

پھرے تو پھرے جیسے آفت زدہ — رہے تو رہے جیسے محنت زدہ
کہو جیسے دیوانہ روئے نہیں — کہو شہر سے دشت میں جا بسے
کھڑا ہے کہیں ہو پریشان سا — کہیں دیکھتا ہے تو حیران سا
کسی سے کرے بات تو دل کہیں — نہ ہر گز کہے دل کی مشکل کہیں

مثنوی میر حسن میں ہجر کا بیان مشہور ہے - میر کے بیانات اس سے کسی طرح کم نہیں -

پوری مثنوی قابلِ ملاحظہ ہے - ذیل میں پوری مثنوی پیش کرتا ہوں - یہ ۹×۷ کی تقطیع کے ساڑھے نو صفحوں پر پھیلی ہوئی ہے - کلیاتِ میر اور مثنویاتِ میر کے مختلف اڈیشنوں میں یہ موجود نہیں - مجھے اس مثنوی کے کسی اور مخطوطے کا علم نہیں - موجودہ نسخہ میں بعض الفاظ اور مصرع صحیح نہیں پڑھے جاسکے - میں ان الفاظ کو قوسین میں تحریر کر رہا ہوں، بعض مصرعوں کے معنی واضح نہیں، مثنوی شایع کرنے کی غرض یہ ہے کہ کسی صاحب کے پاس اس کا کوئی نسخہ ہو یا وہ اس پر مزید روشنی ڈال سکیں تو مجھے اطلاع دیں - یہ مثنوی اسوقت تک صحیح کرکے شایع نہیں کی جاسکتی جب تک اس کا کم از کم ایک اور نسخہ حل نہ جائے - جو اصحاب قلمی نسخوں کا مطالعہ کرتے ہیں انھیں ہی اس کا اندازہ ہوسکتا ہے کہ مخطوطات کو پڑھنے میں کن کن مشکلوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے - مثنوی کا نام نہ معلوم ہوسکا -

مثنوی تصنیفِ میر صاحب

خدا ایک فرقہ میں مانا ہے عشق — کہ نظمِ کل ان سب نے جانا ہے عشق
نہ ہو عشق تو انس باہم نہ ہو — نہ ہو درمیاں یہ تو عالم نہ ہو

یہ آفت زمانہ کی معروف ہے
زمانہ میں جو ہے سو ماؤف ہے

نہیں اس سے خالی جہاں میں بشر
سبھوں میں ہے ساری یہی فتنہ گر

کہیں داغ ہو کر جگر پہ جلا
کہیں زخم سینہ ہوا برملا

مزا ہے یہ عاشق جہاں ہو گیا
عزا ہے جو ان دونوں پر رو گیا

کسو دل میں جا کر ہوا درد یہ
کسو چہرے کو کر گیا زرد یہ

کسو کے لئے ہے بیاباں نورد
کسو کی رہِ دور کا ہے یہ گرد

کسو جان میں ہے تمنائے وصل
کسو دل سے اٹھا (جیائے) فصل

کہیں سبزے میں چشمکِ گل ہوا
کہیں نالۂ زارِ بلبل ہوا،

کہیں سرو بر چیدہ دامن ہے یہ
کہیں قمری کا طوقِ گردن ہے یہ

کہیں پھول لالے کا ہے داغدار
کہیں اس سے ہے مضطرب لالہ زار

کہیں عشق و عاشق ہے معشوق ہے
کہیں خالق و خلق مخلوق ہے

یہی عشق خلوت میں وحدت کے ہے
یہی عشق پردے میں کثرت کے ہے

عجب عشق یہ شعبدہ باز ہے،
موافق کہے گاہ ناساز ہے

غرض طرفہ ہنگامہ آرا ہے عشق
تماشائی عشق و تماشا ہے عشق

مساعد نہ تھا ایک سے روزگار
کیا اُس نے ترکِ وطن اختیار،

پریشانی لائی کہیں سے کہیں،
بجز بے کسی ساتھ کوئی نہیں

سرا ایک تھی شہر کے درمیاں
فرود آیا وہاں یہ مسافر جواں،

ہوا آبِ گردش سے بیمار یہ
رہا اس سبب کوئی دن اس جگہ

کھنچا طول کو رفتہ رفتہ مرض،
دوائے طبیباں سے آئی غرض

مراعات اسباب کے چند روز
دوا سے بڑھا اور کچھ دل کا سوز

کیا ترک نومید ہو کر علاج
کہا لوگوں سے خوش ہے میرا مزاج

مجھے حال ہی پر مرے چھوڑ دو،
نہ لکھ پڑھ کے دل کو مرے توڑ دو

دوا چھوڑی غیرت سے وحشت ہوئی
جنوں کرنے کی اس پہ تہمت ہوئی

خیال اس کا لوگوں نے چھوڑا نداں
تعرض نہ کرتے تھے دیوانہ جان

پھرا کرتا تھا ایدھر اودھر خموش
نہ کچھ دل میں طاقت نہ کچھ سر میں ہوش

شب و روز اپنے بسر یوں کرے
معیشت زمانہ میں جوں توں کرے

یکایک ہوا واقعہ ایک نمود
قریب اس کے حجروں میں آیا فرود

تھی ساتھ اس کے ایک دخترِ بے مثال
گلستانِ خوبی کی تازہ نہال

پری شرم گیر، اس کے رخسار سے
غشی حور کو اس کی رفتار سے

قیامت ادا فتنہ در سر تھی وہ
عجب طرح کی آہ دلبر تھی وہ،

نکلتی نہ پلکوں سے (کم) راہ تھی،
نگہ لیک تا قتل ہمراہ تھی

نظر (گاہ) کا جو کہ مفتون ہو، گریباں کرے چاک مجنون ہو،
قنات آگے حجروں کے لی کھینچ سب لگی رہنے وہ رشکِ مہ روز و شب
پدر مادر ایسے نہ تھے درمیاں، قبیلہ کے کچھ لوگ لائے تھے یہاں
کہ شادی کہیں اس کی کر دیجئے گئے لوگوں کا چندے غم کیجئے؟
سو نسبت ہوئی ہے کسی سے درست اہم کتخدائی ہے اس کی نخست
عروس اور داماد بعد از فراغ وطن ان کو لے جائیں گے خوش دماغ
(مئونت) کو دونوں کے ملک معاش کفایت ہے بے کوشش و بے تلاش
مسافر ہوا اس پری سے دوچار ہوا اس پہ سو جان و دل سے نثار
پریدار سا آنے جانے لگا جنوں کرتے شور ایک اُٹھانے لگا
کبھی بات کرتے جو اس کو سنا بڑی دیر تک اُنے سر کو دھنا
کبھی چلتے پھرتے جو آئی نظر روش سے ہوئی اس کی حسرت دگر
بہت نازک اندام و شیریں کلام قدو قامت اس کا قیامت تمام
نگہ دل زدے کو مسل ڈالتی طرح سے جگر جان مل ڈالتی
ادا ایک غضب ناز اک قہر تھا کرشمہ خرابی کنِ شہر تھا،
سخن عشوہ غمزے سے کیا کوئی کرے کہ آنکھ اس کی ایک پل پڑے تو مرے
بلا زیرِ سر فتنہ گر ناز تھا چمک برقِ خاطف کے انداز تھا
مژے اس کے ہر گشتہ جی میں گھسے نگہ اس کی سرتیز دل میں چبھے،
کشیدہ بھویں دو کمانیں تھیں تاک[1] جھکیں جب حریفاں بہت ہوں ہلاک
صفا سے وہ رخسار آئینہ دار دکھائی دے منہ ان میں ہوتے دوچار
دہن غنچہ لب اس کے گل برگ تر دلا ویز گیسو و عنبر نظر،
گل اندام گل پیرہن گل بدن، دل آرام و دلچسپ و دلکش سخن،
سراپا سے اس کے (ہوا رنگ ہے) کھڑی اس کی ہر جائے صورت رہے
مسافر بھی حیرانِ رفتار تھا پکا جاتا تھا جو خریدار تھا
لٹک کر جو چلے دلا ویز تھے، کفک پاؤں کے کیا بلا خیز تھے
اس آفت نے ایک روز مہندی لگا سر پا سے فتنہ ہزاروں جگا،
دوئے چھاپ شوخی سے دیوار و در رہا نازک ان انگلیوں کا اثر
اُٹھے نقش پنجوں کے اس ڈھنگ سے کہ چھاپے کے گل کب ہوں اس رنگ سے
جو نقاش وہ نقش کرتا نظر تو رہ جاتا ہاتھوں کو بھی کھینچ کر
کئی دن میں شادی قریب آ رہی سرا میں سے اُٹھ شہر میں جا رہی
یہ افسانہ یہاں کا یہیں رہ گیا مسافر سے عشق اس کا کیا کہہ گیا،
پریشاں دلی اس کی اس حد ہوئی کہ طبعِ خوش اُسے بہت بد ہوئی

---

[1] یہاں "تاک" کا کوئی موقع نظر نہیں آتا۔

پھرے تو پھرے جیسے آفت زدہ
رہے تو رہے جیسے محنت زدہ

چلے تو پریشاں پری وار سا
گرے فرش پر سست بیمار سا

جو سونے کو ہو تو کہاں اس کو خواب
پری یاد آوے جو آنکھیں پُر آب

نہ سایہ خوش آوے نہ دھوپ اس کو بھاوے
جہاں جائے وحشت لے کر ساتھ جائے

کبھو جیسے دیوانہ رووے ہنسے
کبھو شہر سے دشت میں جا بسے

کھڑا ہے کہیں ہو پریشان سا
کہیں دیکھتا ہے تو حیران سا،

کسی سے کرے بات تو دل کہیں
نہ ہرگز سجے دل کی مشکل کہیں

جو آنکھیں تھیں اس کی نظر میں سو تھیں
جو پلکیں چھپی تھیں جگر میں سو تھیں

شب و روز اس کو یہی تھا خیال،
کہ کیا خوبصورت ہیں کیا لمبے بال

کہوں خوبی کب تک کہ ہر جا سے خوب
تکلف نہیں کچھ سراپا سے خوب

قیامت ہے اس کی کمر کی لچک
سرکتی تھی دھچکے سے سر کی لچک

نظر سیمیں ساعد پہ کیا جا پڑے
کہ بجلی سی ادھر چمک آ پڑے

کفِ دست سینے پہ رکھے نہاں
تو راحت اُٹھاوے گی صد رنگ جاں

قیامت کا ٹکڑا تھا وہ قدِ راست
یہ حرف و سخن ہیں مرے راست راست

غلام اس کا دل ہاتھ سے لے گیا
کلام اس کا مردوں کو جی دے گیا

سخن کرنے لگتی وہ محبوب جب
تو دلکش قیامت تھی تحریکِ لب

اگر ہنستی آئے ہے وہ کامنی،
تو یوں دانت چمکے ہیں جوں دامنی

نہالِ قد اس کا تھا گلبن مثال
کفِ پا تھے گلبرگِ پائے نہال

سرا میں مسافر جو شب آ رہا
وہیں مہترانی نے جا کر کہا

کہ اے نو سفر عشق کی راہ کے
جدائی کش اس غیرتِ ماہ کے

تو اس حجرے میں جو رہا چند ماہ
سو گلخن سا ہے حالِ حجرہ تباہ

نہ لیپا گیا ہے نہ جھاڑا گیا
خرابہ سا ہے وہ اکھاڑا گیا

ہوا مزبلہ سا خس و خار سے
کہ صحبت رہی تجھ سے بیمار سے

تو اس حجرے میں چار دن جا کے رہ
رہی تھی جہاں آ کے وہ رشکِ مہ

کروں (سیم کل) جھاڑ فانوس و خاک
یہ گھر بھی ہو پُر نور و صاف اور پاک

پھر آ رہبو اس میں ترا ہے مکاں
کوئی ..... لے گیا اس کی جاں

مسافر اسی گھر میں اُٹھ جا رہا
سکونت کو اُترے جہاں تھا کہا،

منقش نظر آئے دیوار و در،
حنائی انھیں پنجوں کا تھا اثر

نشاں اس کے ہاتھوں کا دل لے گیا
ہر ایک نقش صد رنگ غم دے گیا

کہیں حیرتی نقشِ دیوار سا
کہیں عشق سے سست بیمار سا

اکیلا جو اس حجرے میں پا گیا،
غمِ عشق اسے ..... کھا گیا

لے = الفاظ نہیں پڑھے جا سکے

اُٹھا (اونٹ) کر خوں زجوشِ جنوں
یہ ہوتا چلا زرد زار و زبوں،

ہوا فرشِ خواب اس کا فرشِ مرض
کہ تھی عشق کو مرگ اس کی غرض

بڑھی ناتوانی نہ طاقت رہی،
نہ ایک بات کرنے کی فرصت رہی

کئی دن رہا بس طلب چشم وا
وہیں شوق کش جی عدم کو گیا

مسافر سرا سے ندان اُٹھ گیا،
یہ جی اس سرا ہی میں اس کا گیا

(کیا چھوڑ پانے سرا نو سفر)
لئے ساتھ ہجراں میں داغِ جگر

نہ وارث تھا کوئی کہ اس کو اُٹھائے
رکھے نقش کاندھے پہ تا گور جائے

کچھ اس مہترانی نے تزئین کی
مروت سے تجہیز و تکفین کی،

جنازہ نکالا بڑی شان سے
نماز اس کی کی سو مسلمان سے

کیا اس سرا ہی میں مدفون اسے
کیا تھا محبت نے مجنون اسے

سیوم کر کے ماتم نہ اس کا کیا
تمام اس سفر کردہ کا غم کیا

نہ وارث تھا کوئی جو لے تعزیا
کیا کچھ تو للّٰلہ سب نے کیا،

سنا جب کہ یہ واقعہ ہو چکا
تو شادی سے وہ فارغ ہوا

زن و شو وطن کے تئیں جائیں گے
کوئی روز رہ کر یہاں آئیں گے

سرا کے ہے سب لوگوں کو انتظار
کہ کب آوے گی رشکِ باغ و بہار

سرا اس کے رہنے سے گلزار تھی
کرم خصلت و لطف کردار تھی

کہا شو نے منزل کریں گے جہاں
کوئی دن رہیں گے ضرورت کو وہاں

پھر اس میں سرا ہو مکاں ہو کوئی
بیاباں ہو یا گلستاں ہو کوئی

ہمیں اس سرا میں نہ جانا ہے خوب
جہاں سے اُٹھے پر نہ آنا ہے خوب

مبارک نہیں رجعتِ قہقری[1]
خدا جانے پیش آوے ہم سب کو کیا

زن اصرار کر اس ہی جا میں گئی
کشش عشق کی لے سرا میں گئی

اُتر تے دگر گوں ہوا حالِ دل،
وہی کوٹھری میں تھی پتھر کی سِل

کھنچا عشق کے جذب سے یہ لقب
کہ مطلق نہ ہلتے تھے وہ لعلِ لب

وہ آنکھیں کہ تھیں رشکِ چشمِ غزال
ٹھٹک رہ گئیں آئینہ کے مثال

وہ گوندھے ہوئے بال اُلجھے گئے
پریشاں ہوئے پھر نہ سلجھے گئے

گلِ سرخ رخسار مرجھا چلے
شکن کھا بہار اس کی لٹوا چلے

گیا طائرِ رنگ پرواز کر،
سلامت رہی عشق کی ساز کر

لگی رونے آزردہ ہو زار زار
گہا جذب اُلفت سے صبر و قرار

جگر (زن[2]) گیا عشق کے موطرف
ندان ایسی آفت میں ہو گئی تلف

---

[1] اس شعر کے قافیے غلط ہیں۔ خدا معلوم صحیح الفاظ کیا ہوں گے ۔ [2] یہاں "زن" کے بجائے "رہ" ہو تو کچھ معنی نکل سکتے ہیں۔

طرح اس کی جینے کی سی اب نہیں
کوئی دم نہیں دل کی تسکیں کہیں

وہی مضطرب ہے وہی بے حواس
وہی جذب سے عشق کے ہے اُداس

سفر کردہ کا حال پرساں ہوئی
بہت سی بہت دل پریشاں ہوئی

کہا سو کہا مہترانی سے یہ
کہ وہ یہاں جو رہتا تھا کیدھر ہے کہہ

خیال اس کا جاں سے مجھے لے گیا
مسافر عجب داغ ایک لے گیا،

سرا میں فزود آئی میں کس گھڑی
مسافر کی صورت تھی آگے کھڑی

جہاں دیکھتی ہوں پلک میں اُٹھا
اسی کی ہے ترکیب جلوہ نما

اُدھر دیکھے ہے ایک حسرت کے ساتھ
کھڑا ہے خموش ایک حیرت کے ساتھ

جدھر جاؤں وہ بھی چلا جاوے ہے
مرے ساتھ پرچھائیں سا جاوے ہے

جگر جان و دل میں نہیں رہتی تاب
نہ ہے چین دل کو نہ شب کو ہے خواب

جو میں جانتی اس سرا کے یہ ڈھنگ
تو کیوں آ اُترتی مسافر کے رنگ

نہ جا سکتی ہوں اب نہ رہ سکتی ہوں
پشیمانی سے کچھ نہ کہہ سکتی ہوں

مگر شو سے مجھ کو ندامت ہوئی،
مری جان پر یہاں قیامت ہوئی

کیا عشق (شو دنگ) ہوں میں بہت
کہ اس جینے سے تنگ ہوں میں بہت

نشاں دے ترے پاس رہتا تھا وہ
سدا دردِ دل تجھ سے کہتا تھا وہ،

گیا یہاں سے اُٹھ کر تو کیدھر گیا،
کہیں جا کے جیتا ہے یا مر گیا

کہا مہترانی نے بے تاب دیکھ،
کہ قربان میں اب نہ یہ خواب دیکھ

مسافر سرا میں کہا مر گیا،
جدا تجھ سے کام اپنا وہ کر گیا

کیا تیری فرقت نے اس کو ہلاک
ہوا میرے ہاتھوں سے وہ زیرِ خاک

تو ضایع نہ کر آپ کو صبر کر
غم و غصّے سے جی پہ مت جبر کر

سن اس واقعے کو بہت غم کیا
عزا میں بہت حال درہم کیا

کہا حیف صد حیف بے کس موا
گڑھا گور پھر یوں میسر ہوا،

چپ اب عشق کا راز رسوا نہ ہو
خدا جانے ظاہر جو کیا کیا نہ ہو،

ترے چپکے رہنے سے ممنون ہوں
میں اس منت احساں کی مرہوں ہوں

مبادا سنے شوئے ناساز کچھ
لگا دیں اسے اور غمّاز کچھ

سن اس زشت کاری کو ناچار ہو
مجھے ذبح کرنے کو طیار ہو،

شفاعت سے کوئی نہ پھر پیش آئے
عبث جانِ پُرآرزو میری جائے

شتاب اس کی تربت پہ لے چل مجھے
کشش اس کی کھینچتی ہے بے کل مجھے

مخاطب چلی لے کے غافل اسے
کہ جاذب ہے وہ جذبِ کامل اسے

کمیں میں ہے مالوف کش اشتیاق
ہوئی زندگی مردہ سال اسکو شاق

جنازہ پہ آئی نہ تھمی وہ پری
ہوئی گور پر اس کی جلوہ گری

برابر گئی شق ہوئی اس کی قبر
گیا اس کے دل سے سکون اور صبر

شتابی گئی ساتھ والی کو چھوڑ
لیا مردہ عاشق نے گویا مروڑ

کھنچی جو گئی گرد اس گور سے
مسافر بھی آیا بہت دور سے

بغل گیر عاشق ہوئی زیرِ خاک
ہوئی ہم کناری میں آخر ہلاک،

زمیں مل گئی جب یہ آخر ہوئی
مسافر سے مل کر مسافر ہوئی

گیا ہوش اس کا جو ہمراہ تھی
زباں پر فغاں تھی بلب آہ تھی

اچنبھا سا یہ ساختہ ہو گیا
عجب طور کا واقعہ ہو گیا

حواس اُڑ گئے اس کے جتنے سنا
ٹھٹھک ہی گیا دیر تک سر دھنا

سرا میں گئی شور سے غم کیا
بہت حال کو اپنے درہم کیا

خبر شوئے نا ساز کو بھی ہوئی
کہ وہ نازنیں جا سرا میں موئی

گریباں دراں خاک افشاں گیا
لب گور خاطر پریشاں گیا،

کہا گور کھولیں پھر بیلدار،
کہ بن آنکھوں دیکھے نہیں ہے قرار

کھلی گور دیکھا تو چپاں ہے[1] وہ
گلے لگ رہی تھی پہ بے جاں تھی وہ

جدا کرتے مشکل جدا وہ ہوئی
کمال اشتیاق اس کو تھا جو موئی

تئی گور کر دفن دن کو کیا،
نہ غیرت سے شوہر نے ماتم کیا

بنا ایک ..... پئے ساطحہ
موافق کیا رسم کے فاتحہ

گیا[2] شو گیا شہر سے بھی گیا
کہ ہمسر کے یوں مرنے کے تھا جیا،

یہ ہے تیرہ عشق خانہ خراب
کہ جی جتنے مارے ہیں یہاں بے حساب

محابا کسو کا اسے کچھ نہیں
رہا بے محابا سدا ہر کہیں

ڈاکٹر گیان چند جین (حمیدیہ کالج بھوپالی)

---

[1] اس شعر کی ردیف میں ایک مصرع میں "ہے" ہے اور دوسرے میں "تھی"۔ دونوں میں ایک ہی لفظ ہونا چاہئے۔
[2] اس شعر کے کئی الفاظ مشکوک ہیں۔

نگار کے پچھلے مکمل فائل

۴۸ء سے ۵۳ء تک کے بحساب پندرہ روپے فی فائل مل سکتے ہیں، لیکن یہ تمام فائل ایک ساتھ فروخت ہوں گے۔
قیمت جملہ فائل ایک سو پانچ روپیہ معہ محصول
مینجر نگار لکھنؤ

گاہے گاہے باز خواں ——

عیش یا مسرت

فرمانروائے خلد آباد کا خزانہ لعل و گہر سے مالا مال ہے، اس کی حکومت لاکھوں مربع میل تک پھیلی ہوئی ہے، لطف و تفریح کے جتنے اسباب دولت سے فراہم ہو سکتے ہیں وہ سب مہیا ہیں۔ اسی کے ساتھ دولت حسن بھی موجود ہے، دولت شباب کی بھی کمی نہیں۔ ظاہر ہے کہ اُس سے زیادہ مسرور اور کون ہو سکتا ہے، لیکن دفعتہً قصر کے اندر ایک ہنگامہ برپا ہوتا ہے، طبیبوں کے چہرے سے سخت فکر کے آثار نمودار ہونے لگتے ہیں، کیونکہ بادشاہ جو ایک زمانہ سے بیمار ہے دفعتًا نہایت شدید قسم کے درد قلب میں مبتلا ہو جاتا ہے اور کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی —— بادشاہ تڑپ رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ کوئی میری سلطنت لے لے، میری تمام دولت پر قبضہ کرے لیکن اس عذاب سے مجھ کو کسی طرح نجات دلا دے" —— ایک غریب لکڑہارا باہر قصر کے پاس سے گزرتا ہوا دل ہی دل میں کہتا ہے کہ "دولت بھی کیا چیز ہے، کاش مجھ کو بھی حاصل ہوتی اور میں بھی ایسی ہی مسرور زندگی بسر کرتا جیسی بادشاہ بسر کر رہا ہے۔

ملکۂ نسرین جو دولت کے لحاظ سے پھولوں کی رانی مشہور ہے، اپنے پاس کیا کچھ نہیں رکھتی۔ وہ ہمیشہ مخمل و حریر کی تہوں میں سوئی اور لعل و الماس کی روشنی میں بیدار ہوئی۔ اس نے ہمیشہ پھولوں کی چادروں پر قدم رکھا اور نغمہ و رنگ کی فضا میں آنکھ کھولی —— حسن و جمال کا یہ عالم کہ

جو در پہ آ گیا اسے دیوار کر دیا
شباب کا یہ رنگ کہ جس نے ایک بار دیکھا جی سے بیزار ہو گیا

سنگ مرمر کے حوضوں میں بلوریں فوارے چاروں طرف موتی بکھیر رہے ہیں، باغ کے کنجوں میں ہر جگہ تلاطم مچھت ہو رہا ہے، پھولوں کی کثرت نے قصر کے گوشہ گوشہ کو سیلاب رنگ سے لبریز کر رکھا ہے، بربط و رباب کے تاروں سے راگنیاں بلند ہو ہو کر فضا میں مستی کی کیفیت پیدا کر رہی ہیں —— مگر —— ملکۂ نسرین ایک کملائے ہوئے پھول کی سی افسردگی لئے ہوئے بیچ پر پڑی ہوئی ہے اور ریشمی تکیے اس کے نہ تھم سکنے والے آنسوؤں سے تر بتر ہو رہے ہیں، کنیزیں التجائیں کر رہی ہیں، لیکن اس کی ہچکیاں بند نہیں ہوتیں؟

صرف اس لئے کہ شاہزادہ نیلوفر جس کے عشق میں وہ برسوں سے مبتلا تھی کسی اور سے محبت کرنے لگا ہے —— ٹھیک اسی وقت ایک غریب کسان کی بیوی ٹھنڈی سانس بھر کر قصر کے سامنے سے یہ کہتی ہوئی گزر جاتی ہے کہ —— "ملکۂ نسرین بھی کیسی خوش نصیب عورت ہے، کاش میں بھی ایسی ہی مسرور زندگی بسر کرتی۔

حقیقتوں پہ پردے پڑے ہوئے ہیں اور پردوں کے نقش و نگار کو حقیقت باور کیا جا رہا ہے —— یہ ہے انسانی تمناؤں کی ذہانت اور یہ ہے ہماری آرزوؤں کی انتہائی فراست —— ایک غریب تمنا کرتا ہے، کاش وہ دولتمند ہوتا، ایک دولتمند اپنے بہت سے روحانی آزار دور کرنے کے لئے غریب ہونے کی آرزو کرتا ہے، ایک فقیر بادشاہ کی جاہ و ثروت کو رشک کی نگاہوں سے دیکھتا ہے، اور ایک بادشاہ اس آزادی کے لئے تڑپ رہا ہے جو فقیر کو حاصل ہے۔

سوال یہ ہے کہ انسان عیش کا خواہشمند ہے یا مسرت کا کیونکہ سامانِ عیش سامانِ مسرت نہیں اور اسبابِ مسرت اسبابِ عیش نہیں پھر اکثر ایسے ہیں جو عیش کو مسرت جان کر اُسی کی تمنا کرتے ہیں اور کمتر ایسے ہیں جو صرف مسرت کے طلبگار ہیں اور عیش کے خواہشمند نہیں ۔

عیش نام ہے جسم کی آسایش کا اور خواہشِ نفس کی تسکین کا۔ مسرت نام ہے نفس کے اطمینان اور روح کی راحت کا ـــــ پھر یہ تو ٹھیک ہے کہ اسبابِ عیش حاصل ہونے کے بعد انسان مسرتِ روح کے لئے تڑپتا ہے لیکن راحت روح سے آشنا ہونے کے بعد سامانِ عیش کی جستجو کرنا کیا معنی ؟

اس وقت جبکہ دُنیا میں مادّہ روح سے برسرِ پیکار رہے، عیش کی خواہش مسرت کے صحیح مفہوم کو دُنیا سے محو کر دینا چاہتی ہے یعنے اس وقت جبکہ زر و دولت کی محبت نے دُنیا کے اقتصادی و معاشی وسایل کو یکسر آئینِ درندگی بنا رکھا ہے کیا یہ سوچنے کی بات نہیں کہ اس کا نتیجہ کیا ہونے والا ہے اور جس عمیق غار کی طرف "انسانیت" کو ڈھیلا کیا جا رہا ہے اس سے بچنے کی کوئی تدبیر ہے یا نہیں ؟

امریکہ بیتاب ہے کہ ساری دُنیا کی دولت اس کے قبضہ میں آجائے، فرانس مضطرب ہے کہ جرمنی پر اس کا تسلط قایم ہو جائے، جرمنی بے قرار ہے کہ فرانس کو فنا کر دے، اٹلی بیچین ہے کہ رومہ کی قدیم سطوت استبداد کو پھر زندہ کر دے، جاپان کوشش کر رہا ہے کہ وہ ایشیا کو محکوم بنا لے۔ لیکن کیا کوئی ایسی قوم بھی ہے جس نے جغرافی و ملکی امتیاز کو مٹا کر صرف "انسانیت" کی خدمت کو اپنا مقصود قرار دیا ہو ؟

یہ ہے مادی ترقی کا وہ پہلو جس پر آج فخر کیا جاتا ہے اور یہ ہے علم و حکمت کی کاوشوں کا وہ منظر جسے انسان کا منتہائے نظر قرار دیتے ہیں ۔ پھر آج تو نہیں کل وہ وقت آئے گا، جب انسانیت کا خون آلود چہرہ لوگوں کی نگاہ سے اس حجاب کو دور کر دے گا اور بتائے گا کہ عیش کی راہیں مسرت کی راہوں سے بالکل مختلف ہیں اور وہ جسم جو عرصہ تک پھولوں پر لوٹتے رہے ہیں، اُن کے لئے آخر کار بیکھڑیاں بھی خار ہو جایا کرتی ہیں

یقیناً حصولِ مسرت، حصولِ عیش کا مترادف نہیں بشرطیکہ آدمی "عیش" انفرادی حیثیت نہ اختیار کرلے، لیکن انسان کی اس خود غرضی کو مٹانے والا کون ہو سکتا ہے ؟ کیا وہ انسانی قانون جو صرف تیغ و تفنگ کی مدد سے ایک کو غالب اور دوسرے کو مغلوب قرار دیتا ہے ؟ کیا مادی علوم و فنون کی ترقی جو سب سے زیادہ مہلک گیس طیار کر کے انسان پر عرصۂ حیات تنگ کر دینا چاہتی ہے ؟ کیا سرمایہ و دولت کا وہ نظام استعماری جو کمزور و ضعیف انسانوں کا صرف خون نچوڑ سکتا ہے ؟ ۔ نہیں ـــ بلکہ صرف وہ بلند تعلیم جو تمام نوعِ انسانی کو ایک رشتۂ اخوت سے وابستہ کرنا چاہتی ہو وہ نظامِ اخلاق جو رنگ و نسل کے امتیاز کو مٹا کر جملہ افرادِ انسانی کو ایک سطح پر لانا چاہتا ہے وہ اُصولِ حیات جو اسپارٹا والوں کی طرح ضعیف و کمزور کو ہلاک کر دینے کا حامی نہیں ہے، وہ طریقِ ہدایت جو ترقی مفہومِ زر و دولت کا انبار نہیں بلکہ صرف دُنیا کا امن و سکون قرار دیتا ہے ۔

کہا جاتا ہے کہ ایسی بلند تعلیم صرف ایک ہے، ایسا نظامِ اخلاق صرف ایک ہے، یہ اصولِ حیات صرف ایک مسلک نے بتایا، یہ طریقِ ہدایت صرف ایک مذہب نے پیش کیا ۔ لیکن اب اس تعلیم و مذہب کی جستجو کہاں کی جائے ۔ کتابوں میں ؟ مگر عمل کو کتابوں سے کیا تعلق ـــ اُن انسانوں میں جو اب موجود نہیں ہیں ؟ مگر اس سے نتیجہ ـــــ ! ۔ اُن مدعیان بلند بانگ کی زندگی میں جو اس وقت موجود ہیں ـــــ ! ـــ ہاں مگر اس لئے نہیں کہ اُن سے کوئی درس حاصل کیا جائے، بلکہ صرف اس لئے کہ اس تعلیم پر آنسو بہایا جائے جس کے یہ علمبردار ہیں اور اس مذہب کے جنازے پر ماتم کیا جائے جس کو دفن کرنے کے لئے یہ نہایت تیزی سے اپنے شانوں پر اُٹھائے لئے جا رہے ہیں

عورت اور اسلام مالک رام صاحب، ام، اے کی مشہور مور خانہ کاوش کا نتیجہ ہے جس میں انھوں نے عورت کی زندگی کے ہر پہلو پر اسلامی نقطۂ نظر سے گفتگو کی ہے ۔ قیمت تین روپیہ ۔ منیجر نگار۔ لکھنؤ

مشاعرۂ نگار

جولائی کے نگار کے لئے مصرع طرح ، مولانا حسرت موہانی کی غزل سے لیا گیا تھا - افسوس ہے کہ اس میں بہت کم اچھے اشعار نکل سکے - بہرحال ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کیا جاتا ہے جنھوں نے ہماری دعوت کو قبول کیا اور ان شعراء کی خدمت میں معذرت جن کا کوئی شعر انتخاب میں نہ آسکا

اثر انصاری :-

بہت دشوار ہے راہِ طلب میں گام زن ہونا — نشانِ جادۂ منزل غبارِ کارواں تک ہے

احسان دربھنگوی :-

دلوں کا مضطرب جذبہ ، نظر کا منفعل شکوہ ، — مری حیرت ، ترا عشوہ ، کتابوں کی زباں تک ہے
ملے گی روشنی احساں نظر کی گرد تو پوچھو — کہ یہ سارا اندھیرا بس غبارِ کارواں تک ہے

اکرم دھولیوی :-

اُجالا شامِ گلشن کا نہ پوچھو اب کہاں تک ہے — چراغِ آشیاں کا سلسلہ برقِ تپاں تک ہے
نگارِ آرزو شمعِ فروزاں ہی سہی لیکن — بہارِ آرزو پروانۂ آتش بجاں تک ہے
شکایت کے لئے اپنی زباں میں کس طرح کھولوں — ستم ہائے جہاں کا سلسلہ اُس مہرباں تک ہے
گزر دشوارئ راہِ وفا سے بے نیازانہ — غمِ بیچارگی اندیشۂ سود و زیاں تک ہے
بڑھے جاتے ہیں آوازِ جرس پر راہرو لیکن — امیرِ کارواں کا راز امیرِ کارواں تک ہے
کہاں ہوتے ہیں پھر ایسے خراب آرزو پیدا — یہ رنگِ بیقراری اکرم آشفتہ جاں تک ہے

انجم دھولیوی :-

نوائے عشق کی لے ٹوٹ جائے گی تو کیا ہوگا — زمانہ گوش بر آواز میری داستاں تک ہے

پرفن دھولیوی :-

یہ لطفِ چارہ سازی ، چارہ گر درد نہاں تک ہے !! — ہماری بیقراری تیری سعیٔ رائگاں تک ہے
مسلسل تیرے جلوے ہیں جہاں تک ہے نظر میری — جہاں تک جادۂ گرتو ہے نظر میری وہاں تک ہے

حفیظ رزاقی :-

سرور و کیف کا عالم ، نیاز و ناز کی باتیں ، — وہ کیا جانے رسائی جس کی سنگِ آستاں تک ہے
نظر بڑھتی نہیں آگے حدودِ شوقِ پیہم سے — ترے جلووں کی رعنائی حجابِ درمیاں تک ہے

حبیب آروی :-

چمن والو میسر اب تمھیں آسودگی ہوگی — یہ چشمک بجلیوں کی بس ہمارے آشیاں تک ہے
بہاراں ہیں تمنائے بہاراں کون کرتا ہے — نشاطِ انتظارِ فصلِ گل دورِ خزاں تک ہے

رگھبیر داس ساحر جالندھری :-

نجانے اس قدر سہمے ہوئے ہیں کیوں چمن والے — رسائی برق کی تو صرف میرے آشیاں تک ہے

جنوں کی کارفرمائی کو یہ بے مایہ کیا سمجھے
رسائی عقل کی اندیشۂ سود و زیاں تک ہے

شارق میرٹھی ایم - اے :-

کوئی کیا جانے اُس کے حُسن کی دُنیا کہاں تک ہے
وہیں تک دیکھ سکتا ہے نظر جس کی جہاں تک ہے

تڑپتا ہوں کسی کی یاد میں اور یہ سمجھتا ہوں
یہ بے چینی محبت کی فقط عمرِ رواں تک ہے

خلش بڑھتی چلی جاتی ہے ہر لحظہ نگاہوں کی
خدا جانے ہمارے شوق کا عالم کہاں تک ہے

شفقت کاظمی، ڈیرۂ غازی خاں :-

وہی اہلِ چمن ہوں گے وہی دورِ طرب ہوگا
یہ برق و باد کی یورش ہمارے آشیاں تک ہے

لے گی اضطرابِ غم سے پھر فرصت کہاں تجھکو
ترا ذوقِ ستم کوشی مرے ضبطِ فغاں تک ہے

جفائے یار بھی اپنے مقدر میں نہیں شفقت
خدا جانے مری ناکامیوں کی حد کہاں تک ہے

صہبا - پٹنہ ۱ -

دلِ بیتاب تک ہے یا جہاں تم ہو وہاں تک ہے
نہیں معلوم دردِ عشق کی دنیا کہاں تک ہے

مٹا دے گی کبھی شاید حدودِ قید و آزادی
یہ زنجیرِ تصور جو قفس سے آشیاں تک ہے

غریب دھولیوی :-

جو تیرا غم نہ ہوگا کیا رہے گا بزمِ ہستی میں
یہ ساری گرمیٔ بازار اس جنسِ گراں تک ہے

یہ میں نے آج کس کے آستانے پر جبیں رکھدی
نظر کے سامنے روشن فضائے لامکاں تک ہے

ایم - آئی فائز :-

جو ممکن ہو تو امکاں کی حدوں کو اور پھیلا دو
اور اس کے بعد دیکھو میری بیتابی کہاں تک ہے

نہ ٹھہرا عالمِ ہستی میں کوئی کارواں اب تک
بس اس صحرا کی رونق نقشِ پائے رفتگاں تک ہے

نظر شاہجہاں پوری ۱ -

تڑپ جاؤ گے آوازِ شکستِ دل سنی جسدم
تمھاری کم نگاہی التماسِ بے زباں تک ہے

نور :-

منور محفلِ دیر و حرم ہے شمعِ اُلفت سے
کچھ آگے بڑھ کے دیکھیں روشنی اس کی کہاں تک ہے

وحید رائے بریلی :-

وہ منزل کیا، نشانِ جادۂ منزل نہ پائیں گے
مذاقِ جستجو جن کا غبارِ کارواں تک ہے

ستمبر کے لئے یہ مصرع طرح تجویز کیا جاتا ہے :-

شیوۂ عشق نہیں حُسن کو رُسوا کرنا

امید ہے کہ ۲۰ اگست تک غزلیں ہم کو مل جائیں گی ۔

طلسمِ مستقل

فضا ابن فیضی :-

فرشِ سبزہ پر یہ مے ڈھلتی ہوئی — شمع سی ہر کنج میں جلتی ہوئی
یہ حسیں یادوں کا نازِ ارتباط، — یہ شمیمِ لطف یہ بوئے نشاط،
کیف برساتی ہوئی صبحِ مراد — لمحہ لمحہ خلد گوں، مینو سواد،
یہ طلا شیرِ سحر یہ مشکِ شام، — حسنِ فطرت کا یہ سوزِ ناتمام
وادیاں رنگیں، کہستاں سبزہ پوش — ذرّہ ذرّہ دہر کا جنّت بدوش
وہ صراحی اور پیمانوں کی آگ، — مطربِ خوش لہجہ کی تانوں کی آگ
یہ ہوا کی مستیِ صہبا سرشت — یہ کنارِ آب یہ سبزہ پہ کشت
یہ جوانی یہ حدیثِ آب و رنگ — کیف میں ڈوبی ہوئی دل کی امنگ
ہر نفس پروردۂ کیفِ خمار، — ہر نظر آسودۂ روئے نگار
پھول کی پتی سے بھی نازک یہ لب — یہ نشیلی انکھڑیاں جانِ طرب
یہ نگاہوں کی مہارِ جادواں — زلف کے بل میں طرازِ کہکشاں
یہ بدن کا لوچ، اداؤں کا غرور، — جام میں ڈھلتا ہوا صہبا کا نور
یہ لبوں کے غنچے رخساروں کے پھول — یہ شباب حسن کے کمسن رسول،
غازہ ہر رخ سے ہے نگارِ کائنات — آہ! یہ چاندی کے دن سونے کی رات
تا کجا آخر فریبِ آب و گل، — زندگی ہے اک سرابِ مستقل
کہہ رہے ہیں دامنِ ہستی کے چاک — بے بقا ہے۔ طلسمِ خوابناک

دیکھ! بادِ مرگ جب لہرائے گی
جنتوں کی شمع گل ہو جائے گی

غزل - (ارشد کاکوی) :-

کیا ہوا ہے مجھے ناگاہ کوئی کیا جانے — جبکہ خود میں نہیں آگاہ کوئی کیا جانے
پھول ہی پھول سہی راہِ محبت لیکن — کتنی دشوار ہے یہ راہ کوئی کیا جانے
اور راتیں تو کسی طرح سے کٹ جاتی ہیں — کیا گزرتی ہے شبِ ماہ کوئی کیا جانے
رہروؤں کو ہے فقط اپنی ہی منزل کی لگن — کون بیٹھا ہے سرِ راہ کوئی کیا جانے

خواب

(ساقی جاوید بی۔اے)

یہ تصور کے دئے بجھتے ہوئے جلتے ہوئے
ایک افسانے میں لاکھوں حادثے ڈھلتے ہوئے
یہ کسی آذر کی صنعت یہ کسی مانی کا فن
آتشیں سا میکدہ شعلہ فشاں سی انجمن
دامنِ تخئیل سے اُٹھتا ہوا سا اک دھواں
ایک گلستان میں ٹھہرا ہوا سا کارواں
عکس ہائے روز و شب اک آئینہ خانہ میں ہیں
جانے کتنی محفلیں اس ایک ویرانے میں ہیں
نقش ہائے نو بہ نو بنتے بھی ہیں مٹتے بھی ہیں
زیست کے چہرے یہاں بڑھتے بھی ہیں گھٹتے بھی ہیں
بام و در بھی، چلمنیں بھی، سرمئی آنچل بھی ہیں
گھیت بھی، پگھٹ بھی ہیں، جھیلیں بھی ہیں، بادل بھی ہیں
مشعلیں بجھتی بھی ہیں کچھ کردئے جلتے بھی ہیں
قافلے رکتے بھی ہیں، اہلِ سفر چلتے بھی ہیں
نکہتیں، جلوے، دھندلکے، آگ، سناٹے، شباب
جانے کتنی داستانوں پر ہے اک بنیادِ خواب
لو وہ دیکھو خواب کی سرحد نظر آنے لگی،
زہرہ و مہتاب کی سرحد نظر آنے لگی،
لو حدودِ نغمہ و مستی میں داخل ہو گئے
ہم کسی محبوب کی بستی میں داخل ہو گئے
ہم کسی شہناز کے مہمان بن جانے کو تھے
اکتنے افسانوں کے ہم عنوان بن جانے کو تھے
ہم کسی کے دیس کا سنگیت سننے آئے تھے
ہم کسی لالہ کدے میں پھول چننے آئے تھے
ہم کسی کے آتشیں رخسار چھونے ہی کو تھے
عنبریں انفاس کی زلفِ رسا چھونے ہی کو تھے
آندھیاں چلنے لگیں طوفان سے اُٹھنے لگے
سینکڑوں شعلے ہر اک ایوان سے اُٹھنے لگے
جل اُٹھے دار و رسن بھی گنبد و مینار بھی
مصر کے شاہی محل بھی روم کے بازار بھی
اے خوشا گیتی کہ خونیں انقلاب آنے لگا
اک پیام تازہ لے کر آفتاب آنے لگا
صبح کے منبر سے وہ دینے لگا کوئی اذان
"وقت لینا چاہتا ہے ایک خونیں امتحان"
ایک سیلِ شوق، اِک جوشِ جنوں درکار ہے
اس فسانے کے لئے تھوڑا سا خوں درکار ہے

رمزی ترمذی بھوپالی :-

مرے قصے سے اُن کی داستاں تک بات جا پہونچی
کہاں سے بات نکلی تھی کہاں تک بات جا پہونچی
سمجھ کر رازِ جاں جس کو چھپا رکھا تھا سینے میں
وہ جانے دل سے وہ کیونکر زباں تک بات جا پہونچی
بہار اپنے جلو میں لائی تھی رنگینیاں لیکن
گریباں چاکیِ گل سے خزاں تک بات جا پہونچی
کچھ اس انداز سے صحنِ چمن میں بجلیاں کوندیں
اسیری میں قفس سے آشیاں تک بات جا پہونچی
کسی قابل نہ تھی میری متاعِ بندگی رمزی
مرے سجدوں کی اُن کے آستاں تک بات جا پہونچی

تتمہ سالنامہ ۱۹۵۵ء

(علوم اسلامی وعلماء اسلام نمبر)

فہرست

آل حسن قنوجی	(مفسر و محدث)	۳
ابن بری	(ماہر قرأت)	۳
ابن حماد	(مورخ)	۳
ابن الحاوندی	(فیلسوف)	۳
ابن سید الناس	(محدث)	۴
ابن عذاری	(مورخ)	۴
ابن العوام	(ماہر زراعت)	۴
ابن الفرات	(مورخ)	۴
ابن قاسم	(مالکی فقیہ)	۴
ابن کثیر	(ماہر قرأت)	۴
ابن مسیح	(ماہر موسیقی)	۴
ابن نجیم	(فقیہ)	۵
ابن ہبل	(طبیب)	۵
ابن ہشام	(نحوی)	۵
ابو ابراہیم	(شافعی فقیہ)	۵
ابو اسماعیل	(مورخ)	۵
ابن زکریا	(مورخ)	۵
ابو سلیمان	(مورخ)	۵
ابو طالب حسینی	(مورخ)	۶
ابو عبداللہ	(شیعی فقیہ)	۶
ابو عبید	(ادیب)	۶
احمد بن محمد	(مورخ)	۶
احمد رضا خاں	(فقیہ)	۶
احمد طا	(مورخ)	۷
احمد یادگار	(مورخ)	۷
ارادت خاں	(ادیب)	۷
اسحاق موصلی	(ماہر موسیقی)	۷
اسلم جیراجپوری	(مورخ)	۸
اکبر شاہ خاں	(مورخ)	۸
الہ داد سلطانپوری	(فقیہ)	۸
امان علی	(مفسر)	۸
الایجی	(فلسفی)	۹
اوحد الدین	(ادیب)	۹
باجوری	(محدث)	۹
بہاؤ الدین	(ادیب)	۹
بہزاد	(نقاش)	۹
تراب علی	(مفسر)	۹
ترمذی	(فقیہ)	۱۰
تفضل حسین	(شیعی عالم)	۱۰
تلمسانی	(مالکی فقیہ)	۱۰

قیمت ۸ر

جمیلہ (ماہر موسیقی) ۱۰
حسن صفہانی (محدث) ۱۰
حلاج (مورخ) ۱۰
حلی شیرازی (شیعی عالم) ۱۱
حمداللہ (منطقی) ۱۱
حمزہ اصفہانی (مورخ) ۱۱
حیدر رازی (مورخ) ۱۱
حیدر علی (منطقی) ۱۱
خازنی (فلسفی) ۱۲
خزرجی (عروضی) ۱۲
دارقطنی (محدث) ۱۲
درعینی (مورخ) ۱۲
دولت آبادی (مورخ) ۱۲
رضاقلی (شاعر) ۱۲
سعداللہ (عالم) ۱۳
سلام اللہ (محدث) ۱۳
سکاری (فقیہ) ۱۳
سلامت اللہ (فقیہ) ۱۳
سہروردی (صوفی) ۱۳
سید محمد جونپوری (مدعی مہدویت) ۱۴
سیف بن عمر (مورخ) ۱۴
سیفی (عروضی) ۱۴
شرف الدین یزدی (مورخ) ۱۴
شریشی (ادیب) ۱۵
شریف رضی (ادیب) ۱۵
شمس الدین شیرازی (رشاء) ۱۵
شیخ مبارک (عالم) ۱۶
صدیق حسن خاں (عالم) ۱۶
صفدی (مورخ) ۱۶
صفی الدین (مغنی) ۱۶
ضبی (مورخ) ۱۶
ضیاء الدین (ادیب) ۱۶
طغرائی (ادیب) ۱۷
عبدالقادر بن عمر (ادیب) ۱۷
عبدالرشید (لغت نویس) ۱۷
عنایت اللہ (مورخ) ۱۸
محاسبی (شافعی فقیہ) ۱۸
محمد بہرم (محدث وفقیہ) ۱۸
محمد عبدالباقی (مورخ) ۱۸
محمد بقا (مورخ) ۱۹
محمد عبدالقادر غیبی (ماہر موسیقی) ۱۹
فاسی (مورخ) ۱۹
فاروقی (ادیب وفلسفی) ۲۰
فخرالدین (فقیہ) ۲۰
قرۃ العین (بابی مبلغ) ۲۰
کاتبی (فلسفی) ۲۱
کلبی (مورخ) ۲۱
قیام الدین عبدالباری (عالم) ۲۱
عبدالحلیم (عالم) ۲۲
طاہر گجراتی (محدث) ۲۲
محمد فاروق (فلسفی) ۲۲
محمد مرتضیٰ (عالم) ۲۲
مغارق (مفتی) ۲۲
مخدوم الملک (مورخ) ۲۳
میر طاہر (مورخ) ۲۳
میر محمد معصوم (مورخ) ۲۳
نظام بخشی (فقیہ) ۲۳
نظامی حسن (مورخ) ۲۴
نعمت اللہ (مورخ) ۲۴
نعمت خان عالی (ادیب) ۲۴
نہروالی (مورخ) ۲۴
یحییٰ بن احمد (مورخ) ۲۴

تتمہ سالنامہ ۱۹۵۵ء

۱ - آلِ حسن قنوجی ابن اولاد علی ——— ولادت (قنوج) : ۱۲۱۰ھ / ۱۷۹۵ء = ۱۲۵۳ھ / ۱۸۳۷ء

ابتدائی تعلیم قنوج میں ہوئی، اس کے بعد لکھنؤ گئے اور پھر وہاں سے دہلی پہونچ کر تفسیر و حدیث کی تکمیل مولانا عبدالعزیز اور مولانا شاہ رفیع الدین سے کی۔ بعد کو یہ سید احمد بریلوی کے مرید ہوکر جہاد میں ان کے ساتھ شریک ہوئے۔ فارسی، عربی اور اردو میں آپ کی متعدد تالیفات ہیں:

ہدایت المومنین - نورالوفا - ردتحزیہ - تقویۃ الیقین -

حوالہ: (تذکرۂ علماء ہند - رحمان علی)

---

۲ - ابن بَرّی، ابوالحسن علی بن محمد بن علی بن محمد بن الحسین الرباطی

ولادت (تازا) : ۵۶۲ھ / ۱۱۶۶ء ——— وفات (تازا) : ۶۲۹ھ / ۱۲۳۱ء یا ۶۳۳ھ یا ۶۴۳ھ / ۱۲۳۵ء یا ۱۲۴۵ء

علوم اسلامی اور خصوصیت کے ساتھ علم تجوید کے بڑے ماہر تھے۔ یہ گورنر تازا کے میر منشی تھے۔ ان کی تصانیف میں صرف دو باقی ہیں:

مخارج الحروف - الدرالطوامع -

حوالہ: (النجوم الطوالع)

---

۳ - ابن حمّاد، ابوعبداللہ محمد بن علی

عرب مورخ تھے، انھوں نے فاطمیین کی بڑی بسیط تاریخ لکھی۔ تاریخ پیدائش و وفات کا پتہ نہیں چل سکا۔ ان کا زمانہ الموحدون کی حکومت کے بعد ابن خلدون سے پہلے تھا۔

حوالہ: (دائرۃ المعارف اسلامیہ)

---

۴ - ابن الراوندی، ابوالحسین بن یحییٰ بن اسحاق ——— ولادت: (تیسری صدی ہجری کی ابتدا) وفات: (وسط تیسری صدی ہجری)

اول اول یہ عقاید اعتزال رکھتے تھے اور معتزلہ کے بڑے زبردست موید تھے، لیکن بعد کو یہ میدان بھی انھیں تنگ نظر آیا اور معتزلہ پر بھی اعتراض لکھنا شروع کیا۔ اس کے بعد شیعی عقاید اختیار کئے اور پھر ابواسحاق الوراق کی صحبت میں بیٹھ کر ملحد ہوگئے اور نہ صرف اسلام بلکہ تمام مذاہب عالم کے خلاف سخت نکتہ چینی شروع کردی۔ یہ غیر معمولی ذہین شخص تھے اور عنفوان شباب ہی میں ان کی قابلیت کا سکہ لوگوں کے دلوں پر بیٹھ گیا تھا۔

ان کی تصانیف میں خاص خاص قابل ذکر یہ ہیں: کتاب فضیحۃ المعتزلہ (عقاید اعتزال کے رد میں) - کتاب الدامغ (قرآن پر نکتہ چینی)

حوالہ: (کتاب الانتصار - (ضمناً))

---

۵ - ابن سیدالناس فتح الدین ابوالفتح محمد بن ابی بکر محمد الیعمری الاندلسی ——— ولادت (قاہرہ): ۶۷۱ھ / ۱۲۷۲ء

مورخ و محدث تھے، قاہرہ و دمشق میں تعلیم پائی اور مدرسہ ظاہریہ (قاہرہ) میں حدیث کی تعلیم پر مامور ہوئے۔ انھوں نے سیرۃ النبوی پر ایک

کتاب لکھی : " عیون الآثار فی فنون المغازی، الشمایل والسیر" متعدد قصاید بھی لکھے جن میں سے ایک " بشری اللبیب فی ذکر الحبیب" کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

حوالہ (دائرۃ المعارف)

---

۶ - **ابن عذاری، ابوعبداللہ محمد المراکشی**

اسپین و مغرب کے مورخ تھے۔ ان کے حالات تاریکی میں ہیں۔ ساتویں صدی ہجری کے اخیر میں پائے جاتے تھے۔ انھوں نے ایک تاریخی کتاب لکھی : " البیان المغرب فی اخبار المغرب"

حوالہ : (دائرۃ المعارف)

---

۷ - **ابن العوام، ابوزکریا یحییٰ بن محمد بن احمد بن العوام الاشبیلی**

ان کے حالات تاریکی میں ہیں۔ بارھویں صدی عیسوی کے اخیر میں پائے جاتے تھے۔ فن زراعت پر ایک بڑی بسیط تصنیف کی جس کا نام :- " کتاب الفلاحتہ" ہے۔

حوالہ: (دائرۃ المعارف)

---

۸ - **ابن الفرات، ناصر الدین محمد بن عبدالرحیم بن علی المصری** ——— ولادت : ۷۳۵ھ / ۱۳۳۴ء — وفات : ۸۰۵ھ / ۱۴۰۲ء

مورخ تھے۔ ان کی تصنیف " تاریخ الدول والملوک" بڑی مشہور کتاب ہے۔

حوالہ : (دائرۃ المعارف)

---

۹ - **ابن قاسم، ابوعبداللہ عبدالرحمان بن القاسم العنقی** ——— وفات (قاہرہ) : ۱۹۱ھ / ۸۰۶ء

امام مالک کے نہایت ممتاز شاگرد و جانشین تھے۔ اسپین میں مالکی مسلک کا رواج انھیں کی وجہ سے ہوا۔ ان کی تصنیف مدونہ حنبلی مسلک کی کتابوں میں بڑی شہرت رکھتی ہے۔

حوالہ : (ابن خلکان)

---

۱۰ - **ابن کثیر، عبداللہ ابوبکر ابوسعید** ——— ولادت (مکہ) : ۴۵ھ / ۶۶۵ء — وفات : ۱۲۰ھ / ۷۳۸ء

قرآن کے سات مشہور قاریوں میں سے ایک تھے۔ یہ ایرانی النسل تھے اور ان کا خاندان جنوبی عرب میں آباد ہو گیا تھا۔ مکہ میں قاضی کی حیثیت سے بھی کچھ دنوں کام کیا ہے۔

حوالہ جات : (ابن ندیم - ابن خلکان)

---

۱۱ - **ابن مسجح، ابوعثمان سعید** ——— ولادت (مکہ) : وسط ساتویں صدی ہجری — وفات : ۱۵ھ / ۷۱۳ء

عہد امیہ کے سب سے بڑے موسیقار تھے۔ حبشی النسل موالی تھے جنھیں ان کے مالک معاویہ اول نے آزاد کر دیا تھا۔ انھیں گانے کا شوق ان ایرانی معماروں کا گانا سن سن کر ہوا جو اس وقت مکہ میں کام کر رہے تھے اور پھر شام جا کر وہاں کے بربط نوازوں اور ماہرین موسیقی سے یہ فن حاصل کیا۔ اس کے بعد یہ فارس گئے اور وہاں کے نائکوں سے تعلیم حاصل کر کے حجاز لوٹے اور ان کے گانے کی دھوم مچ گئی۔ یہاں تک کہ زیادہ سخت مذہبی آدمیوں نے گورنر مکہ سے درخواست کی کہ ان کا گانا ممنوع قرار دینا چاہئے۔

جب ۸۶ھ میں خلیفہ عبدالملک کو خبر ہوئی تو انھیں اپنے پاس دمشق بلا لیا اور بڑی عزت کی۔ کہا جاتا ہے کہ اول اول انھوں نے ہی عرب نغموں کو ایرانی نغموں کی صورت میں پیش کیا۔ عرب کے مشہور موسیقاروں میں ابن سُریج، ابن مُحرز، الغریض اور یونس الکاتب سب انھیں کے شاگرد تھے۔

حوالہ: (کتاب الاغانی)

---

۱۲ - ابن نجیم، زین العابدین بن ابراہیم بن نجیم المصری ——— ولادت : ابتداء دسویں صدی ہجری — وفات : ۹۷۰ھ/۱۵۶۲ء
فقہ حنفی کے مشہور عالم تھے، ان کی تصانیف مشرق میں بہت مقبول ہوئیں - خاص تصانیف یہ ہیں :-
الاشباہ والنظائر الفقہیہ - البحر الرائق (شرح کنز الدقائق) القضاء فی الیمنو
حوالہ : (دائرۃ المعارف)

۱۳ - ابن مُہَبَّل، مہذب الدین ابو الحسن علی بن احمد ——— ولادت (بغداد) : ۵۱۵ھ/۱۱۲۲ء — وفات : ۶۰۱ھ/۱۲۱۳ء
طبیب، نحوی وفقیہ تھے - اخیر میں یہ بدر الدین لولو فرمانروائے ماردین کے دربار کے طبیب ہو گئے تھے - انکی خاص تصنیف "المختصر فی الطب" ہے -
حوالہ جات : (ابن القفطی - ابن ابی عصیبیہ)

۱۴ - ابن ہشام، جمال الدین ابو محمد عبداللہ بن یوسف بن احمد بن عبداللہ بن ہشام الانصاری المصری
ولادت (قاہرہ) : ۷۰۸ھ/۱۳۰۹ء (قاہرہ) : ۷۶۱ھ/۱۳۶۰ء
مشہور نحوی ابو حیان کے شاگرد اور شافعی مسلک کے ماہر قرآن ومتعدد تصانیف کیں - بعض یہ ہیں :-
قطر الندی وبل الصدی (نحو) - شذور الذہب فی معرفۃ کلام العرب (ادب) — القواعد الاعراب (نحو)
حوالہ جات : (سیوطی - ابن خلدون)

۱۵ - ابو ابراہیم اسماعیل ابن یحییٰ المزنی ——— وفات : ۲۶۴ھ/۸۷۸ء
امام شافعی کے نہایت مشہور شاگرد تھے اور علم حدیث وفقہ کے بڑے ماہر سمجھے جاتے تھے - جامع صغیر کے علاوہ انھوں نے اور تصانیف بھی کیں :- مختصر - منصور - رسایل المعتبرہ - کتاب الوثائق -
حوالہ : (ہیل)

۱۶ - ابو اسماعیل محمد
تاریخ فتوح الشام کے مصنف، جس میں حضرت عمر کی ۴ مہم جنگوں کا حال درج ہے جو انھوں نے ۶۳۳ء میں فتح شام کے لئے لڑی تھیں - یہ کتاب طبقات واقدی کا ترجمہ وخلاصہ ہے -
حوالہ : (ہیل)

۱۷ - ابو زکریا یحییٰ بن ابی بکیر
ورقلا کے رہنے والے تھے - انھوں نے رستمیین اور اباضیین کے حالات میں ایک تاریخ لکھی جس کا نام "کتاب السیرۃ واخبار الائمہ" ہے جو اس عہد کی نہایت قدیم ومستند تاریخ سمجھی جاتی ہے
حوالہ : (دائرۃ المعارف)

۱۸ - ابو سلیمان داؤد بن ابو الفضل بن محمد فخر بناکیتی
ماوراء النہر کے ایک قریہ بناکیت میں پیدا ہوئے جس کا نام بعد کو شاہرخیہ ہو گیا، انھوں نے ایک تاریخی کتاب "روضۃ اولی الباب فی تواریخ الاکاسرۃ والخلفاء" لکھی جسے "تاریخ بناکیتی" بھی کہتے ہیں یہ کتاب ۷۱۸ھ/۱۳۱۸ء میں لکھی گئی اور سلطان ابو سعید (ایران کے مغل فرمانروا) کے نام منسوب کی گئی - یہ دراصل جامع رشیدی کا خلاصہ ہے جو ابو سلیمان سات سال پہلے مکمل کر چکا تھا - یہ سلطان غازان خاں کے دربار کا ملک الشعراء بھی تھا -
حوالہ : (دائرۃ المعارف)

۱۹- **ابو طالب حسینی** ——— (گیارھویں صدی ہجری)

تزک تیموری کے مرتب - جس میں تیمور کے ابتدائی ۳۰ سال کے حالات درج ہیں - یہ کتاب فارسی ترجمہ ہے خود تیمور کی لکھی ہوئی تزک کا جسے خود اس نے ترکی زبان میں لکھا تھا - ابو طالب نے یہ ترجمہ شاہجہاں سے منسوب کیا تھا - اس کا انگریزی ترجمہ میجر چارلس اسٹوارٹ نے کیا ہے -

حوالہ : (سہیل)

۲۰- **ابو عبداللہ بن محمد النعمانی (معروف بہ شیخ مفید اور ابن معلم)** ——— وفات : ۴۱۳ھ / ۱۰۲۲ء

مشہور شیعی فقیہ تھے، اور ابو جعفر الطوسی کے بیان کے مطابق اپنے عہد کے بہترین خطیب و مجتہد تھے - انھوں نے سیکڑوں تالیفات اپنے بعد چھوڑیں جن میں ایک ارشاد نے بڑی شہرت پائی -

---

۲۱- **ابو عبیدہ معمر بن المثنیٰ التیمی** ——— ولادت : ۱۱۰ھ / ۷۲۸ء — وفات : ۲۱۰ھ / ۸۲۵ء

قبیلۂ تیم کے مولیٰ تھے اور بڑے مشہور ادیب - بعض نے ان کو یہودی النسل بتایا ہے اور بعض نے خارجی - یہ قدیم عربی لٹریچر کے بڑے ماہر تھے - انھوں نے تقریباً ۱۰۰ رسایل عربی لٹریچر پر لکھے -

حوالہ : (ابن خلکان)

۲۲- **احمد بن محمد بن عبدالغفور الغفاری القزوینی**

یہ قاضی احمد الغفاری کے نام سے مشہور تھے - محمود غزنوی کے عہد کے مورخ تھے - انھوں نے نگارستان کے نام سے ایک کتاب لکھی جسے تاریخ تو نہیں کہہ سکتے لیکن اس وقت کے مختلف حکمراں خاندانوں کے قصص و حکایات کا مجموعہ ضرور ہے - یہ کتاب ۹۵۹ھ / ۱۵۵۲ء میں لکھی گئی تھی - اور اس کے مصنف کا بیان ہے کہ ۲۸ معتبر کتب تاریخ سے انھوں نے مواد فراہم کیا تھا -

حوالہ : (اسلامی ہند - نیاز)

۲۳- **احمد رضا خاں بریلوی ابن مولوی نقی علی خاں بن مولوی رضا علی خاں بریلوی**

ولادت (بریلی) : ۱۲۷۲ھ / ۱۸۵۵ء ——— وفات (بریلی)

روہیلکھنڈ کے نہایت مشہور مفتی، عالم و مصنف، چار سال کی عمر میں قرآن حفظ کیا اور پھر اپنے والد سے تمام علوم درسیہ حاصل کئے اور اپنے والد کی جگہ فتویٰ نویسی کی خدمت انجام دینے لگے، اس کے بعد آپ سید شاہ آل رسول مارہروی کے مرید ہوئے اور ان سے سند حدیث لیکر اپنے والد کے ساتھ حرمین گئے اور یہاں کے اکابر علماء سے فقہ حدیث و تفسیر وغیرہ تمام دینی علوم حاصل کئے - آپ نے ۵۰ سے زیادہ کتابیں لکھیں جن میں خاص خاص یہ ہیں :-

(سیرۃ نبوی) :- تجلی الیقین - سلطنۃ المصطفےٰ - ابحث الفاحص عن طرق حدیث الخصائص

(متعلق بہ شیخین) :- منتہی التفصیل لمبحث التفضیل - مطلع القمرین -

(متعلق بہ اہل بیت اور صحابہ) :- مناقب البیبت - الجلال السبابہ فی اجلال الصحابہ - الاحادیث الرادیہ لمناقب معاویہ -

(متعلق بہ اولیاء کرام) :- انہار الانوار - ازہار الانوار - طوامع النور

(نزاعی مسایل) :- سماع الاموات - منیر العین المبارقۃ الشارقہ

(...ش) :- النجوم الثواقب -

(...) :- حسن البراعہ - شرح جوہرۃ المضیئۃ - الامر باحترام المقابر - فصل القضائی سم الافتراء

(دیگر علوم) :- مقامع الحدید (منطق) - اعتبار الطالب - السعی المشکور - فوز الآمال -

حوالہ : (علماء ہند - رحمان علی)

۲۴ - احمد (مُلّا)

ان کے آبا و اجداد ٹھٹہ (سندھ) کے رہنے والے تھے - یہ خاندان فاروقی حنفی تھا، لیکن خود ملا احمد شیعہ ہو گئے تھے جب ۹۹۶ھ میں دیکن سے لوٹ کر اکبر کے دربار سے وابستہ ہوئے تو تاریخ الفی کو مکمل کرنے کی خدمت ان کے سپرد ہوئی - اس تاریخ کی ترتیب مختلف مورخوں کے سپرد کی گئی تھی، جن میں سے ایک یہ بھی تھے - پہلی دو جلدیں چنگیز خاں کے عہد تک کی وہ مکمل کر چکے تھے کہ مرزا فولاد برلاس نے (جس کے پاس وہ لاہور میں مقیم تھے) جو سخت زخمی کر دیا کیونکہ خلفاء اول کے حالات لکھنے میں انھوں نے بدتمیزی کی تھی - اس جرم میں مرزا فولاد کو قتل کیا گیا اور اس کے تین چار دن بعد ان کا بھی انتقال ہو گیا - اس کے بعد تاریخ الفی کے کام کو آصف خاں جعفر بیگ نے شروع کیا اور ۱۰۰۶ھ تک اسے پورا کیا -

حوالہ: (سیل)

۲۵ - احمد یادگار

شاہانِ سور کے دربار سے وابستہ تھے اور داؤد شاہ نے انھیں سلاطین افاغنہ کی تاریخ لکھنے کا حکم دیا - یہ تاریخ سہلول لودی کے حالات سے شروع ہوتی ہے اور ہمایوں کے واقعۂ قتل پر ختم ہو جاتی ہے ان کا باپ مرزا عسکری کا وزیر تھا - تاریخ تصنیف کہیں درج نہیں ہے -

حوالہ: (اسلامی ہند - نیاز)

۲۶ - ارادت خاں واضح (مرزا مبارک اللہ) ——— وفات: ۱۱۲۸ھ / ۱۷۱۶ء

ان کے والد اسحاق خاں (جو بعد کو کفایت خاں کے نام سے مشہور ہوئے) نواب عظیم خاں کے بیٹے تھے اور یہ دونوں باپ بیٹے امراء میں شمار ہوتے تھے - اسحاق خاں عہدِ جہانگیر میں میر بخشی اور فوجدار جونپور کے عہدوں پر ممتاز رہے (وفات: ۱۰۵۹ھ / ۱۶۴۹ء) ان کی وفات پر ان کے بیٹے مبارک اللہ کو ارادت خاں کا خطاب عطا ہوا اور اورنگ زیب نے انھیں مختلف اوقات میں جگنا، اورنگ آباد اور مانڈو کا فوجدار مقرر کیا - شاہ عالم یا بہادر شاہ اول کے عہد میں یہ دو آب کے گورنر رہے - اخیر میں یہ تارکِ الدنیا ہو گئے اور عہد فرخ سیر ۱۱۲۸ھ میں انتقال کر گئے -

یہ بڑے اچھے شاعر اور انشا پرداز تھے - ظہوری کی مینا بازار انھیں کی تصنیف بتائی جاتی ہے - ایک دیوان بھی اپنے بعد چھوڑا - حکمات عالمیات کے نام سے بھی ایک کتاب لکھی - جانشینان اورنگ زیب کی بھی ایک تاریخ لکھی جس کا انگریزی ترجمہ جوناتھن اسکاٹ نے کیا تھا

حوالہ: (دائرۃ المعارف)

۲۷ - اسحاق موصلی، ابو محمد اسحاق بن ابراہیم بن میمون بن بہمان ——— ولادت (رے): ۱۵۰ھ / ۷۶۷ء - وفات (بغداد): ۲۳۵ھ / ۸۵۰ء

عہدِ عباسیہ کے سب سے بڑے موسیقار تھے - یہ فارس کے ایک نہایت معزز خاندان کے فرد تھے - ان کے باپ کوفہ میں پیدا ہوئے اور وہیں قبیلہ بنو تمیم یا بنو دارم میں تعلیم و تربیت ہوئی، اسحاق نے بھی قرآن و حدیث وغیرہ کی پوری تعلیم حاصل کی اور موسیقی اپنے چچا زلزال عائقہ بنت شہدا اور اپنے باپ سے سیکھی -

ہارون الرشید اور وزرا آلِ برمک ان کے بڑے قدر دان تھے - یحییٰ بن خالد برمکی نے ایک بار انھیں ایک مکان عنایت کیا اور اسی کے ساتھ ایک لاکھ درہم اس مکان کی آرایش کے لئے عطا کئے - جب فضل بن یحییٰ برمکی خراسان کا گورنر مقرر ہوا تو اس نے اسحاق موصلی کو صرف ایک شعر پر ایک ہزار اشرفیاں انعام میں دیں - انعامات کی بارش نے انھیں بڑا دولتمند انسان بنا دیا تھا لیکن وہ نہایت فیاضی سے مستحقین میں تقسیم بھی کر دیتے تھے - چنانچہ ابن عربی (لغت نویس) بھی ان کے وظیفہ خوار تھے -

ہارون الرشید کے بعد امین، مامون، معتصم، واثق اور متوکل کے زمانہ میں بھی یہ بدستور مورد عنایات رہے - مامون کہا کرتا تھا کہ اگر اسحاق موصلی موسیقار نہ ہوتے تو میں انھیں قاضی مقرر کر دیتا - اور دربار میں انھیں علماء و فقہا ہی کی صف میں جگہ دیا جاتی تھی -

اسحاق کی آواز اتنی اچھی نہ تھی لیکن فنی حیثیت سے وہ بڑے جامع انسان تھے - وہ ہمیشہ تیز اونچے سروں سے گاتے تھے اور اسی لئے انھیں "مسلوع" (عقرب زدہ) کہتے تھے - یہ چند کتابی اور دوسرے علماء کی طرح انھوں نے یونان کی موسیقی کی کتابوں کا ترجمہ عربی میں

ہے یہ اور علمی حیثیت سے ان کا مرتبہ اتنا بلند نہ تھا لیکن علمی و فنی حیثیت سے انھوں نے عرب موسیقی کی بڑی گرانقدر خدمات انجام دیں۔ یہ حرف و ہر موسیقی ہی نہ تھے بلکہ ادیب و فقیہ بھی تھے۔

ابن ندیم نے ان کی سے تصانیف کا ذکر کیا ہے جن میں کتاب الاغانی الکبیر - اخبار ذی الرمہ - کتاب جواہر الکلام - کتاب تفضیل الشعر اور کتاب موارث الحکمۃ خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

ان کا کتب خانہ بغداد کے بڑے بڑے کتب خانوں میں شمار ہوتا تھا جس میں تمام علوم و فنون کی کتابیں پائی جاتی تھیں۔ ابن خورداذبہ انھیں کے شاگرد تھے۔ ان کے بیٹے حماد نے جو مشہور محدث تھے ان کے حالات زندگی تحریر کئے تھے۔

حوالہ: (کتاب الاغانی - فہرست (اخبار ندیم عقد الفرید - نہایت الادب)

۲۸- **اسلم جیراجپوری** ——— ولادت (جیراجپور اعظم گڈھ): ۱۲۹۹ھ

آپ کے والد مولانا سلامت اللہ بھوپال میں افسر تعلیمات تھے، وہیں اپنے والد سے درس نظامی کی تکمیل کی۔ اس کے بعد پیسہ اخبار میں مترجم ہوگئے، دو سال بعد علی گڈھ اسکول میں چلے آئے اور پھر لٹن لائبریری میں علوم مشرقیہ کی کتابوں کے مہتمم ہوگئے۔ اس کے چند سال بعد علی گڈھ کالج میں عربی، فارسی کے پروفیسر بنادئے گئے۔ ۱۹۰۷ء میں بہ سلسلۂ ترک موالات جامعہ ملیہ چلے آئے۔ آپ کو مذہب اور تاریخ سے خاص دلچسپی ہے۔ آپ کی بعض تصانیف یہ ہیں: تاریخ القرآن - حیات جامی، حیات حافظ - تاریخ نجد - تاریخ الامت، تعلیمات قرآن۔

۲۹- **اکبر شاہ خاں نجیب آبادی** ——— ولادت (نجیب آباد): ۱۸۸۸ء - وفات (نجیب آباد): ۱۹۳۸ء

ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی جو بہت بڑے عالم تھے۔ عربی، فارسی کی تعلیم کے بعد سرکاری مدرسہ میں داخل ہوئے اور مڈل پاس کرنے کے بعد گورنمنٹ ہائی اسکول فارسی کے مدرس ہوگئے۔ چند دن بعد ترک ملازمت کرکے لاہور چلے گئے اور وہاں دیال سنگھ کالج اور لوکل کمیرج کالج میں پروفیسر ہوگئے۔ آپ نے اسی دوران میں پیغام صلح، زمیندار، منصور وغیرہ متعدد اخبارات میں اڈیٹری کے فرائض بھی انجام دئے۔ اس کے بعد نجیب آباد واپس آکر ایک رسالہ عبرت جاری کیا اور تصنیف و تالیف میں مشغول ہوگئے۔

آپ کو تاریخ سے خاص لگاؤ تھا اور سرکاب آپ [illegible] متعدد تاریخی رسالوں کے علاوہ آپ نے کئی کتابیں لکھیں جن میں سندھ ذیل خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں:

آئینۂ حقیقت نما (دو حصوں میں) محمد بن قاسم فاتح سندھ سے لیکر آخری بادشاہ تک کی تاریخ - مقدمہ تاریخ ہند قدیم (دنیا کے تمام اقوام و ممالک اور مذاہب و علوم پر تبصرہ) نظام سلطنت - تاریخ اسلام تین حصوں میں۔

۳۰- **الہ داد سلطانپوری** ——— وفات: ۱۰۶۷ھ / ۱۶۵۷ء

موضع نبودہ (ندیلہ) میں پیدا ہوئے اور عبداللہ مخدوم الملک سے تعلیم حاصل کی۔ اپنے وقت کے ممتاز علماء میں شمار کئے جاتے تھے۔ اکبر کے زمانہ میں کچھ عرصہ تک الہ آباد کے قاضی بھی رہ چکے تھے۔ متعدد تصانیف کیں۔ جن میں کشف الغمہ اور منہاج الدین مشہور ہیں۔

حوالہ: (علماء ہند - رحمان علی)

۳۱- **امان علی احمد آبادی ابن حکیم شیر علی** ——— وفات (دیوان): ۱۲۸۲ھ / ۱۸۶۵ء

مشہور عالم و طبیب تھے۔ آپ اپنے والد سے پڑھی اور دیگر علوم مندرجہ مولوی محمد سعید رامپوری سے۔ بڑے زاہد و مرتاض شخص تھے۔ دربار ریواں میں پہلے طبیب کی حیثیت سے ملازم تھے اور پھر مہتمم پرمٹ ہوگئے۔ ان کی خاص تصانیف یہ ہیں: حسن البیان (تفسیر)۔ موضح البدعات۔ تیسیر العسیر (طب) - ردالوشیقہ (مناظرہ) - عجائب الذہیر (طب) - مجربات متین (طب) - قرابادین متین (طب)

حوالہ: (علماء ہند - رحمان علی)

۳۲- الایجی، عضدالدین عبدالرحمان بن احمد ——— وفات : ۷۵۶ھ / ۱۳۵۵ء

ان کے حالات زندگی نامعلوم ہیں - ایج (فارس) کے رہنے والے تھے اور شیراز میں قاضی و مدرس بھی تھے - علم کلام و فلسفہ کے عالم تھے اور ان کی کتاب "المواقف فی العلم الکلام" یورپ میں بھی کافی مقبول ہوئی -

حوالہ : (دائرۃ المعارف)

۳۳- اوحدالدین بلگرامی

قصبۂ بلگرام کے متوطن تھے اور عربی ادبیات کے بڑے ماہر تھے - شیخ احمد عرب یمنی ان کے استاد تھے، ان کی تصنیف نفائس اللغات مشہور لغت ہے جس میں اردو الفاظ کے عربی، فارسی مترادف الفاظ دئے گئے ہیں - یہ کتاب محمد علی شاہ بادشاہ اودھ کے زمانہ میں لکھی گئی تھی -

حوالہ : (علماء ہند - رحمان علی)

۳۴- باجوری، ابراہیم ابن محمد ——— پیدائش : ۱۱۹۸ھ / ۱۷۸۳ء — وفات : ۱۲۷۷ھ / ۱۸۶۱ء

قاہرہ سے قریب ایک گاؤں باجور کے رہنے والے تھے - جامع ازہر میں تعلیم پائی اور اپنے تبحر و کمال کی وجہ سے بہت مشہور ہوئے - تعلیم سے فارغ ہوکر یہیں پروفیسر ہوگئے اور اخیر عمر تک اس خدمت پر مامور رہے - انھوں نے علوم و فنون کی مختلف کتابوں کی شرحیں لکھیں - بعض تصانیف کے نام یہ ہیں : شرح شمایل ترمذی - شرح جوہرۃ التوحید - شرح رسالۃ فی البیان -

حوالہ : (دائرۃ المعارف اسلامیہ)

۳۵- بہاؤالدین ابوالمعالی محمد بن الحسن ——— ولادت (بغداد) : ۴۹۳ھ / ۱۱۰۱ء - وفات غالباً : ۵۶۳ھ / ۱۱۶۸ء

ماہر ادبیات تھے اور دربار خلافت عباسیہ سے وابستہ - لیکن خلیفۃ المقتفی نے کسی بات پر برہم ہوکر معتقید کردیا تھا اور اسی حالت میں انتقال ہوا -

انھوں نے اکابر شعرو تاریخ کا ایک بسیط تذکرہ مرتب کیا تھا جس کا نام ہی "التذکرہ" تھا -

حوالہ : (دائرۃ المعارف اسلامیہ)

۳۶- بہزاد، کمال الدین ——— ولادت (ہرات) اندازاً : ۸۵۴ھ / ۱۴۵۰ء — وفات : ۹۴۲ھ / ۱۵۳۶ء

فارس کے نہایت مشہور مصور و نقاش تھے - بعض ان کو میر روح اللہ کا شاگرد ظاہر کرتے ہیں اور بعض پیر سید احمد تبریزی کا - تزک جہانگیری میں لکھا ہے کہ وہ خلیل مرزا کی نقاشی کے مقلد تھے - میر علی شیر نوائی اور حسین بیقرہ ان کے بڑے قدردان تھے - بیقرہ کے درباری "تذوں میں، نوائی جامی اور خوندمیر کے ساتھ بہزاد بھی شامل تھے - جب خاندان بیقرہ ختم ہوا اور حکومت شیبانیوں کی ہوئی تو یہ ہرات سے تبریز چلے گئے جو اسوقت صفوی حکومت کا پایۂ تخت تھا - شاہ اسماعیل صفوی اور اس کا جانشین طہماسپ بھی بہزاد کا بڑا قدرشناس تھا -

۹۴۲ھ / ۱۵۳۶ء یا بعض روایات کے مطابق ۹۳۹ھ / ۱۵۳۳ء میں انتقال ہوا اور شاہ کمال تجندی (مشہور شاعر) کی قبر کے پاس تبریز میں دفن کئے گئے یہ اپنے عہد کے مشہور نقاش تھے اور چھوٹی چھوٹی تصاویر بنانے میں کمال رکھتے تھے - جہانگیر نے تزک میں لکھا ہے کہ وہ لڑائی کے مناظر دکھانے میں یدطولیٰ رکھتے تھے - ظفرنامہ، گلستان، بوستان اور خمسۂ نظامی کے بعض مخطوطات جو بہزاد کے نقوش سے مزین ہیں، مختلف لائبریریوں میں محفوظ ہیں -

حوالہ : (دائرۃ المعارف اسلامیہ)

۳۷- تراب علی لکھنوی بن شجاعت علی ——— ولادت : ۱۲۱۳ھ / ۱۷۹۸ء - وفات (محمد آباد اعظم گڈھ) : ۱۲۷۱ھ / ۱۸۶۴ء

ان کے مورث اعلیٰ دہلی سے تعلق رکھتے - علوم متداولہ کی تکمیل انھوں نے لکھنؤ میں کی اور بعد فراغ درس و تدریس میں مشغول ہوگئے - ان کی خاص تصانیف یہ ہیں : شمس الضحیٰ - النکملۃ الکبریٰ - العشرۃ الکاملہ - العجالۃ الدقیقہ - سبیل النجاح - حاشیہ شرح مسلم - الہلالین علی [illegible]

ہدایۃ المجتہدین - رسالۂ معراجیہ -

حوالہ : (تذکرہ - رحمان علی)

۳۸ - الترمذی ، ابوعبداللہ محمد بن علی بن حسین ——— وفات : ۲۸۵ھ / ۸۹۸ء

خراسان کے سنی فقیہ و محدث تھے ، ان کا شمار صوفیہ میں بھی ہوتا ہے - کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ۳۰ کتابیں تصنیف کیں - جن میں سے بعض یہ ہیں : نوادر الاصول - ختم الولایت - علل العبودیۃ - کتاب الفروق -

حوالہ : (کشف المحجوب (ہجویری))

۳۹ - تفضل حسین کشمیری (خان علامہ) ——— وفات : ۱۲۱۵ھ / ۱۸۰۰ء

شیعی مذہب کے زبردست عالم تھے - ہندسہ ، منطق اور علوم دینیہ کے ماہر تھے ، حزیں سے بھی استفادہ کیا تھا - عربی فارسی کے علاوہ انگریزی و لاطینی بھی جانتے تھے - نواب آصف الدولہ کے زمانہ میں اس کے نائب رہے لیکن نواب سعادت علی خاں کے عہد میں ملازمت ترک کردی - ہیئت - جبر و مقابلہ میں انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں -

حوالہ : (ریل)

۴۰ - تلمسانی ، ابواسحاق ابراہیم بن ابی بکر ——— ولادت (تلمسان) : ۶۱۰ھ / ۱۲۱۳ء ——— وفات : ۶۹۱ھ / ۱۲۹۱ء

ابتدائی تعلیم غرناطہ اور ملاغا میں ہوئی - یہ مالکی فقیہ تھے - انھوں نے علم الفرائض پر ایک کتاب اُرجوزہ لکھی اور اس کے علاوہ ایک کتاب سیرۃ نبوی پر بھی لکھی - نتیجۃ الخیار ، اور ایک عروض پر بھی -

حوالہ : (دیباج (ابن فرحون))

۴۱ - جمیلہ

ابتداء عہد بنی امیہ کی نہایت مشہور مغنیہ تھی - اس نے موسیقی کی تعلیم سائب خاثر سے حاصل کی تھی اس نے تعلیم موسیقی کی ایک باقاعدہ درسگاہ قائم کی تھی ، عرب کے متعدد مشہور ماہر موسیقی (معبد ، ابن عائشہ ، حنابہ ، سلامہ) اسی کے شاگرد تھے -

جمیل کی مشہور محبوبہ ثبینہ اس کی سہیلی تھی -

حوالہ : (اغانی)

۴۲ - حسن صغانی لاہوری (ابن محمد بن حسن بن حیدر) ——— ولادت (لاہور) : ۵۷۷ھ / ۱۱۸۱ء - وفات (بغداد) : ۶۵۰ھ / ۱۲۵۲ء

صغانی (چغانی) ماوراء النہر کا ایک شہر ہے - ان کے مورث اعلیٰ یہیں سے لاہور آئے - اپنے والد سے علوم متداولہ حاصل کئے اور فقہ و حدیث میں مہارت تامہ حاصل کی - بعد کو بغداد ہجرت کر گئے اور یہیں تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا - خاص خاص تصانیف یہ ہیں :

کتاب العباب (لغت) - مشارق الانوار - کتاب العروض - مصباح الدجیٰ - شرح البخاری - کتاب الفرائض -

حوالہ : (تذکرہ رحمان علی)

۴۳ - الحلاج ، ابوالمغیث الحسین بن منصور بن محمّیۃ البیضاوی ——— ولادت : ۲۴۴ھ / ۸۵۸ء

ایرانی النسل صوفی و فقیہ تھے اور عربی زبان کے مصنف - ان کا دادا آتش پرست تھا - ۲۶۴ھ / ۸۷۷ء سے ۲۹۷ھ / ۹۰۹ء تک صوفیہ کی صحبت میں خلوت نشینی کی زندگی بسر کی - اس کے بعد باہر نکل کر خود دعوت و تبلیغ شروع کی اور تصوف میں ایک نیا "طبقہ علیا" قایم کیا - جب ۲۹۶ھ / ۹۰۸ء میں مکہ سے بغداد واپس آئے تو ایک بڑی جماعت ان کے ساتھ ہوگئی اور معتزلہ ، امامیہ ، اور ظاہریہ تمام طبقوں نے ان کے خلاف فتاوی صادر کئے اور دو بار گرفتار کئے گئے - حتیٰ کہ عباسی وزیر ابن عیسیٰ نے ۳۰۱ھ / ۹۱۳ء میں قید کردیا - ۸ سال تک بغداد میں مقید رہے اور اس کے بعد علماء نے ان کو کافر و مرتد قرار دیا اور سولی دیکر ان کی لاش جلادی گئی -

اس واقعہ کے بعد ان کے مقلدین فارس اور اہواز میں ابوعمارۃ الہاشمی کے گرد جمع ہوئے اور خراسان میں الدینا وری کے گرد اور

اس خراسانی جماعت کے زیر اثر فارسی شاعری میں تصوف کا وہ رنگ پیدا ہوا جس کے بانی ابوسعید تھے - حلاج کا مسلک یہ تھا کہ صوفی ترقی کر کے ذات خداوندی میں شامل ہو جاتا ہے اور اسی لئے انھوں نے انا الحق کا دعویٰ کیا تھا جس پر ان کو سولی دی گئی -

اسلام میں شاید ہی کوئی ایسی ہستی گزری ہو جس کے متعلق فقہا، متکلمین، حکماء اور صوفیین میں اتنا اختلاف پایا جاتا ہو - چنانچہ بعض تو حلاج کو کافر کہتے ہیں، بعض کوئی رائے نہیں دیتے اور بعض ان کے تصوف کے قایل ہیں -

حوالہ جات :- (فرزوبنی - ذہبی - ابن جوزی - مقدسی)

---

۴۴ - علی شیرازی (جمال الدین حسن بن المطہر حلی) ——— وفات : ۷۲۶ھ

مشہور شیعی فقیہ و محدث تھے - اکابر شیعہ کے حالات میں انھوں نے ایک مبسوط تاریخ لکھی جس کا نام خلاصۃ الاقوال ہے - حدیث میں انھوں نے تین کتابیں لکھیں : استقصاء - مصباح الانوار - درر و المرجان -

حوالہ : (دائرۃ المعارف)

---

۴۵ - حمداللہ سندیلوی (ابن حکیم شکراللہ) ——— وفات (دہلی) : ۱۱۳۰ھ / ۱۷۱۹ء

نظام الدین سہالوی کے خاص شاگرد تھے اپنے عہد کے مشہور عالم و طبیب تھے - سندیلہ میں ایک مدرسہ قایم کیا جسکے مصارف کے لئے کئی گاؤں بادشاہ کی طرف سے دیئے گئے اور فضل اللہ خاں کا خطاب عطا ہوا - نواب ابوالمنصور خاں صوبہ دار اودھ سے ان کے برادرانہ تعلقات تھے - ان کے شاگردوں میں بعض بڑے جید عالم پیدا ہوئے - ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں :

حمداللہ (شرح تصدیقات مسلم العلوم) - حاشیہ شمس بازغہ - حاشیہ صدرا - شرح زبدۃ الاصول -

حوالہ : (تذکرہ رحمان علی)

---

۴۶ - حمزہ الاصفہانی، ابوعبداللہ حمزہ بن الحسن الاصفہانی

ولادت (اصفہان) اخیر تیسری صدی ہجری ——— وفات : ۳۵۰ھ / ۹۶۱ء اور ۳۶۰ھ / ۹۸۱ء کے درمیان

انھوں نے تعلیم کی غرض سے مختلف مقامات کا سفر کیا، لیکن زیادہ حصہ عمر کا وطن ہی میں صرف کیا - تاریخ و لسانیات کا ان کو خاص ذوق تھا - ادب و لغت پر انھوں نے بارہ تصانیف کیں جن میں صرف تین باقی رہیں : تاریخ حمزہ اصفہانی - کتاب الامثال علی الافعال اور ان کا مرتب کیا ہوا دیوان ابونواس -

حوالہ : (دائرۃ المعارف)

---

۴۷ - حیدر بن علی حسینی رازی ——— ولادت : ۹۹۳ھ / ۱۵۸۳ء

فارسی مورخ تھے - انھوں نے اپنی تاریخ حیدری ۱۰۲۱ھ / ۱۶۱۱ء میں شروع کی اور ۱۰۲۸ھ / ۱۶۱۹ء میں ختم کی جبکہ ان کی عمر ۳۵ سال کی تھی - اس تاریخ کے پانچ حصے یا ابواب ہیں پہلے باب میں عرب دوسرے میں فارس، تیسرے میں وسطی و شرقی ایشیا، چوتھے، چوتھے میں مغرب اور پانچویں میں ہندوستان کی تاریخ لکھی -

حوالہ : (دائرۃ المعارف)

---

۴۸ - حیدر علی سندیلوی ابن حمداللہ ——— وفات (سندیلہ) : ۱۲۳۵ھ / ۱۸۱۰ء

انھوں نے تکمیل علوم اپنے والد اور ملا باب اللہ جونپوری سے کی - بڑے متبحر عالم اور طبیب حاذق تھے - ان کے شاگردوں میں بڑے بڑے نامور علماء پیدا ہوئے - مولوی دلدار علی لکھنوی (مشہور شیعی مجتہد) اور مولوی رجب علی پڑیا کوٹی انھیں کے شاگرد تھے -

ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں : حاشیہ میر زاہد - تعلیقات میر زاہد جلال - تعلیقات میر زاہد جلال - تعلیقات شرح مسلم

حوالہ : (تذکرہ رحمان علی)

۴۹۔ الخازنی، ابوالفتح عبدالرحمان المنصور الخازنی

یہ یونانی غلام تھے جن کی پرورش علی الخازن المروزی نے مرو میں کی اور فلسفہ و ریاضی کی تعلیم دلائی۔ بعد کو یہ مسز الدین سلطان خراسان سے وابستہ ہوگئے۔ ان کا زمانہ پانچویں صدی ہجری تھا۔ ان کی متعدد تصانیف میں سے دو باقی رہیں: الزیج المعتبر سنجری، کتاب میزان الحکمۃ۔

حوالہ: (تاریخ حکماء اسلام (بیہقی))

۵۰۔ الخزرجی ضیاء الدین ابوالحسن علی بن محمد بن یوسف بن عفیف الخزرجی السعیدی

ولادت (بیغا، قرطبہ): ۵۹۰ھ/۱۱۹۴ء ——— وفات (اسکندریہ): ۶۲۲ھ/۱۲۲۸ء

یہ اپنے عہد کے بہت بڑے عروضی تھے۔ اس موضوع پر انھوں نے ایک کتاب بڑے معرکہ کی لکھی ہے جس کا نام:۔ "الرامض الشافیہ فی علم العروض والقافیہ" ہے۔ اس کتاب کی شرحیں بکثرت لکھی گئیں۔

حوالہ: (دائرۃ المعارف)

۵۱۔ دارقطنی، ابوالحسن علی بن عمر بن احمد بن مہدی ——— ولادت (دارالقطن، بغداد): ۳۰۵ھ/۹۱۷ء۔ وفات (بغداد): ۳۸۵ھ/۹۹۵ء

اپنے عہد کے بڑے زبردست محدث تھے اور اس فن کے "امیر المومنین" کہلاتے تھے۔ انھوں نے بصرہ، کوفہ، واسط، شام و مصر کا سفر کر کے یہ فن حاصل کیا۔ انھوں نے فن تجوید بھی متعدد اساتذہ سے حاصل کیا اور فقہ ابوسعید الاصطخری سے پڑھی۔ وہ بہت بڑے ادیب بھی تھے۔ انھوں نے اصول حدیث پر بھی متعدد کتابیں لکھیں۔ خاص تصانیف یہ ہیں:

السنۃ۔ کتاب علل الحدیث۔ الزامات علی الصحیحین۔ کتاب الاستدراکات۔ کتاب الافراد۔ کتاب الامالی۔ کتاب الاربعین۔ کتاب الرؤیا۔ غریب الحدیث۔

حوالہ جات: (تاریخ بغداد، خطیب بغدادی، معجم (یاقوت)، تذکرۃ الحفاظ (ذہبی))

۵۲۔ درجینی، ابوالعباس احمد بن سعید بن سلیمان بن علی بن اخلف

ساتویں صدی ہجری میں خاندان اباضی کے مشہور عالم تھے۔ انھوں نے ایک تاریخی کتاب "طبقات المشائخ" لکھی تھی جو اباضی طبقہ کے اکابر و مشاہیر کی بڑی مستند تاریخ ہے۔

حوالہ: (دائرۃ المعارف)

۵۳۔ دولت اباضی، شہاب الدین احمد بن شمس الدین بن عمر الزاولی الہندی ——— وفات: ۸۴۶ھ/۱۴۴۲ء

دولت اباد (دکھن) میں پیدا ہوئے، علماء دہلی سے تعلیم حاصل کی۔ جب تیمور نے دہلی پر حملہ کیا تو یہ اپنے استاد مولانا خواجگی کے ساتھ کالپی چلے گئے اور عرصہ تک یہیں رہے۔ اخیر میں جونپور گئے، جہاں سلطان ابراہیم شرقی نے ان کو قاضی القضاۃ مقرر کر دیا۔ سلطان ابراہیم شرقی کے قبر کے پاس ان کی بھی قبر ہے۔ بحر مواج تفسیر قرآن (فارسی) مشہور کتاب ہے۔

حوالہ جات: (سبحۃ المرجان۔ ابجد العلوم۔ مفید المغنی۔ حدیقہ الحنفیہ)

۵۴۔ رضا قلی خاں بن محمد ہادی بن اسماعیل کمال ——— وفات: ۱۲۸۸ھ/۱۸۷۱ء

مشہور شاعر کمال مجندی کے خاندان سے تھے۔ ان کے والد دربار قاچار سے وابستہ تھے۔ بہت کمسنی میں باپ کا انتقال ہوگیا۔ فارس میں تعلیم پائی اور یہیں ملازم ہوگئے۔ فتح علی شاہ قاچار ان پر بہت مہربان تھے۔ محمد شاہ نے اپنے بیٹے عباس مرزا کا اتالیق مقرر کیا لیکن محمد شاہ کے انتقال کے بعد ۱۸۴۸ء میں وہ خانہ نشین ہوگئے۔ ۱۸۵۳ء میں ناصر الدین شاہ قاچار نے سفارتی سلسلہ میں فیضو کو بھیجا اور پھر دارالفنون کا مہتمم اور اپنے بیٹے مظفر الدین کا اتالیق مقرر کیا۔

انھوں نے متعدد کتابیں لکھیں جن میں سے اکثر شایع نہ ہوسکیں۔ ادبیات میں انھوں نے دو کتابیں لکھیں: مفتاح الکنوز (شرح کلام خاقانی)

اور نژادنامہ سلاطین عجم نژاد (تاریخ قدیم فرمانروایانِ ایران) - ایک دیوان بھی ۳۰ ہزار اشعار کا چھوڑا اور چھ مثنویاں - بعض دوسری تصانیف یہ ہیں: فہرس التواریخ - اجمل التواریخ - روضۃ الصفا و ناصری - ریاض العارفین - فرہنگ انجمن آرائے ناصری - مدارج البلاغہ -

حوالہ: (دائرۃ المعارف)

---

۵۵ - سعد اللہ مرادآبادی (مفتی) ـــــ ولادت: ۱۲۱۹ھ/۱۸۰۴ء ـــــ وفات (رامپور): ۱۲۹۰ھ/۱۸۷۳ء

لکھنؤ، رامپور اور دہلی میں علوم متداولہ کی تکمیل کی اور مکہ میں شیخ جمال کی سے سند حدیث حاصل کی - واجد علی شاہ کی معزولی کے بعد، نواب یوسف علی خاں (رامپور) کے زمانہ میں عہدۂ قضا پر مامور ہوئے اور نواب کلب علی خاں کے زمانہ تک یہ خدمت انجام دیتے رہے - ان کی تصانیف کی تعداد بہت ہے - خاص خاص یہ ہیں:

مفید الطلاب - عقود الاجیاد - نوادر الاصول (صرف) - غایت البیان - نوادر البیان (علم قرآن) نور المصباح فی اغلاط الصراح - حاشیہ شرح سلم - شرح قطبی (منطق) - مفید البصیرہ (حساب) - حاشیہ شرح چغمینی (ہیئت) - رسالۂ اعراض - رسالۂ تشبیہ و استعارہ (علم بیان)

حوالہ: (تذکرہ رحمان علی)

---

۵۶ - سلام اللہ محدث رامپوری بن شیخ الاسلام بن حافظ فخر الدین ـــــ وفات: ۱۲۲۹ھ/۱۸۱۴ء

شیخ عبدالحی محدث دہلوی کے خاندان سے تھے - مشہور محدث، فقیہ و مفسر تھے - ان کی مشہور تصانیف یہ ہیں: کمالین حاشیہ جلالین - شرح موطا ترجمہ فارسی صحیح بخاری - ترجمہ فارسی شمائل ترمذی - رسالہ اصول الحدیث (عربی)

حوالہ: (تذکرہ رحمان علی)

---

۵۷ - السکاکی، ابوبکر یوسف بن ابی بکر بن محمد سراج الدین خوارزمی ـــــ ولادت (ماوراء النہر): ۵۵۵ھ/۱۱۶۰ء - وفات: ۶۲۶ھ/۱۲۲۸ء

ترکی النسل تھے اور ابتداءً دھات کی چیزیں بناتے تھے اور ان پر نقاشی کا کام کرتے تھے، اسی لئے انھیں سکاکی کہنے لگے - یہ بالکل عامی شخص تھے لیکن بعد کو علم کا شوق پیدا ہوا - ان کے حالات زندگی بہت کم معلوم ہیں - ان کا شمار حنفی فقہا میں ہوتا ہے - ان کی کتاب "مفتوح العلوم" (فن مناظرہ) بہت مقبول ہوئی -

حوالہ جات: (بغیۃ الوعاۃ (سیوطی) ـــ روضۃ الجنان (محمد باقر)

---

۵۸ - (محمد) سلامت اللہ ـــــ وفات: ۱۲۳۵ھ/۱۸۲۰ء

قصبہ پرسرام پور ضلع علی گڑھ میں پیدا ہوئے - ابتدائی تعلیم اعظم گڑھ میں پائی - اس کے بعد رامپور کے علمی ماحول کی شہرت سن کر بعہد نواب کلب علی خاں رام پور آئے اور مولانا ارشاد حسین مجددی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے - جب مولانا شبلی نعمانی، مولانا ارشاد حسین سے فقہ کی تکمیل کی غرض سے رامپور آئے تو مولانا نے چند در چند مصروفیات کی وجہ سے انھیں مولوی سلامت اللہ کے سپرد کر دیا - چنانچہ علامہ شبلی نے دو برس رہ کر فقہ کی تکمیل سلامت اللہ سے کی - آپ نے بچپن برس کی عمر میں کلام اللہ حفظ کیا - علوم صرف و نحو اور فقہ و تفسیر و حدیث میں آپ کا پایہ بلند تھا - فتوویٰ کا سلسلہ رامپور و بیرون رام پور جاری رہتا تھا - میاں خواجہ احمد صاحب کے مدرسہ میں ملازم تھے - پندرہ روپے کی تنخواہ تھی - جب دو روپے کا اضافہ ہوا تو یہ کہکر کہ ہماری گزر اس میں ہو جاتی ہے اضافے سے انکار کر دیا - آپ کا زہد و تقویٰ اور استغنا بہت مشہور تھا - آپ ہی کی بدولت مدرسہ ارشاد العلوم کی تعمیر ہوئی -

بعض مشہور تصانیف یہ ہیں: بلاغ المرام (غیر مقلدین کے رد میں) - القول الفصل - تلخیص الافادات (نحو) - برہان الصرف - تتمہ ارشاد المنطق -

(ذریعہ اثر رامپور)

---

۵۹ - السہروردی، شہاب الدین، ابوحفص عمر بن عبداللہ ـــــ ولادت (سہرورد): ۵۳۹ھ/۱۱۴۵ء - وفات: ۶۳۲ھ/۱۲۳۴ء

مشہور صوفی اور شافعی فقیہ تھے - تصوف کی تعلیم اپنے چچا ابوالنجیب اور شیخ عبدالقادر جیلانی سے حاصل کی - بغداد میں خلیفہ الناصر کے دربار سے وابستہ ہو گئے تھے اور وہیں انتقال کیا - شیخ سعدی نے دورانِ قیام بغداد میں ان سے بہت کچھ سیکھا جس کا ذکر بوستاں میں پایا جاتا ہے - انھوں نے

متعدد حج کئے اور تصوف پر ان کی تصنیف " عوارف المعارف " بہت مشہور کتاب ہے - دوسری کتاب جس میں انھوں نے فلاسفۂ یونان کی تعلیمات کی مخالفت کی ہے - " کشف النصائح " ہے -

حوالہ : (دائرۃ المعارف)

---

۶۰ - **سید محمد جونپوری (مدعی مہدویت)** ——— ولادت : ۸۴۷ھ / ۱۴۴۳ء - وفات : ۹۱۰ھ / ۱۵۰۴ء

جونپور کے متوطن اور سید خاں کے بیٹے تھے - انھوں نے شیخ دانیال جونپوری سے تعلیم حاصل کی اور بارہ سال کی عمر میں تمام علوم متداولہ سے فراغت حاصل کرلی - فطرتاً بہت ذہین تھے اور دقایق علمیہ پر بحث و مباحثہ میں بے انتہا جری - چنانچہ علماء جونپور و دانا پور انھیں اسد العلماء کہا کرتے تھے - سلطان حسین حاکم دانا پور (جو دلیپ راؤ دگوڑ) کا باجگذار تھا) ان کا اتنا عقیدتمند تھا کہ ہر مہم میں اپنے ساتھ رکھتا تھا - انھوں نے سلطان حسین کو آمادہ کیا کہ وہ دلیپ راؤ سے جنگ کرکے آزاد ہوجائے، چنانچہ اس نے گوڑ پر حملہ کیا، سید محمد بھی اس کے ساتھ تھے - اول اول سلطان حسین کو شکست ہوئی، لیکن پھر سید محمد نے ۱۵۰۰ سواروں سے جنھیں بہیرگی کہتے تھے حملہ کیا اور دلیپ راؤ کو قتل کردیا - اس کے بعد بارہ سال تک ان پر جذب کی کیفیت طاری رہی اور اسی دوران میں مہدویت کا دعوے کیا اور مع اہل و عیال کے ترک وطن کرکے چندیری پہونچے - یہاں کے لوگ جب ان کے وعظ و تلقین سے بہت متاثر ہوئے تو چندیری کے اکابر علماء نے ان کو یہاں سے نکال دیا - یہ مانڈو (پایۂ تخت مالوہ) پہونچے - یہاں سلطان غیاث الدین فرمانروائے مالوہ نے ان کی بڑی قدر کی - اس کے بعد آپ چانپانیر (پایۂ تخت گجرات) پہونچے - سلطان محمود گجراتی نے ان کے پاس جانا چاہا لیکن علماء گجرات نے اسے باز رکھا - اس کے بعد وہ برہانپور اور دولت آباد ہوتے ہوئے احمد نگر پہونچے اور یہاں کے فرمانروا احمد نظام الملک نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی - پھر بیدر اور گلبرگہ ہوتے ہوئے حج کے لئے روانہ ہوگئے - حج سے فارغ ہوکر گجرات آئے اور مسجد تاج خان میں قیام کیا - یہاں آپ نے دوبارہ اپنی مہدویت کا اعلان کیا جسے دعوے دوم کہتے ہیں - جب آپ کو یہاں بھی نہ ٹھہرنے دیا گیا تو آپ پٹن (نہروالہ) چلے گئے، لیکن یہاں سے بھی نکالے گئے اور موضع بدلی میں قیام کیا - یہاں آپ نے پھر تیسری بار اپنی مہدویت کا اعلان کیا اور فرمانروائے گجرات نے انھیں یہاں سے بھی باہر چلے جانے کا حکم دیا - اب یہ ٹھٹھہ (دارالحکومت سندھ) پہونچے - فرمانروائے سندھ نے ان کے قتل کئے جانے کا حکم دیا لیکن یہ حکم بعد کو منسوخ کرکے ان کو خارج البلد کردیا - اس وقت ۸۰۰ مریدان کے ساتھ تھے - یہ سب کو ساتھ لیکر خراسان کی طرف روانہ ہوئے - جب قندھار پہونچے - یہاں بھی وہی دارو گیر شروع ہوئی اور آپ فرزہ چلے گئے اور یہیں انتقال کیا -

حوالہ : دائرۃ المعارف)

---

۶۱ - **سیف بن عمر الاسدی التمیمی**

عرب مورخ تھے - ابن ندیم نے ان کی دو تاریخی کتابوں کا ذکر کیا ہے - ایک کتاب الفتوح الکبیر جابر و قادہ - دوسری کتاب الجمائل و میر عایشہ علی طبری نے اول الذکر کتاب سے کافی کام لیا ہے -

حوالہ : (دائرۃ المعارف)

---

۶۲ - **سیفی (مولانا) بخاری المعروف بہ عروضی** ——— وفات : ۹۱۵ھ / ۱۵۰۹ء

ان کے حالات زندگی نامعلوم ہیں - تیموری سلطان ابو سعید (بابر کا دادا) کے دربار سے ہرات میں عرصہ تک وابستہ رہے - فن عروض پر ان کی کتاب عروض سیفی نے کافی شہرت حاصل کی - اس موضوع پر انھوں نے ایک مکمل کتاب میزان الاشعار بھی لکھی تھی -

حوالہ جات : (تذکرۃ الشعراء (دولت شاہ) - آتشکدہ (لطف علی بیگ) - کشف الظنون (حاجی خلیفہ))

---

۶۳ - **شرف الدین علی یزدی** ——— وفات : ۸۵۸ھ / ۱۴۵۴ء

ظفر نامہ کے مصنف - جو تیمور کے حالات پر مشتمل ہے اور میر خوند کے نزدیک اس کا شمار بہترین تاریخوں میں ہے - اس کا ترجمہ یوروپ کی اکثر زبانوں میں ہوچکا ہے - یہ سلطان ابراہیم (شاہ رخ میرزا کے بیٹے) کے دربار سے وابستہ تھے - اور اسی کی فرمائش سے انھوں نے ظفر نامہ لکھنا شروع کیا اور ۸۲۸ھ / ۱۴۲۵ء میں ختم کیا -

حوالہ : (اسلامی ہند - نیاز)

۶۴ - **الشریشی، ابوالعباس احمد** ——— وفات: ۶۱۹ھ / ۱۲۲۲ء

ادیبین کے مشہور مصنف تھے۔ انھوں نے الفارسی کی الایضاح اور الزجاجی کی الجمل کی شرحیں لکھیں اور فنِ عروض پر بھی کئی رسالے تصنیف کئے۔ ایک تذکرہ قدیم شعراء عرب کا بھی مرتب کیا۔ لیکن ان کی ادبی شہرت کا باعث مقامات حریری کی شرح ہے۔

حوالہ جات: (تکملۃ الصلہ (ابن الابار) - بغیۃ الوعات (سیوطی))

۶۵ - **الشریف الرضی، ابوالحسن محمد بن ابی طاہر الحسین بن موسیٰ الکاظم** ——— ولادت (بغداد): ۳۵۹ھ / ۹۷۰ء - وفات: ۴۰۶ھ / ۱۰۱۶ء

حسینی سید تھے۔ ان کے باپ آل بویہ کے عہد میں طالبیین کے نقیب تھے اور قبیلۂ قریش کے سب سے بڑے شاعر۔ بقول ثعلبی دس سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ ان کے دیوان میں سب سے پہلی نظم وہ ہے جو پندرہ سال کی عمر میں انھوں نے لکھی تھی۔ باپ کے بعد نقابت کی خدمات انھوں نے سنبھالیں۔ اور بہاؤ الدولہ نے رضی اور شریف کے خطابات سے ممتاز کیا۔

انھوں نے قرآن پر دو کتابیں بھی لکھیں: معانی القرآن - مجازات القرآن - جو ضایع ہوگئیں۔

حوالہ جات: (تتمۃ الدہر (ثعلبی) - ابن خلکان - مرآۃ الجنان (یافعی))

۶۶ - **حافظ شمس الدین محمد شیرازی** ——— ولادت غالباً: ۷۲۷ھ / ۱۳۲۷ء - وفات (شیراز): ۷۹۱ھ / ۱۳۸۹ء

فارسی کے مشہور غزل گو شاعر تھے۔ ان کے ابتدائی حالات تاریکی میں ہیں۔ انھوں نے پہلے قرآن حفظ کیا اور پھر علوم متداولہ حاصل کئے۔ وہ اپنے دیوان میں ابواسحاق انجو کا ذکر کرتے ہیں جو مظفری خاندان کے تسلط سے قبل فارس کا حکمراں تھا۔ یہ اُس وقت کے بعض اکابر شیراز سے بھی مخلصانہ تعلقات رکھتے تھے، جن میں سے ایک درویش شیخ امین الدین تھے اور دوسرے حاجی قوام الدین حسن تھے اور ان دونوں کی صحبت سے حافظ بہت متاثر ہوئے تھے۔ جب ۷۵۳ھ میں مبارز الدین محمد (امیر مظفر کا بیٹا) شیراز پر قابض ہوا تو حافظ کی پریشانیوں میں کافی اضافہ ہوا کیونکہ یہ بڑا مذہبی شخص تھا اور شراب نوشی کا دشمن، علاوہ اس کے چونکہ مبارز الدین سنی تھا اور حافظ شیعہ، اس لئے حافظ اپنے آپ کو خطرہ میں پاتے تھے۔ جب مبارز الدین کو اس کے بیٹے جلال الدین شاہ شجاع نے معزول کر کے خود عنانِ حکومت میں لی تو حافظ کو اطمینان ہوا کیونکہ یہ بہت آزاد خیال تھا۔ یہ زمانہ حافظ کے انتہائی عروج و شہرت کا تھا جب نہ صرف فارس بلکہ دور دراز ملکوں تک ان کی شاعری کے قدر دان پیدا ہو گئے تھے، یہاں تک کہ ہندوستان کے بہمنی خاندان کے فرمانروا محمود شاہ اول کے وزیر عبدلیہ نے بھی انھیں ایک بار طلب کیا لیکن یہ نہ جا سکے۔

شاہ شجاع کی وفات کے بعد (۷۸۶ھ) اس کے بیٹے کا بیٹا زین العابدین بھی حافظ کا بڑا قدر دان تھا۔ جب تیمور نے اسے نکال کر شیراز پر قبضہ کیا تو حافظ بہت پریشان ہوئے، لیکن جب تیمور واپس گیا اور شاہ منصور کا زمانہ آیا تو اس نے حافظ کی بڑی عزت کی اور ان پر قرض کا جو بار ہو گیا تھا وہ بھی ادا کر دیا۔

حافظ کو اپنے وطن شیراز سے بڑی محبت تھی اور یہ اس سے جدا ہونا پسند نہ کرتے تھے، چنانچہ غزلوں میں شیراز کی شراب اور شیراز کی عورت کا ذکر نہایت والہانہ انداز سے پایا جاتا ہے۔ حافظ کی میخواری کے متعلق لوگوں میں اختلاف ہے، بعض کا خیال ہے کہ حافظ کی شراب، شراب تصوف تھی۔ بعض اس کے مخالف ہیں، لیکن حافظ کے تحریرات کو بغور دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس میں یہ جوش پیدا ہونا ممکن نہ تھا اگر وہ خود شراب کے عادی نہ ہوتے، علاوہ اس کے کسی خانوادہ تصوف سے متعلق ہونا بھی تاریخ سے ثابت نہیں، ان کے کلام سے بھی یہی پتہ چلتا ہے کہ جس شراب کا وہ ذکر کرتے ہیں وہ اسی دُنیا کی شراب ہے، چنانچہ جب شاہ شجاع تخت نشین ہوا تو اس کی آزاد خیالی کی تعریف میں حافظ کے قلم سے بے اختیار یہ مصرعہ نکل گیا:-

کہ دورِ شاہ شجاع ست مے دلیر بنوش

حافظ کا ابتدائی کلام ضایع ہو گیا۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے دوست محمد گل اندام نے ان کے منتشر کلام کی جمع و ترتیب کی خدمت انجام دی۔ نہیں کہا جا سکتا کہ گل اندام کے نسخے میں کتنی غزلیں تھیں اور اس کی نقلیں کب اور کس طرح ملک میں پھیلیں، لیکن اس میں شک نہیں

کہ دیوان حافظ کا وہ نسخہ جو ابو طالب نے مرتب کیا تھا اور کلکتہ میں چھپا تھا (۱۷۹۱ء) سب سے زیادہ مکمل نسخہ ہے (گو پورا غلط ہے) جس میں ۵۲۷ غزلیں پائی جاتی ہیں۔ صحت و تنقیح کے لحاظ سے HERMANBROCKHANS کا شایع کردہ نسخہ جو سودی کے نسخہ کے مطابق ہے زیادہ قابل لحاظ ہے۔ اس میں غزلوں کی تعداد ۲۹۲ ہے۔

دیوان کے علاوہ حافظ کی دو تصانیف اور بھی ہیں۔ ایک حاشیۂ کشاف (زمخشری) دوسرا حاشیۂ مصباح۔

حوالہ جات: (مواہب الٰہی (معین الدین یزدی) ۔ زبدۃ التواریخ (حافظ آبرو) ۔ مطلع السعدین (عبدالرزاق سمرقندی)۔ روضۃ الصفا (میر خوند)

۶۷۔ شیخ مبارک ناگوری ——— وفات (لاہور): ۱۰۰۱ھ

اپنے عہد کے مشہور عالم تھے۔ ابوالفضل کا مفروفی اور مولانا عماد طاری سے گجرات میں تمام علوم متداولہ حاصل کئے۔ علوم قرآنیہ کے بھی بڑے ماہر تھے۔ منبع العلوم کے نام سے ایک تفسیر چار جلدوں میں لکھی۔ اور ۵۰ سال تک آگرہ میں درس و تدریس کا مشغلہ جاری رکھا۔ ابوالفضل اور فیضی انھیں کے بیٹے تھے۔

حوالہ: (علماء ہند۔ رحمان علی)

۶۸۔ صدیق حسن خاں، سید ابوالطیب قنوجی (نواب امیر الملک والاجاہ بہادر)

ولادت (بریلی): ۱۲۴۸ھ / ۱۸۳۲ء ——— وفات (بھوپال): ۱۳۰۷ھ / ۱۸۹۰ء

یہ اپنے والد سید اولاد حسن کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ ماں کا نام نجیب النسا تھا جو بریلی کی رہنے والی تھیں۔ سلسلۂ نسب جلال الدین جہانیاں جہاں گشت سے ملتا ہے جن کے دادا سید جلال بخارا سے ہندوستان آئے تھے (۷۶۳ھ / ۱۳۶۱ء)۔

تعلیم دہلی میں ہوئی اور فراغ کے بعد بھوپال میں ملازم ہوگئے۔ یہاں جمال الدین خاں وزیر بھوپال کی لڑکی سے شادی ہوگئی، بیوی کی وفات کے بعد دوسری شادی شاہجہاں بیگم (والیٔ بھوپال) سے ہوئی۔ ان کے بیٹے سید علی حسن خاں نے جو پہلی بیوی سے تھے ان کی زندگی کے حالات آخر صدیقی میں جمع کئے ہیں، جس کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے ۲۲۲ کتابیں تصنیف کیں۔ ۴۰ عربی میں، ۵۴ فارسی میں اور ۱۰۳ اردو میں جن میں سے ۵۰ شایع نہیں ہوئیں۔

بیگم بھوپال سے شادی ہوجانے کے بعد ان کا دنیاوی وقار بہت بڑھ گیا اور ملک کے مختلف علماء کو جمع کرکے علمی مباحث میں حصہ لینا شروع کیا۔ چنانچہ ان کے زمانہ میں بھوپال ایک اچھا خاصہ مرکز علم و ادب بن گیا تھا۔

حوالہ جات: (مآثر صدیقی۔ تذکرہ علماء ہند (رحمان علی))

۶۹۔ صغدی، الحسن بن ابی محمد عبداللہ الہاشمی

صوبہ فرمانروا سلطان الناصر بن قلاؤن کے درباری تھے۔ آٹھویں صدی ہجری کے آغاز میں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے ۷۱۶ھ میں مصر کی ایک تاریخ لکھی جس کا نام "نزہۃ المالک والممالک" تھا۔

حوالہ: (دائرۃ المعارف)

۷۰۔ صفی الدین، عبدالمومن بن یوسف بن فاخر الارموی البغدادی ——— وفات: ۶۹۳ھ / ۱۲۹۴ء

اخیر عہد عباسیہ کے نہایت مشہور مغنی تھے۔ بغداد میں پیدا ہوئے اور یہیں تعلیم و تربیت ہوئی۔ یہ آخری عباسی خلیفہ المعتصم کے مصاحب و مغنی اور ملازمین میں سے تھے۔ موسیقی میں وہ اسحاق موصلی کے مرتبہ کے اور خطاطی میں یاقوت کے ہم پلہ سمجھے جاتے تھے اور ۵ ہزار دینار ان کا وظیفہ مقرر تھا جب ہلاکو نے بغداد میں قتل عام کیا تو ان کا خاندان محض مغنی ہونے کی وجہ سے محفوظ رہا اور ہلاکو نے ان کا مشاہرہ دس ہزار دینار مقرر کردیا۔ ہلاکو کے جانے کے بعد یہ اس کے وزیر شمس الدین جوینی کے لڑکوں کے اتالیق ہوگئے۔ جوینی خاندان کا عروج جب تک رہا یہ امیرانہ زندگی بسر کرتے رہے، لیکن اس خاندان

کے زوال کے بعد ان کا عروج بھی ختم ہوگیا یہاں تک کہ وہ ۳۰۰ دینار قرض کے عوض قید کردئے گئے اور اسی حال میں انتقال کیا۔
انھوں نے ادب و موسیقی پر کئی کتابیں لکھیں جن میں بعض کے نام یہ ہیں:
رسالۃ الشرفیہ — کتاب الادوار — فی العلوم العروض والقوافی والمدایح۔
حوالہ جات: (فوات الوفیات (قطبی) - تاریخ دمشق)

---

۷۱ - **الضبی ابوجعفر احمد بن یحییٰ بن احمد بن عمیرہ** ——— وفات: ۵۹۹ھ/۱۲۰۳ء
اسپین کے عالم تھے۔ اپنی زندگی کا بڑا حصہ مرسیا (المحالی افریقہ) میں بسر کیا۔ ان کی تصانیف میں سے صرف ایک "تاریخ عرب واسپین کے علماء کی باقی رہی۔ اس کا نام "بغیتہ الملتمس" تھا۔
حوالہ: (دائرۃ المعارف)

---

۷۲ - **ضیاء الدین ابوالفتح نصراللہ** ——— ولادت (جزیرہ): ۵۵۸ھ/۱۱۶۳ء — وفات (بغداد): ۶۳۷ھ/۱۲۳۹ء
صلاح الدین کے زمانہ میں ملازم ہوئے اور الملک الافضل کے عہد میں وزیر ہوگئے۔ جب دمشق پر تاتاریوں کا قبضہ ہوا تو یہ بھی قسر بھاگ گئے اور پھر ۶۱۳ھ/۱۲۱۶ء میں فرمانروائے حلب کے ملازم ہوگئے اس کے بعد وہ موصل چلے گئے اور وہاں ناصرالدین محمود کے عہد میں دیوان انشاء کے افسر ہوگئے۔ ان کی کتاب "المثل السائر فی ادب الکاتب والشاعر (ادبیات) بڑی مشہور تصنیف ہے"۔
حوالہ: (ابن خلکان)

---

۷۳ - **الطغرائی، مؤیدالدین، فخرالکتاب ابواسماعیل اصفہانی** ——— ولادت (اصفہان): ۴۵۳ھ/۱۰۶۱ء — وفات: ۵۱۵ھ/۱۱۲۱ء
مشہور شاعر و مصنف تھے۔ سلاطین سلجوقیہ کے زمانہ میں، کاتب یا سکریٹری کی خدمت پر مامور ہوئے، لیکن آدمی بڑے بلند حوصلہ کے تھے اسلئے عہدۂ وزارت حاصل کرنے کے لئے سیاسیات میں نمایاں حصہ لیا، اور اس وقت کی خانہ جنگیوں سے فایدہ اٹھانا چاہا۔ لیکن اخیر میں وہ ناکام ہوئے اور قتل کئے گئے۔
ان کی نہایت مشہور کتاب "لامیات العجم" ہے جس میں انھوں نے اپنے عہد کے ناموافق حالات کا ذکر کیا ہے اور شاعری کے لحاظ سے خاص مرتبہ کی چیز سمجھی جاتی ہے۔ انھوں نے ایک دیوان بھی اپنے بعد چھوڑا۔ فن خطاطی کے بھی ماہر تھے۔ ان کی بعض دوسری تصانیف یہ تھیں:
جامع الاسرار۔ تراکیب الانوار۔ حقیقت الاستشہادات۔ ذات الفوایہ۔ رد علی ابن سینا فی ابطال الکیمیا۔ مصابیح الحکم۔
حوالہ جات: (یاقوت۔ ابن خلکان۔ ابن الاثیر)

---

۷۴ - **عبدالقادر بن عمر البغدادی** ——— پیدایش: ۱۰۳۰ھ/۱۶۲۰ء — وفات: ۱۰۹۳ھ/۱۶۸۲ء
بغداد کے مشہور ماہر لسانیات تھے۔ جامع ازہر (مصر) میں خفاجی سے تعلیم حاصل کی۔ یہ فارسی زبان کے بھی ماہر تھے۔ ان کی تصانیف یہ ہیں:
خزانۃ الادب ولب لباب لسان العرب — فرہنگ شاہنامۂ فردوسی۔
حوالہ: (خلاصۃ الادب محبی)

---

۷۵ - **عبدالرشید بن عبدالغفور الحسینی المدنی التتاوی** ——— وفات: ۱۰۶۹ھ/۱۶۵۸ء
فارسی کے مشہور لغت نویس تھے۔ تتہ میں پیدا ہوئے اور ۱۰۶۲ھ/۱۶۵۲ء کے بعد انتقال کیا۔ ان کا فارسی لغت "فرہنگ رشیدی" بہت مشہور ہے، جسے ۱۰۶۴ھ/۱۶۵۴ء میں انھوں نے مرتب کیا تھا۔ انھوں نے ایک لغت عربی سے فارسی کا بھی مرتب کیا جس کا نام "منتخب اللغات" ہے۔ اس لغت کو انھوں نے شاہجہاں کے نام سے منسوب کیا تھا۔
حوالہ: (دائرۃ المعارف)

---

۷۶ - عنایت اللہ کمبوہ ——— ولادت: ۱۰۱۵ھ/۱۶۰۶ء — وفات: ۱۰۸۲ھ/۱۶۷۱ء یا ۱۰۸۳ھ/۱۶۷۲ء

مغلوں کے زمانہ میں یہ لاہور میں کسی خدمت پر مامور تھے - بہادر دانش کے علاوہ انھوں نے عہد شاہجہاں تک کی ایک تاریخ بھی لکھی جو "تاریخ دلکشا" کے نام سے موسوم ہے - انھوں نے اپنی زندگی ہی میں اپنا نہایت شاندار مقبرہ لاہور میں طیار کرایا تھا جسے بعد کو سکھوں نے مسمار کر دیا اور انگریزوں کے زمانہ میں وہ کلیسا بن گیا -

(سید محمد لطیف لاہوری)

۷۷ - محاسبی، ابو عبداللہ حارث بن اسد العنزی ——— ولادت (بصرہ) - وفات: ۲۴۳ھ/۸۵۷ء

شافعی فقیہ تھے - مسایل مذہب میں معقولات سے کام لینے کے زیادہ موید تھے اور معقولات ہی سے انھوں نے معتزلہ کا مقابلہ کیا - لیکن اخیر میں گوشہ نشین ہو گئے اور مناظرہ وغیرہ ترک کر دئے - حنابلہ ان کے سخت مخالف تھے - ان کی خاص تصنیف "دعایۃ لحقوق اللہ" ہے جس میں انھوں نے بطور نصائح کے روحانی زندگی کے نکات ظاہر کئے ہیں - ان کی بعض دوسری کتابیں یہ ہیں: کتاب التوہم - ماہیۃ العقل -

حوالہ جات: (کشف المحجوب (ہجویری) - منقذ (غزالی) - کتاب الانساب (سمعانی) - طبقات (سبکی))

۷۸ - محمد بیرم (محمد بن مصطفےٰ ابن محمد بن حسین بن احمد بن محمد بن حسین بن بیرم):

ولادت (تیونس): ۱۲۵۲ھ/۱۸۳۶ء ——— وفات (حلوان مصر): ۱۳۰۶ھ/۱۸۸۹ء

تیونس میں بیرم مشہور خاندان تھا جس کے افراد نے تیونس کی فتح میں نمایاں حصہ لیا تھا اور ان میں اکثر تیونس کے مفتی اعظم رہ چکے تھے - محمد بیرم نے ابتدائی تعلیم اپنے عہد کے بڑے بڑے علماء سے حاصل کی - ۱۷ سال کی عمر میں ایک کتاب حکومت کے قواعد و ضوابط پر لکھی جس کا نام کناش تھا -

۱۲۷۹ھ/۱۸۶۲ء میں مدرسہ حنفیہ اور جامعہ زیتونہ ان کے چارج میں دئے گئے - چند دن بعد انھوں نے فرانسیسی حکومت کے مظالم کے خلاف اخبار رائض میں مضامین لکھنے شروع کئے اور اسمبلی میں عوام کی نمایندگی کا مطالبہ شروع کیا - ۱۲۹۱ھ/۱۸۷۴ء میں یہ متہم اوقاف بنا دئے گئے اور جدید مغربی اصول پر انھوں نے صادقی کالج کی بنیاد ڈالی - اسی سال بغرض علاج پیرس گئے اور اپنے اخبار رائض کی اشاعت شروع کی - ۱۲۹۳ھ/۱۸۷۶ء میں سروپا اور مانٹی نگرو کے خلاف انھوں نے ترکی کی بہت مدد کی - ۱۲۹۵ھ/۱۸۷۸ء میں وہ پھر پیرس گئے اور وہاں کی نمایش میں شریک ہوئے - یہاں سے وہ لندن گئے اور لوٹ کر الجزایر آئے - تیونس کی سیاسیات میں چونکہ نمایاں حصہ لیا تھا اس لئے فرانس کی حکومت نے انھیں وہاں نہ رہنے دیا - چنانچہ ۱۲۹۶ھ/۱۸۷۹ء میں یہ براہ مالٹا، اسکندریہ اور قاہرہ پہونچے - جہاں خدیو توفیق پاشا نے ان کی بڑی آؤ بھگت کی - اس کے بعد وہ حج کے لئے حجاز گئے اور پھر وہاں سے قسطنطنیہ پہونچے یہ زمانہ سلطان عبدالحمید کا تھا - یہیں انھوں نے اپنی مشہور کتاب "صفوۃ الاعتبار" مرتب کی - یہاں سے یہ پھر قاہرہ گئے اور الاعلام ایک سیاسی وعلمی اخبار جاری کیا - دو سال بعد یہ ملکہ وکٹوریہ کی جوبلی میں شرکت کے لئے لندن گئے اور وہاں سے لوٹ کر "تجرید السنان فی الرد علی الخطیب ریٹان" لکھی جس میں ریٹان کے اس الزام کا جواب دیا گیا تھا کہ اسلام ترقی علوم و فنون کا مخالف ہے - ۱۳۱۶ھ/۱۸۹۹ء میں یہ قاہرہ میں حج کی حیثیت سے مامور ہوئے لیکن اس کے بعد ہی انتقال ہو گیا -

یہ حدیث، فقہ، قدیم و جدید تاریخ کے بڑے ماہر تھے - انھوں نے متعدد کتابیں تصنیف کیں، جن میں سے بعض یہ ہیں: -

"نفحۃ الخواص فی حل صید بندق الرصاص" (اس میں انھوں نے بندوق سے ہلاک ہو جانے والے جانور کو ذبیحہ قرار دیکر اس کے کھانے کا فتویٰ دیا ہے) "التحقیق فی مسئلۃ الرقیق" (غلامی کے مسئلہ پر)

حوالہ: (تاریخ آداب اللغۃ العربیہ (جرجی زیدان))

۷۹ - محمد عبدالباقی الرحیمی نہاوندی ——— وفات: ۱۰۶۲ھ/۱۶۴۳ء

عہد اکبری کے خاص لوگوں میں سے تھے اور عبدالرحیم خانخاناں کے متوسلین خصوصی میں - ان کی تاریخی کتاب مآثر رحیمی بڑی مشہور کتاب ہے

جو ۱۰۱۲ھ/۱۶۰۳ء میں پوری ہوئی - اس میں عہد اکبری کے امراء و ملوک کے حالات نہایت تفصیل کے ساتھ درج کئے ہیں اور عبدالرحیم خانخاناں کے حالات اتنی شرح و بسط کے ساتھ لکھے ہیں کہ بعض لوگوں نے اسے خانخاناں ہی کی سیرت قرار دیدیا - یہ کتاب عبدالرحیم خانخاناں کے نام سے موسوم ہے اسی لئے اس کا نام مآثر رحیمی رکھا گیا -

(اسلامی ہند - نیاز)

---

۸۰ - **محمد بقا ابن شیخ غلام محمد** ـــــــــ ولادت: ۱۰۳۷ھ/۱۶۲۷ء — وفات (سہارنپور): ۱۰۹۳ھ/۱۶۸۳ء

ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی اور پھر شیخ عبدالحق محدث دہلوی سے - تعلیم سے فارغ ہوکر خود سلسلۂ درس و تدریس جاری کیا - یہ محمد معصوم سرہندی کے مرید تھے - افتخار خاں میر خانساماں نے انھیں اورنگ زیب کے دربار سے متعارف کیا اور یہ بخشی و وقایع نگار کی خدمت پر مامور ہوگئے - اسی سلسلۂ ملازمت میں انھوں نے مراۃ جہاں نما تاریخی کتاب لکھی - اس کے علاوہ دو کتابیں اور لکھیں: ریاض الاولیاء، تذکرۃ الشعراء -

حوالہ: (مراۃ عالم (بختاور خاں)

---

۸۱ - **عبدالقادر بن غیبی الحافظ المراغی** ـــــــــ ولادت (مراغہ آذربیجان) وسط آٹھویں صدی ہجری — وفات (ہرات): ۸۳۹ھ/۱۴۳۵ء

فارس کے سب سے بڑے ماہر علم موسیقی تھے - نویں صدی ہجری میں یہ فرمانروائے عراق، سلطان حسین جلائری کے نہایت محبوب مصاحب تھے - اسی زمانہ میں ایک بار رضا الدین رضوان شاہ نے جو اپنے عہد کا بہت بڑا ایک تھا ان کو مقابلہ کی دعوت دی اور ایک لاکھ دینار کی شرط قرار پائی، ابن غیبی یہ شرط جیت گئے -

سلطان حسین کے بعد یہ اس کے جانشین احمد کے دربار کے بھی معنی رہے بعض کا بیان ہے کہ وہ سلطان بایزید فرمانروائے ترکی کے دربار سے کچھ عرصہ تک وابستہ رہے - جب تیمور نے بغداد کو فتح کیا (۱۳۹۳ء) تو وہ اپنے ساتھ ابن غیبی کو بھی سمرقند لے گیا اور دربار کا خاص مغنی مقرر کیا - چند سال بعد وہ تیمور کے لڑکے میران شاہ کے دربار سے وابستہ ہوکر تبریز چلے گئے - جب تیمور کو معلوم ہوا کہ میران شاہ کا بعض بدعنوانیوں کا باعث اس کے مصاحب تھے تو اس نے میران شاہ کے چند مغنی مصاحبین کو قتل کرا دیا، لیکن ابن غیبی کسی ترکیب سے جان بچاکر پھر سلطان احمد کے پاس بغداد پہونچ گئے جب تیمور نے ۱۴۰۱ء میں دوبارہ بغداد کو فتح کیا تو ابن غیبی بھی گرفتار ہوکر سامنے لائے گئے اور ان کے قتل کا حکم دیا گیا، لیکن انھوں نے تیمور کو قرآن کی بعض آیتیں نہایت خوش الحانی سے سناکر خوش کرلیا اور وہ پھر سمرقند لے گیا -

تیمور کی وفات کے بعد وہ شاہرخ کے دربار سے وابستہ ہوگئے - ۱۴۱۲ء میں انھوں نے موسیقی پر ایک رسالہ لکھا اور مراۃ ثانی کی خدمت میں پیش کرنے کے لئے ہرات پہونچے تو اس وقت وہ خود اپنی الجھنوں میں مبتلا تھا اس لئے وہ جلد ہی پھر سمرقند واپس آگئے، اور ۱۴۳۵ء میں یہ عالم و طاعون انتقال ہوگیا -

وہ نہ صرف بڑے زبردست مغنی تھے بلکہ خطاط، شاعر و نقاش بھی تھے، ان کی سب سے بڑی تصنیف اس فن پر "جامع الالحان" ہے - ان کی دوسری کتاب "مقاصد الالحان" ہے جو "جامع الالحان" ہی کا خلاصہ ہے - تیسری کتاب "کنز الالحان" میں انھوں نے اپنے بتائے ہوئے تمام گیت جمع کردئے اور ان کے گانے کے طریقے بھی بتائے - ان کی آخری تصنیف شرح الادوار ہے -

ابن غیبی نے اپنی تصانیف میں نہ صرف فارس و عرب کی تاریخ موسیقی تحریر کی ہے بلکہ عملی موسیقی اور سازوں کا بھی تذکرہ کیا ہے، ان کی تمام تصانیف کے مطبوعات قسطنطنیہ کی عثمانیہ لائبریری اور جوڈین لائبریری میں موجود ہیں -

حوالہ جات: (حبیب السیر (خواند میر) - تذکرۃ الشعراء (براؤن) - ظفر نامہ (یزدی) - تذکرہ دولت شاہ)

---

۸۲ - **الفاسی، محمد بن احمد بن علی ابوالطیب تقی الدین المکی الخزاعی** ـــــــــ ولادت (مکہ): ۷۷۵ھ/۱۳۷۳ء — وفات: ۸۳۲ھ/۱۴۲۹ء

فارغ تھے - قاہرہ، دمشق، یروشلم، اسکندریہ اور یمن کی سیاحت کرکے وہاں کے علماء سے تحصیل علم کی اور ۸۰۶ھ/۱۴۰۳ء میں مکہ کے قاضی مقرر ہوگئے - لیکن ۸۲۴ھ/۱۴۲۱ء میں اس عہدہ سے ہٹا دیا گیا - انکی تاریخی تصانیف صرف مکہ سے متعلق ہیں - ان کی تصانیف یہ ہیں: -

کتاب العقد الثمین فی تاریخ البلد الامین - کتاب لبضا والمقبول فی فضایل المدینۃ و زیارت رسول -
حوالہ جات : (کتاب الروض العاطر نعانی) - طبقات الحفاظ (سیوطی))

۸۳ - الفاروقی، (ملا) محمود بن محمد ـــــــــ ولادت (جونپور) : ۹۹۳ھ / ۱۵۸۵ء ـــــ وفات : ۱۰۶۲ھ / ۱۶۵۱ء

ابتدائی تعلیم اپنے دادا اور استاد الملک محمد افضل جونپوری سے حاصل کی اور سترہ سال کی عمر میں طلبہ کو درس دینے لگے جو تمام اطراف ہند سے اس کے پاس آتے تھے - ان کے فضایل و کمال کی شہرت شاہجہاں تک پہونچی تو دہلی طلب کیا اور سہ صدی منصب عطا کیا - جب یہ بادشاہ کے ساتھ لاہور گئے تو شاہ میر لاہوری سے بیعت کی اور ترک ملازمت کرکے وطن واپس چلے گئے اور درس و تدریس میں عمر گزار دی - ان کا شمار نہ صرف ہندوستان بلکہ تمام ممالک اسلامی کے فاضل علماء میں تھا - یہ ادبیات و فلسفہ دونوں کے ماہر تھے - ان کی تصنیفات یہ ہیں :-

حاشیہ علی ادب الباقیہ - الفرایدی شرح القواید - رسالہ فی ابطال الہیولیٰ - الشمس البازغہ (جو ہندوستان کے عربی درس نظامی میں شامل ہے)
حوالہ جات : (سبحۃ المرجان (آزاد بلگرامی) - شگرف بیان (زبیری) - حدایق الحنفیہ (فقیر محمد لاہوری) - ابجد العلوم (صدیق حسن خاں))

۸۴ - قاضی خان فخر الدین الحسن بن منصور الاوزجندی الفرغانی وفات : ۵۹۲ھ / ۱۱۹۶ء

حنفی مسلک کے مشہور عالم و مفتی تھے - فقہ پر متعدد کتابیں لکھیں، جن میں "فتاوی قاضی خاں" بہت مشہور ہے - اسکی چار جلدیں تھیں -
حوالہ : (ابن قتلوبغا - حاجی خلیفہ)

۸۵ - قرۃ العین ـــــــــ (زمانہ تیرھویں صدی ہجری)

بہائی مسلک کی ایک مشہور مجاہد خاتون - ان کے والد حاجی ملا محمد صالح قزوین کے ایک ذی اثر تاجر تھے - حاجی سید کاظم (شیخ احمد احصائی بانی مسلک شیخی کے جانشین) کے دوست تھے - قرۃ العین نے سب سے پہلے شیخی مسلک کے اصول حاجی سید کاظم سے معلوم کئے اور سید کاظم ہی نے ان کو قرۃ العین کہکر پکارا، ورنہ ان کا اصلی نام زریں تاج تھا -

قرۃ العین کی ابتدائی تعلیم دینیات وغیرہ کی بڑی اچھی ہوئی تھی اور وہ تمام علمی مباحثوں جو اس وقت ہوا کرتے تھے پرجوش حصہ لیا کرتی تھیں اول اول ان کی شادی آخوند محمد تقی مجتہد سے تجویز پائی تھی لیکن بعد کو اپنے عم زاد بھائی حاجی ملا محمد تقی سے بیاہ دی گئیں جو قزوین کے مجتہد تھے -

جس طرح یہ غیر معمولی حسن و جمال رکھتی تھیں اسی طرح غیر معمولی جودت و ذہانت کی بھی مالک تھیں - یہ قرآن، حدیث اور عربی زبان کی بڑی ماہر تھیں - شیخی مسلک کی طرف ان کے رجحان کا سبب یہ تھا کہ یہ بالطبع بہت آزاد طبع تھیں اور اس مسلک میں عورت و مرد دونوں کو برابر کا درجہ دیا گیا تھا اور پردہ بھی غیر ضروری چیز قرار دیا جاتا تھا -

جب سید کاظم کا انتقال ہو گیا (۱۲۵۹ھ / ۱۸۴۳ء) تو قرۃ العین نے ان کے ایک خاص پیرو ملا حسین بشروی سے شیخی مسلک کے ساتھ اپنی بڑھی ہوئی ارادت کا ذکر ایک تحریر کے ذریعہ سے کیا اور یہ بھی لکھا کہ بابی شیخی مسلک کا ظہور کسی نہ کسی دوسرے انسان میں ضرور ہوگا - ملا حسین جب بہ سلسلۂ سیاحت و جستجو شیراز پہونچے اور مرزا علی محمد سے ملاقات ہوئی تو ان سے یہ ذکر کیا اور انھوں نے کہا کہ شیخ احمد احصائی کا ظہور میرے ہی اندر ہوا ہے اور باب کا لقب اختیار کرکے تبلیغ شروع کر دی -

باب نے اس کے بعد اپنے ۱۹ حواریین کی ایک جماعت "حروف الحی" کے نام سے منتخب کی جن میں سے ایک قرۃ العین بھی تھیں (۱۲۶۰ھ / ۱۸۴۴ء) قرۃ العین نے بابی مسلک انتیار کرتے ہی برقع کو خیرباد کہدیا اور قزوین میں کھلم کھلا بہائی مسلک کی تبلیغ کرنے لگیں - ان کے خاندان والوں نے بہت کوشش کی کہ وہ ایسا نہ کریں، لیکن یہ باز نہ آئیں اور ایک اچھی خاصی جماعت ان کے ساتھ ہو گئی - ہو سکتا ہے قرۃ العین کی کامیابی کا بڑا سبب ان کا حسن و جمال رہا ہو، لیکن اس سے انکار ممکن نہیں کہ اس کامیابی میں ان کے فضل و کمال اور مجاہدانہ خلوص و صداقت کا بھی بڑا ہاتھ تھا

جب قزوین میں ایک بڑی جماعت ان کی ہمنوا پیدا ہو گئی تو یہ کربلا گئیں اور وہاں تبلیغ شروع کی، یہاں انھوں نے اپنے آپ کو جناب فاطمہ کا مظہر ظاہر کیا اور چند دن میں وہاں بڑا رسوخ حاصل کر لیا - مخالفین نے اس فتنہ کی طرف کربلا کے حاکم کو متوجہ کیا، اس نے بغداد کے

گورنر کو خط لکھا اور حکم دیا کہ جب تک وہاں سے کوئی جواب نہ آئے قرۃ العین کربلا سے باہر قدم نہ نکالیں، لیکن کسی نہ کسی طریقے سے کربلا چھوڑ کر بغداد پہونچ گئیں اور یہاں کے مفتی اعظم سے بڑی گرم بحث کی۔ پاشائے بغداد نے سارا حال قسطنطنیہ لکھ بھیجا اور وہاں سے فرمان صادر ہوا کہ قرۃ العین کو کسی نہ کسی ترکیب سے ایران لوٹا دیا جائے۔ اسی دوران میں قرۃ العین کے بعض ساتھی ان کی غیر معمولی آزادی و بے پردگی کے مخالف ہو گئے اور انھوں نے علی محمد باب کو شکایت لکھ بھیجی وہاں سے جواب آیا کہ قرۃ العین جو کچھ کرتی ہیں بالکل ٹھیک ہے اور اسی کے ساتھ جناب طاہرہ کا خطاب عطا ہوا۔

بغداد سے لوٹ کر یہ کرمان شاہ اور ہمدان آئیں۔ یہاں سے انھوں نے پایۂ تخت جا کر خود محمد شاہ شاہ ایران کو باقی بنانے کا قصد کیا۔ ان کے والد اور دوسرے اعزہ نے بہت سمجھایا اور بابی مسلک ترک کر کے اپنے شوہر کے پاس چلے جانے کی تلقین کی لیکن یہ نہ مانیں۔ اتفاق سے اسی وقت انکے خسر اور چچا حاجی ملا محمد تقی کو (جو بابیوں کے سخت مخالف تھے) بابیوں نے قتل کر دیا۔ اس پر بڑا ہنگامہ ہوا اور قرۃ العین کو مع ستر ساتھیوں کے گرفتار کر لیا گیا، بعد کو عدم ثبوت کی وجہ سے قرۃ العین کو صرف شہر بدر کر دیا گیا، یہ یہاں سے ماندران گئیں اور بدشت میں بابی متبعین اور لیڈروں سے ملیں جن میں نابالغ مرزا یحییٰ "صبح ازل" بھی شامل تھے۔ یہاں شیوخ و علماء سے مناظرہ ہوا جسے انھوں نے "تاریخ جدید" کے نام سے ایک طویل نظم میں قلمبند کیا۔

بدشت سے یہ نوراچلی گئیں لیکن ان کے ساتھی شیخ تہرسی کے مقبرہ میں پناہ گزیں ہو گئے جو مازندرانی انقلاب پسندوں کا مرکز تھا۔ جب انقلاب پسند جماعت زیر کر لی گئی تو قرۃ العین بھی گرفتار کر کے طہران لائی گئیں۔ ناصر الدین شاہ تاجداران کی صورت دیکھ کر مسحور ہو گیا اور کوتوال کی نگرانی میں ایک مکان کے اندر نظر بند کر دیا۔ اس کے بعد جب ۱۸۵۲ء میں جب ناصر الدین پر قاتلانہ حملہ کیا گیا اور بابیوں کی پکڑ دھکڑ شروع ہوئی تو قرۃ العین سے کہا گیا کہ وہ بابی مسلک کو ترک کر دے لیکن یہ نہ مانیں اور آخرکار نہایت جرأت و دلیری سے موت کی سزا قبول کر لی۔

قرۃ العین فارسی کی مشہور شاعر تھیں لیکن ان کا کلام چند غزلوں اور ایک مثنوی کے علاوہ باقی نہ رہا۔

حوالہ: (ناسخ التواریخ - براؤن)

---

۸۶ - کاتبی، نجم الدین علی بن عمر القزوینی ——— وفات: ۶۷۵ھ / ۱۲۷۶ء

ایرانی نژاد فلاسفر تھے اور نصیر الدین طوسی کے شاگرد۔ مسئلہ واجب الوجود پر دلایل قدماء کی حمایت میں ان کی مراسلت نصیر الدین طوسی سے ایک مخطوطہ کی شکل میں اب بھی موجود ہے۔ ان کی خاص تصانیف یہ تھیں:

جامع الدقایق فی کشف الحقایق (منطق و طبیعیات) - عین القواعد فی المنطق والحکم - کتاب حکمۃ العین (طبیعیات) - الرسالۃ الشمسیۃ فی القواعد المنطقیہ۔

حوالہ جات: (تاریخ گزیدہ (قزوینی) - حبیب السیر (خوندمیر))

---

۸۷ - الکلبی، محمد ابو المنذر ہشام ——— وفات (کوفہ): ۲۰۴ھ / ۸۱۹ء

مورخ تھے۔ ابن ندیم نے ان کی ۱۴۴ تصانیف کا ذکر کیا ہے جن میں حسب ذیل کتابیں باقی رہیں:

کتاب النسب الکبیر (قبایل عرب پر) - کتاب نسب الخیل فی الجاہلیۃ - کتاب الاصنام۔

حوالہ جات: (طبقات ابن سعد - تہذیب التہذیب (ابن حجر))

---

۸۸ - (قیام الدین) عبد الباری ابن عبد الوہاب بن عبد الرزاق ——— ولادت: ۱۷۹۵ء / ۱۲۱۰ھ - وفات: ۱۸۷۶ء / ۱۲۹۳ھ

فرنگی محل کے آخری دور میں بڑے مرتبہ کے عالم تھے۔ انھوں نے علوم متداولہ مختلف اساتذہ سے حاصل کئے۔ نہایت وسیع المطالعہ انسان تھے اور پابندی کے ساتھ درس و تدریس میں مشغول رہتے تھے۔ آپ نے ممالک اسلامی کی بھی سیاحت کی اور وہاں کے علماء سے استفادہ کیا۔ فرنگی محل میں ۱۳۱۳ھ میں مدرسۂ نظامیہ قایم کیا جو اب تک موجود ہے۔ آپ کو سیاسیات میں بھی کافی دلچسپی تھی۔ خدام کعبہ، غلافت کمیٹی، جمعیۃ العلماء کے آپ ہی بانی و موسس تھے۔ علی برادران اور گاندھی جی سے آپ کے بڑے وسیع تعلقات تھے۔ آپ کی تصانیف کی فہرست بہت طویل ہے اور علوم متداولہ میں سے کوئی علم ایسا نہیں جس پر آپ نے کوئی تصنیف نہ چھوڑی ہو۔

حوالہ: (تذکرہ علماء فرنگی محل)

۸۹ - عبدالحلیم فرنگی محلی ابن مولوی امین اللہ ـــــــــ ولادت: ۱۲۳۹ھ/۱۸۲۳ء ـــ وفات (حیدرآباد): ۱۲۸۵ھ/۱۸۶۸ء

علماء فرنگی محل میں سے تھے - ابتداء عمر میں قرآن حفظ کرکے ۱۲ سال کی عمر میں علوم درسیہ کی تکمیل سے فارغ ہوگئے - بانڈہ، جونپور اور حیدرآباد کے مدارس عربیہ میں ملازمت کی - اخیر میں حج کے لئے چلے گئے اور حرمین کے اکابر علم وفضل سے علوم عقلی ونقلی کی سند حاصل کی - ۱۲۸۲ھ میں لکھنؤ واپس آئے اور اپنے فرزند مولوی عبدالحئی کے نکاح سے فارغ ہوکر حیدرآباد گئے اور وہیں انتقال کیا - ان کی تصانیف بہت ہیں - خاص خاص یہ ہیں: - القول الاسلم حاشیہ شرح مسلم - کشف الکرم - حل المعاقد - الایضاحات - الفرقان (منطق) - غایۃ الکلام - ثمرالاثمار - (حاشیہ نورالانوار) حاشیہ نفسی -

حوالہ: (تذکرۂ علماء فرنگی محل)

۹۰ - محمد طاہر گجراتی ـــــــــ ولادت (پٹن): ۹۱۲ھ/۱۵۰۶ء ـــ وفات: ۹۸۶ھ/۱۵۷۸ء

ابتدائی تعلیم وطن میں پائی، اس کے بعد مکہ چلے گئے اور وہاں کے اکابر علماء سے حدیث پڑھی اور علی بن حسام الدین المتقی سے قادری اور شاذلی سلسلہ میں بیعت کی - وہاں سے لوٹ کر محمد جونپوری (مدعی مہدویت) کے خلاف ایک محاذ قائم کرکے اس کے اعتقادات کی تردید میں بڑی کوشش کی جب ۹۹۳ھ میں اکبر نے گجرات فتح کیا تو اس نے خود اپنے ہاتھ سے ان کے سر پر پگڑی باندھی اور خان اعظم عزیز محمد کوکلتاش گورنر گجرات نے مہدوی جماعت کے خلاف ان کی بہت مدد کی - جب عبدالرحیم خانخاناں گجرات کا گورنر ہوا تو محمد جونپوری کے متبعین نے محمد طاہر کو بہت پریشان کیا - اور انھوں نے گھبرا کر اکبرآباد کا رخ کیا تاکہ اکبر سے تمام حالات بیان کرے، لیکن احمدین کے راستہ میں انھیں محمد جونپوری کے کسی مرید نے قتل کردیا - محمد جونپوری بوہرہ تھے اور اسی جماعت کے افراد انکے متبع تھے - انھوں نے متعدد تصانیف کیں جن میں خاص خاص یہ ہیں: -

مجمع البحار (لغت قرآن) - المغنی (راویئین احادیث کا تذکرہ) - تذکرۃ الموضوعات (موضوع احادیث پر)

حوالہ جات: (اخبارالاخیار (عبدالحق دہلوی) - سبحۃ المرجان (آزاد بلگرامی) - حدیق الحنفیہ (فقیر محمد) - ابجدالعلوم (صدیق حسن خاں)، اتحاف النبلاء (صدیق حسن)

۹۱ - محمد فاروق چریاکوٹی ابن قاضی علی اکبر

علمی تبحر اور فضل وکمال میں اپنا مثل نہ رکھتے تھے - علوم نقلیہ وعقلیہ اپنے بڑے بھائی مولوی عنایت رسول سے حاصل کئے ہیئت مولوی رحمت اللہ فرنگی محلی سے پڑھی، فقہ مفتی محمد یوسف فرنگی محلی سے اور منطق ابوالحسن منطقی سے - اس کے بعد حجاز گئے اور وہاں کے اکابر علماء سے استفادہ کیا، عربی وفارسی ادبیات کے بھی ماہر تھے - ان کے شاگردوں میں سے بعض نے بہت نام پایا - مولانا شبلی انھیں کے شاگرد تھے -

حوالہ: (علماء ہند - رحمان علی)

۹۲ - محمد مرتضیٰ بن محمد بن عبدالرزاق ابوالفیض الحسینی الزبیدی الحنفی ـــــــــ ولادت (بلگرام): ۱۱۴۵ھ/۱۷۳۲ء ـــ وفات (قاہرہ): ۱۲۰۵ھ/۱۷۹۱ء

بڑے جید عالم تھے - طویل سیر وسیاحت کے بعد قاہرہ میں مقیم ہوگئے (۱۱۶۷ھ/۱۷۵۳ء) - یہاں سے وہ فن حدیث پر لکچر دینے لگے - ان کی شہرت سوڈان اور ہندوستان تک پھیل گئی ـــ ان کی تصانیف میں دو بہت اہم ہیں - ایک تاج العروس جو فیروزآبادی کی قاموس کی شرح ہے - دوسری اتحاف المتقین، غزالی کی شرح - ان کے علاوہ گیارہ رسایل ان کے اور ہیں جن میں ایک "حکمت الاشراق الی کتاب الآفاق" ہے اس میں انھوں نے عربی خط کی تاریخ اور مشہور خطاطوں کا ذکر کیا ہے -

حوالہ جات: (عجائب الآثار (الجبرتی) - الخطوط التوفیقیہ (علی پاشا مبارک))

۹۳ - مُغارق ابوالمُنّاع بن یحییٰ بن ناؤس ـــــــــ وفات (سمرا): ۲۳۲ھ/۸۴۴ء

عہد عباسیہ کے نہایت مشہور مغنی تھے - یہ ایک قصاب کے لڑکے تھے اور عاتقہ بنت شوذا (مشہور مغنی کا غلام - عاتقہ نے ان کو گانا سکھایا اور دربار کے مغنی ابراہیم الموصلی کے ہاتھ فروخت کردیا - موصلی نے ان کو مزید تعلیم موسیقی کی دی اور ہارون الرشید کے دربار تک پہونچا دیا - ہارون الرشید نے ان کا گانا بہت پسند کیا اور اس نے آزاد کردیا - ہارون کے بعد بھی عباسیہ دربار میں ان کی عزت ووقعت بدستور باقی رہی -

یہ بڑا خوش الحان مغنی تھا اور اس کی آواز بڑی پاٹ دار تھی - دربار عباسیہ میں تین مغنی بڑے مرتبہ کے فنکار سمجھے جاتے تھے ابراہیم الموصلی

ابن جامع اور مغارق۔ عہد مامون میں اول الذکر دو مغنیوں کا انتقال ہو چکا تھا اور صرف مغارق باقی رہ گیا تھا۔
مغارق کے زبردست ماہر فن ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ فارابی نے عہد عباسیہ کے صرف دو موسیقاروں کو ایک تسلیم کیا تھا۔ ان میں ایک اسحاق موصلی تھا اور دوسرا مغارق۔

حوالہ: (کتاب الاغانی۔ عقد الفرید)

۹۴۔ مخدوم الملک، مولانا عبداللہ ابن شیخ شمس الدین سلطانپوری ——— وفات: ۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء

ان کے آباؤ اجداد ملتان سے آکر لاہور کے قریب سلطان پور میں مقیم ہو گئے تھے۔ یہ مولانا عبدالقادر سرمندی کے شاگرد تھے اور ابوالفضل کے سخت مخالف۔ ہمایوں نے انھیں صدر الاسلام کا خطاب دیا اور اکبر کے عہد میں بھی کافی اقتدار حاصل رہا۔ بیرم خاں نے انھیں تھانکو الا کا علاقہ جاگیر میں دیا جس کی آمدنی ایک لاکھ تھی اور اکبر نے مخدوم الملک خطاب عنایت کیا۔ جب اکبر نے دین الٰہی جاری کیا تو انھوں نے سخت مخالفت کی اس لئے اکبر نے جلاوطن کر کے مکہ بھیجوا دیا (۹۹۸ھ/۱۵۷۹ء)۔ جب مکہ سے واپس آئے تو ۹۹۹ھ/۱۵۸۱ء میں انھیں زہر دیا گیا اور وہ مر گئے۔ ان کی تصانیف کی فہرست یہ ہے:

عصمت الانبیاء۔ منہاج الدین (سیرۃ نبوی)۔ حاشیہ شرح ملا جامی۔ شرح شمایل ترمذی۔

حوالہ جات: (منتخب التواریخ (بدایونی)۔ مآثر الامراء (شاہ نواز خاں اورنگ آبادی)۔ آئین اکبری)

۹۵۔ میر طاہر محمد نسیانی ابن سید حسین ——— ولادت: ۹۹۰ھ/۱۵۸۱ء

اصل وطن قندھار تھا لیکن جب ۱۰۰۳ھ/۱۵۹۴ء میں فارسیوں نے قندھار پر حملہ کیا تو یہ اپنی تعلیم پوری کرنے کے لئے ٹھٹھا آ گئے (اس وقت ان کی عمر ۲۵ سال کی تھی) اور مولانا اسحاق کے شاگرد ہو گئے۔ جب ہمایوں شیر شاہ سے شکست کھا کر سندھ پہونچا تو طاہر محمد کے نانا عمر شاہ اور ماموں داؤد نے اس کی بہت مدد کی اور اس نے ایک پروانہ لکھ دیا کہ اگر میں کامیاب ہوا تو دو تہیلا ان کی جاگیر میں دیدیا جائے گا، لیکن محمود خاں گورنر بھکر نے ان دونوں کو قتل کرا دیا اور ان کے خاندان کے باقی افراد احمد آباد بھاگ گئے۔

طاہر محمد نے تاریخ طاہری کے نام سے سندھ کی ایک بڑی اچھی تاریخ لکھی جو ۱۰۱۳ھ/۱۶۰۴ء میں انھوں نے تمام کی تھی یہ کتاب انھوں نے شاہ محمد بیگ عادل خاں کے نام سے منسوب کی ہے جو ارغون خاندان کے گورنر قندھار کا بیٹا تھا۔ اس کتاب میں سمرا، سما، ارغون اور ترخان خاندانوں کے حالات درج ہیں۔

حوالہ: (اسلامی ہند۔ نیاز فتحپوری)

۹۶۔ میر محمد معصوم المتخلص بہ نامی ——— (دسویں صدی ہجری)

یہ بھکر (سندھ) میں پیدا ہوئے، باپ کا نام صفائی حسینی کربائی تھا۔ یہ اچھے تاریخ داں اور مشہور خوشنویس تھے۔ عہد اکبر و جہانگیر میں اپنے جاتے تھے، اکبر نے انھیں بھکر میں جاگیر بھی دی تھی۔ انھوں نے سندھ کی ایک بڑی جامع تاریخ ۱۰۰۰ھ/۱۶۰۰ء میں مرتب کی جس کا نام تاریخ معصومی ہے۔ اس کتاب میں راجہ داہر (فرمانروائے سندھ) سے لیکر اکبر کے عہد تک کی تاریخ سندھ قلمبند کی ہے۔ بعد کے مورخین نے اس کتاب سے کافی استفادہ کیا۔

حوالہ: (اسلامی ہند۔ نیاز فتحپوری)

۹۷۔ نظام بدخشی ——— وفات (اودھ): ۹۹۲ھ/۱۵۸۴ء

اپنے وطن بدخشاں میں مولانا سلام الدین ابراہیم اور ملا سعید سے فقہ و حدیث پڑھی اپنے عہد کے چند فضلاء میں شمار کئے جاتے تھے۔ بعد کو شیخ حسین خوارزمی کے مرید ہوئے اور سلیمان والی بدخشاں نے قاضی خاں کا خطاب دیا۔ کچھ دن بعد یہ ہندوستان آئے اور اکبر کے دربار میں باریاب ہوئے اور پروانچی کا عہدہ تفویض کیا گیا۔ پھر ایک ہزاری منصب دیا گیا۔ چند فوجی مہموں میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد غازی خاں کا خطاب ملا اور ۷۰ سال کی عمر پا کر اودھ میں انتقال کیا۔ اس کی خاص تصنیف "عقاید نسفی" کی شرح ہے۔ تصوف پر انھوں نے بعض رسایل لکھے تھے۔

حوالہ جات: (منتخب التواریخ (عبدالقادر بدایونی)۔ مآثر الامراء (شاہ نواز خاں)۔ دربار اکبری (آزاد)۔ آئین اکبری)۔

۹۸ نظامی، حسن، صدرالدین محمد بن حسن ——— ولادت (نیشاپور) : (چھٹی صدی ہجری)

سورخ تھے۔ نیشاپور میں پیدا ہوئے اور شیخ محمد کوفی ہدایت کے مطابق تکمیل علم کے لئے غزنی گئے۔ یہاں یہ سخت بیمار ہوگئے، دہلی کا رُخ کیا اور پٹھان فرمانرواؤں کے دربار سے وابستہ ہوگئے۔ ۶۰۲ھ میں اپنی مشہور تاریخ تاج المآثر لکھنا شروع کی۔ جو محمد بن سام، قطب الدین ایبک اور شمس الدین التمش کی تاریخ ہے۔ اس میں فتح اجمیر (۵۸۷ھ) سے لیکر ناصرالدین محمد کے گورنر لاہور مقرر ہونے کے وقت (۶۱۴ھ) تک کے حالات درج ہیں۔ یہ کتاب تاریخی، ادبی حیثیت سے بھی بڑا مرتبہ رکھتی ہے۔

حوالہ : (میرخوند)

۹۹ - نعمت اللہ بن حبیب اللہ نہروی ——— (دسویں صدی ہجری)

ایرانی مورخ تھے۔ ان کے والد ۳۰ سال تک اکبر کے ملازم رہا اور یہ خود گیارہ سال تک جہانگیر کے وقایع نویس و مورخ رہے۔ اس کے بعد وہ خانجہاں کے ملازم ہوگئے اور دکن کی مہم میں اس کے ساتھ گئے۔ لیکن اسی زمانہ میں سامانہ کے سلیم خاں کاکر کے بیٹے میاں ہیبت خاں سے ان کی شناسائی ہوگئی اور اس نے نعمت اللہ کو خانجہاں کی حکومت کی تاریخ لکھنے پر آمادہ کیا۔ انھوں نے ۱۰۲۱ھ میں بمقام ملکاپور یہ تاریخ لکھنا شروع کی اور دوسرے سال ختم کردی۔ اس کتاب کا نام تاریخ خانجہانی ہے۔ افغانوں کی تاریخ کے ساتھ ساتھ انھوں نے بہلول لودی۔ شیرشاہ سور۔ اور خانجہاں لودی کے حالات بھی بہت مفصل قلمبند کئے۔ اخیر میں افغان شیوخ کے حالات بھی درج کئے۔ اسی کتاب کا خلاصہ بعد کو مخزن افغانی کے نام سے کہا گیا۔

حوالہ : (دائرۃ المعارف)

۱۰۰ - نعمت خان عالی، مرزا نورالدین محمد ——— وفات (دہلی) : ۱۱۲۲ھ

یہ شیرازہ کے مشہور طبیب خاندان کے فرد تھے۔ یہ ہندوستان میں پیدا ہوئے اور شاہجہاں کے عہد میں "داروغۂ جواہرخانہ" مقرر ہوئے۔ اورنگ زیب ان کا بڑا قدردان تھا جس نے ان کو عفت خاں۔ مقرب خاں اور دانشمند خاں کے خطابات سے ممتاز کیا۔ ان کا تخلص عالی تھا اور نظم و نثر فارسی کے بڑے ماہر تھے۔ نظم و نثر میں ان کی متعدد تصانیف پائی جاتی ہیں : جن میں خاص خاص یہ ہیں : وقایع حیدرآباد یا وقایع نعمت خان عالی (اورنگ زیب کے معاصرۂ حیدرآباد کے واقعات) جنگ نامہ (اورنگ زیب کے آخری عہد کی تاریخ جب اس کے لڑکے باہم کر برسرپیکار تھے) بہادر شاہ نامہ (شاہ عالم بہادر شاہ کے ابتدائی دو سال کی تاریخ) مثنوی حسن و عشق (فتاحی کی مثنوی "حسن و دل" کے جواب میں)۔ راحت القلوب (اپنے بعض ہمعصروں پر طنز و مزاح)۔ ہجو حکماء (بعض اطباء کی نااہلی کا خاکہ)۔ خوان نعمت (طباخی)۔ رقعات (بنام مرزا مبارک اللہ ارادت خاں و مرزا محمد سعید)۔ دیوان۔ مثنوی بغیر نام کی (جس میں صوفیہ کے اخلاقی نظریوں کا ذکر کیا گیا ہے)۔

حوالہ : (حمزہ اللہ عامرہ)

۱۰۱ النہروالی (نہروانی)، قطب الدین محمد بن علاؤالدین احمد ——— ولادت (مکہ) : ۹۱۶ھ — وفات : ۹۹۰ھ

ان کے والد نہروالہ (گجرات) سے مکہ ہجرت کرگئے۔ اور یہیں یہ پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم باپ سے حاصل کی اور پھر ۹۳۴ھ میں قاہرہ چلے گئے۔ یہاں سیوطی کے تلامذہ سے تکمیل علم کی۔ ۹۶۶ھ میں مدرسہ اشرفیہ (مکہ) میں مدرس ہوگئے۔ ۹۷۵ھ میں استنبول گئے اور وہاں سے لوٹ کر مدرسہ سلیمانیہ میں مدرس ہوگئے (۹۸۵ھ) اور پھر مکہ کے مفتی ہوگئے۔ انھوں نے تاریخ و ادب پر متعدد تصانیف کیں۔ بعض کا نام یہ ہے : تمثال الامثال (ادبیات)۔ التمثیل والمحاضرہ (ادبیات) کنزالاسماء (فن معمہ)۔ برق الیمانی فی الفتح العثمانی۔ (ترکی فتوحات کی تاریخ)۔ الاعلام (تاریخ مکہ)

حوالہ جات : (الشقایق النعمانیہ۔ نورالوافر۔ ریحانۃ الالباء (خفاجی))

۱۰۲ - یحییٰ بن احمد بن عبداللہ سرہندی ——— (ساتویں صدی ہجری)

ان کے حالات زندگی نامعلوم ہیں۔ صرف اتنا پتہ چلتا ہے کہ وہ مبارک شاہ (سید خاندان کے حکمراں) سے وابستہ تھے اور اسی کے مفصل حالات انھوں نے اپنی مشہور کتاب "تاریخ مبارک شاہی" میں لکھے ہیں۔ اس تاریخ کی ابتدا محمد سام غوری کے زمانہ سے ہوتی ہے۔ فیروز شاہ تک کے حالات دوسری تاریخوں کی مدد سے لکھے اور بعد کے واقعات معتبر روایات اور خود اپنے مشاہدہ کی بنا پر تحریر کئے۔ یہ سید خاندان کے حالات کی یہی ایک معتبر تاریخ ہے جو طبقات اکبری، تاریخ فرشتہ، اور عبدالقادر بدایونی کا بھی ماخذ ہے۔

(اسلامی ہند - نیاز فتحپوری)

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۴۸ء
جنوری، فروری

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے۔ جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی

قیمت دو روپے
علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۴۹ء
جنوری، فروری

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیئے

قیمت دو روپے
علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۰ء
(حسرت نمبر)

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اہل مذاق سے کیا گیا ہے کہ آپکو کلیات حسرت کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرقع معلوم ہوگا

قیمت دو روپے علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۴۶ء
فروری، مارچ

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم ارباب نگار کے مضامین پر مشتمل ہے قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۱ء
جنوری، فروری

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں ارنسٹ ہنڈی کی مشہور عالم کتاب ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ اقتباس ہے جس میں اس نے ایران مصر، عراق فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے ساتھ ہی بتایا گیا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اسکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت عہ

علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۳ء
جنوری، فروری

(داغ نمبر)

جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رام پور، قیام حیدرآباد کے زمانہ کے علاوہ ان کی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور انکے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۴۳ء
جنوری

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت عہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۴ء

(فرمان روایان اسلام نمبر)

یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لیکر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر انکے اسباب عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ دراصل تاریخ کی کتاب ہے۔ جوہر کلچے پڑھنے کے پاس ہونا چاہیئے۔ قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۵ء

(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر مع تتمہ)

جس میں اسلامی علوم و فنون پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات دے کر ان کی علمی خدمات اور تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۲۸ء

(موسی نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مومنین کے مطالعہ کے لیے اس پڑھنا از بس ضروری ہے قیمت دو روپے

مکتوباتِ نیاز

(تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام دلچسپ و جذبات نگاری، سلاست بیان، انگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۸ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے

قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

(انگریزی سے ترجمہ کیا ہوا ایک درسی مضامین شامل ہیں۔

(۱) چند قدیم فلاسفہ کے عقائد کی اور ان کے ساتھ۔

(۲) ہماری کائنات جس میں ہم رہتے ہیں اور جس کے متعلق ہم کچھ نہ کچھ جانتے ہیں

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے باوجود طریقت و خانقاہ کے عوام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرتی اور اجتماعی حیات کے لیے کس درجہ مہلک قاتل ہے، زبان، پلاٹ، انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے مشہور خیالات کا لکھا ہوا افسانہ جس کی دلکش تمام نقش بخش کیفیات اس مجموعہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ آپ کو نہیں مل سکتی

تازہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

جذباتِ بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے ان کی اپنی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے، اردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول ڈاک

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان، تخیل، اس کی نزاکت بیان اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت دو روپے

علاوہ محصول ڈاک

مذہب

حضرت نیاز کا وہ [illegible] جس میں انھوں نے [illegible] اور [illegible] کے متعلق کیا ہے اور [illegible] کو [illegible] ہمارے [illegible] ہے [illegible] پابندی کا [illegible] علاوہ محصول

مذاکراتِ نیاز

[illegible] کی ڈائری جو ادبیات و تنقید [illegible] کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن بہت عمدہ نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول ڈاک

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ نہرت معنی ہے۔ ایران و ہندوستان کا اثر جو شاعری پر ہمارے زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تبصرہ اردو غزل گوئی کی صدیہ عہد ترقی، نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، فنون ادبیہ و حقیقت نگاری

قیمت چار روپے علاوہ محصول

فراست الید

مؤلفہ نیاز فتحپوری

اس کے [illegible] ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی [illegible] کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، [illegible] عروج و زوال، صحت و حیات [illegible] بیماری، شہرت و ننگ نامی پر کی پیشین گوئی [illegible] سکتا ہے

[illegible] روپیہ علاوہ محصول

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۲ر

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ چھ آنے (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان کے ملک میں جو درجۂ قبولی حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد ملعابین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس اڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے اڈیشنوں میں نہ تھے اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و تالیف کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے جس میں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی علمی، اخلاقی اور نفسیاتی لحاظ نہایت بلند انشائیاں اور پرزور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

تیسرا اڈیشن

تیسرا اڈیشن

قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور دلکشی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ بجائے ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس اڈیشن میں افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے اڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشاء کا لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنہیں حضرت نیاز کی انشاء نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات کا

مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ و کرامت (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) یہ سب علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یوسف ہاروں (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) کوہ طور (۱۵) لقمان (۱۶) عالم برزخ (۱۷) یاجوج ماجوج (۱۸) ہاروت ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ

ضخامت ۲۲۰ صفحات کاغذ سفید و بیز

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے

ترغیبات جنسی یا شہوانیات (مجلد)

اس کتاب میں نواشی کی تمام نظری اور غیر نظری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ نواشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپکو حیرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ایڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۵۶ء

"خدا نمبر"

(مع متعدد تصویروں، نقوش اور خاکوں کے)

چھ حصوں میں تقسیم ہوگا:

حصۂ اول: مذہب کا خیال کب اور کیوں پیدا ہوا اور عہدِ تاریک سے گزر کر یہ مہذب اقوام نے خدا کا تصور کس کس طرح کیا

حصۂ دوم: ملل قدیمہ اور سامی اقوام میں، مصری، بابلی و آشوری، فنیقی، یہودی، عیسائی مذاہب اور اسلام کا تقابلی مطالعہ۔

حصۂ سوم: آریہ مذاہب میں یونانی، رومی، ٹیوٹانی بکیلٹی، فارسی، ہندو، بودھی، چینی اور سکھ اقوام نے خدا اور مذہب کو کس نقطۂ نگاہ سے دیکھا۔

حصۂ چہارم: امریکہ کی مایا اور دوسری غیر مہذب اقوام نے خدا کو سمجھنے کی کیا صورتیں اختیار کیں۔

حصۂ پنجم: عقل و مذہب کی جنگ، روایت و درایت کا تصادم اور الحاد و لامذہبیت کا ارتقاء۔

حصۂ ششم: تمام ابواب پر مفصل تبصرہ۔

"نیجر "نگار"

بعض کمیاب کتابیں

(ان کتابوں پر کمیشن نہیں مل سکے گا)

کتاب دول الاسلام - شمس الدین - - - - صفحہ ۱۵۰	وفیات الاعیان تاریخ ابن خلکان - ۲ جلد - قاضی احمد بن خلکان صفحہ ۱۵۰
عیون الانباء فی طبقات الاطباء - ابی العباس احمد ۲ جلد صفحہ ۱۵۰	فتوح الشام - - ابو عبداللہ واقدی - - - - - - - - ۲
تذکرۃ الحفاظ - ۴ حصے - شمس الدین ابی عبداللہ ذہبی - صفحہ ۱۵۰	عقد الفرید ۳ جلدیں - شہاب الدین احمد - - - - - صفحہ ۳۵۰
کتاب الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب - ۲ حصص ابی عمر یوسف - - صفحہ ۳۰	صواعق محرقہ - - - - - - - - - - - - ۱
تاریخ الخلفاء - - - - جلال الدین سیوطی - - - - - ۲	شرح نہج البلاغۃ - ابی الحدید المعتزلی - ۲ جلد مطبوعہ ایران - صفحہ ۱۵۰
تاریخ ابوالفداء - ۴ حصے - عماد الدین اسماعیل ابی الفدا - صفحہ ۳۵۰	دیوان حسان بن ثابت - - - - - - - - - - صفحہ

فارسی

العقد الثمین ... طرفہ و زہیر امرالقیس ... ۷ے
دیوان ابوالعتاہیہ - ابواسحٰق اسمٰعیل ... عنہ
شرح دیوان الحماسہ - ۲ حصص - شارح ابی زکریا یحییٰ ... ۲۵ے
شرح مقامات حریری - ۲ حصص - شارح ابی عباس احمد ... ۳۵ے
دیوان متنبی مع شرح ... مترجمہ ذوالفقار علی ... عنہ
القاموس ... ۴ حصے - مجدالدین محمد ... ۴۰ے
مجمع البحرین ... ۴ حصے - فخرالدین ... ۲۵ے
گلستان ہند ... درگا پرشاد ... ۱۵ے
جہاں کشائے نادری مصور، مرزا مہدی خاں ... عنہ
جہانکشائے نادری ... ۷ے
سفرنامہ شاہ ایران - مصور (یورپ) ... عنہ
انفاس العارفین ... شاہ ولی اللہ ... ۷ے
تذکرہ خزینۃ الاصفیا - غلام سرور ... ۲۵ے
گلستان مسرت - کرم خوردہ - عبدالرحمٰن ... عنہ
تذکرہ دولت شاہ سمرقندی ... ۷ے
صبح گلشن (تذکرہ) ... علی حسن خاں ... ۲۵ے
وقائع نعمت خان عالی المشاہ حسن و عشق ... ۵ے
جذبۃ القلوب الی دیار المحبوب - مصنفہ شیخ عبدالحق - قلمی کتوب ... ۳۵ے
تاریخ مشتمل بر حالات نادر شاہ - قلمی ... عنہ
انتخاب سیر البلاد - قلمی ... ۲۵ے
کلیات قاآنی ... مرزا حبیب شیرازی ... ۲۵ے
کلیات جامی ... عبدالرحمٰن ... ۷ے
کلیات ظہیر فاریابی ... للعہ
کلیات اسمٰعیل اصفہانی ... ۷ے
دیوان حافظ ... مطبوعہ بمبئی ... ۲۰ے
دیوان عرفی ... جمال الدین ... للعہ
دیوان نعمت خان عالی ... ۵ے
دیوان ہلالی مجنی ... ۵ے
دیوان مظہر جانجاناں ... ۷ے
برہان قاطع ... محمد حسین مطبوعہ ٹائپ ... ۶۰ے

قاطع برہان ... میرزا اسداللہ خاں ... ۵ے
غیاث اللغات ... ۱۰ے
منتخب اللغات ... ۸ے
تاج التواریخ ۲ جلد - مرتبہ نصرت علی ... ۵ے
تاریخ الاسلام ... محمد احسان اللہ ... ۱۲ے
تواریخ ڈھاکہ مصور ... رحمان علی ... ۱۰ے
تذکرہ بہار گلشن کشمیر ۲ جلد مصور (تذکرہ شعراء کشمیر پنڈتان) ... ۵ے
تاریخ فرشتہ - ۲ جلد - محمد قاسم ... ۲۵ے
نگارستان فارس - محمد حسین آزاد ... ۷ے
تذکرہ گل رعنا ... عبدالحی ... ۱۰ے
تذکرہ سخن شعراء - عبدالغفور ... ۱۲ے
تذکرہ سراپا سخن - میر حسن علی ... ۱۰ے
تذکرہ کاملان رام پور - احمد علی خاں ... ۱۰ے
صحیفہ زریں - مرتبہ نولکشور پریس ... للعہ
البرامکہ ... محمد عبدالرزاق ... ۱۰ے
کلیات میر - مطبوعہ قدیم ... ۱۰ے
دیوان ولی - مرتبہ حیدر ابراہیم ... ۷ے
دیوان شرف - آغا ہجو ... ۷ے
کلیات سودا - میرزا رفیع ... ۷ے
دیوان تسلیم - منشی امراللہ تسلیم ... للعہ
کلیات نظیر اکبرآبادی ... ۵ے
کلیات ناسخ ... شیخ امام بخش ... ۷ے
مراۃ الغیب ... امیر مینائی ... ۵ے
محامد خاتم النبیین ... " ... للعہ
گلدستہ ... مرزا محمد ہادی عزیز ... للعہ
قصاید عزیز ... " ... للعہ
کلیات ناسخ ... شیخ امام بخش ناسخ قلمی ... ۵ے
سیرۃ النعمان ... شبلی نعمانی ... ۵ے
واقعات انیس ... میر مہدی حسن ... ۷ے
روح نظیر ... مرتبہ محمود ... ۵ے

نگار بک ایجنسی لکھنؤ
محصول ڈاک ذمہ خریدار

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی
آٹھ روپیہ چودہ آنے میں دی، پی موکا جس میں

نگار

کہ آپ کا چندہ اگست میں ختم ہو گیا اور ستمبر کا "نگار"
سالنامہ ۱۹۵۶ء کی قیمت (مع مصارف رجسٹری) بھی شامل ہے

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۸ | فہرست مضامین اگست ۱۹۵۶ء | شمار ۲

ملاحظات ۳
فیض ۔ ترقی پسندوں میں ایک ممتاز شاعر ... تاظر انصاری ۵
اکبری عہد کے تراجم ... (پروفیسر) قاضی محمد ابراہیم ۱۷
ڈاکٹر فاروقی اور میر تقی میر ... کنور لطافت علی خاں ۲۰
عنترہ بن شداد ... محمود علی ۲۶
فخر الدین ابراہیم عراقی ... ڈاکٹر سعید حسن (الہ آباد یونیورسٹی) ۳۲
کیوپڈ و سائکی (نظم) ۳۹
فن تحریر کی تاریخ ... محمد اسحاق صدیقی ۴۰
وعدہ شکن ... محشر عابدی ۴۴
گاہے گاہے باز خواں ۴۹
منظومات ... دل شاہجہانپوری ۔ فکی لکھنوی ۔ شفقت کاظمی
انجم رضوانی ۔ بشر نواز ۔ ندیم جعفری ۔ لیث قریشی پاکستانی ... ۵۳

ملاحظات

فیصلۂ کشمیر کی تنہا امکانی صورت

ہندوستان و پاکستان کی راہ میں نزاع کشمیر ایک ایسا سنگ گراں ہے جس کے ہٹائے بغیر دونوں کے تعلقات کا خوشگوار ہونا ممکن نہیں لیکن بدقسمتی سے اس کے ہٹنے کی بظاہر کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی۔

ہر چند ایسے مسایل میں رواداری یا ایثار کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا، تاہم کبھی کبھی مفاہمت کی ایسی صورتیں بھی پیدا ہو جاتی ہیں جو استحقاق سے کم اور مصلحت سے زیادہ قریب ہوتی ہیں، لیکن بدقسمتی سے کشمیر کے معاملہ میں استحقاق و مصلحت دونوں اس طرح الجھ کر رہ گئے ہیں کہ ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔

تقسیم ہند کے وقت ایک عام اصول تسلیم کر لیا گیا تھا کہ جس حصۂ ملک میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے وہ پاکستان کو ملنا چاہئے اور جہاں ہندو آبادی زیادہ ہے وہ ہندوستان کے پاس جانا چاہئے، چنانچہ ہندوستان کی تقسیم زیادہ تر اسی اصول کو سامنے رکھ کر عمل میں آئی۔ لیکن ریاستوں کے بارے میں اصول کی نوعیت بدلی ہوئی تھی اور اس کا فیصلہ رئیس کے ہاتھ میں دیدیا گیا تھا کہ وہ پاکستان یا ہندوستان میں جسکو چاہے منتخب کرلے۔ ہر چند یہ کوئی معقول اصول نہ تھا کیونکہ اس طرح پبلک کی رائے کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا تھا، تاہم اس خیال سے کہ ہندوستانی ریاستیں قدرتاً ہندوستان ہی کے ساتھ اپنا شمول چاہیں گی اور پاکستانی ریاستیں پاکستان کے ساتھ، اس کو تسلیم کر لیا گیا تھا اور صرف دو ریاستیں ایسی تھیں جن کے بابت کوئی نزاع پیدا ہو سکتی تھی۔ ایک حیدرآباد جہاں اکثریت ہندوؤں کی تھی اور حکومت مسلم خاندان کی، دوسرے کشمیر جہاں اکثریت مسلمانوں کی تھی اور حکومت ہندو خاندان کی۔ کہا جاتا ہے کہ پٹیل نے اس قضیہ کو یوں طے کرنا چاہا تھا کہ حیدرآباد ہندوستان میں شامل رہے اور کشمیر پاکستان میں، لیکن غالباً

حیدرآباد اور پاکستان دونوں نے غلطی سے اس کو تسلیم نہیں کیا اس کے بعد حالات نے کچھ ایسا رُخ بدلا کہ حیدرآباد کو تو ہندوستان میں شامل ہونا پڑا اور کشمیر کے مسئلہ کو پاکستانی خلہ نے اتنا اُلجھا دیا کہ مونٹ بیٹن کو اس کے فیصلہ کا انحصار وہاں کی رائے عامہ پر رکھنا پڑا۔ اور یہی رائے عامہ اب وہاں ایک عقدۂ لاینحل ہو کر رہ گئی ہے۔

رائے شماری کو اصولاً ہندوستان و پاکستان دونوں اس کو تسلیم کرتے ہیں، لیکن کوئی ایسا طریق کار جو دونوں کو مطمئن کر سکے ابھی تک متعین نہیں ہو سکا ان حالات کا مطالعہ ہندوستان و پاکستان نے بالکل دو مختلف زاویوں سے کیا، پاکستان نے یہ سوچکر کہ وہاں کی آبادی مسلمان ہونے کی حیثیت سے اسی کے حق میں رائے دے گی اور سیکورٹی کونسل سارا وقت امید افزا انتظار میں بسر کر دیا، لیکن ہندوستان نے یہ سمجھ کر کہ سیکورٹی کونسل کوئی دو ٹوک فیصلہ جلد نہ کرے گی، مزید انتظار کئے بغیر اپنی کامیابی کے لئے نفسیاتی تدابیر بھی شروع کر دیں اور اپنی خوش نیتی ثابت کرنے اور وہاں کے عوام کو اپنی طرف مائل کرنے کے لئے نہایت وسیع پیمانہ پر ان کی اصلاح و ترقی پر بیدریغ روپیہ صرف کرنا شروع کیا اور وہاں کے تعلیمی، اقتصادی اور صنعتی و تجارتی سطح کو اتنا بلند کر دیا کہ وہی کشمیر جو ڈوگرا راج میں صرف بھوکے ننگے جاہل مسلمانوں کا ملک تھا، آج زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کی راہ پر گامزن نظر آتا ہے۔ سب سے اہم سوال ایک ملک کی آبادی کے لئے غذا کا ہوا کرتا ہے، اور کشمیر قلت پیداوار کی وجہ سے بہت بدحال تھا، لیکن آج وہاں غذا کی فراوانی کا یہ عالم ہے کہ چاول جو وہاں کی خاص غذا ہے سوا روپیہ سیر کی جگہ چھ آنے سیر میں سب کو مل رہا ہے۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ وہاں کی آبادی پر ان باتوں کا کتنا اثر ہوا ہوگا اور تمرد تا ہندوستان کے ساتھ ان کی ہمدردیاں کتنی بڑھ گئی ہوں گی ۔ اسی کے ساتھ انھوں نے جب آزاد کشمیر کی حالت کا مطالعہ کیا ہوگا اور وہاں کی تکالیف و مشکلات کا حال سُنا ہوگا تو کیا انھوں نے اس سے یہ نتیجہ نہ اخذ کیا ہوگا کہ پاکستان صرف اسلامی حکومت کا مدعی ہے لیکن اسلامی اخوت و انسانیت، اسلامی فہم و فراست سے اسے کوئی واسطہ نہیں۔ پاکستان غالباً یہ سمجھتا ہے کہ محض مسلمان ہونا ایسا قوی رشتہ ہے کہ کشمیر اس کی خاطر ہر قسم کی قربانی پر آمادہ ہو جائے گا، لیکن اس نے یہ نہیں سوچا کہ جب خود اسکی طرف سے غیر مسلمانہ کردار کا اظہار ہو رہا ہے تو محض مذہب کا خیال اہل کشمیر کو اسکی طرف مائل نہیں کر سکتا۔

حال ہی میں پنت جی کے بیان نے پاکستان میں پھر غم و غصہ کی لہر دوڑا دی ہے اور اس نے ہندوستان کے خلاف احتجاج بھی کیا ہے لیکن بقول سول ملٹری گزٹ لاہور کے وہ خود اپنے گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتا کہ وہ کس منہ سے اپنے آپ کو وادیٔ کشمیر کا مستحق قرار دیتا ہے جبکہ اسکے طرز عمل نے آزاد کشمیر کو تمام کردہ بنا رکھا ہے اور وادیٔ کشمیر کی آبادی مشکل ہی سے اس تلخ تجربہ سے گزرنے پر اپنے آپ کو آمادہ کر سکتی ہے ۔ ان حالات میں پاکستان کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہیں کہ وہ یا تو سیکورٹی کونسل کی پناہ ڈھونڈھے یا امریکہ کی فوجی امداد کے بھروسہ میں فوجی اقدام کرے، لیکن یہ دونوں باتیں فی الحال پوری ہوتی نظر نہیں آتیں، کیونکہ سیکورٹی کونسل خود یہ نہیں چاہتی کہ ہندوستان و پاکستان کے تعلقات خوشگوار رہیں اور جنیوا کانفرنس نے جو فضا اس وقت پیدا کر دی ہے وہ جنگ کی راہ میں بھی حایل ہوگی، لیکن بالفرض یہ بھی ضروری ہے کہ کسی نہ کسی طرح ہندوستان و پاکستان کے تعلقات میں خوشگواری پیدا کی جائے اور اسکی صورت سوا اس کے کوئی نہیں کہ یہ دونوں ملک خود ہی کوئی راہ صلح و آشتی کی پیدا کریں اور یہ راہ صرف یہی ہو سکتی ہے کہ کشمیر کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور اس وقت جس حصہ پر جس کا قبضہ ہے وہ اس پر بدستور قابض رہے ۔ اس کے سوا نزاع کشمیر کے دور ہونے کی کوئی دوسری صورت نہیں ہے اور آج نہیں تو کل یہی ہونا ہے اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ اس میں تاخیر کی جائے اور خواہ مخواہ رائے شماری پر اصرار کر کے اسکو التوا میں ڈالا جائے

خان عبدالغفار خاں اور حکومتِ پاکستان

پاکستان میں مشرقی و مغربی صرف دو وحدتیں قایم رکھنے کا خیال اس میں شک نہیں اچھا ہے اور اس سے نظم و نسق کے مصارف میں یقیناً بہت کمی ہو جائے گی، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا اس سے وہاں کی صوبائی عصبیت بھی دور ہو سکے گی جو اس وقت پاکستان کا شدید ترین دردِ سر ہے ؟

جس حد تک مشرقی بنگال کا تعلق ہے، معاملہ خاصا صاف ہو چکا ہے اور اصولاً یہ بات مان لی گئی ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ خود مختاری دیدی جائے گی، لیکن سندھ، سرحد اور پنجاب کے عناصر میں اتحاد و یکرنگی پیدا ہونا مشکل ہے۔ چنانچہ خان عبدالغفار خاں کے اس مطالبہ نے کہ جب تک سرحد کی آبادی کی صحیح رائے معلوم کر لی جائے مغرب میں ایک وحدت کا قیام مناسب نہیں۔ تشویش پیدا کر دی ہے اور اس کا نتیجہ غالباً یہ ہوگا کہ خان عبدالغفار خاں پھر نظر بند ہو جائیں گے اور وہاں کی حکومت ایک اور نئی اُلجھن میں گرفتار ہو جائے گی ۔

فیض

ترقی پسندوں میں ایک ممتاز شاعر

فیض نہ صرف حریت پسند انسان ہیں بلکہ وہ سیاست داں بھی ہیں اور زندگی کے حقایق کے رازداں بھی۔ وہ ادبی دنیا میں ایک شاعر کی حیثیت سے جلوہ گر ہوئے ہیں۔ لیکن اُن کی شاعری بازاری نہیں ہے بلکہ وہ اپنے محبوب کو بھی کارزارِ ہستی میں اپنے دوش بدوش جنگ آزما ہونے اور محاذ ہائے سرگرمیوں میں مصروف رہنے کی تلقین کرتے ہیں، چنانچہ کہتے ہیں ؎

اب بھی دلکش ہے ترا حسن مگر کیا کیجئے
یہ بھی جاتی ہے اِدھر کو بھی نظر کیا کیجئے

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
اور بھی دکھ ہیں زمانہ میں محبت کے سوا

مجھ سے پہلی سی محبت مری محبوب نہ مانگ

پھر تلخیِ ایام کو یادِ محبوب سے زیادہ شیریں تسلیم کرتے ہوئے اپنے محبوب سے خطاب کرتے ہیں :-

تمہارے ہاتھ پہ ہے تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دلداریِ عروسِ سخن

تمہارا حسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک
تمہارا دم ہے تو دمساز ہے ہوائے وطن

اگرچہ تنگ ہیں اوقات سخت ہیں ایام
تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیِ ایام

سلام لکھنؤ اے خانۂ تمہارے حسن کے نام

نقشِ فریادی کے مقدمہ نگار جناب ام راشد نے فیض کے متعلق کتنی درست رائے ظاہر فرمائی ہے :

"فیض ایک ایسا شاعر ہے جو رومان اور حقیقت کے سنگم پہ کھڑا ہے"

وہ رومان پسند ہیں، عاشق ہیں لیکن عیاش نہیں۔ وہ اپنی شاعری کو عیش پسندوں کی تفریحِ طبع کا ذریعہ نہیں بناتے۔ اُن کا پہلا دورِ شاعری عشق کی خواب آلود کیفیات کا حامل ہے۔ لیکن ہیجانی جنسی بھوک اور آسودگیِ جسم کے جذبات سے مبرا ہے۔ پھر وہ دور آیا کہ اُن کے عشق کا رجحان کائناتِ انسانی کے دکھ درد اور رنج والم کی طرف مڑا۔ انھوں نے اصلِ آدم کی فریاد اپنے گوشِ ہوش سے سُنی۔ موجودہ دور کے انسانوں کی پریشانیاں، اُن کے مصائب اور اُلجھنیں محسوس کیں۔ اسی عشق نے اُن کے دل میں بیکس و مظلوم انسانوں کا درد، حمایت اور ہمدردیاں بھر دیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کی عشقیہ شاعری میں ہوا و ہوسی کا عنصر نام کو بھی نہیں پایا جاتا۔ اُن کی شاعری جنسی جذبات کو برانگیختہ کرنے کا باعث نہیں ہے۔ بلکہ عشق و زندگی کے اسرار و رموز کی حامل ہے اسی لئے حضرت نیاز فتحپوری نے بجا طور پر فیض کو ایک "ہوش و گوش والا شاعر" فرمایا ہے۔ کیونکہ اُن کی نظر لذت کشی ہوش و گوش ہے۔ ہوا و ہوسی اور آسودگیِ جسم نہیں۔ اسی لئے میری رائے میں وہ ترقی پسندوں میں ممتاز شاعر ہیں۔

ہر مبتدی شاعر کی طرح اپنی شاعری کا آغاز فیض نے غزل گوئی ہی سے کیا (وہ دنیائے شعر و سخن میں ایک غزل گو شاعر کی حیثیت سے نمودار ہوئے اور عروسِ غزل کو ایسا سنوارا اور نکھارا، اُس کے لوچ پک کچھ اس انداز سے درست کئے کہ صفِ اول کے شعراء میں اپنا مقام پیدا کر لیا۔ غم جاناں کے ساتھ اُن کے یہاں غمِ دوراں کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ اُس حساس فنکار کی طرح جو اپنے ماحول اور سماج سے آنکھیں نہیں چُراتا بلکہ سماج کے آئینے کو سامنے رکھ کر سنوارنے کی کوشش کرتا ہے، فیض نے غزل کو عصرِ حاضر کے سماجی حقایق کو سامنے رکھ کر سنوارا اور نکھارا ہے۔ اسی لئے انداز بیان اور نکتہ فن

کی پختگی اُن کی غزل کے شاندار مستقبل کی شہادت دے رہی ہے۔

اُنھوں نے نقشِ فریادی میں کہا تھا ؎

وفائے وعدہ نہیں وعدۂ دگر بھی نہیں — وہ مجھ سے روٹھے تو تھے لیکن اس قدر بھی نہیں
نگاہِ شوق سرِ بزم بے حجاب نہ ہو — وہ بے خبر ہی سہی اتنے بے خبر بھی نہیں

نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں
اک ایسی راہ پر جو تیری رہگزر بھی نہیں

دُنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا، — تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

فیض کے کلام میں جذبات کی شدت اور فکر کی کارفرمائی نمایاں ہے۔ صداقت و خلوص اور سچے گداز نے اُن کی غزلوں کو پُرتاثیر بنا دیا ہے۔ وہ ترقی پذیر فن تخلیقات کی زبردست صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ اُن کی غزل اپنے بے پناہ جلال و جمال اور صحت مندانہ عناصر و محرکات کے باعث زندگی کو حرارت بخشتی ہے، احساس کی شدت، طرزِ بیان کی سنجیدگی، مضمحل قویٰ کو تازگی و توانائی اور طراوت عطا کرتی ہے ؎

پھر آگ بھڑکنے لگی ہر ساز طرب سے — پھر شعلے لپکنے لگے ہر دیدۂ تر سے

پا پوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی — متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

سرِ خسرو سے ناز و کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

نقشِ فریادی ۱۹۴۱ء میں زیورِ طبع سے آراستہ ہو کر منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی تھی۔ اُس وقت اور اُس کے چند سال بعد ۱۹۴۷ء تک فیض نے غزل کو اتنی اہمیت نہ دی تھی۔ تقسیمِ ہند کے دورِ انتشار نے ہر فنی حسن کار کو نیا زاویۂ خیال بنانے پر مجبور کر دیا۔ حساس فنکاروں کا محورِ فکر و نظر بدلا۔ فیض کی غزلیہ شاعری میں بھی اُس وقت ایک عظیم انقلاب رونما ہوا۔ اُن کی غزل نئے محورِ فکر و نظر پر گھومنے لگی۔ اُس کا بہت نمایاں رنگ و نہجِ صبا کی غزلوں میں پایا جاتا ہے۔ چنانچہ اُس غزل کے تیور اور بانکپن ملاحظہ ہو ؎

ہم پر دورشِ لوحِ و قلم کرتے رہیں گے — جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
منظور یہ تلخی یہ ستم ہم کو گوارا — دم ہے تو مداوائے الم کرتے رہیں گے
میخانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے — تزئینِ درو بامِ حرم کرتے رہیں گے
باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا، — رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے

اک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک
اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

غزل بڑی کافر صنف سخن ہے اُس کی روایات قدیم ہیں۔ اُس کے پیرایۂ اظہار میں سیکڑوں برس کی چھن آئی ہے۔ شگفتگی و تازگی ہے وہ مختلف ادوار سے منازل ارتقا طے کرتی ہوئی ہمارے اس دور تک پہونچی ہے جسے جمہوری دور کہا جاتا ہے۔ غالب نے غزل کی تنگ دامانی کا شکوہ یوں کیا تھا ؎

بقدرِ شوق نہیں ظرفِ تنگنائے غزل
کچھ اور چاہئے وسعت مرے بیاں کے لئے

حالی کے یہاں غزل میں مضمون سمجھانے والی بات نہ رہی تھی ؎

گر غزل لکھیے تو کیا لکھئے کہ حالی اس میں ۔۔۔ نہ رہی بات وہ مضمون سمجھانے والی

اور پھر وہ اُسے بے وقت کی راگنی تسلیم کرتے ہوئے اُس سے دامن کشی کرنا چاہتے ہیں، فرماتے ہیں ؎

ہو چکے حالی غزل خوانی کے دن ۔۔۔ راگنی بے وقت کی اب گائیں کیا

لیکن اس کے باوجود غزل کا وجود، اُس کی ہستی باقی رہی اور یہ دونوں عظیم المرتبت اُستاد و شاگرد اُس کے سحر و اعجاز سے متاثر ہوتے رہے ۔ غالب کے طرزِ تغزل نے غزل ہی میں ہمعنوں کا ساخروش اور وسعت و پہنائی پائی جاتی ہے اور حالی کی غزل میں زندگی کی صحیح ترجمانی ۔

حالی کے بعد ایک انحطاطی دور ضرور آیا تھا جو اہتزاز اور رکاکت کا دور تھا۔ سب سے پہلے مولانا حسرت موہانی نے غزل کے جسد میں نہاں خون دوڑایا اُس کے تنِ مُردہ میں جان ڈالی اس کے مزاج میں ایسی بنیادی تبدیلی پیدا کی جو گویا انقلابی تھی ۔ اُس کے نظامِ اعصاب میں صحت مند عناصر کے ذریعہ مرارت و طراوت بخشی ۔ اُسے ترقی یافتہ فنی تخلیقات سے سنوار کر عشق پاک باز کے مرتبے پر پہونچا دیا ۔ اور اپنے پیچھے آنے والے غزل گو شعراء کے قافلے کے لئے ایک شاہراہ طیار کر دی ۔ ایک واضح اور صاف راستہ متعین کر دیا (موجودہ دور میں اکبر، اقبال، جگر، جوش، فانی، یگانہ، فراق، جذبی، مجاز، فیض، شفائی اور قیصر نے غزل کو اپنی خستہ جگری، آزاد منشی، قناعت پیشگی اور دلِ گداختہ سے اُبھارا اور اُسے ایک کی دوسری اصناف کے دوش بدوش کھڑا کر دیا ۔)

فیض نے تغزل کے لطیف خیالات اور عشق کے نازک جذبات کے علاوہ سیاسی رموز و کنایات کو بھی غزل میں بڑے حسن و خوبی سے سمو دیا ہے ۔ اُنھوں نے اپنے فطری رجحان کے مطابق غزل کے رخِ زیبا میں جس حسن و رعنائی کا اضافہ کیا ہے اور جس خلوص و دردمندی سے ان رعنائیوں اور زیبائیوں کی اوٹ سے ہماری نئی مجالسِ زندگی کے عینی حقایق کی عکاسی کی ہے اُن کی یہ مساعی غزل کے روشن مستقبل کی ضامن ہے ۔

فیض نے غزل کو نہ صرف میر و سودا اور غالب کے رنگ میں سنوارا اور نکھارا بلکہ اُنھوں نے اپنا بھی ایک الگ رنگ قایم کیا ہے ۔ پرانی شراب کو نئے پیالہ و ساغر میں بھر کر پیش کیا ہے لیکن جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں وہ نئے انسان کی اُلجھنوں سے بیحد متاثر ہوئے ہیں کہ اُن کی غزل میں وحدتِ خیال کا عنصر غالب ہے اور اُن کی غزل بعض اوقات غزلِ مسلسل بن جاتی ہے ۔ "اگست ۱۹۴۷ء" کے عنوان سے جو غزل مسلسل لکھی ہے اُس میں سیاسی اشاریت اپنی خوبیوں کے ساتھ نمایاں ہے فرماتے ہیں ؎

روشن کہیں بہار کے امکاں ہوئے تو ہیں، ۔۔۔ گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں
اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں ۔۔۔ گوشے چمن چمن میں غزلخواں ہوئے تو ہیں
ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر ۔۔۔ کچھ کچھ سحر کے رنگ پر افشاں ہوئے تو ہیں
ہاں کج کرو کلاہ کہ سب کچھ لٹا کے ہم ۔۔۔ اب بے نیازِ گردشِ دوراں ہوئے تو ہیں
اہلِ قفس کی صبح چمن میں کھلے گی آنکھ ۔۔۔ بادِ صبا سے وعدہ و پیماں ہوئے تو ہیں

ہے دشت اب بھی دشت مگر خونِ پا سے فیض
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں

فیض کی نظم گوئی غزل میں ایک ہی خیال کو مکمل صورت میں ایک ہی شعر میں سمو دینا لازمی دلا بدی ہوتا ہے ۔ اسی لئے غالب نے اُسے ظرفِ تنگنائے غزل کہا تھا اور اپنے بیان کے لئے مزید وسعت چاہی تھی وہ وسعت، اصنافِ سخن میں صرف نظم کو حاصل ہے ۔ نظم شاعر کے خیال کی گہرائیوں اور پہنائیوں کو وضاحت سے بیان کر سکتی ہے ۔ اُس کے دامن میں اتنی وسعت اور فراخی ہے کہ اُس میں آغاز سے انجام تک ایک ہی سلسلۂ تخیل کو جاری رکھا جا سکتا ہے ۔ وہ سلسلۂ تخیل مختلف مقامات سے ہم آہنگ ہوتا ہے ۔ وحدتِ خیال کے باعث اُس میں تاثر کی فضا قایم رہتی ہے ۔

فیض کی نظموں میں جو شگفتگی ہے وہ دوسرے ترقی پسند شعراء کے یہاں کم نظر آتی ہے ۔ اس کی اصل وجہ یہی ہے کہ اُنھوں نے غم و ہاں کو

نہ صرف محسوس کیا ہے بلکہ قید و بند کے مصائب خود برداشت کئے ہیں، ایک تماشائی کی طرح اُسے دامن بچا کر دور سے نہیں دیکھا۔

نظم گوئی کے دوران میں اُن کے جذبات بے قابو نہیں ہونے پاتے۔ لہجہ میں تلخی اور ترشی نہیں ہونے پاتی۔ عبارت میں نرمی و دلچسپی یہی وجہ ہے کہ اُن کی نظمیں اثر انگیز ہوتی ہیں۔ وہ صرف ہنگامہ آفرینی کی خاطر نظم نہیں کہتے بلکہ سامع کے ذہن کو بیدار کرتا اور دل میں جوش و خروش اضطراب اور ولولہ پیدا کرنا ہی اُن کا مقصدِ اولین ہوتا ہے۔ یہی وہ جوہرِ لطیف ہے جو اُن کی نظموں کو ممتاز و مشرف بناتا ہے۔

فیض کی اکثر نظمیں حقیقت نگاری کے روشن پہلو کو پیش کرتی ہیں، اس اعتبار سے موضوعِ سخن" (نقشِ فریادی)، صبح آزادی، دو آوازیں، سیاسی لیڈر کے نام، اے دلِ بیتاب ٹھہر، نثار میں تیری گلیوں پہ ۔۔۔۔ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، یہ نظمیں معنی آفرینی اور اثر انگیزی کے لحاظ سے مستحسن ہیں۔ اگرچہ فیض کے محرکاتِ شعری میں حسن و عشق کو بہت زیادہ دخل ہے لیکن ساتھ ہی وہ دوسرے موضوعات کی طرف رمز و کنائے سے قاری کی توجہ مبذول کرتے ہیں، سیاسی اور اجتماعی تقاضوں کو اپنی نظموں میں بطرزِ احسن ادا کر جاتے ہیں، یہ دونوں رجحانات اُن کی شاعری میں گھل مل گئے ہیں، ان جذبات کی کارفرمائی نے اُن کی نظموں کو قبولِ عام کی سند عطا کی ہے۔

نقشِ فریادی کی نظم "موضوعِ سخن" میں فرماتے ہیں ؎

آج پھر حسنِ دلآرا کی وہی دھج ہوگی — وہی خوابیدہ سی آنکھیں وہی کاجل کی لکیر
رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار — صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر
اپنے افکار کی اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی شاہدِ معنیٰ ہے یہی

وہ اپنے افکارِ عالیہ کی جانِ مضموں اور شاہدِ معنیٰ کی تصویر کشی کا اختتام اس طرح کرتے ہیں ؎

لیکن اس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
بائے اس جسم کے کمبخت دل آویز خطوط
آپ ہی کہئے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
اپنا موضوعِ سخن اس کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن اس کے سوا اور نہیں

"اے دلِ بیتاب ٹھہر" میں وہ ایک کامیاب فنکار کی حیثیت سے تشبیہات کا استعمال کرتے ہیں، بندش بھی نہایت چست اضافیل تناسب ہے

تیرگی ہے کہ امنڈتی ہی چلی آتی ہے، — شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی — دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے
رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے اے دلِ بیتاب ٹھہر

پورے بند میں الفاظ کی مستحکم و قوی بندش، عزم کی بلندی اور ولولے کی تندی ظاہر ہو رہی ہے۔ پہلے شعر میں نہایت حسین تشبیہ ہے دوسرے شعر میں بھی ایک نہایت عمدہ تشبیہ نے اس بند کی خوبی میں چار چاند لگا دئے ہیں۔ حسن اور قابلِ داد ہے۔

غیر منقسم ہندوستان میں آزادی کی جدوجہد کے لئے کیا کچھ نہ کیا گیا۔ سالہا سال سے ہم غلامی سے نجات حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے قومی حکومت کے رنگین و دلنشین خواب دیکھ رہے تھے، چنانچہ ان خوابوں کی تعبیر صبحِ آزادی اگست ۱۹۴۷ء کی صورت میں نمودار ہوئی۔ لیکن یہ صبح کاذب ہی ثابت ہوئی اور غلامی کی تیرگی کے باعث یہ سحر "شب گزیدہ" محسوس ہوئی۔ اس ناکامی کا احساس فیض یوں کرتے ہیں ؎

یہ داغ داغ اُجالا یہ شب گزیدہ سحر وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں

پھر فرماتے ہیں ؎

سُنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نور سُنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام

اور آخر میں ایک پُر زور و پر اثر اور چست بندش کی شاعرانہ عظمت کے ساتھ وہ انسانیت کا دامن تھامے ہوئے اپنے غیر متزلزل ارادوں کے ساتھ رفیقانِ سفر کو منزلِ اسی کی ترغیب دیتے ہیں ؎

جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ، دل کی جلن، کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا کدھر کو گئی، ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں
ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی

فیض نے غلامی سے بغاوت کی۔ اپنے ہم وطنوں کی اُلجھنوں اور مظالم کے خلاف آواز بلند کی۔ لیکن ساتھ ہی حسنِ دلآرا کا نکھار، سج دھج، زیب و زینت بھی دکھائی۔ خوابیدہ آنکھوں میں کاجل کی لکیر، رنگِ رخسار پر غازے کا غبار، حنائی تحریر، دلآویز خطوط، شفق کا مہکایا ہوا پیراہن ٹمٹماتے ہوئے آویزے، غرض رنگ و بو کے ایک نورانی پیکر کی تصویر کشی کی۔ لیکن وہ لیلائے وطن پر بھی اُسی انداز سے شیفتہ و فریفتہ رہے۔ اُسی انداز سے اُسے چاہا۔ اُس میں بھی وہی دلربائی و رعنائی دیکھی۔ اُنھوں نے اپنے محبوب کے ساتھ لیلائے وطن سے بھی عشق کیا ہے۔ عشقِ محبوب تو بیم و رجا کی کشمکش، اور نازِ جاناں کی ستم کیشیاں، رقابت، رقیب کے گلے شکوے، تک محدود رہا ہوگا۔ لیکن لیلائے وطن کے عشق کو وہ سربلندی حاصل ہوئی کہ دار و رسن تک پہونچنا نصیب ہوگیا۔ سچ تو یہ ہے کہ ؎

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن نہیں (محمد علی جوہر)

لیلائے وطن سے اُنھیں جو عشق ہے وہ بہت استوار ہے۔ چنانچہ اپنی نظم "دو عشق" میں اسی جذبے کی ترجمانی کرتے ہیں ؎

تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے کہا کیا نہ دلِ زار نے ڈھونڈی ہیں بنائیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں بانہیں

اور اب لیلائے وطن کے عشق کا انداز دیکھئے:

چاہا ہے اُسی رنگ میں لیلائے وطن کو تڑپا ہے اُسی طور سے دل اُس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یونہی شوق نے آسائشِ منزل رخسار کے خم میں کبھی کاکل کی شکن میں
واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا تنہا نہیں لوٹی کبھی آواز جرس کی
خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی

اور اس عشق میں ہزار دل صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں ؎

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار
چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی کارِ ستم و شنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت

یہی جذبہ "شامِ شہرِ یاراں" میں تری گلیوں پہ ..... ہے شدید تر بن گیا ہے۔ اس میں محبوب کی یاد اور اُس کے دلکش نقش و نگار نہیں ہیں لیکن

نگارِ وطن کی محبت کا جذبہ پختہ ہوگیا ہے ؎

نثار میں تری گلیوں پہ اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے،
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چرا کے چلے، جسم و جاں بچا کے چلے

اور پھر ؎

بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی منصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں

پسِ زنداں بھی شاعر لیلائے وطن سے تصور ہی تصور میں محوِ کلام ہے ؎

بجھا جو روزنِ زنداں تو دل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پہ بکھر گئی ہوگی

غرض تصورِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

لیکن لیلائے وطن سے یہ جدائی دائمی نہیں عارضی ہے ؎

مگر آج تجھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جدائی تو کوئی بات نہیں،
مگر آج اوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دن کی خدائی تو کوئی بات نہیں

جو تجھ سے عہدِ وفا اُستوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

قطعات فنی نقطۂ نظر سے قطعے کے سارے مصرعوں میں ایک ہی مفہوم منقسم ہوتا ہے۔ اس طرح پورا قطعہ بحیثیت مجموعی ایک ہی مفہوم کو واضح و نمایاں کرتا ہے۔ فیض کے اکثر قطعات میں تراکیب کی ہم آہنگی اور عبارت کا ترنم بدرجۂ اتم موجود ہے۔ مضمون کی بلندی اور خیالات کی پاکیزگی کا جوہر قاری کے ذہن کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتا ؎

وقتِ حرماں و یاس رہتا ہے
دل ہے اکثر اُداس رہتا ہے
تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احسان کا پاس رہتا ہے
فضائے دل پہ اُداسی بکھرتی جاتی ہے
فسردگی ہے کہ جاں تک اُترتی جاتی ہے
فریبِ زیست سے قدرت کا مدعا معلوم
یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے

اس قطعہ میں تشبیہات کی ندرت قابلِ داد ہے ؎

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

اس قطعہ میں غمِ جہاں سے متاثر ہو کر غمِ دوست کو آواز دے رہے ہیں ؎

دل ربینِ غمِ جہاں ہے آج،
ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج،
سخت ویراں ہے محفلِ ہستی
اے غمِ دوست تو کہاں ہے آج،

زورِ بیان اور تخیل کی بلندی کے لحاظ سے ذیل کے قطعات قابلِ تحسین و آفریں ہیں، حسنِ ادا قابلِ داد ہے۔

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں انگلیاں میں نے
زباں پہ مہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اُٹھا ہوں ۔۔۔ نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی،
نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے ۔۔۔ مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی
ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی مجال ۔۔۔ عبائے شیخ و قبائے امیر و تاج شہی
ہمیں سے سنّتِ منصور و قیس زندہ ہے ۔۔۔ ہمیں سے باقی ہے کل دامنی و کج کلہی

لیکن بعض قطعات مفہوم کے لحاظ سے مہمل ہو کر رہ گئے ہیں، جو سراسر فہم و فراست کے حدود سے باہر ہیں، جن میں کوئی تاثر نہیں مثلاً

صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے اُنکے ہاتھوں کی ۔۔۔ ٹھہر ٹھہر کے یہ ہوتا ہے آج دل کو گماں،
وہ ہاتھ ڈھونڈ رہے ہیں بساطِ محفل میں ۔۔۔ کہ دل کے داغ کہاں ہیں نشستِ درد کہاں

اس قطعہ کے دونوں شعر علٰحدہ علٰحدہ مفہوم رکھتے ہیں، دونوں میں کوئی ربط نہیں پایا جاتا اور ایک قسم کی بے لطفی سی محسوس ہوتی ہے دوسرے شعر کو میری ناچیز فہم نہ سمجھ سکی۔

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی ۔۔۔ اے اہلِ مصر وضع تکلف تو دیکھئے
انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر ۔۔۔ اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھئے

اس قطعہ کے پہلے اور دوسرے شعر میں کوئی تسلسل اور ربط نہیں پایا جاتا۔ دوسرا شعر اگرچہ کسی غزل کے شعر کی طرح صاف و واضح معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اُس کا پہلے شعر سے کوئی تعلق نہیں۔ جان کس طرح بیچی گئی۔ وضعِ تکلف کس نے کیا۔ اس سے شاعر کا کیا مقصد ہے۔

اسی قبیل کے چند قطعات ملاحظہ ہوں ؎

نہ پوچھ جب سے ترا انتظار کتنا ہے ۔۔۔ کہ جن دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے اُن اجنبی بہاروں میں ۔۔۔ جو تیرے لب ترے بازو ترا کنار نہیں
پھر حشر کے سامان ہوئے ایوان ہوس میں ۔۔۔ بیٹھے ہیں ذوی العدل گنہگار کھڑے ہیں
ہاں جرم وفا دیکھئے کس کس پہ ہو ثابت ۔۔۔ وہ سارے خطاکار سرِ دار کھڑے ہیں

تصویر کا دوسرا رُخ

فیضؔ کے کلام میں محاسن کے ساتھ ساتھ معائب بھی پائے جاتے ہیں، اُن کا سرسری جائزہ پیش کرتا ہوں۔ یہ معائب نظم و غزل کے حسن کو مجروح بنا دیتے ہیں اور شعر کا حسن خاک میں مل کر رہ جاتا ہے۔

اے دلِ بیتاب ٹھہر ہیں ع مطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی

مطلق الحکم نہایت ثقیل لفظ ہے۔ جو آواز کے اعتبار سے بھاری بھرکم ضرور ہے سامعین کے دلوں پر ہیبت طاری کر سکتا ہے لیکن اُس کے تہ تو کوئی معنی پیدا ہوتے ہیں اور نہ کوئی مفہوم:

ع ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں

ساغر کی صفت ناب درست نہیں ہے۔ فارسی میں ناب کے معنی "خالص" کے ہوتے ہیں اور صفت عام طور پر شراب اور مجازاً کے لئے استعمال کی جاتی ہے۔ شاید فیضؔ نے اسے شراب کے مفہوم میں استعمال کیا ہے لیکن یہ درست نہیں۔

ع کبھی کبھی یاد میں اُبھرتے ہیں[1] نقشِ ماضی مٹے مٹے سے (غزل کا مصرعہ)

یاد میں اُبھرنا خلافِ محاورہ ہے۔

---

[1] حضرت نیاز فتحپوری نے اِس مصرعہ پر یوں اصلاح فرمائی ہے :۔
کبھی کبھی یاد آ ہی جاتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے

"مرے ہمدم مرے دوست" میں فرماتے ہیں ؎

"جی اُٹھے پھر ترا اُجڑا ہوا بے نور دماغ"

اُجڑا ہوا بے نور دماغ جی اُٹھے غلط ہے ۔ اُجڑنے کی ضد بسنا ہے اور بے نور کی منوّر یا روشن، اگر یہ کہا جاتا کہ تیرا اُجڑا ہوا دماغ آباد ہو جائے یا بے نور دماغ روشن ہو جائے تو درست ہو سکتا تھا ۔ پھر فرماتے ہیں ؎

"تیری پیشانی سے ڈھل جائیں یہ تذلیل کے داغ"

تذلیل کے لغوی معنی ہیں ذلیل کرنا ۔ لیکن یہاں یہ لفظ ذلّت کے مفہوم میں ادا ہوا ہے ۔ فیضؔ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ تیری پیشانی سے ذلت کے داغ ڈھل جائیں ۔ لیکن یہاں تذلیل سے یہ مفہوم ادا نہیں ہوتا ۔

؎ کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم

حسیناؤں جمع حسیناؤں غلط ہے ۔ برفاب (آب + برف) کا مرکب مقلوب ہے ۔ گویا اس کا مطلب ہوا پانی کا پگھلنا ۔ جو کسی طرح صحیح نہیں ۔

؎ کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش

"نقوش کا ٹھہرنا" محلِ نظر ہے ۔

؎ گیت بنتا روں بیٹھا رہوں تیری خاطر

گیت بننا محاورے کے خلاف ہے ۔

"صبحِ آزادی" میں فرماتے ہیں ؎ دیارِ حُسن کی بے صبر خوابگاہوں سے

خوابگاہ کو بے صبر کہنا درست نہیں ۔ کوئی جاندار چیز ہی بے صبر ہو سکتی ہے ۔ بارعایتِ لفظی کے ساتھ کسی دوسری صورت سے استعمال کر سکتے ہیں ۔ غیر ذی روح کے لئے بطور صفت رعایتِ لفظی کے بغیر استعمال کرنا درست نہیں ۔

؎ بہت قریں تھا حسینانِ نور کا دامن

"حسینانِ نور" کی ترکیب غیر مانوس ہے ۔

دوسری آواز میں ؎ یہ شام و سحر یہ شمس و قمر یہ اختر و کوکب اپنے ہیں

اس مصرعے میں اختر و کوکب مرادف ہیں ۔ ان میں سے ایک لفظ خارج کر کے دوسرا لفظ جس کے معنی میں تضاد پایا جائے ۔ استعمال کیا جاتا تو بہتر ہوتا ۔

؎ حدیثِ بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف

یہاں "کس مصرف کا" ہونا چاہئے تھا ۔ محض کس مصرف غلط ہے ۔

"مرثیہ" (قوالی) میں فرماتے ہیں ؎ "ذرا صیقل تو ہو لے تشنگی بادہ گساروں کی"

پیاس کی شدت کے لئے تشنگی کا صیقل ہونا، اہلِ زبان اساتذہ نے کہیں نہیں لکھا ہے ۔ تشنگی ایک جذبہ اور ایک کیفیت ہے کسی ذی روح کے جسم کی ۔ وہ کس طرح زنگ آلود ہو سکتا ہے ۔ اور اس کا صیقل ہونا کیا معنی رکھتا ہے ۔ نیز یہ محاورے کے بھی خلاف ہے ۔

غزل کا مصرعہ ہے ؎ "حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں"

"عنواں نکھرنا" غیر مانوس اور بھدی ترکیب ہے ۔

؎ تو چشمِ صبح میں آنسو اُبھرنے لگتے ہیں

"آنسو اُبھرنا" خلافِ محاورہ ہے ۔ "آنسو بھر آنا" درست ہے ۔

؎ وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری

لب کی بخیہ گری تو خیر صحیح ہے ۔ کیونکہ "ہونٹ سی دینا" محاورہ بھی ہے ۔ لیکن نطق کی بخیہ گری درست نہیں ۔ کیونکہ وہ کوئی جاندار اور ٹھوس چیز

نہیں ہے یہ عمل تو اُس چیز پر ممکن ہے جس کا کوئی ظاہری اور ٹھوس وجود ہو ۔

حضرت نیاز فتحپوری نے اس مصرعہ کی اصلاح یوں فرمائی ہے : "زبان دلب کی وہ کرتے ہیں جب بھی بخیہ گری"

✓ "تمھارے حسن کے نام" میں فرماتے ہیں ؎

بنی بساطِ غزل جب ڈبو لئے دل نے تمھارے سایۂ رخسار و لب میں ساغر و جام

اس شعر سے یہ مفہوم اخذ کیا جا سکتا ہے کہ میری غزلیں تمھارے لب و رخسار کے تصور کی رہینِ منت ہیں ۔ لیکن سایۂ رخسار و لب میں جام ڈبونا نہایت نامانوس اور متبذل اندازِ بیان ہے ۔

"ترانہ" میں کئی ایک ایسے معائب ہیں، جنھیں نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ۔ فرماتے ہیں :

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے کچھ اپنی سزا کو پہونچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے

جزا لے جائیں گے صحیح نہیں، جزا پائیں گے ہونا چاہئے ۔

؎ اے خاک نشینو! اٹھ بیٹھو، وہ وقت قریب آ پہونچا ہے جب تخت گرائے جائیں گے، جب تاج اُچھالے جائیں گے

تخت گرائے نہیں جاتے بلکہ اُلٹ دئے جاتے ہیں ۔

؎ اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں، اب زندانوں کی خیر نہیں جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں، تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

دریا جھوم کے نہیں اُٹھتا اپنی سیلابی کیفیت میں وہ طوفان ضرور اُٹھاتا ہے ۔ اُس کی پرجوش موجوں سے پناہ حاصل کرنے کے لئے اس کا رخ بدلا جا سکتا ہے آسے تنکوں سے ٹالا نہیں جا سکتا ۔ علاوہ ازیں یہ شعر دو لخت ہو گیا ہے ۔ دونوں مصرعوں میں کوئی ربط نہیں ہے ۔ مصرعۂ اولیٰ میں زنجیروں اور زندانوں کا ذکر ہے ۔ اور مصرعۂ ثانی میں دریا اور تنکوں کا ۔

؎ کٹتے بھی چلو بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

اِس شعر میں لف و نشر درست نہیں ۔ مصرعۂ اولیٰ میں فرماتے ہیں کہ "کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو" اُس کے بعد فرماتے ہیں کہ بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت ۔ بازو اور سر دونوں کا کٹنا مسلم لیکن اُن کا بڑھنا محلِ نظر ہے ۔ آخر یہ کس طرح اور کس سے بڑھیں گے ۔ اس کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا گیا ۔ ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ بازو اور سر کٹتے ہیں اور قدم آگے بڑھتے ہیں ۔

غزل کا شعر ہے ؎ خیر ہیں اہلِ دیر جیسے ہیں آپ اہلِ حرم کی بات کرو

"آپ بات کرو" غیر ادبی اور غلط زبان ہے ۔ "آپ بات کریں" "آپ باتیں کیجئے" استعمال کیا جاتا تو بہتر تھا، ردیف کی مناسبت سے "تم بات کرو" درست ہو سکتا تھا ۔

"دو عشق" میں ع ہر درد کو اجیالا ہر اک غم کو سنوارا

"درد کو اجیالنا" نہایت بھدا اور غیر مانوس اندازِ بیان ہے ۔

"نوحہ" میں فرماتے ہیں ع اپنے رنگ کا یہ دکھتا ہوا خوں رنگ گلاب

"دکھتا ہوا" گلاب کی صفت نہیں ہو سکتی ۔

✓ آزاد نظم "ایرانی طلباء کے نام" میں ع کیوں نوچ کے ہنس ہنس سینک دئے

یہاں "ہنس ہنس کر" چاہئے ۔

"جس میٹھے نور اور کڑوی آگ،
سے ظلم کی اندھی رات میں پھوٹا
صبح بغاوت کا گلشن"

اُردو میں نور کو میٹھا اور آگ کو کڑوا نہیں کہتے اور "گلشن بھوٹنا" صحیح اندازِ بیان نہیں ہے ۔ "اگست ۱۹۴۹ء" میں فرماتے ہیں ؎

اِن میں لہو جلا ہو ہمارا کہ جانِ و مال محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

چراغ میں تیا جل سکتا ہے اور شاعر کے خون کو تیل فرض کر لیا جائے یا استعارا مان لیا جائے تو درست ہو سکتا ہے ۔ لیکن جان و مال چراغ میں کس طرح جل سکتے ہیں، خون کی طرح وہ کوئی مائع تو ہیں نہیں کہ اُسے بھی تیل سمجھ لیا جائے یا استعارا مان لیا جائے ۔

غزل کا شعر ہے ؎ اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے جو بھی چل نکلی ہے وہ بات کہاں ٹھہری ہے

"زباں ٹھہری ہے" غلط ہے ۔ فیض کا مطلب یہ ہے کہ جنوں کا ذکر زبانِ زدِ خاص و عام ہے ۔ لیکن یہاں زباں ٹھہری ہے سے یہ مفہوم ادا نہیں ہوتا اور حرف کو تذکرہ و حکایت کے معنی میں استعمال کرنا موزوں نہیں ۔

؎ آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام اب وہی دشمنِ دیں راحتِ جاں ٹھہری ہے

یہاں اکرام کو فیض نے تقوے کے معنی میں استعمال کیا ہے ۔ جو درست نہیں ۔ یہ لفظ تعظیم کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے ۔ گویا وہ کہہ رہے ہیں کہ "شیخ کی تعظیم میں جو شے حرام تھی" یہ ایک بے معنی سی بات ہے ۔

؎ وصل کی شب تھی تو کس درجہ سبک گزری تھی ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے

رات کی طوالت کو "گراں ٹھہرنا" نہیں کہتے گراں گزرنا کہتے ہیں ۔

؎ شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں، کیوں ؎ موتی ہو کہ شیشہ جامِ کہ دُر جو ٹوٹ گیا سو ٹوٹ گیا

دُر بالکسرہ موتی ہی کو کہتے ہیں لیکن مصرعہ میں پہلے ہی موتی استعمال ہو چکا ہے ۔ بالفتح دروازے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے لیکن اِن معنوں میں یہاں محلِ استعمال موزوں نہیں ۔

زندان کی ایک صبح میں فرماتے ہیں ؎ "عکسِ جاناں کو وداع کر کے اُٹھی میری نظر" ۔۔۔ 'وداع' صحیح ہے ۔ ودیع لکھنا غلط ہے

فیض کے نشتر

اُردو شاعری میں میر کے بہتر نشتر بہت مشہور ہیں ۔ میر کی طرح کلامِ فیض میں بھی کئی نشتر موجود ہیں ۔ فیض کا کمالِ فن اُنکی نظموں سے زیادہ غزلوں میں نمایاں ہے ۔ یہ جواہر پارے اُن کی مشہور و مقبول تصانیف "نقشِ فریادی" اور "دستِ صبا" سے منتخب شدہ ہیں :-

حسن مرہونِ بادۂ نازہ عشق منت کشِ فسونِ نیاز
سوزشِ درد دل کسے معلوم کون جانے کسی کے عشق کا راز
میری خاموشیوں میں لرزاں ہے میرے نالوں کی گمشدہ آواز

خوفِ ناکامیِ امید ہے فیض
ورنہ دل توڑ دے طلسمِ مجاز

تیری رنجش کی انتہا معلوم حسرتوں کا مری شمار نہیں
چارۂ انتظار کون کرے تیری نفرت بھی استوار نہیں
فیض زندہ رہیں وہ ہیں تو سہی کیا ہوا گر وفا شعار نہیں

منتِ چارہ ساز کون کرے درد جب جاں نواز ہو جائے
عشق دل میں رہے تو رسوا ہو لب پہ آئے تو راز ہو جائے

غریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی تم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آواز پاتے ہیں
تمہاری ہر نظر سے نسلکِ ہے تشنہ تمنا کی مگر دور کی باتیں کوئی نادان کیا سمجھے

اپنی مشقِ ستم سے ہاتھ نہ کھینچ میں نہیں یا وفا نہیں، باقی

تیری چشمِ الم نواز کی خیر — دل میں کوئی گلا نہیں باقی
تیز ہے آج دردِ دل ساقی — تلخیٔ مے کو تیز تر کر دے
میری قسمت سے کھیلنے والے — مجھ کو قسمت سے بے خبر کر دے

دُنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا — تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

وفائے وعدہ نہیں وعدۂ دگر بھی نہیں — وہ مجھ سے روٹھے تو تھے لیکن اسقدر بھی نہیں
نہ جانے کس لئے اُمیدوار بیٹھا ہوں، — اک ایسی راہ پر جو تیری رہگذر بھی نہیں
نگاہِ شوق سرِ بزم بے حجاب نہ ہو — وہ بے خبر ہی سہی اتنے بے خبر بھی نہیں
آس اُس در سے ٹوٹتی ہی نہیں — جا کے دیکھا نہ جا کے دیکھ لیا

ماضی میں جو مزہ مری شام و سحر میں تھا — اب وہ فقط تصورِ شام و سحر میں ہے
کیا جانے کس کو کس سے ہے اب درد کی طلب — وہ غم جو میرے دل میں ہے تیری نظر میں ہے

تھی مگر اتنی رائگاں بھی نہ تھی، — آج کچھ زندگی سے کھو بیٹھے،
تیرے در تک پہونچ کے لوٹ آئے — عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے

موت اپنی نہ عمل اپنا نہ جینا اپنا — کھو گیا شورشِ گیتی میں قرینہ اپنا
ناخدا دور، ہوا تیز، قریں کامِ نہنگ — وقت ہے پھینک دے لہروں میں سفینہ اپنا
بیش قیمت ہیں یہ غم ہائے محبت مت بھول — ظلمتِ یاس کو مت سونپ خزینہ اپنا

ساغر تو کھنکتے ہیں شراب آئے نہ آئے — بادل تو گرجتے ہیں گھٹا برسے نہ برسے
پاپوش کی کیا فکر ہے دستار سنبھالو — پایاب ہے جو موج گزر جائے گی سر سے

کئی بار اُس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے — مگر دل ہے کہ اُس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی
نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی، — متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی
سرِ خسرو سے ناز و کج کلاہی چھن بھی جاتا ہے — کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

نگاہ و دل ہیں قرار کیسا، نشاط و غم میں کمی کہاں کی — وہ جب ملے ہیں تو اُن سے ہر بار کی ہے اُلفت نئے سرے سے

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے — جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے
ہاں تلخیٔ ایام ابھی اور بڑھے گی — ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے
منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا — دم ہے تو مداوائے اَلم کرتے رہیں گے
میخانہ سلامت ہے تو ہم سرخیٔ مے سے — تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے
باقی ہے لہو دل میں تو ہر اشک سے پیدا — رنگِ لب و رخسار صنم کرتے رہیں گے
اک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُن کو مبارک — اک عرضِ تمنا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

خوشا نظارۂ رخسارِ یار کی ساعت — خوشا قرارِ دلِ بے قرار کا موسم
صبا کی مست خرامی تو کمند نہیں — اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہیں — وہ بات اُن کو بہت ناگوار گزری ہے
نہ گل کھلے ہیں نہ اُن سے ملے نہ مے پی ہے — عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے،

تمھاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمھیں یاد کرنے لگتے ہیں

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

درِ قفس پہ اندھیرے کی مُہر لگتی ہے
تو فیض دل میں ستارے اُترنے لگتے ہیں

ہجر کی شب تو کٹ ہی جائے گی
رو نو وصل صنم کی بات کرو

جان جائیں گے جاننے والے
فیض فرہاد و جم کی بات کرو

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس
مدحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں

ہے فقط مرغِ غزلخواں کہ جسے فکر نہیں
معتدل گرمیِ گفتار کروں یا نہ کروں

گرانیِ شبِ ہجراں دو چند کیا کرتے
علاجِ درد ترے دردمند کیا کرتے

جنھیں خبر تھی کہ شرطِ نوا گری کیا ہے
وہ خوش نوا گلۂ قید و بند کیا کرتے

تم آ رہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں

پیو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید
گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں

کہو تو ہم بھی چلیں فیض اب نہیں سردار
وہ فرقِ مرتبۂ خاص و عام کہتے ہیں

اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چمن والے غریبانِ چمن
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

فیض اُن کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنھیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

کچھ ہمیں کو نہیں احسان اُٹھانے کا دماغ
وہ تو جب آتے ہیں مائل بہ کرم آتے ہیں

اور کچھ دیر نہ گزرے شبِ فرقت سے کہو
دل بھی کم دکھتا ہے وہ یاد بھی کم آتے ہیں

آتے آتے یونہی دم بھر کو رُکی ہوگی بہار
جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

جبل اُٹھے بزمِ خیر کے در و بام
جب بھی ہم خانماں خراب آئے

فیض تھی راہ سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے کامیاب آئے

کسی گماں پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں
پھر آج کوئے بتاں کا ارادہ رکھتے ہیں

بہار آئے گی سب آئے گی یہ شرط نہیں
کہ تشنہ کام رہیں گر پہ بادہ رکھتے ہیں

غمِ جہاں ہو، غمِ یار ہو کہ تیرِ ستم
جو آئے آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

ذکرِ دوزخ بیانِ حور و قصور
بات گویا یہیں کہیں کی ہے،

اشک تو کچھ بھی رنگ لا نہ سکے
خوں سے تر آج آستیں کی ہے

کیسے مانیں جرم کے سہل پسند
رسم جو عاشقوں کے دیں کی ہے

ناظر انصاری

اکبری عہد کے تراجم

ہندوستان کے مسلم عہد میں درباری زبان فارسی تھی اس لئے تمام حکمرانوں نے اس کی سرپرستی کی۔ ایران کے شعراء و ادباء ہندوستان کی طرف کھنچ کھنچ کر آنے لگے جس کا اعتراف خود اہلِ ایران کرتے ہیں ؎

نیست در ایرانِ زمیں سامانِ تحصیلِ کمال تا نیاید سوئے ہندوستاں حنا رنگین نہ شد

بعض حکمرانوں نے فارسی کے ساتھ ساتھ سنسکرت اور ہندوستان کی دوسری زبانوں کو بھی فارسی سے روشناس کرادیا اور اس سلسلہ میں سب سے زیادہ اکبر نے توجہ کی۔ اکبر کو شروع ہی سے مذہب اور اس کی حقیقت جاننے کا شوق دامنگیر تھا۔ وہ ہر ایک مذہب کا پورا مطالعہ کرنا چاہتا تھا، قرآن کے علاوہ دیگر کتب سماوی کے جاننے کی خواہش بھی اس کے دل میں موجزن تھی۔ چنانچہ جب اسے معلوم ہوا کہ ان کتب سماوی کے فارسی اور عربی ترجمے یورپ میں ہیں تو اس نے دیارِ فرنگ سے اس سلسلہ میں خط و کتابت کی اور ان سے یہ ترجمے طلب کئے وہ لکھتا ہے :

"و بسمعِ ہمایوں رسیدہ کہ کتب سماوی مثل توریت و انجیل و زبور بزبان عربی و فارسی آوردہ اند اگر آں کتب مترجم یا غیر آں کہ نفع آں عام و فایدہ آں تام باشد دراں ولایت است بودہ باشد فرستند"

اسی طرح ہندوؤں کی مقدس کتابوں کا مطالعہ بھی اس نے ضروری اور اہم سمجھا اور ہندو ادیبوں اور پنڈتوں کو اپنے پاس بٹھا کر ان مقدس کتابوں کو ان سے سنا۔ ان کتابوں کو سننے کے بعد اکبر نے ضروری سمجھا کہ ان کو فارسی میں منتقل کیا جائے تاکہ مسلمان جو فارسی جانتے تھے ان سے واقف ہوں۔ اسی غرض سے اس نے ایک دارالترجمہ قایم کیا جس میں ہندو مسلم اور دوسرے اہلِ قلم کو اس کام کے لئے مقرر کیا۔ اور ملک الشعرا ابوالفیض فیضی کو اس کا صدر مقرر کیا۔ دارالترجمہ کے اکثر ممبر سنسکرت کے ماہر تھے جن میں ملا عبدالقادر بدایونی صاحب منتخب التواریخ، فیضی، نقیب خاں اور ملا شیریؔ خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہیں۔ یہ امر کہ ان لوگوں نے کب، کہاں اور کیونکر سنسکرت کی تعلیم حاصل کی تھی ہنوز پردۂ خفا میں ہے۔ فیضی کے متعلق مصنف تاریخ کا بیان ہے کہ اس نے ہندوؤں کا بھیس بدل کر اور اپنے آپ کو ہندو بتا کر ایک برہمن سے سنسکرت میں مہارت حاصل کی لیکن یہ بیان قابلِ اعتماد نہیں۔

اکبر نے پہلے نقیب خاں کو حکم دیا کہ۔ مہابھارت کا ترجمہ کرے، جبکہ بعد کو بدایونی نے بھی اس کام میں نقیب خاں کا ہاتھ بٹایا بلکہ یہ کہنا درست ہوگا کہ زیادہ تر کام بدایونی ہی نے کیا۔ بقول بدایونی ہی نے تین چار مہینے کے عرصہ میں اٹھارہ جزو کا ترجمہ کیا۔

بدایونی کے علاوہ ملا شیری نے بھی نقیب خاں کا ہاتھ بٹایا، لیکن کتاب کی ضخامت کو دیکھ کر اکبر نے سلطان حاجی تھانیسری کو حکم دیا کہ وہ بھی اس کام میں شامل ہو جائے۔ ان لوگوں نے ترجمہ کو کامیابی خاتمے میں پہونچانے کی کوشش کی اور کچھ عرصہ کے بعد اسے مکمل کیا، اس ترجمہ کا نام "رزم نامہ" ہے جو آج بھی ہندوستان کے مختلف کتب خانوں میں محفوظ ہے۔ اکبر نے ماہر مصوروں سے تمام معرکوں کی تصویریں بھی بنوا کر کتاب کی زینت میں اضافہ کیا۔ چونکہ اکبر اپنی رعایا کے درمیان اتحاد و یکجہتی قایم کرنا چاہتا تھا اس لئے اس نے حکم صادر کیا کہ تمام امرا اس ترجمہ کا ایک ایک نسخہ اپنے پاس رکھیں۔ ابوالفضل نے اس پر ایک بڑا اچھا مقدمہ لکھا تھا اور اکبر نے اسے بہت پسند کیا تھا اس ترجمہ کا ایک نسخہ بھی یونیورسٹی کے کتب خانہ میں موجود ہے۔

رامائن، ہندوؤں کی مشہور اور مقدس کتاب ہے جو رام، سیتا اور لچھمن کے حالات پر مشتمل ہے۔ اس کے فارسی ترجمہ کا کام اکبر نے بدایونی کے سپرد کیا۔ اس کتاب پر رائے زنی کرتے ہوئے بدایونی لکھتے ہیں کہ ان کی نظر میں یہ کتاب مہا بھارت سے زیادہ مفید و کارآمد ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

"دریں ایام فقیر را ترجمہ کتاب رامائن فرمودند کہ در تصنیف ہر مہا بھارت سبقت دارد"

چھ سال کی جانفشانی کے بعد بدایونی نے یہ ترجمہ ۹۹۹ھ میں مکمل کیا جو اکبر کو بہت پسند آیا اس کا آخری شعر تھا:

ماقصہ نوشتیم بہ سلطاں کہ رساند جاں سوختہ کرد یم بہ جاناں کہ رساند

کرشن جی کا احترام ہر ہندو اپنا فرض سمجھتا ہے۔ ان سے متعلق ایک کتاب تاریخ کرشن جی، اکبر کی نظر سے گزری تو اس نے اس کے ترجمہ کا کام دارالترجمہ کے سپرد کیا جس میں ہندو اور مسلمان علماء دونوں شامل تھے۔ اکبر نے فارسی اور عربی کی متعدد کتابوں کو تصویروں سے مزین کرا کر شاہی کتب خانہ میں رکھا تھا، جن میں شیریں و فرہاد۔ لیلیٰ مجنوں اور قصۂ امیر حمزہ مشہور ہیں۔ اسی دوران میں اکبر کو ایک ہندی الاصل قصہ کا خیال پیدا ہوا جسے اس نے بنڈتوں اور دیگر ارباب ادب سے سنا تھا۔ یہ قصہ نلدمن کا ہے۔ اس کے ترجمہ کے لئے اکبر نے ملک الشعراء فیضی کا انتخاب کیا جس نے پانچ ماہ کی قلیل مدت میں مکمل کر لیا۔ یہ مثنوی چار ہزار دو سو شعر پر مشتمل ہے۔ مثنوی کو اکبر نے تصویروں سے آراستہ کرایا۔ ملا بدایونی نے بھی جو فیضی اور اس کے خاندان کے سخت دشمن تھے اس مثنوی کی تعریف کی کہ واقعی یہ ایسی مثنوی ہے کہ اس تین سو سال کے عرصہ میں امیر خسرو کے بعد شاید ہی کسی نے لکھی ہو:

"الحق مثنوی ست کہ دریں سہ صد سال مثال آں بعد از امیر خسرو شاید در ہند کسے دیگر نہ گفتہ باشد"

مذہبی کتابوں کے علاوہ اکبر نے سنسکرت کی دیگر کتابوں کا بھی فارسی میں ترجمہ کرایا۔ سنسکرت ادب بلاشبہ علم و ہنر کا خزینہ تھا اکبر اس سے فایدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ سنسکرت کی ایک کتاب "لیلاوتی" ریاضی کی مشہور کتاب ہے۔ اس کا ترجمہ بھی اکبر نے فارسی میں کرایا۔ ہندوستان کے مشہور ریاضی داں بھاسکر چاریہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بھاسکر چاریہ نے اس کی تعلیم و تربیت کی طرف تمام کوششیں صرف کر دی تھیں۔ لیلاوتی جب جوان ہوئی تب بھاسکر چاریہ کو باپ کی ذمہ داریوں کا احساس ہوا لہٰذا اس نے اپنی بیٹی کی شادی کرنا مناسب سمجھا۔ اس نے شادی طے کرنے سے پہلے اپنی ریاضی و نجوم کی مدد سے معلوم کیا کہ اگر لیلاوتی کی شادی کر دی جائے تو بھی وہ جلد بیوہ بن جائے گی۔ بھاسکر چاریہ یہ معلوم کر کے بہت ہی اداس ہوا۔ آخر کار اس نے دیگر ریاضی دانوں اور ماہرین نجوم کی مدد سے ایک ایسی مبارک ساعت ڈھونڈھ نکالی کہ اگر ٹھیک اسی وقت لگن پڑے تو لیلاوتی زندگی کی خوشیوں سے مالا مال ہو سکتی ہے۔ لہٰذا شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ صحیح وقت معلوم کرنے کے لئے ایک خاص قسم کی گھڑی رکھی گئی لیلاوتی نے جو دلہن بنی ہوئی تھی اسے دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا اور جونہی اسے دیکھنے لگی اس کی مانگ میں سے ایک باریک موتی گھڑی پر گرا اور وہ بند ہو گئی۔ لوگ ساعت مسعود کا انتظار کر رہے تھے۔ جب کافی دیر ہو چکی تو بھاسکر چاریہ کو معلوم ہوا کہ گھڑی بند ہو گئی ہے اور شادی نہ ہو سکی آخر کار باپ نے اپنی بیٹی کی توجہ ریاضی کی طرف مایل کی اور ایک کتاب لکھ کر اسے لیلاوتی کے نام سے موسوم کیا۔ اس کتاب نے اکبر کو متاثر کیا اور اس کے ترجمے کا کام فیضی کے سپرد کیا۔ اس ترجمہ کا ایک قلمی نسخہ اب بھی بمبئی یونیورسٹی کی لائبریری میں موجود و محفوظ ہے۔

سنسکرت کے علاوہ ہندی ادب کی طرف بھی اکبر نے بڑی کافی توجہ کی۔ اس نے اس ادب کی بیش بہا کتابوں اور ادبی پاروں کو فارسی میں ڈھالا تاکہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس سے مستفید ہو سکیں۔ اکبر وقتاً فوقتاً خود بھی اس زبان کو روزمرہ کی گفتگو میں استعمال کرتا تھا، چنانچہ ابوالفضل صاحب اکبرنامہ اپنی تصنیف میں جا بجا اس طرف اشارہ کرتا ہے۔ خان آنکہ اور اعظم خاں کے حالات اکثر تاریخوں میں ملتے ہیں۔ تاریخ کے اوراق اس بات کے گواہ ہیں کہ اعظم خاں نے خان آنکہ کو اکبر کی موجودگی میں قتل کیا تھا اس وقت اکبر کے منہ سے جو ہندی جملہ نکلا اسے تاریخ نے یوں پیش کیا ہے:

"خان نزائے برخاست، روزی خان را بحضور در پیش شمشیر کشید و شاہ والا بر آشفتہ بزبان ہندی فرمود کہ ای

"لچھ گاؤدی تو ایوں آنکہ مار"

اکبر نے سنگھاسن بتیسی کا ترجمہ بھی بدایونی اور خواجہ حسین مروی کے ذریعہ سے فارسی میں کرایا اس وقت ایک اور کتاب اکبر کو بہت پسند آئی یہ

کشمیر کی تاریخ تھی اور راج ترنگنی اس کا نام تھا۔ بقول مصنف "بزم تیموریہ" "تاریخ کشمیر یا راج ترنگنی ایک شخص کلہانا نامی کی تصنیف ہے جو سلطان زین العابدین والی کشمیر کے زمانہ میں لکھی گئی تھی۔ مصنف مذکور لکھتا ہے کہ جس وقت اکبر کشمیر میں تھا اس وقت یہ کتاب اس کی نظر سے گزری اس نے چاہا کہ اس کا فارسی ترجمہ ہو، لہذا مولانا شاہ محمد شاہ آبادی نے اس کام کو انجام دیا۔ بدایونی نے بھی سلیس زبان میں اس کا ترجمہ کیا جو شاہی کتب خانہ میں داخل کر دیا گیا۔ ترجمہ کے صلہ میں اکبر نے بدایونی کو دس ہزار تنکہ اور ایک گھوڑا انعام دیا۔ چنانچہ بدایونی خود اپنی تاریخ منتخب التواریخ میں اس کا اعتراف کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں :۔

"و بعد از التفات بسیار دہ ہزار تنکہ انعام و اسپ فرمودند"

بعض اور کتابوں کے نام یہ ہیں :

(۱)	کلیلہ دمنہ ۔۔۔۔۔۔	متر جم	ابوالفضل
(۲)	بحر الاسماء ۔۔۔۔۔۔	"	بدایونی
(۳)	ہربنس ۔۔۔۔۔۔۔۔	"	مولانا شیری
(۴)	اتھروبن ۔۔۔۔۔۔۔۔	"	بدایونی
(۵)	یوگ واشسٹھ ۔۔۔۔۔۔	"	نقیب خاں، ملا شاہ اور ابوالفضل
(۶)	مہیش مہانند ۔۔۔۔۔۔	"	ابوالفضل
(۷)	تاجک ۔۔۔۔۔۔۔۔	"	کمل خاں گجراتی

ترجمہ کا کام سب سے زیادہ ملا عبدالقادر بدایونی نے کیا، اسی لئے اکبر انھیں ہر وقت اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ بدایونی اس سلسلہ میں لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ اجمیر میں متولی کی جگہ خالی ہوئی، امرا نے بدایونی کا نام پیش کیا۔ اس جگہ کے لئے ان سے بہتر اور کوئی شخص ان کی نظر میں نہیں تھا۔ لیکن اکبر کو یہ تجویز پسند نہیں تھی کیونکہ بدایونی کو دربار سے دور اجمیر میں بھیجنا اسے گوارا نہ تھا۔ بدایونی لکھتے ہیں :

"اما چوں چیزہا را باد ترجمہ میفرمایم بسیار خوب و غلط خواہ حی نویسد نمی خواہیم کہ از ما جدا باشد"

(پروفیسر) قاضی محمد ابراہیم

تصانیف نیاز فتحپوری

یادگار قیمت — بہترین تحفہ

من ویزداں — مذہبی استفسارات و جوابات — جمالستان — نگارستان — شہوانیات

مکتوبات نیاز (تین حصے) — انتقادیات — حسن کی عیاریاں — ماہ و ما علیہ — شہاب کی سرگزشت

فلاسفۂ قدیم — مذاکرات نیاز — فراست الید — مذہب — نقاب اٹھ جانے کے بعد

میزان

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف چالیس روپیہ میں مل سکتی ہیں۔

منیجر نگار۔ لکھنؤ

ڈاکٹر فاروقی اور میر تقی میر

"میر تقی میر - حیات اور شاعری"۔ ایک جدید تحقیقی تذکرہ ہے جو ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی نے ایک وسیع مطالعہ کے بعد مرتب فرمایا ہے اور انجمن ترقی اُردو (ہند) نے شایع کیا ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کتاب مرتب کرکے ڈاکٹر فاروقی نے اُردو ادب میں تذکرہ نویسی کی ایک نئی راہ قایم کی ہے اور یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہو کہ اُن کے دلکش اندازِ بیان نے تذکرے کی نثر کو میر کے "شیوۂ گفتار" کا ہم آہنگ بنا دیا۔

اُردو ادب سے مجھے بھی دلچسپی ہے۔ اس لئے میں نے بھی اس تذکرے کو دلچسپی سے پڑھا۔ ایک بار پڑھنے کے بعد دوبارہ پڑھنے کی ضرورت محسوس کی اور دوبارہ پڑھنے کے بعد بے کم و کاست اپنے تاثرات کو پیش کر دینے کا خیال ہوا۔

جس تلاش و تجسس کے ساتھ اُنھوں نے اس تذکرہ کو مرتب فرمایا ہے اُس کا تقاضہ ہے کہ وہ ہر لحاظ سے ایک مکمل تصنیف ہو اور ایسی خامیوں سے پاک ہو جو اُس کی مستند حیثیت یا قیمت پر اثر انداز ہوتی ہوں۔

میرا مقصد صرف یہ ہے کہ کتاب کے دوسرے اڈیشن میں وہ خامیاں دور ہو جائیں جو ایسی اچھی کتاب پر جا بجا بدنما داغ کی طرح نمایاں ہیں۔ اس تذکرہ کی سب سے نمایاں خامی واقعات، حوالہ جات، عبارات اور اشعار کا اعادہ و تکرار ہے۔ اس میں بعض مقامات پر تو ایک ہی عبارت کو اتنی مرتبہ دہرایا ہے کہ ذوقِ سلیم پر بار ہوتا ہے۔ خاص طور سے اشعار کے اعادہ و تکرار نے میر کے بعض بہت ہی پر لطف اشعار کی اہمیت ضایع کر دی۔

کسی ایک تصنیف میں ایک ہی واقعہ کو اُنھیں الفاظ میں وہ جگہ دہرانا بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا لیکن اس تذکرہ میں بعض عبارات اور اشعار چھ چھ مقامات پر دہرا دئے گئے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ متفرق اشعار میں سے شاید ۵، فیصدی اشعار اس تذکرہ میں ایسے ملیں گے جنھیں کم از کم دو مرتبہ ضرور نقل کیا گیا ہے۔ اس قسم کے اعادہ و تکرار سے کہیں بہتر یہ تھا کہ جس شعر کو مختلف مقامات پر مختلف خصوصیات کے تحت بار بار دہرانے کی ضرورت پڑی ہے اُس کے جملہ محاسن ایک ہی جگہ بیان کر دئے جاتے اور اگر اصناف و محاسن کی علٰحدہ علٰحدہ تقسیم و تفصیل ضروری تھی تو پھر ہر ایک کے لئے ایک نئے شعر کا حوالہ مناسب تھا۔ ایک ہی شعر کو بار بار دُہرانے کے معنی یہ بھی ہیں کہ جس شاعر کے محاسن شعری پیش کئے جا رہے ہیں اُس کا کلام اتنا کم مایہ اور تہی دامن ہے کہ مختلف اصنافِ سخن کو الگ الگ پیش کرنے سے عاجز ہیں۔

میر کی شاعری میں محبوب کا تصور خیالی یا فرضی نہیں بلکہ اُس کے خدوخال حقیقی ہیں اور اُن کا عشق واقعاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے کلام میں اُن کی زندگی نمایاں طور پر محسوس کی جاسکتی ہے۔ اس حقیقت کے ثبوت کے لئے میر کا کلام کافی ہے لیکن ڈاکٹر فاروقی نے اسے ایک تاریخی واقعہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس میں اُنھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ تذکرۂ بہارِ بے خزاں کا مندرجہ ذیل اقتباس اُنھوں نے مختلف مقامات پر پوری طوالت کے ساتھ اپنے تذکرے میں نقل کیا ہے۔

ملاحظہ ہو صفحہ ۹۷:-

"تذکرہ بہارِ بے خزاں میں لکھا ہے کہ میر پر شہر خویش بابری تمنائے کہ عزیز افش بود در پردہ تعشق دمیل خاطر داشت۔ آخر عشق او فاصہ مشک پیدا کردہ از ننگ افشائے راز از وطن واقربا دلے لعل پر وردۂ حسرت وحرماں وباخاطر شاد دست وگریباں تطع رشتہ حب وطن ساختہ از اکبر آباد بعد از خانہ برانداز زیبا پیہ شہر لکھنؤ رسید وہمیں جا بہ حسرت جانکاہ ٥

جلا وطنی و حرماں نصیبی از دیدارِ یار و دیار جاں بجہاں آفریں دادتا بقیہ رشتہ حیات بود طرقِ محبت بہ گردن و سلسلۂ دیوانگی بہ پا داشت ۔ از کلام عاشقانہ و درد انگیزش پیداست کہ صد آرزو بخاک بردہ"۔

یہی بات اس کے بعد پانچ جگہ اور ظاہر کی گئی ہے ۔ ملاحظہ ہو:۔ صفحہ ۲۹۵ ـــــ صفحہ ۵۴۱ ـــــ صفحہ ۵۸۰ ـــ صفحہ ۳۸ ـ صفحہ ۴۲ تذکرہ بہار بے خزاں کا یہ بیان جسے خود شیفتہ نے ایک افواہ کی حیثیت دی ہے کسی طرح میر کے معاشقہ کا تاریخی ثبوت نہیں ہو سکتا نہ کتاب میں چھ مختلف مقامات پر دہرانے سے اس کے وزن میں کوئی اضافہ ہو سکتا ہے ۔ نہ ڈاکٹر فاروقی کے اس شدید اصرار پر اس کی حیثیت افواہ سے زیادہ کوئی اور حیثیت اختیار کر سکتی ہے ۔

میر کی شعر و شاعری کے کچھ ذاتی اصول و قواعد تھے وہ صرف ایسی فارسی ترکیبوں کو اُردو میں رائج کرنا چاہتے تھے جو اس زبان میں کھپ سکیں اور اجنبی نہ معلوم ہوں ۔ اس نظریے کے ثبوت میں میر کی "نکات الشعراء" کا ایک حوالہ صفحہ ۳۹۴ پر درج ہے :۔

" چہارم آنکہ ترکیبات فارسی می آرند ۔ اکثر ترکیب کہ مناسب زبان ریختہ می افتد آں جائز است و ایں را غیر شاعر نمی داند و ترکیبے کہ نامانوس ریختہ می باشد آں معیوب است و دانستن ایں نیز موقوف بسلیقہ شاعری ست و مختار فقیر ہمیں ست اگر ترکیب فارسی موافق گفتگوئے ریختہ بود مضائقہ ندارد"۔

یہی حوالہ کتاب میں تین جگہ اور دہرایا گیا ہے ـــــ ملاحظہ ہو صفحہ ۳۱۰ ـــــ صفحہ ۲۹۴ ـــــ صفحہ ۴۳ ۔

مندرجہ بالا حوالہ کو ایک جگہ نقل کرنے سے بھی یہی ظاہر ہوتا کہ میر اُردو شاعری میں فارسی ترکیبوں کے استعمال پر ذوقِ سلیم کی پابندی رکھنا چاہتے تھے ۔ چار جگہ لکھنے کے بعد بھی یہ بات اس حد سے آگے نہیں بڑھتی ۔

" ذکر میر" سے میر کے بچپن کا ایک واقعہ نقل کیا ہے ۔ یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جس وقت میر آگرے سے پہلی بار دہلی آئے ہیں اور صمصام الدولہ کے پاس حاضر ہوئے ہیں ۔ ملاحظہ ہو:

صفحہ ۵۳ ـــ " خواجہ محمد باسط کہ برادر زادۂ صمصام الدولہ امیر الامرا بود حنا تیے بجمالِ من کرد و پیش نواب برد ۔ چوں مرا دید پرسید کہ ایں پسر از کیست ؟ گفت از میر محمد علی است ۔ فرمود از آمدن ایں پیدا است کہ ایشاں از جہاں رفتہ باشند ۔ پس از افسوس بسیار سخن زد کہ آں مرد بر من حقہا داشت ۔ یک روپیہ روز ہ در سرکار من ہا بیں پسری دادہ باشند ۔ التماس نمودم اگر نواب لطف می فرماید دستخط کردہ بدہد کہ جائے سخن منصدیاں نہ ماند ۔ التماسے کہ فرشتہ بودم از کیسہ بر آوردم ۔ ناگاہ از زبانی خواجہ مذکور برآمد کہ وقتِ قلمدان نیست ۔ چوں ایں سخن شنیدم بقاہ قاہ خندیدم ۔ نواب در روئے من دید و سبب خندیدہ پرسید عرض نمودم کہ ایں عیار تر افتد بمیدم ۔ اگر ایشاں می گفتند قلمدان بردار حاضر نیست ایں حرف گنجایش داشت یا آنکہ وقت دستخط نواب نیست باہتی بود وقت قلمدان نیست ۔ انشائے تازہ است ۔ قلمدان چوبی میش نمی باشد وقت و غیر وقت نمی داند ۔ بہر نفرے کہ اشارت رود برداشتہ بیارد نواب بخندہ در آمدہ گفت کہ معقول می گوید ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ"

" دہلی کا پہلا سفر" کے عنوان سے مندرجۂ بالا عبارت کا لفظ بلفظ ترجمہ پوری طوالت کے ساتھ صفحہ ۸۰ پر من وعن درج ہے ۔ اسی طرح صفحہ ۴۴۱ پر میر کے شکار نامے کا ذکر کرتے ہوئے مندرجۂ ذیل عبارت نقل کی گئی ہے :۔

" بندگان عالی برائے شکار تا بہرائچ رفتند من در رکاب بودم شکار نامہ موزوں نمودم بار دیگر بارے برائے شکار سوار شدند تا دامن کوہ شمالی تشریف بردند ۔ اگرچہ مردماں از نشیب و فراز ایں سفر دور و دراز سخت محزون شدند ۔ لیکن شکار چنیں و فضائے چنیں دیدہ بودند بعد از سہ ماہ بدار القرار خود آمدند ۔ فقیرے شکار نامۂ دیگر گفتہ بحضور خواند ۔ دو غزل از غزلہائے شکار نامہ انتخاب زدہ خود بدولت مخلص کردند بخوبی کمی بایست دو رنگین غزل پسند افتادہ غزل دیگر فرمایش نمودند آں ہم از فضل الٰہی گفتہ شد ۔ زبان مبارک بہ تحسین کشادند و داد سخنوری دادند"۔

صفحہ ۲۱۶ پر اس عبارت کا لفظی ترجمہ پھر دہرایا گیا ہے۔

صفحہ ۹۱ پر میر کے سوتیلے بھائی حافظ محمد حسن کا ایک خط جو انھوں نے خان آرزو کے نام لکھا اس طرح درج ہے :-

" میر محمد تقی فتنۂ روزگار است ذہنہا پریشیت او نہایہ پرداخت و در پردۂ دوستی کارش بایہ ساخت آں عزیز نہ دنیا دارد و نہ عقبی بود نظر بہ خصومت ہمشیرزادۂ خود بدمن اندیشید..... چہ بیاں کنم کہ ازوجہ دیدم چگویم کہ چہ حالت کشیدم ..... خصمئی او اگر بتفصیل بیان کردہ آید دفترے جداگانہ می باید خاطر گرفتہ ترشد۔ سودا کردم - دل تنگم تنگ تر گردید۔ وحشتے پیدا کردم ....."

حالانکہ صفحہ ۸۴ - ۸۵ اور ۵۴۰ پر پھر اس واقعہ کا ذکر موجود ہے۔

عبارات اور واقعات کی تکرار کے علاوہ اس تذکرہ میں میر کے جن اشعار کو جگہ جگہ دہرایا گیا ہے اُن کی بھی چند مثالیں دیکھتے جائیے۔ طوالت کے خوف سے میں صرف اُن اشعار کا حوالہ دے رہا ہوں جو اس کتاب میں چار یا اس سے زیادہ مقامات پر دہرائے گئے ہیں۔ تین بار لکھے ہوئے اشعار کا حوالہ دینا بھی فہرست کو کافی طویل بنا دیتا۔ دو مرتبہ کا تو شمار کرنا بھی مشکل ہے۔ میر کا ایک نہایت ہی لطیف شعر ہے :

پاسِ ناموسِ عشق تھا ورنہ کتنے آنسو پلک تک آئے تھے

اس شعر کو علی الترتیب صفحہ ۲۳۶ و ۲۹۹ — ۳۵۱ — ۳۴۲ — ۳۶۵ اور ۳۵۴ پر چھ جگہ نقل کیا گیا ہے

اسی طرح ایک دوسرا شعر :-

ہوگا کسی دیوار کے سائے میں پڑا میر کیا کام محبت سے اس آرام طلب کو

صفحہ ۳۵۱ - ۳۷۱ — ۳۷۵ — ۳۸۰ اور ۴۲۳ پر پانچ مرتبہ دہرایا گیا ہے :

بے خودی لے گئی کہاں ہم کو دیر سے انتظار ہے اپنا

صفحہ ۲۷ — ۲۸۸ — ۳۳۴ — ۳۷۲ اور ۴۰۳ پر پانچ بار نقل کیا گیا ہے۔

کچھ کرو فکر مجھ دوانے کی دھوم ہے پھر بہار آنے کی!

صفحہ ۳۳۳ — ۳۶۳ — ۳۷۳ — ۳۷۵ پر چار جگہ لکھا گیا ہے۔

کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

صفحہ ۴۴ — ۳۹۱ — ۴۹۱ — ۵۰۱ پر چار بار دہرایا ہے۔

سب میر کو دیتے ہیں جگہ آنکھوں میں اپنی اس خاک رہ عشق کا اعزاز تو دیکھو

صفحہ ۴۲ — ۳۴۵ — ۳۴۳ اور ۳۶۵ پر چار جگہ لکھا گیا ہے۔

فٹ نوٹ میں مطالعہ کی ہوئی کتابوں کا ہر مقام پر حوالہ دینے کے بعد بھی کتاب کے آخر میں اُن کا ایک طویل ضمیمہ شامل کرنا غیر ضروری تھا دوسرا نقص جو اس تذکرے میں محسوس ہوتا ہے وہ میر کے قیام لکھنؤ کے حالات اور واقعات کی کمی ہے یہ کمی اس وجہ سے اور بھی محسوس ہوتی ہے کہ قیام دہلی کے حالات اور تفصیلات بیان کرنے میں مصنف نے غیر معمولی طوالت سے کام لیا ہے یہاں تک کہ بعض غیر ضروری تاریخی حوالے بھی دیدئے ہیں۔ مثال کے طور پر غلام قادر روہیلہ کے مظالم کی تفصیلات ہر چند کہ اُس زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں جب میر دہلی سے خیر باد ہو چکے تھے اس لحاظ سے یہ حادثہ میر کا تاریخی منظر نہیں ہو سکتا، پھر بھی انھوں نے اس ناگفتنی حادثے کی تفصیل تاریخ وار لکھی ہے۔ اس سلسلہ میں مولوی خیر الدین کا روزنامچہ لکھنے سے بہتر ہوتا کہ خود " ذکر میر " سے اس واقعہ کو نقل کر دیا جاتا جس سے واقعہ کے ساتھ اُن کے ذاتی تاثرات یا ردِ عمل کا اندازہ ہو جاتا۔

اس کے برعکس لکھنؤ کے قیام کا حال اس قدر تشنۂ تفصیل ہے کہ میر کی عمر کے آخری دس سال میں سے صرف اُن کی موت اور نواب الموت کا

ایک حوالہ راجہ صاحب محمود آباد کے قلمی نسخہ سے اور دوسرا "تذکرۂ خوش معرکۂ زیبا" سے دیا ہے اور بس - کوئی ایسی تاریخی تفصیل اُن کے قیام لکھنؤ کی نہیں ملتی جس میں اُن کی روزمرہ زندگی کی جھلک دکھائی دیتی ہو۔ اس کمی سے ایک بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ اُنھوں نے بعض نہایت ہی ضعیف روایات کی بنا پر بہت اہم نتائج مرتب کرلئے ہیں۔ مثلاً تذکرۂ گلشنِ ہند سے ایک عبارت نقل کی ہے :-

"نواب آصف الدولہ نے روز ملازمت خلعت فاخرہ دیا اور تین سو روپیہ ماہوار مقرر کرکے تحسین علی خاں ناظر کے سپرد کردیا۔ اگرچہ گرفتہ مزاجی سے روز بروز صحبت نواب مرحوم سے بگڑتی گئی لیکن تنخواہ میں کبھی قصور نہ ہوا اور نواب سعادت علی خاں کے عہد میں آج کے دن تک کہ ۱۲۱۵ھ ہے وہی حال ہے جو اوپر مذکور ہوا" صفحہ ۵۴۲

محض اس عبارت کی بنا پر فاروقی صاحب نے نہ صرف تذکرہ "آبِ حیات"، تذکرۂ ناصر، تذکرۂ بہارِ بے خزاں اور تذکرہ خوش معرکۂ زیبا کے حوالہ جات کو نظر انداز فرما دیا بلکہ خود "گلشنِ ہند" کی یہ عبارت بھی بھول گئے جو اُنھوں نے صفحہ ۳۱۰ پر نقل کی ہے اور جس میں خود اسی مصنف (مرزا علی لطف) نے لکھا ہے :-

"میر سا شاعر جو کہ سحرہ ریِ سخن میں طلسم سازِ خیال کا جادو طرازِ بیان میں معانی پرواز ہے مقال کا وہ نان شبینہ کا محتاج ہے۔ اور بات کوئی نہیں پوچھتا اس کی آج ہے"[1]

ڈاکٹر فاروقی اس تضاد کو نظر انداز فرما گئے اور اس نتیجہ پر پہونچ گئے کہ :-

"تنخواہ کے ناغہ ہونے اور دیر سویر کی رعایت کرنے کے باوجود لکھنؤ میں میر کا حال دہلی سے بہتر تھا" صفحہ ۵۴۲

ستم بالائے ستم یہ کہ مرزا علی لطف کا پہلا بیان ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء کے بارے میں ہے اور میر کی وفات ۱۸۱۰ء میں ہوئی لیکن اُنھوں نے محض اس بیان کی بنیاد پر صاحب آبِ حیات کی اس تحقیق کو غلط قرار دیدیا کہ آخر عمر میں میر کی تنخواہ بند ہوگئی تھی۔

میرے نزدیک اول تو مرزا علی لطف، صاحبِ گلشنِ ہند کی تحقیق قابلِ لحاظ نہیں اس لئے کہ اُن کے بیان میں زمین و آسمان کا تضاد ہے جو صفحہ ۳۱۰ اور صفحہ ۵۴۲ کے حوالہ جات سے واضح ہے پھر جو واقعہ اُنھوں نے بیان کیا ہے کہ میر کی تنخواہ بدستور جاری ہے وہ ۱۲۱۵ھ/۱۸۰۰ء کی بات ہے اور میر کا انتقال ۱۲۲۵ھ/۱۸۱۰ء میں ہوا، اس لئے اس بیان سے صاحب آبِ حیات کی اس تحقیق کی تکذیب نہیں ہوتی کہ آخر عمر میں میر کی تنخواہ بند ہوگئی تھی اس کے برعکس دوسرے تذکرہ نگاروں کے بیانات اس کی تائید میں ہے خصوصاً تذکرۂ خوشِ معرکۂ زیبا کا یہ حوالہ کہ: "جب میر صاحب بیمار ہوئے تو وصیت کی کہ میرے جنازے کے اُٹھانے میں تعجیل نہ کرنا جو جئے گا میر نے انتقال کیا ہے خواہ تنخواہ بند ہوگئی تھی بلکہ اُن کی مالی حالت بھی حد سے زیادہ سقیم ہوگئی تھی۔

اس سلسلے میں فاضل مصنف نے نوادر الکملاء کی ایک عبارت کا صفحہ ۲۶۳ پر حوالہ دیا ہے جس میں میر کے مرض الموت میں شاہی طبیبوں یا مصاحبوں کے آنے اور عیادت کرنے کا ذکر ہے اُس سے بھی یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان لوگوں کو نواب سعادت علی خاں نے بھیجا تھا اگرچہ ڈاکٹر فاروقی نے اس سے یہی نتیجہ اخذ کیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ میر صاحب کا چونکہ ایک عرصہ تک دربار اودھ سے واسطہ رہ چکا تھا یوں بھی وہ ایک نامور شخصیت تھے اس لئے شاہی طبیب یا مصاحبین اپنے ذاتی تعلقات کی بناء پر میر صاحب کی عیادت کے لئے آئے۔

اسی حوالہ کے اس جملہ سے کہ "چہ تحسین باکہ نرسند و چہ آفرین باکہ نکشند" اُن کا یہ نتیجہ نکالنا بھی حیرت انگیز ہے کہ "میر صاحب نے لکھنؤ میں بھی فارغ البالی سے زندگی بسر کی" صفحہ ۲۶۲ - حالانکہ صاحب آبِ حیات کی تحقیق کے مطابق اس کا یہ مفہوم زیادہ قرین قیاس معلوم

---

[1] فاروقی صاحب نے یہ دونوں عبارتیں "گلشنِ ہند" سے نقل کی ہیں۔ ممکن روشن عبارت کا یہ اختلاف کہ دوسرے حوالہ کی نثر مقفیٰ ہے اور پہلے کی سادہ، اس اشتباہ کو تقویت دیتا ہے کہ یہ دونوں عبارتیں ایک ہی تذکرہ کی زبان نہیں ہوسکتیں۔ دونوں حوالہ جات میں جو واقعاتی تضاد ہے وہ علٰحدہ محلِ نظر ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ تذکرۂ گلشنِ ہند مجھے یہاں دستیاب نہ ہوسکا جو اس اختلاف کی تصدیق کرسکتا۔

"خالی آداؤں سے تو خاندان نہیں پلتے"

مجھے اس سلسلہ میں فاضل تذکرہ نگار سے ایک بنیادی اختلاف بھی ہے جس کا اظہار بے محل نہ ہوگا۔ اُردو غزل کی خالص عشقیہ شاعری کو تاریخی پیمانے سے ناپنے کی کوشش ایک ایسا اقدام ہے جو بہت کچھ احتیاط کے باوجود گمراہ کن ہو سکتا ہے۔ اس لئے کہ جہاں اُردو غزل کی اشاراتی شاعری میں ہمیں میر کی آپ بیتی کی جھلکیاں نظر آجاتی ہیں وہاں ریاض جیسے زاہد شب زندہ دار کو ہم شراب کے نشے میں چور مست و مخمور یہ شعر گنگناتے ہوئے بھی سنتے ہیں ؎

ہم بھی پئیں تمھیں بھی پلائیں تمام رات
جاگیں تمام رات جگائیں تمام رات !!

پھر میر کی غزلوں سے کسی تاریخی ترتیب کا پتہ نہیں چلتا اور یہ طے کرنا ناممکن ہے کہ فلاں غزل دہلی کے دورِ پُر آشوب میں کہی گئی ہے اور فلاں لکھنؤ کی "سرزمین شعر و جمال" میں۔

پھر اس کا کیا جواب ہے کہ میر کے ہم عصر مشاہیر یعنی وہ لوگ جن کی شعر و شاعری کا تاریخی پس منظر بالکل وہی ہے جس میں فاروقی صاحب نے میر کی تصویر کو فٹ کیا ہے، حالات سے بالکل بے نیاز نظر آتے ہیں اور اُن کے کلام میں اُس آگ کی لپٹ کہیں بھی محسوس نہیں ہوتی جس سے زمانہ جل رہا تھا اور جو میر کی شاعری کا مزاج بن گئی تھی۔ مثال کے طور پر سودا (متوفی ۱۷۸۰ء) کے کلام کو لیجئے ایک شہر آشوب کے علاوہ اُن کی تمام غزلیں پڑھ جائیے، سارے قصاید دیکھ جائیے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ تاریخی زاویۂ نگاہ سے یہ شخص کس طرح میر کا ہم عصر ہو سکتا ہے ؟۔ سودا کے علاوہ قائم (متوفی ۱۷۹۵ء) سوز (متوفی ۱۷۹۹ء) ۔ میر حسن (۱۷۸۶ء) ۔ مصحفی (۱۸۲۴ء) ناسخ (۱۸۳۸ء) انشا (۱۸۱۷ء) ۔ جرأت (۱۸۱۰ء) ۔ رنگین (۱۸۳۴ء) ۔ نظیر (۱۸۳۰ء) — ان تمام مشاہیر کی شاعری پر آپ کیا حکم لگائیں گے ؟

حقیقت یہ ہے کہ ہر فطری شاعر کی شاعری کا اپنا علٰحدہ مزاج اور مخصوص انداز ہوتا ہے۔ پھر غزل کا میدان تو وارداتِ عشق و محبت کے لئے مخصوص ہے اُسے تاریخ و سیاست سے کیا واسطہ۔ پھر غزل کا میدان تو وارداتِ عشق و محبت کے لئے مخصوص ہے اُسے تاریخ و سیاست سے کیا واسطہ ؟۔

میر ایک منفرد شخصیت رکھتے تھے اور زمانہ سے علٰحدہ ایک مزاج۔ وہ فطری شاعر تھے اسی لئے اُن کا شیوۂ گفتار بھی منفرد ہے اور اُن کی شاعری کا مزاج بھی سب سے الگ۔ اُن کے کلام کے مطالعہ سے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح آشکارا ہو جاتی ہے کہ جو مضامین دوسروں کے لئے خیالی تھے وہ اُن کے لئے حالی تھے۔ اُن کے یہاں تصنع اور مبالغہ نہیں اسی لئے اُن کی باتیں سچے جذبوں کی طرح دل میں اُترتی چلی جاتی ہیں۔ ان ہی سیدھی سادی حقیقتوں کو اُن کا "شیوۂ گفتار" نشتر بنا دیتا ہے۔ ایسا دل دوز نشتر جس کی کھٹک "دیر تک سر دھننے" پر مجبور کر دیتی ہے ؎

باتیں ہماری یاد رہیں پھر باتیں ایسی نہ سنئے گا !
پڑھتے کسی کو سنئے گا تو دیر تلک سر دھنئے گا !

اس دعوے کی صداقت کے لئے تاریخی شواہد کی تلاش میر کی شاعری پر اچھا خاصہ ظلم ہے اور اس پر اصرار کرنا کہ سب آہ و بکا فلاں "پری تمثال عزیزہ" کا طفیل ہیں، بڑا نامناسب عمل ہوگا۔

اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ میر کا کوئی اپنا مزاج نہ تھا بلکہ حالات نے اُن کا ایک مزاج بنا دیا تھا۔ یہی دلیل ہمیں اس نتیجہ پر بھی پہونچا سکتی ہے کہ میر فطری شاعر نہ تھے بلکہ حالات نے اُنھیں شاعر بننے پر مجبور کر دیا تھا۔

میر ۱۷۲۵ء میں پیدا ہوئے۔ گیارہ سال کی عمر میں یعنی ۱۷۳۶ء میں دہلی آئے اور ۱۷۸۲ء میں لکھنؤ چلے گئے ۱۸۱۰ء میں

لکھنؤ اُن کا انتقال ہوا۔

میر کے اس نوے سالہ دورِ حیات کو جس طرح فاروقی صاحب نے تقسیم کیا ہے۔ مجھے اُس پر بھی اعتراض ہے۔ میر کے قیام دہلی کے ۴۵ سال کی تاریخ کتاب کے دو سو چھیالیس صفحات پر پھیلی ہوئی ہے اور قیام لکھنؤ کے ۲۸ سال محض پندرہ سال میں ختم کر دئے گئے ہیں اور صفحہ ۲۶۰ پر میر کی وفات کا واقعہ لکھنے کے بعد اُن کی اولاد اور شاگردوں کا بیان شروع کر دیا گیا ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اُن کی زندگی کے دورِ آخر کا بیان کسی قدر تشنۂ تشریح ہے؟ اس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ ابتدائی ریسرچ کو اُنھوں نے اتنا پھیلا دیا کہ اخیر میں وہ تھک گئے اور اکثر کام کو سمیٹ لیا۔ دوسری یہ کہ لکھنؤ، دہلی سے دور تھا اور جس طرح دہلی میں اُنھیں مولوی خیرالدین کا روزنامچہ، دہلی کرانیکل اور اُردو اخبار آسانی سے مطالعہ کے لئے مل گئے اس طرح شاہانِ اودھ کی صبح و شام دیکھنے کے لئے نہ مل سکی۔ کیا اچھا ہوتا کہ میر کے قیام لکھنؤ کا تاریخی پس منظر بھی وہ شاہانِ اودھ کی تاریخوں۔ تذکروں اور روزنامچوں سے مرتب کر سکتے۔ کتاب تاریخی حیثیت سے بھی بہتر ہو جاتی اور اس تحقیق میں میر کی زندگی کے وہ گوشے بھی روشنی میں آجاتے جو ایک متضاد ماحول میں اُنھوں نے بسر کئے۔

میر کی ریسرچ کا غالباً سب سے اہم کام اُن کی کسی مستند تصویر کا حاصل کرنا اور اُن کی قبر کا پتہ لگانا تھا جس کی طرف کافی توجہ نہیں کی گئی۔ تصویر کا پتہ معلوم ہو جانے پر بھی اُسے حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی گئی اور قبرستان کی نشان دہی کے باوجود قبر کا سراغ نہ مل سکا حالانکہ اس حد تک اُنھوں نے معلوم کر لیا کہ میر تقی کے بیٹے عرش کے انتہائی معتقد شاگرد ۱۸۹۸ء تک حیات تھے جنھیں یقیناً میر کی قبر کا پتہ معلوم ہوگا۔ اُن کی اولاد یا میر کی اولاد، یا میر کی اولاد میں اب بھی کوئی نہ کوئی شخص ایسا مل سکتا تھا جو اس طرف رہبری کر سکتا لیکن یہ سب کام لکھنؤ کے طویل قیام کے بعد ہی ممکن ہو سکتا تھا۔

کنور لطافت علی خاں

علم النفس کا ایک نکتہ

جرمنی کا مشہور وزیر بسمارک، ایک روز اپنے کسی دوست کے ساتھ شکار کو گیا۔ اتفاقاً اُس دوست کا پاؤں پھسل گیا اور وہ دلدل میں جا پڑا، جس سے نکلنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ آخر مجبور ہو کر اس نے اپنے دوست بسمارک کو آواز دی اور دوستی کا واسطہ دلا کر کہا: "مجھے اس مصیبت سے کسی طرح نکالو، ورنہ میں مر جاؤں گا۔"

ہر چند صورتِ حال نہایت خطرناک تھی، لیکن بسمارک نے نہایت اطمینان سے جواب دیا کہ: "میں تمہارے لئے اپنی زندگی کو قربان نہیں کر سکتا، کیونکہ اگر میں تم سے قریب ہوا، تو وہی مصیبت میرے لئے بھی ہے جس میں تم گرفتار ہو، اور چونکہ اب تمہاری موت یقینی ہے، اس لئے میرے امکان میں صرف یہی ہے کہ تمھیں تکلیف کی موت سے نجات دوں اور کچھ ایسی تدبیر کروں کہ تمہاری جان بجائے آہستہ آہستہ نکلنے کے دفعتہً پرواز کر جائے۔" یہ کہکر اس نے اپنے دوست کی طرف بندوق سیدھی کی اور کہا کہ: "حرکت نہ کرو تاکہ گولی ٹھیک تمہارے سر میں لگے۔"

بسمارک کی طرف سے یہ غیر متوقع طرزِ عمل دیکھ کر وہ شخص دلدل کی مصیبت تو بھول گیا اور گولی سے بچنے کے لئے اپنی تمام کوششیں صرف کرنے لگا اور آخر کار دلدل سے باہر نکل آیا۔ بسمارک کا مقصود یہی تھا کہ وہ موت کی بالکل یقینی صورت پیشِ نظر رکھ کر اپنی تمام کوشش جان بچانے میں صرف کر دے، چنانچہ اس میں اُسے کامیابی ہوئی۔

عنترہ بن شداد

عنترہ بن شداد عبسی، جس کا زمانہ ظہور اسلام سے سات سال قبل تھا، شعراء عرب کے طبقۂ اولیٰ میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ شاعر اُس سرزمین حسن و محبت میں پیدا ہوا تھا، جو نجد کہلاتی ہے اور اس کا تعلق اس قبیلۂ بنی عبس سے تھا جو ایام عرب میں، اپنی بہت سی خصوصیات کی وجہ سے اک نمایاں امتیاز کا مالک تھا۔

اس کی ماں ایک سیاہ فام کنیز تھی، جسے اس کا باپ کسی لڑائی میں پکڑ لایا تھا۔ ماں کی وجہ سے عنترہ کا رنگ بھی حبشیوں کی طرح سیاہ تھا، جس کی وہ تعریف کرتا ہے:۔

یعلبونی بالسواد جہالۃً ولولا سواد اللیل ما طلع الفجر[1]

لوگ اپنے جہل و نادانی سے میرے رنگ پر سیاہی کا عیب لگاتے ہیں، درانحالیکہ اگر رات کی سیاہی نہ ہوتی تو صبح کبھی نمودار نہ ہوتی

عرب میں دستور تھا کہ کنیز زادہ کو اپنی طرف منسوب نہ کرتے تھے، بلکہ اُسے غلام بنا لیتے تھے۔ چنانچہ اسی دستور کے مطابق عنترہ کا شمار بھی غلاموں میں تھا اور وہ غلاموں ہی کی طرح ذلیل زندگی بسر کرنے پر مجبور تھا۔

ایک مرتبہ عرب کے کسی قبیلہ نے بنی عبس پر حملہ کیا اور بہت سے آدمیوں کو قتل کر کے عورتیں اور مویشی پکڑ لے گئے، چونکہ عنترہ غلام تھا اسلئے اس نے قصداً بنی عبس کی مدد نہیں کی۔ اس کا باپ شداد اس کے پاس گیا اور کہا کہ تمہیں بھی ہمارے ساتھ جنگ میں شریک ہونا چاہیئے۔ عنترہ نے جواب دیا کہ "میں تو ایک ذلیل غلام ہوں اور میرا کام صرف مویشی چرانا ہے"۔ باپ نے کہا "اچھا ہم نے تمہیں آزاد کیا"۔ یہ سُنکر عنترہ نے دشمن پر حملہ کیا، جسے دیکھ کر قبیلۂ بنی عبس کے اور لوگوں کو بھی غیرت آئی۔ عنترہ نے اس جنگ میں بہادری کے خوب خوب جوہر دکھائے اور دشمن

---

[1] ابو اسحاق ابراہیم حرّانی نے جو صابی المذہب تھا، سیاہ رنگ کی تعریف زیادہ حسن کے ساتھ بیان کی ہے۔ اس کا ایک غلام یمن بہت سیاہ فام تھا اُس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:۔

قد قال یمن وہو اسود للذی ۔ بیضا نہ استعلے علوا لحاجبین
ما فخر جبک بالبیاض وہل تری ۔ ان قد افدت بہ مزید محاسن
ولو ان منی فیہ خالاً زانہ ۔ ولو ان منہ خالاً شانتی

یعنی یمن نے جو سیاہ فام ہے ایک گورے شخص سے کہا کہ تجھے اپنے سپید رنگ پر فخر کرنے کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ اس سے تیرے محاسن میں کوئی اضافہ نہیں ہو سکتا۔ اگر میرے رنگ سے بمقدار ایک تل کے بھی تجھے مل جائے تو تیری زینت بڑھ جائے اور اگر تیرے رنگ کا ایک نقطہ بھی میرے رنگ پر پڑ جائے، تو میں بدنما ہو جاؤں۔

دوسری جگہ وہ ان الفاظ میں سراپا کہتا ہے:

فیہ معنے من البدور ولکن ۔ نقضت صبغہا علیہ اللیالی
لم یشنک السواد بل زرت حسنا ۔ انما یلبس السواد الموالی

اس چہرہ میں تو بدر کامل کے معنے پنہاں ہیں، جس پر راتوں نے اپنا رنگ پھیلا دیا ہے، سیاہی نے تجھے بدنما نہیں کیا، بلکہ تیرا حسن اور دوبالا ہو گیا ہے کیونکہ سیاہ رنگ ہی وہ رنگ ہے جسے موالی سردار پہنا کرتے ہیں" (اڈیٹر)

کو شکست دے کر تمام مال غنیمت چھین لیا۔ باپ نے جب عنترہ کا یہ شاندار کارنامہ دیکھا، تو بہت خوش ہوا اور سب کے سامنے کہا کہ "عنترہ میرا بیٹا ہے"۔ اس کے بعد عنترہ کی زندگی کا دوسرا دور شروع ہوا اور اس کی شجاعت، بلند ہمتی، عزتِ نفس تمام عرب میں مشہور ہو گئی۔

اسلام سے قبل عرب کا دستور تھا کہ جب کسی قبیلہ کے پاس کچھ کھانے کو نہ رہتا، تو دوسرے قبیلہ پر حملہ کر کے اس کا مال و اسباب لوٹ لیتے، اسی لئے وہ شخص جو زیادہ شجاع ہوتا تھا، ایسے معرکوں میں حصہ لیتا تھا اور وہی بڑا عزت والا خیال کیا جاتا تھا۔ چنانچہ عنترہ خود لکھتا ہے:۔

لعمرک إنّ المجد و الفخر و العُلیٰ	تیری عمر کی قسم، بزرگی، فخر، علوئے مرتبت، مقاصد کا حصول
قبل الامانی و ارتفاع المراتب	اور مرتبوں کی بلندی، صرف اس شخص کا حصہ ہوتی ہے جو
من یلتقی ابطالها و سراتها	ان صفات کے مالکوں، بہادروں اور سرداروں سے شمشیر زنی
لقلب صور عند وقع المضارب	کے وقت نہایت استقلال سے مقابلہ کرے، اور تلوار کی دھار
بنی لجدّ التیهف مجداً مُشیّداً	سے ایسے بلند مرتبہ والی عظمت کی بنیاد قایم کرے، جو آسمان کے
لی فلک العُلیا و فوق الکواکب	ستاروں سے بھی زیادہ بلند ہو۔

عنترہ میں بھی، شجاعت، اقدام جری، شہامت حربی، جو جاہلیت عرب کے تنہا فضایل تھے، درجۂ کمال موجود تھے۔ وہ اپنے زمانہ کی تمام مشہور لڑائیوں میں شریک ہوا، جس کی سرگزشت نہایت دلچسپ ہے۔

یوسف بن اسماعیل مصری نے (جو روایاتِ عرب میں، ابو عبیدہ، ابن ہشام اور اصمعی کا شاگرد ہے) عنترہ کی تمام لڑائیوں کا قصہ نہایت دلچسپ انداز میں لکھا ہے۔

عنترہ، صرف بہادر و شجاع ہی نہ تھا، بلکہ عرب کا فصیح ترین شاعر بھی تھا، اس کا کلام ان ثقیل الفاظ سے خالی ہے جو اکثر شعراء جاہلیت کے کلام میں پائے جاتے ہیں۔ اس کا طرزِ بیان اور اندازِ تعبیر بھی سب سے نرالا تھا۔ حسنِ تخیل، نزاکتِ مضمون، تصرفِ معانی، لطافتِ تشبیہ، حلاوتِ بیان اور سب کچھ اس کے حصہ میں تھا اور چونکہ اس کے دل میں محبت کا شریف جذبہ بھی موجود تھا، اس لئے اس کا کلام حسیاتِ قلب کی بھی بہترین تصویر ہے۔

عنترہ کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ باوجود شاعرِ جاہلیت ہونے کے، اس کے کلام میں وہ عریانی نہیں ہے، جو آدابِ شاعری اور ذوقِ لطیف کے منافی ہو۔ امرالقیس، جو عرب کا ملک الشعراء خیال کیا جاتا ہے، ہر چند بلند طبقہ کا شخص (یعنی شاہزادہ) تھا۔ لیکن اس کے کلام میں بعض مواقع پر اس قدر عریانی ہو جاتی ہے کہ مہذب طبایع اس کا سننا گوارا نہیں کر سکتے، برخلاف اس کے عنترہ کا سادہ دیوان پڑھ جایئے، لیکن آپ کو کوئی شعر ایسا نہ ملے گا جو لطیف طبائع پر گراں ہو۔

عنترہ کو اپنی عم زاد بہن عبلہ بنت مالک سے بڑی محبت تھی۔ عرب میں دستور تھا کہ اگر لڑکی والے کو معلوم ہو جاتا کہ فلاں شخص میری لڑکی سے محبت کرتا ہے، تو کبھی اس کے ساتھ عقد نہ کرتا۔ چنانچہ عنترہ کو بھی ابتدا میں یہی مشکلات پیش آئیں، بڑی کوششوں کے بعد عبلہ کا باپ نکاح کر دینے پر راضی ہوا، لیکن شرط یہ کی کہ مہر میں عراق کی بہترین اونٹنیاں دی جائیں۔ غریب عنترہ یہ شرط پوری کرنے کے لئے عراق پہونچا، لیکن یہاں بدقسمتی سے اس کو منذر بن ماء السماء نے جو عراق کا بادشاہ تھا، قید کر لیا اور اس کے پاؤں میں لوہے کی بیڑیاں ڈالیں۔ عنترہ نے اسی عالم میں، عبلہ کی یاد اور اس کے وداعی الفاظ کو اس طرح ظاہر کیا ہے:

جفون العذاری من خلال البراقع	کنواریوں کی پلکیں، نقاب کے اندر بھی، درخشاں باریک اور
احدّ من البیض الرقاق القواطع	کاٹنے والی تلواروں سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہیں۔

إذا تجرت ذلّ الشجاع واصبحت	جب یہ لوایں (بدلیں) عریاں ہوتی ہیں، تو بڑے بڑے بہادر
محاجرہٗ قرحیٰ تفیض المدامع	سرنگوں ہوجاتے ہیں اور ان کی آنکھیں خرطگریہ سے مجروح ہوجاتی
لقد ودّعتنی عبلۃٌ یوم بینہا	ہیں، عبلہ نے فراق کے دن مجھے رخصت کیا اور اسے یقین تھا کہ
وداع یقلن انّنی غیر راجع	میں اب کبھی واپس نہ ہوسکوں گا۔
وناحت وقالت کیف تصبح بعدنا	وہ رونے لگی اور پوچھا کہ تم ہمارے بعد اپنا وقت کس طرح
اذا غبت عنّا فی القفار الشواسع	گزارو گے، جبکہ تم دور و دراز صحراؤں میں ہم سے دور ہوگئے
فکن واثقًا منّی بحسن مودّۃٍ	(بہرحال) میری طرف سے حسن محبت کا یقین رکھو اور
وعش ناعمًا فی غبطۃٍ غیر جازع	آرام و امن سے قابل رشک زندگی بسر کرو۔
أیا علم السّعدیٰ ہل انا راجعٌ	اے جبل سعدی، کیا میں پھر کبھی واپس آؤں گا اور تیرے اطراف
وانظر فی تطریک زہر الاراجع	میں موسم بہار کے کھلے ہوئے پھولوں کو نظارہ کرسکوں گا؟

اس کے بعد عنترہ ایک زمانہ تک قید کے مصائب برداشت کرتا رہا۔ پھر بڑی مشکلوں سے رہا ہوا اور اپنے مقاصد میں کامیاب ہوکر نوے سال کی عمر تک جیا۔

(۴)

عام خیال ہے کہ عرب، چونکہ غیر متمدن وحشیانہ زندگی بسر کرتے تھے، اس لئے ان کے اشعار میں، لطافت، تشبیہ، رقت معانی اور حسن تعبیر کیا نہیں پایا جاتا، جو ایک متمدن ملک کے پوقلموں مناظر دیکھنے والے شاعر کے کلام میں ہوسکتا ہے، لیکن اگر شعراء عرب کے کلام کا استقصا کیا جائے تو معلوم ہوسکتا ہے کہ باوجود غیر متمدن اور وحشی ہونے کے، ان کے کلام میں وہ لطیف استعارات، نازک تشبیہات اور نادر اسلوب بیان پایا جاتا ہے، جو دوسری قوموں کے شعراء کو اگر حاصل ہوا بھی ہے تو اس وقت جب وہ تمدن کے تمام مدارج طے کرچکے تھے۔

اب ہم مناسب سمجھتے ہیں کہ کلام عنترہ کا انتقاد پیش کریں، جس سے ہمارے اس قول کی پوری تصدیق ہوسکتی ہے۔ تشبیہ کی خوبی یہ ہے کہ وجہ شبہ، جس قدر مشبہ اور مشبہ بہ کے درمیان زیادہ مشترک ہوگی اور جس قدر ان میں تناسب معنوی زیادہ ہوگا اسی قدر وہ زیادہ لطیف ہوگی۔ ایک جگہ عنترہ کہتا ہے:-

وَرَنَت فقلت غزالۃٌ مذعورۃٌ	محبوبہ نے دیکھا، تو میں نے کہا کہ یہ کوئی خوفزدہ ہرنی ہے
قدرا عہا وسط الفلاۃ بلاؤ	جسے وسط صحرا میں کسی خوفزدہ شے نے ڈرایا ہے۔

محبوبہ کی تشبیہ خوفزدہ ہرن سے جیسی مکمل ہے، محتاج بیان نہیں، محبوبہ جب اپنے عاشق کو دیکھتی ہے تو اس کی نگاہوں اور اداؤں میں بالکل اسی طرح کی دہشت پیدا ہوجاتی ہے، جیسے ایک خوفزدہ ہرن کی، کیونکہ اس کو بھی یہ ڈر لگا رہتا ہے کہ کوئی دیکھتا نہ ہو۔

دوسری جگہ لکھتا ہے:

وبدت فقلت البدر لیلۃ تمّہ	جب وہ ظاہر ہوئی تو میں نے کہا یہ تو چودھویں رات کا چاند ہے
قد قلّدتہ نجومہا الجوزاؤ	جسے جوزا نے اپنے ستاروں کا ہار پہنا دیا ہے۔

اس شعر میں عنترہ نے چہرۂ محبوب کو چاند سے تشبیہ دی ہے جو ایک عام تشبیہ ہے، لیکن اسی کے ساتھ ساتھ دوسری تشبیہ بھی ہے جس کا مشبہ مذکور نہیں ہے، یعنی محبوبہ موتیوں کا ہار بھی پہنے ہوئے ہے، جس کو نجوم جوزا سے تعبیر کیا، ظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اصل مقصود صرف چاند سے تشبیہ دینا تھا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ شاعر کا مدعا اس شعر میں، صرف چاند کی خوبی ظاہر کرنی تھی، جسے نہایت لطیف استعارہ کی صورت میں بیان کرگیا۔

ایک موقعہ پر عنترہ میدانِ جنگ کا نقشہ اس طرح پیش کرتا ہے :-

تطیر رؤس القوم لحت ظلامها — غبار لشکر کے نیچے، لوگوں کے سر اس طرح اُڑتے اور سرعت کے
وتنقض فیها کالنجوم الثواقب — ساتھ گرتے ہیں۔ گویا وہ شہاب ثاقب ہیں۔
وتلمع فیها البیض من کل جانب — اور اس میں سپید تلواریں ہر طرف سے اس طرح چمک رہی ہیں،
کلامع بروق فی ظلام الغیاهب — جیسے سخت اندھیری میں بجلیاں کوندتی ہیں۔

چونکہ حماست، خاص عنترہ کے ذوق کی چیز ہے اس لئے اشعار مذکورۂ بالا میں اس نے جس جوش سے کام لیا ہے اور مشبہ بہ جس قدر موزوں تلاش کیا ہے وہ ارباب فہم سے مخفی نہیں۔ چونکہ منظر کی ہیبت لوگوں پر ظاہر کرنی مقصود تھی، اس لئے مشبہ بہ اُسی انداز کا تلاش کیا اور یہی ہے اصل بلاغت، جو ہر شاعر کا حصہ نہیں ہوتی۔

ذیل کے اشعار میں، عنترہ نے شاہانِ روشن طلعت کو جدا جدا دو تشبیہوں سے ظاہر کیا ہے اور ان میں سے ہر تشبیہ اپنی جگہ مکمل ہے۔ لکھتا ہے :

لمن الشموس عزیزة الاحداج — سواریوں پر یہ کس کے آفتاب ہیں، جنھیں مردوں کی طرف ذرا
ایطاعن بین الوشی والدیباج — التفات نہیں ؟ (ہاں) یہ وہ آفتاب ہیں جو حریر و دیبا کے لباس
من کل فاتنة الجمال کریمة — سے مطلوع ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک جمال فایقہ کی مالک ہے
من لولوٍ قد صوّرت فی عاج — اور اُن موتیوں کی طرح ہے جو عاج میں بنائے جاتے ہیں۔

پہلا شعر استعارہ کی بڑی دلکش مثال ہے اور دوسرے شعر میں جو تشبیہ پیش کی گئی ہے، وہ اپنی جدت و ندرت کے لحاظ سے خوب ہے کسی حسین صورت کو دیکھ کر یہ کہنا کہ وہ تختۂ عاج پر موتی کی تصویر ہے۔ نزاکتِ تخیل کا نہایت پیارا نمونہ ہے :

اشارت الیها الشمس عند غروبها — غروب ہوتے وقت آفتاب نے اس کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ میرے
تقول اذا سوالہ جئی فاطلعی بعدی — بعد جب تاریکی بڑھ جائے تو تو طلوع ہو جانا، اور بدر منیر نے اس سے
قال لها البدر المنیر الاسفری — کہا کہ تو رُخ سے نقاب کیوں نہیں اُٹھا دیتی کیونکہ کمال و سعد میں
فانک مثلی فی الکمال و فی السعد[1] — تو بھی میری ہی طرح ہے (یہ سنکر) اس نے مارے شرم کے پیشانی پر
فولّت حیاءً ثم ارخت لثامها — لی، نقاب چہرہ پر ڈالا اور اپنے رخسار سے تازہ گلاب
وقد نثرت من خدّها رطب الورد — بکھیرتی ہوئی چلی گئی۔

یوں تو تینوں شعر اپنی اپنی جگہ، اندازِ بیان کا بہترین نمونہ ہیں، لیکن خصوصیت کے ساتھ تیسرا شعر بہت زیادہ قابلِ تعریف ہے، جس میں حیاءً لورد رخساروں کی حالت "تازہ گلاب بکھیرنے" سے ظاہر کی گئی ہے۔ حالتِ انفعال میں جو سُرخی رخساروں پر نمودار ہو جاتی ہے اس کے ظاہر کرنے کے لئے یہ

---

[1] محبوب کے چہرہ کو چاند سے تشبیہ دینا، تمام ممالک میں رائج ہے، چنانچہ شعراء عرب نے بھی اکثر اس خیال کو ظاہر کیا ہے اور ہر شاعر نے اندازِ بیان میں ندرت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ عنترہ کا یہ شعر جو فاضل مضمون نگار نے لکھا ہے خوب ہے، لیکن بدیع الزماں ایک جگہ اسی مضمون کو جس خوبی کے ساتھ ادا کر گیا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ لکھتا ہے :

لو قیل للبدر من فی الارض احسده — اذا تجلّی، لقال بنت الفلانی

یعنی جس وقت چودھویں رات کا چاند خوب چمک رہا ہو اگر تم اس سے پوچھو گے کہ زمین میں تجھے کس پر رشک آتا ہے، تو وہ فوراً کہہ دے گا کہ فلاں شخص کی لڑکی پر۔ (اڈیٹر)

یہ اندازِ بیان تلاش کرنا، جس میں بہترین استعارہ بھی پایا جائے کمال شاعری میں داخل ہے۔

مشبہ ہیں، وہ جو شبہ بہ نسبت مشبہ بہ کے ذرا کمزور ہوا کرتی ہے، یعنی جو وصف مشترک، مدارِ تشبیہ ہے، وہ مشبہ بہ میں، بہ نسبت مشبہ کے زیادہ قوی پایا جاتا ہے۔ نیچے کے شعر میں، عنترہ نے ثابت کیا ہے کہ چشمِ آہو کی خوشنمائی اور اس کی سحر طرازی ایسی نہیں ہے کہ اس سے چشمِ محبوب کو تشبیہ دی جائے بلکہ خود چشمِ آہو نے اپنا سحر اُس سے مستعار لیا ہے۔ لکھتا ہے:

اعارت النظبی سحر مقلتیھا	محبوبہ نے ہرن کو اپنی آنکھوں کا سحر مستعار دیا ہے اور مقامِ شکر
وبات لیث الشریٰ علی حذر	(جہاں کے شیر مشہور ہیں) کے شیر اب خائف رہتے ہیں کہ کہیں ہرن شکار نہ کر لے۔

دوسرے مصرعہ میں ایک اور لطیف بات بھی بیان کی ہے۔ یعنی شاعر، بہادر آدمیوں کو شیر سے تشبیہ دیکر کہتا ہے کہ عام طور پر تو شیر ہرن کا شکار کرتے ہیں، مگر محبوب عجیب قسم کا ہرن ہے کہ شیر (یعنی بہادر لوگ) بھی اس سے ڈرتے ہیں کہ کہیں اس کا شکار نہ ہو جائیں[1]

تشبیہ مرکب کا رواج عربوں میں بہت تھا اور واقعہ یہ ہے کہ شعراءِ عرب نے اس مخصوص تشبیہ کے بڑے بڑے نادر نمونے پیش کئے ہیں، لیکن ظلم ہوگا اگر اسی سلسلہ میں عنترہ کا ایک شعر نہ لکھا جائے، جو تشبیہ مرکب کی نہایت خوبصورت مثال ہے۔ لکھتا ہے:

تَرِیک من ثغرھا اذا ابتسمت	وہ تبسم کی حالت میں ایسا جامِ شراب پیش کرتی ہے، جو موتیوں
کاس مدام قد حُفَّ بالدرر	سے بھرا ہے (یا جڑا ہوا ہے[2])

عرب میں بُت پرستی کا عام رواج تھا، چنانچہ عنترہ کی محبوبہ، عبلہ بھی، جو خود ایک مجسمۂ حُسن تھی، پرستشِ اصنام کے لئے جاتی تھی، لیکن عنترہ اس پرستش کو کس نگاہ سے دیکھتا تھا، اس کا ذکر اس شعر میں ہے:

سجدت تعظیم ربھا فتمایلت	جب وہ بُت کے آگے اظہارِ تعظیم میں جھکی، تو اسکے جلال (حُسن)
لجلالھا اربا وھا تعظما	کے سامنے ہمارے تمام بُت سرنگوں ہو کر رہ گئے۔

آپ محسوس کریں گے کہ باوجود شاعری کی تمام صنعتوں کا خیال رکھنے کے، عنترہ عاشقانہ جذبات سے کہیں انحراف نہیں کرتا اور جہاں کہیں وہ خالص جذباتِ محبت نظم کر جاتا ہے تو پھر اس کے بیان کی فطرتا دگی بے پناہ نظر آتی ہے۔ ملاحظہ ہو:-

والشمر ارضا انت فیھا مقیمۃ	میں اس زمین کو چومتا ہوں، جہاں وہ مقیم ہے کہ شاید اسی طرح
لعل الھوی من ثرالارض یہدو	میری آتشِ شوق اُس زمین کے پودنے سے سرد ہو جائے۔

عنترہ، چونکہ بہادر شخص تھا اور عرب کی اکثر لڑائیوں میں اس نے دادِ شجاعت دی تھی اس لئے حماست میں بھی اس نے عجیب عجیب اشعار

---

[1] چنانچہ عین الزماں لکھتا ہے:

اذ لنبی بعد عزّ والھوی ابدا لیستعبد اللیث للظبی الکناسی

یعنی میں تو بڑا عزت والا مغرور شخص تھا، لیکن اس نے مجھ کو بالکل دبا لیا۔ عشق ایسی ہی چیز ہے جو شیروں کو بھی (جھاڑیوں میں پھرنے والے) ہرن کا غلام بنا دیتا ہے۔ (اڈیٹر)

[2] عبدالحکم نے بھی دانتوں کو موتیوں سے تشبیہ دی ہے، لیکن عجیب انداز سے لکھتا ہے:-

قامت لطالبنی بلولو لحرھا لما رات عینی لجود بدرّھا

وتبسمت عجبا فقلت لصاحبی ھذا الذی اتقمت بہ فی ثغرھا

جب اس نے دیکھا کہ میری آنکھیں آنسو کے موتی برسا رہی ہیں، تو وہ کھڑی ہو کر اپنی گردن کا ہار (جو کھو گیا تھا) مجھ سے مانگنے لگی۔ اس کے بعد جب وہ مسکرائی تو میں نے اپنے ساتھی سے کہا کہ دیکھو جس چیز کی خجلت اس نے مجھ پر لگائی تھی، وہ خود اس کے دہن میں موجود ہے۔ (اڈیٹر)

کہتے ہیں۔ لکھتا ہے:۔

فتیٰ یخوض غبار الحرب متسمًا،
ویثنی وسنان الرمح مختضب
ان سل صدرمہ سالت مضاربہ
واشرق الجو والشقت لہ الحجب
لی النفوس وللطیر اللحوم ولل،
وحش العظام ولغربان السلب
اسود غاب ولکن لا یثوب لھم
الا الاسنتہ والہندیۃ القضب

میں وہ جوان ہوں کہ غبار جنگ میں مسکراتا ہوا داخل ہوتا ہوں اور اس حال میں واپس آتا ہوں کہ نیزہ کی انی خون سے رنگین ہوتی ہے اور جب اپنی تلوار عریاں کرتا ہوں تو اسکی دھار سے دشمنوں کا خون بہتا ہوتا ہے، فضا چمک اٹھتی ہے اور کوئی حجاب باقی نہیں رہتا۔ میرے حصہ میں دشمنوں کی جانیں ہیں، پرندوں کے حصہ میں گوشت، درندوں کے حصہ میں ہڈیاں اور سواران لشکر کے حصہ میں مال غنیمت، وہ سوا جنگل کے شیر ہیں، انکے دانت صرف نیزہ کی انی اور کاٹنے والی تلواریں ہیں۔

خلقت للحرب جسیما اذا بروت
واصطلی نارھا فی شدۃ اللھب
بصارم جیما جرد وشہ سجدت
لہ جبابرۃ الاعجام والعرب

میں لڑائی کے لئے پیدا ہوا ہوں۔ (چنانچہ) جب وہ ٹھنڈی ہو جاتی ہے تو میں اُسے گرم کرتا ہوں اور جب نار حرب شدت سے بھڑک اٹھتی ہے تو میں اس سے تاپتا ہوں اور میرے ہاتھ میں ایسی تلوار ہوتی ہے کہ جب میں اسے بڑھ کر کرتا ہوں تو عرب و عجم کے بڑے بڑے جبابرہ سجدہ کرتے ہیں

ندیمی دعاک اللہ قم غنّ لی علی
کوس المنایا من دم حسین اشیرب
ولا تسقنی کاس المدام فانما
یفضل بہا عقل الشجاع ویذہب

اے ندیم (خدا تیری حفاظت کرے) جب میں خونناک موت پیوں تو اس وقت تو نغمہ سرائی کر، مجھے ساغر شراب نہ پلا، کیونکہ اس سے بہادر کی عقل (بجائے زیادہ ہونے کے) اور زایل ہو جاتی ہے۔

محمود علی

دستورِ پاکستان

مذہب سے نفور، آدمیت سے نفور
اخلاق سے دُور، حسنِ کردار سے دُور
خود سُنّت و قرآن کو تو ٹھکرائیں مگر
دستور بنے سُنّت و قرآں پہ ضرور

فخرالدین ابراہیم عراقی

عراقی، ہمدان کے ایک قصبہ کمجان میں ۶۰۹ھ میں پیدا ہوئے۔ کہا جاتا ہے کہ ان کے والد نے ایک رات خواب دیکھا کہ حضرت علیؓ چند رفقا، ایک باغ میں تشریف فرما ہیں۔ ایک شخص نے ایک بچہ لاکر ان کے سامنے رکھ دیا، حضرت علیؓ نے بچہ کو اُٹھا کر عراقی کے والد کے ہاتھ میں پھر دیا اور فرمایا "اس بچے کو اچھی طرح رکھنا، یہ بچہ دُنیا میں نامور ہوگا"۔ اس خواب کے مطابق، حضرت علیؓ نے بچہ کا نام عراقی تجویز کیا تھا۔ چنانچہ اس واقعہ کے ایک ماہ بعد عراقی پیدا ہوئے یہ اس بچہ کے ہم شکل تھے جس کو حضرت علیؓ نے خواب میں، ان کے باپ کے سپرد کیا تھا لہذا ان کے باپ نے ان کا نام عراقی رکھا۔

عراقی نہایت ذہین اور ذکی تھے ابتدائی تعلیم قرآن شریف سے شروع ہوئی۔ صرف نو ماہ میں انھوں نے قرآن شریف حفظ کرلیا۔ بلا کے خوش الحان تھے، جب کلام مجید کی تلاوت فرماتے، لوگ سننے کے لئے کھڑے ہوجاتے۔ چنانچہ آٹھ ہی سال کی عمر میں، عراقی، ہمدان میں خوش الحانی کے لئے مشہور ہوگئے۔ نہایت ذوق و شوق سے تحصیل علم میں مصروف ہوئے اور سترہ ہی برس کی عمر میں تمام علوم درسیہ سے فراغت حاصل کرلی اور درس و تدریس میں مشغول ہوگئے۔

۶۲۵ھ میں، عراقی کو ایک انقلاب انگیز واقعہ پیش آیا۔ قلندروں کا ایک گروہ ہمدان آیا، اُن میں ایک مقبول صورت نوجوان بھی تھا۔ قلندروں کا یہ گروہ کسی سلسلہ سے منسلک نہ تھا۔ یہ گروہ نہایت خوش الحانی سے دُنیا سے بے غرضی اور بے تعلقی کا اظہار مندرجہ ذیل اشعار سے کرتا تھا:-

مارخت زمسجد بہ خرابات کشیدیم ۔۔۔ خط بر ورق زہد و کرامات کشیدیم
در کوئے مغاں در صف عشاق نشستیم ۔۔۔ جام از کف رندان خرابات کشیدیم
گر دل بزند کوس شرف شاید ازیں پس ۔۔۔ چوں رایت دولت بہ سماوات کشیدیم
از زہد مقامات گزشتیم کہ بسیار ۔۔۔ کاس تعب از زہد مقامات کشیدیم

ان اشعار کی خوش الحانی سے عراقی پر ایسا کیف طاری ہوا کہ وہ اپنا عمامہ اور عبا پھینک کر اس گروہ میں شامل ہوگئے۔ غالباً ان کی یہ پہلی غزل اسی والہانہ جذبہ کے ماتحت ہے:

چہ خوش باشد کہ دلدارم تو باشی ۔۔۔ ندیم و مونس و یارم تو باشی
زشادی در ہمہ عالم نگنجم ۔۔۔ اگر یک لحظہ غمخوارم تو باشی

ان قلندروں نے کچھ عرصہ کے بعد اصفہان کا رخ کیا، عراقی بھی درس و تدریس کو خیرباد کہہ کے ان کے ساتھ ہولئے۔ اور اُس اعزاز و احترام کا مطلق خیال نہ کیا جو انھیں علوم الٰہیہ اور شریعت کے دقیق رموز و مطالب بیان کرنے کی وجہ سے حاصل تھا۔ اور آئندہ اور حاصل ہوتا۔ یہ ہمدان سے نکل کر دربدر ان کے ساتھ پھرنے لگے۔ مختلف شہروں کا گشت لگانے کے بعد قلندروں کی یہ جماعت ایران ہوتی ہوئی ہندوستان پہونچی اور ملتان میں چند دنوں مولانا بہاؤالدین زکریا کی خانقاہ میں مقیم رہی۔ مولانا بہاءالدین، مولانا شہاب الدین سہروردی کے خاص مرید اور خلیفہ تھے۔ یہ عراقی کی علمی استعداد اور تبحر سے بہت متاثر ہوئے انھوں نے خواہش کی کہ عراقی اُن کے پاس قیام کریں۔ عراقی خانقاہ

زندگی کے لئے طیار نہ تھے۔ اس لئے مولانا سے اجازت لے کر قلندروں کی گروہ کے ساتھ دہلی آئے، چند دن دہلی میں قیام کرنے کے بعد ایک زبردست طوفان کی وجہ سے یہ گروہ منتشر ہوگیا۔ اور عراقی اس گروہ سے جدا ہوگئے۔ پھر باوجود کوشش کے انھیں اُن لوگوں کا پتہ نہ چلا۔ آخرکار مجبور ہوکر ملتان، مولانا بہاء الدین کی خدمت میں پہونچے۔ مولانا بہاء الدین نہایت عزت و احترام اور خاطر تواضع سے پیش آئے اور انھیں اپنے حلقہ میں شریک کرلیا۔ عراقی، اپنے رفقا کی جدائی کی وجہ سے اکثر پریشان اور غمگین رہتے تھے۔ اب سہروردی سلسلہ کے مطابق عراقی چلہ کشی میں مصروف ہوئے، دس دن تک باقاعدہ چلہ کشی کے قواعد کی پابندی کی یعنی سوائے کلام مجید کی تلاوت یا حدیث شریف کے کسی اور مبحث پر گفتگو نہ کی، گیارھویں دن اُن پر ایسا وجد طاری ہوا کہ والہانہ انداز میں خوش الحانی سے اپنی مشہور حسب ذیل غزل باآواز بلند پڑھنے لگے:۔

نخستیں بادہ کاندر جام کردند ۔۔۔ زچشم مست ساقی وام کردند

مولانا بہاء الدین کے مُریدوں نے عراقی کے اس فعل پر جو سنت سہروردیہ کے خلاف تھا سخت نکتہ چینی کی اور مولانا سے اس کی شکایت کی۔ مولانا نے ان لوگوں کو جواب دیا کہ عراقی کے لئے سنت سہروردیہ کی پابندی ضروری نہیں، کچھ دنوں کے بعد، مولانا بہاء الدین کے ایک رفیق مولانا عماد الدین، ایک خرابات کے پاس سے گزرے، اور عراقی کی مذکورۂ بالا غزل، لوگوں کو گاتے سنا، اس کا تذکرہ انھوں نے مولانا بہاء الدین سے کیا۔ مولانا نے عراقی کی مذکورۂ بالا غزل، لوگوں کو گاتے سُنا، اس کا تذکرہ انھوں نے مولانا بہاء الدین سے کیا۔ مولانا نے عراقی کو بلاکر فرمایا: "تم دیر میں عبادت کرتے ہو ذرا میرے پاس آؤ" عراقی مولانا کے پیروں پر گر پڑے اور رونے لگے۔ مولانا اُن کے اس فعل سے اس قدر متاثر ہوئے کہ اپنا خرقہ اُتار کر اُن کو پہنا دیا اور اپنی لڑکی کی شادی ان سے کردی۔

عراقی پچیس سال، ملتان میں مقیم رہے۔ مولانا بہاء الدین بہت بوڑھے ہوگئے تھے، چونکہ عراقی سے بہت خوش تھے اس لئے انھوں نے عراقی کو اپنا خلیفہ مقرر کردیا۔ مولانا بہاء الدین کے وصال کے بعد، چند اہل غرض نے عراقی اور ان کے ساتھیوں کی شکایت سلطان سے کی، سلطان، گروہ صوفیہ سے پہلے ہی سے ناراض تھا، اس نے عراقی اور ان کے رفقاء کی گرفتاری کا حکم صادر کردیا۔ عراقی کو خبر ہوگئی یہ مع اپنے چند ساتھیوں کے ملتان سے فرار ہوگئے۔

چند سال دربدر پھرنے کے بعد عراقی نے مکۂ معظمہ کی زیارت کے لئے سمندر کا سفر اختیار کیا۔ دوران سفر میں عمان پہونچے جہاں لوگ نہایت عزت و احترام اور خاطر تواضع سے پیش آئے۔ سلطان نے ان کا استقبال کیا اور شیخ الشیوخ کا خطاب عطا فرمایا۔ ساتھ ہی یہ بھی خواہش ظاہر کی کہ عمان میں قیام کریں، لیکن چونکہ عراقی کو مکۂ معظمہ کی زیارت کا شوق دامنگیر تھا۔ انھوں نے اس دنیاوی اعزاز کو خیرباد کہہ کر پوشیدہ طور سے حجاز کے ایک قافلہ کے ہمراہ ہوگئے۔ زیارت مکۂ معظمہ سے فارغ ہوکر، عراقی شامیوں کے ایک قافلہ کے ہمراہ دمشق پہونچے پھر روم (یعنی ترکی) کے ایک مقام قونیہ میں مقیم ہوگئے۔ یہاں اس وقت مولانا صدرالدین قونوی جو ابن العربی کے خاص شاگرد تھے اور جنھیں ابن العربی کے قونیہ تشریف لانے کے وقت شاگردی کا شرف حاصل ہوا تھا، سکونت پذیر تھے۔ مولانا صدرالدین نے ابن العربی کی مشہور تصنیف "فصوص الحکم" کا عمیق مطالعہ کیا تھا، اس کی نہایت اچھی تفسیر بھی لکھی تھی اور فصوص الحکم کے درس میں خاص شہرت کے مالک تھے۔ عراقی ان کے حلقۂ درس میں شامل ہوگئے۔ جس سے اُن پر خاص اثر ہوا۔

عراقی کی ملاقات، قونیہ میں معین الدین پروانہ سے ہوئی جو علم دوستی کے لئے مشہور تھے، اسی زمانہ میں عراقی کے ہمعصر مشہور صوفی شاعر مولانا جلال الدین رومی اور مشہور عالم مولانا صدرالدین قونوی کا انتقال ہوگیا۔ معین الدین پروانہ ان دونوں حضرات کے نہایت معتقد اور قدردان تھے۔ ان دونوں کی وفات سے پروانہ کو اپنی زندگی میں ایک بہت بڑا خلا محسوس ہوا لہذا انھوں نے عراقی ہی کی صحبت کو غنیمت جانا اور اتنے ہم نشیں و رفیق ہوگئے۔ عراقی کے لئے پروانہ نے دو وقات میں ایک شاندار خانقاہ تعمیر کرائی اس طرح سے عراقی اور پروانہ کے تعلقات نہایت استوار ہوگئے اور ایک دوسرے کی جدائی شاق ہونے لگی حتیٰ کہ جس دن پروانہ کو مولانا کی ہم نشینی کا اتفاق نہ ہوتا، وہ دن اپنی زندگی کے شمار میں نہ لاتے۔ اتفاقاً ۶۷۶ھ میں پروانہ، ایلخانی سلطان کی عنایت سے محروم ہوگیا، اُسے اپنے مصائب اور بےکسی کا کامل یقین ہوگیا، وہ عراقی

کے پاس آیا اور زر کی ایک تھیلی نذر کرکے کہنے لگا :۔ "میرا بخت روگرداں ہے اور میری جان خطرہ میں ہے، یہی ایک تھیلی میری کمائی کی کل کائنات ہے۔ میرا ایک لڑکا قاہرہ میں قید ہے اگر آپ وہاں پہنچ سکیں تو اس کی رہائی کی کوشش کیجئے اور اس سلسلہ میں جو کچھ خرچ ہو اس تھیلی سے لے لیجے۔ اگر آپ اس کی رہائی میں کامیاب ہو جائیں تو اسے اپنی صحبت سے جدا نہ کریں اور تصوف کی تعلیم دیں۔ سلطنت کے کاموں میں اسے مشغول نہ ہونے دیں"۔ چنانچہ کچھ ہی دنوں کے بعد ایاقاخان کے حکم سے پروانہ قتل کر دئے گئے اور عراقی اپنی جان بچا کر قاہرہ فرار ہو گئے، اس طرح سے عراقی کی عزت و احترام اور خوشی کے دن جلد ختم ہو گئے۔ اب عراقی، قاہرہ میں سلطان کے دربار میں پہونچے، مذکورہ بالا تھیلی پیش کر کے سلطان سے پروانہ کے لڑکے کی رہائی کی درخواست کی، سلطان نے ان کی درخواست منظور کر لی اور عراقی کی علمی استعداد اور ذہانت کا حال معلوم کر کے بہت متاثر ہوا۔ عراقی نے ایک مرتبہ کلام پاک کی آیت "قل متاع الدنیا قلیل، والآخرۃ خیر لمن اتقیٰ ولا تظلمون فتیلا"۔ نہایت خوش الحانی سے تلاوت کی اور ایسے موثر طریقہ سے اس کی تفسیر بیان کی کہ سلطان رونے لگا۔ دوسرے دن سلطان نے منادی کرادی کہ عراقی، قاہرہ کے شیخ الشیوخ مقرر کئے گئے۔ اور یہ حکم دیا کہ ان کے اجلاس کے لئے قاہرہ کے تمام بزرگان دین اور عقلا و فضلا حاضر ہوں چنانچہ تمام صوفیہ و اکابر علما و اشراف فرما ہوئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ عراقی کے جلوس میں یہ سب پیادہ پا چلیں عراقی کے سوا کوئی سوار ہی پر نہ ہو۔ سلطان کے حکم کے مطابق ایسا ہی کیا گیا اور عراقی کو سلطان کی طرف سے خلعت خاص مرحمت ہوا ایسی حالت میں عراقی نے اپنے نفس پر غرور کا غلبہ محسوس کیا، اس غلبہ کو رفع کرنے کے لئے عراقی نے فوراً اپنا خلعت اُتار پھینکا اور خاموش کھڑے ہو گئے۔ ان کا یہ غیر معمولی مضحکہ خیز رویہ دیکھ کر لوگ ہنسنے لگے اور انھوں نے کہا بھلا، کہیں یہ دیوانہ، مسخرہ، اس مرتبہ کے لائق ہے وزیر نے عراقی سے پوچھا "یا شیخ ما فعلت ہذا" عراقی نے جواب دیا "اُسکت وانت لا تعرف فی الحال" عراقی کے اس طرز عمل کی خبر سلطان کو ہو گئی دوسرے روز سلطان نے عراقی کو طلب کیا اور اُن سے اس غیر معمولی طرز عمل کی وجہ دریافت کی۔ آپ نے فرمایا مجھ پر نفس غالب آگیا تھا اگر ایسا نہ کرتا تو اس سے بڑائی ہوتی اور عذاب الٰہی میں مبتلا ہو جاتا اس سے سلطان کا حسن اعتقاد اور بڑھ گیا اور اس نے اِنکا وظیفہ مقرر کر دیا، عراقی، آرام و راحت سے اپنی زندگی کے دن گزارتے رہے لیکن ایسی زندگی سے اُن کی روح بے تاب ناخوش تھی سلطان سے دمشق جانے کی اجازت چاہی، قاہرہ سے رخصت ہو کر دمشق پہونچے، وہاں بڑی آؤ بھگت ہوئی۔ ملک الامرا نے سلطان کے حکم کے مطابق شیخ الشیوخ کا لقب مرحمت فرمایا اور وظیفہ مقرر کر دیا۔ عراقی کے صاحبزادے کبیر الدین، ملتان میں سہروردیہ سلسلہ کے خلیفہ تھے۔ چھ ماہ کے بعد بغرض ملاقات دمشق پہونچے اتفاقاً اسی دوران میں عراقی بیمار ہوئے اور انھوں نے بستر مرگ پر اپنے بیٹے کو قریب بلا کر یہ آیت تلاوت فرمائی :۔ "یوم یفر المرء من اخیہ و امہ و ابیہ و صاحبتہ و بنیہ" اس کے بعد حسب ذیل رُباعی پڑھی اور داعی اجل کو لبیک کہا :۔

در سابقہ چوں قرار عالم دادند ما ناکہ نہ ہر مراد عالم دادند
زاں قاعدہ و قرار کاں روز افتاد نہ بیش بکس دہند و نہ کم دادند

وفات کے وقت ۶۸۸ھ میں، عراقی کی عمر اٹھتر سال کی تھی۔ صالحیہ کے گورستان میں مشہور صوفی، عالم مولانا محی الدین ابن العربی کے پہلو میں جن سے اُن کو خاص عقیدت تھی دفن کئے گئے۔

عراقی کی شاعری و تصنیفات

عراقی نے اپنی زندگی میں، اسلامی اقتدار کا خاتمہ اور جنگ جو تاتاریوں کا اسلامی ممالک میں عروج دیکھا تھا۔ تاتاریوں کی سفاکی اور خونریزی بلائے بے درماں کی طرح تمام ممالک اسلامی میں پھیلی ہوئی تھی۔ ابتدا میں اس جنگجو اور بادیہ نشین قوم کو ادب یا شاعری سے مطلق دلچسپی نہ تھی۔ ایسے ماحول میں، شعرا کو قصیدہ گوئی اور دربار میں باریابی اور صلہ یابی کا کوئی موقع نہ تھا۔ لہٰذا اس صدی میں شعرا، عموماً ایک ملک سے دوسرے ملک میں یا ایک شہر سے دوسرے شہر میں، خوشی سے یا مجبوراً، چکر لگایا کرتے تھے۔ خوش قسمتی سے اگر کوئی سلطان یا والی، قدر دانی کرتا تو اس کے سایۂ عاطفت میں جب تک

ممکن ہوتا زندگی بسر کرتے۔ عراقی کے حالات زندگی سے پتہ چلتا ہے کہ کبھی وہ عسرت اور کبھی ثروت سے ہمدوش رہے اور زمانہ کے سرد و گرم کی وجہ سے کبھی عزت نصیب ہوئی تو کبھی ذلت و ناموگیر تھی۔ زندگی کے مختلف حالات نے عراقی کو پختہ کار بنا دیا تھا۔ زمانہ کے ماحول نے انھیں تصوف اور معرفت الٰہی کی طرف متوجہ کیا، جس کی وجہ سے عراقی نے دنیا کے لئے ایک گراں بہا سرمایہ اپنے اشعار کا چھوڑا جس میں عشق الٰہی اور عرفان کے دقیق رموز پائے جاتے ہیں۔ عراقی ایک زبردست سالک طریقت و عرفان اور رہبر و راہِ حقیقت تھے جو دیر و حرم دونوں میں انوار الٰہی کا مشاہدہ کر کے کیف حاصل کرتے تھے، عراقی ایک ایسے جام کے طالب تھے جو گیتی نما ہو اور جس میں مکمل طور سے عقل کی آنکھ سے یہ دیکھ سکیں کہ دنیا میں جو کچھ ہے سب "ہمہ اوست" ہے اور انھیں اس کا پورا یقین تھا کہ جان جاناں، دلبر، دل، اور دین سب وہی ہے۔ فرماتے ہیں:

جام گیتی نمائے بطلب — تا بہ بینی بہ چشم عقل تمام
کہ ہمہ اوست ہر کہ ہست یقیں — جانِ جاناں و دلبر و دل و دیں

عراقی، معشوق حقیقی کی الفت میں حیران تھے اور عرفان کے جام مئے لعل سے سرشار۔ معشوق کی زلفوں تک ان کا ہاتھ پہونچا تو دل غائب ہو گیا۔ جو حیران کے ہاتھ لگی اس نے انھیں حیرت میں غرق کر دیا، وہ معشوق کے سلسلۂ زلف میں گرفتار ہو کر عالم و ہستی دونوں سے آزاد ہو گئے یعنی "فنا فی اللہ" کے مرتبہ پر پہونچ گئے۔ ایک غزل میں فرماتے ہیں:۔

در دام سر زلفش ما ندیم ہمہ حیراں — وز جام مے لعلش گشتیم ہمہ سرمست
از دست بشد چوں دل در طرۂ او زد چنگ — غرقہ زند از حیرت در ہر چہ بیابد دست
چوں سلسلۂ زلفش بند دل حیراں شد — آزاد شد از عالم و ز ہستی خود وارست

کبھی عراقی سرگشتگی اور حیرانی سے پریشان ہو کر دلداری اور لطف کے، نہایت لطیف پیرائے میں خواہاں ہوتے ہیں۔

ز روئے لطف بنما رو کہ در روے تو دارم — بجز روے تو در عالم نمی بینم
عراقی را بدر گاہت رہے بنما کہ در عالم — چو او سرگشتہ حیرانے نمی بینم نمی بینم

عراقی، مئے عرفان سے مست ہو کر ہر جگہ دیر و حرم میں جمالِ الٰہی دیکھتے ہیں اور دیر و حرم دونوں میں انھیں ریا کار بھی ملتے ہیں ثمر خانہ میں اگر وہ پاکبازوں کو دیکھتے تو صومعہ میں انھیں ریا کار بھی نظر آتے ہیں۔ طمانیتِ قلب اور سکونِ دل وہ قلندری ہی پاتے ہیں۔

عراقی کی مشہور غزل انھیں مضامین سے مملو ہے:

صنما رہِ قلندر سزد ار بہ من نمائی — کہ در انزوا دو دیدم رہ و رسم پارسائی
بطواف کعبہ رفتم بہ حرم رہم نہ دادند — کہ برونِ در چہ کردی کہ درونِ خانہ آئی
بہ زمیں چو سجدہ کردم ز زمیں ندا برآمد — کہ مرا خراب کردی تو بہ سجدۂ ریائی
بہ شراب خانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم — چو بہ صومعہ رسیدم ہمہ یافتم وغائی
در دیر چوں زدم من ز دروں ندا برآمد — کہ بیا بیا عراقی تو ز خاصگانِ مائی

بعض وقت عراقی، ذوق اور وجدانیت کے وفور میں کسی خاص راہ و رسم کی پابندی نہیں کرتے، ان کی سب سے مشہور غزل درج ذیل ہے جو مولانا بہاؤالدین کی خانقاہ میں، دورانِ چلہ کشی میں انھوں نے والہانہ انداز سے خوش الحانی سے پڑھنا شروع کی تھی:

نخستیں باده کاندر جام کردند — ز چشم مست ساقی وام کردند
چو با خود یافتند اہل طرب را — شراب بے خودی در جام کردند
لب میگوں جانانِ جام در داد — خمارِ عاشقانش نام کردند

سر زلف بتاں آرام نگرفت ، ز بس دلہا کہ بے آرام کردند
بہ مجلس نیک و بد را جائے دادند بہ جائے کار خاص و عام کردند
چو گوئی حسن در میداں فگندند بیک جولاں دو عالم رام کردند
ازاں لب کار روے جملہ دلہا است نصیب بے دلاں دشنام کردند
دلے را تا بدست آرند ہر دم سر زلفین خود را دام کردند
بہ غمزہ صد سخن گفتند با جاں ، بہ دل ز ابرو دو صد پیغام کردند
نہاں با محرمے رازے بگفتند جہانے را ازاں اعلام کردند
بہ عالم ہر کجا درد و غمے بود ، بہم کردند و عشقش نام کردند

چو خود کردند راز خویشتن فاش
عراقی را چرا بدنام کردہ

عراقی کی غزلوں کا مجموعہ ، دیوان عراقی کے نام سے شایع ہوا لیکن اس میں اغلاط کافی ہیں ۔

جس زمانہ میں عراقی اور معین الدین پروانہ میں باہمی ارتباط اور دوستانہ ہم نشینی تھی ، عراقی نے ایک منظوم کتاب " عشاق نامہ " لکھی تھی ۔ یہ کتاب مثنوی کے طرز پر ہے جو ایک ہزار ساٹھ اشعار پر مشتمل ہے ۔ اس میں اپنے مخصوص انداز میں عشق الٰہی کے مطالب بیان کئے گئے ہیں ۔ مطالب کے لحاظ سے عراقی کا عشاق نامہ ان کی دوسری تصنیف " لمعات " کی طرح ہے " عشاق نامہ کے نام سے منظوم کتابیں پہلے سے بھی موجود تھیں ، جن میں عشق الٰہی کی تشریح نہایت وضاحت اور آزادی سے کی گئی ہے ۔ بعض لوگوں نے ایک " عشاق نامہ " سنائی کے نام بھی موسوم کیا ہے جو عراقی سے ایک سو چالیس سال قبل گزرے ہیں ۔ دوسرا " عشاق نامہ " خلاق المعانی کمال اصفہانی کی تصنیف ہے ، جنھیں ۶۳۵ھ میں مغلوں نے قتل کر دیا تھا ۔ عراقی کے بعد ایک " عشاق نامہ " مولانا جلال الدین کے صاحبزادے سلطان ولد نے لکھا جو ۱۸۸۸ء میں استنبول میں شایع ہوا ۔

' عشاق نامہ ' تصوف کی مثنوی کے طرز پر ہے ، تصوف کی مثنویوں میں عموماً خدا کی توصیف و تحمید ، کنایات و استعارات سے شروع ہوتی ہے ، اس کے بعد نعت رسول ، پھر مصنف اگر اہل سنت والجماعت ہے تو صحابہ کی ثنا کرتا ہے پھر اپنے ولی نعمت یا کسی رئیس مالدار کی تعریف کرتا ہے جس کی فیاضی سے وہ مستفید ہوا ہے یا ہونے کی امید ہے ۔ کبھی کبھی یہ تمہید کافی طویل اور غیر دلچسپ ہوتی ہے ، اس کے بعد ان اسباب کو بیان کرتا ہے جنھوں نے مثنوی لکھنے پر آمادہ کیا اور کتاب کے عنوان کا تذکرہ کرتا ہے ۔ عراقی نے اس قدیم طرز کو نہایت اچھے پیرائے سے نباہا ہے ۔ یہ حسب ذیل اشعار ، عراقی کی اس روحی حالت کو ظاہر کرتے ہیں جس نے انھیں " عشاق نامہ " لکھنے پر آمادہ کیا :

صاحبا راز اندروں بنہفت تا نپرسی زمن نہ خواہم گفت
بندہ را خاطریست تا خرسند عاشق ہجر یار لیک بہ بند
کہ پسند چو من ہنرمندی لب بہ بستہ اسیر در بندی
بندہ را شاعرے نہ پنداری زاں گریاں خام نہ شماری
چوں در گنج دوست واکردند بہ من ایں مشیوہا عطا کردند
[illegible] لوشم
از لطف [illegible] را
تا نوائے عشقش آغازم دیں چنیں تختہ با بہ پردازم

کلیاتیست از مخارج اصل اندرو مجموعہ مندرج دہ فصل

عراقی نے "عشاق نامہ" کو دس فصلوں میں منقسم کیا ہے۔ ہر فصل میں عشق الٰہی کے ایک پہلو کی تشریح کی ہے، قابلِ لحاظ بات یہ ہے کہ اس مثنوی میں جابجا غزلیں بھی شامل ہیں جس سے ایک خاص دلچسپی ہوگئی ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ اس طرز پر سب سے پہلے مثنوی نگار، حضرت امیر خسرو ہیں جن کی مثنوی "قران السعدین" اسی طرز پر ہے لیکن یہ قرین قیاس نہیں کیونکہ مثنوی قران السعدین ۶۸۸ھ/۱۲۸۹ء کی تصنیف ہے جو عراقی کا سنہ وفات ہے۔ ممکن ہے عراقی نے اپنی وجدانی کیفیت کے اظہار کے لئے مثنوی سے غزل کو جن پر انھیں زیادہ دسترس حاصل تھا، بہتر خیال کیا ہو اور اسی وجہ سے انھوں نے مثنوی کا یہ طرز اختیار کیا ہو۔ تمثیلات سے عراقی کے مسلم الثبوت استاد ہونے کا پتہ چلتا ہے، ان کے افسانوں میں شوخی، شگفتگی اور خندہ آوری پائی جاتی ہے، لیکن یہ موضوع عشق الٰہی کے متانت وجلال کو کسی طرح کم نہیں کرتی، ملاحظہ ہو:

آں شنیدی کہ عاشقِ جاں باز وعظ گفتی بہ خطۂ شیراز
سخنش منبع حقایق بود خاطرش کاشفِ دقائق بود
روزے آغاز کرد بر منبر سخنے دل فریب جاں پرور
بود زرد از زرخت سخن سکۂ عشق بر درست سخن
مستمع عاشقاں گرم انفاس ہمہ مستانِ عشق بے وکاس
گرم نازاں عرصۂ تجرید پاکباز اں عالمِ توحید
عارفے زاں میاں بپا برخاست گفت عشاق را مقام کجاست؟
پیرِ عاشق کہ دُرِّ معنی سفت از سرِ سوزِ عشق با او گفت
نہ شنیدی کہ ایزدِ وہاب گفت "طوبیٰ لہم وحسن مآب"
ایں بگفت و بر انداز سرِ شوق سخن اندر میاں زغایت ذوق
ناگہاں روستائی نادان خالی از نور دیدہ و دل و جان
ناتراشیدہ ہیکلی ناراست ہیچ غولے ازاں میاں برخاست
لبِ بخشک و دیدہ تر گشتہ پا، زکار اوفتادہ سرگشتہ
گفت اے مقتدائے اہلِ سخن غم کارم بخور کہ امشب من
خرکے داشتم چگونہ خرے؟ خرے آراستہ بہ ہر ہنرے
خانہ زاد و جواں و فربہ و نغز استخوانش زفربہی ہمہ مغز
من و او چوں برادرانِ شفیق روز و شب ہم نشیں و یار و رفیق
یک دم آوردم آں سبک رفتار بہ تفرج میانۂ بازار
ناگہانش زمن بہ دزدیدند از جماعت بپرس اگر دیدند
محلس گرم و غرق در اسرار کے دراں معرض آید ایں گفتار
حاضراں خواستندش آزردن خربہ مسجد زناگہ آوردن
پیر گفتا بدو کہ "اے خرجو پنجیں یک زماں و نیچ مگو،
نطق در بند و گوش بس دے بنشیں و خموش باش دمے"

پس نذا کرد سوے محلسیاں "کاندریں طائفہ زپیر و جواں"
ہر کہ باعشق در نیا میزد زیں میانہ بہائے برخیزد
ایلچے ہمچو خر کریہہ لقا چست برجست از خرے برپا
پیر گفتش " توئی کہ در یاری یوں نہ بستی بہ عشق ؟ گفت آری"
ہانگ برزد بگفت " اے خردار ہاں حذر یا فتم بیار افسار"

عراقی کی دوسری مشہور تصنیف " لمعات" ہے جس میں انھوں نے ابن العربی کی مشہور اور مشکل ترین تصوف کی کتاب "فصوص الحکم" کی تمثیلی اور مجازی طریقے سے تفسیر کی ہے، عراقی نے جب اس کتاب کو صدرالدین قونوی کے سامنے پیش کیا تو وہ بہت خوش ہوئے اور کتاب کو بوسہ دیکر فرمایا " تو سرسخن مرداں آشکارا کردی" یہ ایک مخصوص طرز کی مختصر سی کتاب ہے جس میں عشق الٰہی کا بیان ہے۔ اسی مختصر کتاب کی شرح مولانا جامی نے " لوائح " کے نام سے کی ہے جسے پروفیسر ونڈفیلڈ نے انگریزی میں ترجمہ کرکے ۱۹۰۷ء میں شائع کیا ہے۔ اس کے بعد بہت سی اسی قسم کی کتابیں لکھی گئیں لیکن اب تک سب سے بہتر عراقی ہی کی کتاب خیال کی جاتی ہے۔ عراقی نے اپنی اس مختصر کتاب کو اٹھائیس مختصر حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ہر حصّہ کا نام " لمعہ" رکھا ہے، پروفیسر براؤن کا خیال ہے کہ عراقی مقصد حروف تہجی کے لحاظ سے ہر حرف پر ایک لمعہ لکھنے کا تھا، لیکن ایک قدیم ترین نسخے میں صرف ستائیس لمعات پائے جاتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ چونکہ ابن العربی نے "فصوص الحکم" کو ستائیس فصلوں میں لکھا ہے، اس لئے عراقی نے بھی ستائیس حصّوں ہی میں لمعات کو تقسیم کیا ہو بعضوں کا خیال ہے کہ قونوی " فصوص الحکم" کو ستائیس، درسوں میں ختم کرتے تھے، ممکن ہے اسی لحاظ سے عراقی نے ہر درس پر ایک لمحہ تحریر کیا ہو۔

عراقی نے اپنی شاعری اور تصنیفات کا گراں بہا سرمایہ جس میں عشق الٰہی اور آفرینش کی زیبائی کی بہترین توضیح ہے، دُنیا کے لئے چھوڑا اگرچہ شہرت اور عظمت کے لحاظ سے عراقی کو وہ رتبہ نصیب نہیں ہوا جو اُن کے ہمعصر مولانا جلال الدین رومی کو ان کی مثنوی کی وجہ سے نصیب ہوا۔ ذوق وشوق، اخلاص، نغز بیانی اور جوش آہنگی کے لحاظ سے عراقی عدیم المثال تھے۔ عراقی کی شاعری اور زندگی کے حالات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عراقی نے جو کچھ عشق کے متعلق لکھا ہے وہ دوسروں کے تجربات اور مشاہدات نہیں ہیں بلکہ ان کے ذاتی قلبی جذبات اور واردات کا عین اظہار ہے۔ عراقی عیش و آسایش کو کبھی اپنے کو فراموش نہیں کیا اور تکلیف و مصائب میں کبھی مایوس نہیں ہوئے۔

احبابِ کراچی سے

مُلّا زدہ سرزمیں سے کیا میرا ربط
مذہب کا جنوں وہاں، یہاں عقل کا خبط
کیونکر میں کراچی آؤں، بولو، جب تم
کر لیتے ہو ڈانٹی کی انفرنو ضبط

؟

کیوپڈ و سائکی

سائکی تھی ایک دن گلشن میں مصروفِ خرام
دیویوں کی طرح یکسر جلوہ یکسر انتسام

پیچ و تابِ اودِ عنبر اپنے بالوں میں لئے
التہابِ آتشِ سیّال، گالوں میں لئے

اُس کے آنکھوں کے تبسم کا وہ رنگِ اضطراب
تھی چھلک پڑنے کو گویا جام سے موجِ شراب

اس کے قامت میں تناسب کا وہ اندازِ قبول
فنِ موسیقی کے جس سے ضبط ہو سکتے اصول

قد کی رعنائی سے اس کے، سرو کے دل میں ملال
اس کے چہرہ کے مقابل چاند کی صورت نڈھال

ابروؤں کے بانکپن کی بے قراری کا یہ حال،
ان کی ہر جنبش میں بن بن کر بگڑتے سو ہلال

جسم میں رنگِ جوانی تھا، کہ شیشے میں پری
یا شرابِ تند تھی اک آبگینہ میں سجی سی

تھی مزہ اس کی کچھ ایسی شوخ، ایسی بے قرار
توڑ جاتی اس کی جنبش قلب میں لشتر ہزار

دیکھ کر گلشن میں اک معبودۂ حسن و شباب
ہو گئی کیوپڈ کی ساری روح یکسر اضطراب

بڑھ کے آیا روبرو پھر یہ مبارز خواہِ عشق
اور اس کے سامنے کی پیش بازیگاہِ عشق،

ہو گئی قایم وہیں گلشن میں پھر بزمِ قمار
اور ہوئے مشغول بازی دونوں باصد افتخار

آخرش کیوپڈ تھا اور اس کی شکستِ متصل
ہر شکستِ فاش تھی اور اضطرابِ منفعل

لب کا مرجاں بھی وہ ہارا، جسم کا بلّور بھی
مشک بالوں کا دیا اور سینہ کا کافور بھی

چہرہ کا سونا دیا اس نے، ذقن کی سیم خام
دانت کا الماس ہارا اور گردن کا رخام

ہاتھ سے ترکش بھی کھویا اور پرِ سوفار بھی
تیر بھی اس کے چبھنے اور قوس کا زنّار بھی

جب نہ کچھ باقی رہا، تو سائکی نے جیت لی
شوخی و برنائی بھی اور آنکھ کی بینائی بھی پر

فنِ تحریر کی تاریخ

(یہ سلسلۂ ماسبق)

گلاگولیٹک خط (GLAGOLITIC. ALPHABET)

اس کو سلاقی زبان میں گلاگولیٹسا کہتے تھے (گلاگول بمعنی "لفظ" "حرف" گلاگو سکی معنی "ادبی") یہ خط ۴۰ حروف پر مشتمل تھا جو بجائے یونانی کے ایتھوپی (حبشی) سے مشابہ نظر آتے ہیں۔ وہ ایک عجیب انداز سے رسمی طرز پر ڈھالے ہوئے ہیں۔ اُن کی شکلیں سڈول اور ہندسی ہیں۔ اجزائے ترکیبی میں چھوٹی چھوٹی چوگوشیہ علامتیں، مثلث اور دایرے خاص ہیں۔ دو یا دو سے زاید حروف ملے ہوئے بطور ایک جوڑ (لیگچر) کے اس خط میں نہیں پائے جاتے (ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۲۶)

گلاگولیٹک خط کی دو قسمیں تھیں (۱) قدیم خط جسے بلغاری گلاگولیٹسا بھی کہتے تھے بارھویں صدی کے آخر تک کام آتا تھا، اس کے حروف زیادہ مدور تھے۔ (۲) متاخر خط جسے کروآٹی گلاگولیٹسا بھی کہتے ہیں زیادہ رسمی طرز پر ڈھالا ہوا تھا۔ اس کا ارتقا چودھویں صدی میں ہوا (بالکل اُسی طرح جیسے رومن سے گوتھک خط پیدا ہوا) اور جب سے تقریباً یہ ویسا ہی ہے۔

گلاگولیٹک خط کی تاریخ عجیب ہے۔ اس کا جزیرہ نمائے بلقان کے سلاقی لوگوں کی مذہبی تاریخ سے خاص تعلق ہے۔ نویں صدی کے دوسرے نصف میں یہ خط سلاقی کلیسا کی دعاؤں کی کتاب کے ساتھ موراوی حکومت میں داخل ہوا لیکن جلد ہی غائب ہوگیا کیونکہ کتاب مذکورہ کو پوپوں نے نامنظور کرکے امتناعی احکام جاری کردئے۔ بلغاریہ اور کروآٹیا میں اس خط کو سلاقی کلیسا کی دعاؤں کی کتاب کے ساتھ تسلیم کرلیا گیا اور وہ ڈلماشیا (DALMATIA) کے ساحل پر جنوب میں مانٹی نیگرو (MONTE NEGRO) اور مغرب میں اسٹریا (ISTRIA) میں پھیل گیا۔ مشرقی یا یونانی کلیسا کے ماننے والے سلاقی لوگوں میں گلاگولیٹک خط کا جلد ہی خاتمہ ہوگیا اُس پر سریلک خط نے فتح پائی۔ جزیرہ نمائے بلقان کے مغربی حصّہ میں اُس کا استعمال کیتھولک مذہب کے ماننے والوں میں سلاقی کلیسا کی دعاؤں کی کتاب کے ساتھ ساتھ جاری رہا باوجودیکہ کیتھولک مذہب کے اکابر اس کی مخالفت کرتے رہے۔ حتّٰی کہ پوپ نے اس کے استعمال کی خاص اجازت دیدی۔ اس خط کو اب بھی ڈلماشیا اور مانٹی نیگرو کے بعض فرقے استعمال کرتے ہیں جو رومن کیتھولک مذہب کے ماننے والوں میں سلاقی کلیسا کی دعاؤں کی کتاب کے استعمال کرنے والے تنہا لوگ ہیں۔

گلاگولیٹک خط کے عروج کا مختصر سا زمانہ سولھویں اور سترھویں صدی عیسوی میں تھا۔ جب اُسے لاطینی اور اطالوی زبانوں سے ترجمہ کرنے، نیز طبعزاد ادبی کاوشوں اور اُن تبلیغی تحریروں میں استعمال کیا جاتا تھا جنھیں جرمنی کے پروٹسٹنٹ مبلغین اپنے مذہب کو جنوبی سلاقی لوگوں میں پھیلانے کی غرض سے شایع کررہے تھے۔ اُس زمانہ میں متعدد مقامات پر گلاگولیٹک خط کے مطبع موجود تھے جو قدیم ترین گلاگولیٹک دستاویز موجود ہے وہ ۱۴۸۳ء کی ہے۔ متعدد گلاگولیٹک روزنامچے بھی محفوظ ہیں جو سولھویں صدی کے ہیں۔

گلاگولیٹک خط کی جگہ بلغاریہ والوں میں روسی خط نے لی اور الیرائی (ILIRIAN) کروآٹی (CROATIAN) اور سلووین (SLOVENIAN) لوگوں میں رومن خط نے۔ بوہیمیا اور پولینڈ کے لوگوں نے جن میں عیسائی مذہب روم کے ذریعہ آیا تھا، شروع ہی سے رومن خط کو اختیار کرلیا تھا جس میں سلاقی زبان کی مخصوص اصوات کو ظاہر کرنے کے لئے امتیازی نشانات کا

اضافہ کیا گیا اس طرح ان کے حروف کی تعداد رومن سے تقریباً دوگنی ہوگئی۔

سرلیک اور گلاگولٹک خط کا تعلق اس سے ظاہر ہے کہ گلاگولٹک کے کئی حروف سرلیک میں کام آتے ہیں اور دونوں میں حروف کے نام بامعنی الفاظ ہیں اور انھیں ملاکر پڑھتے وقت حرف کے شروع کی آواز لی جاتی ہے اور بقیہ حصہ کو حذف کر دیا جاتا ہے (یہ وہی اصول ہے جو ساتھی رسوم خط میں پایا جاتا ہے) بعض الفاظ کے معنی یہ ہیں :-

بکی (Buki) = پیڑ کا درخت ... لیودی (Lyudi) = لوگ، آدمی
ویدی (Vedi) = چراگاہ، مرغزار زیوئیے (Zhivete) = زندگی
زیملیا (Zemlya) = خشکی، زمین ... سلووو (Slovo) = تقریر، بولی

ایجاد سلاقی رسوم خط کی ایجاد کے بارے میں بلغاری راہب خرابرے نے لکھا ہے کہ وہ ایسے اشخاص سے واقف تھا جو سرل اور تھیوڈیس کو جانتے تھے "شروع میں سلاقی لوگوں کے پاس کتابیں نہ تھیں۔ وہ لکڑی پر تصاویر و نقوش بنا کر لکھتے، اور پیشین گوئی کرتے تھے۔ عیسائی مذہب قبول کرنے کے بعد وہ سلاقی زبان کو بغیر کسی اصول کے یونانی و لاطینی حروف میں لکھنے لگے لیکن اُن کی زبان کے بہت سے الفاظ ایسے تھے جنھیں وہ نہ لکھ سکتے تھے اس طرح کئی سال گزر گئے۔ بالآخر خدا کو جو بنی آدم سے محبت کرتا ہے سلاقی لوگوں پر ترس آیا اور اُس نے ان (لوگوں) میں سینٹ کونسٹانٹائن فلسفی کو بھیجا جسے سرل بھی کہتے ہیں وہ ایک منصف پسند اور راستباز آدمی تھا۔ اُس نے اُن کے لئے ایک خط ایجاد کیا جو ۳۸ حروف پر مشتمل تھا جن میں سے بعض یونانی طرز کے تھے اور بعض سلاقی زبان کے مطابق تھے"

یہ روایت اس بارے میں خاموش ہے کہ سرل نے کونسا خط ایجاد کیا تھا لیکن نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرلیک خط ہی سرل کی ایجاد تھا، گلاگولٹک خط کی ایجاد کے بارے میں بڑے متضاد نظرئے پیش کئے گئے ہیں۔ اُسے فنیقی، عبرانی، سماری، ارمنی، جارجی (یا گرجی) ایتھوپی (یا حبشی) البانوی، گھسیٹ یونانی (آئزک ٹیلر اور پیالگ کے مطابق) گھسیٹ لاطینی (دوبنسکی کے مطابق) یا "سلاقی رونی" سے ماخوذ قرار دیا گیا ہے۔ اگرچہ گلاگولٹک کے بعض حروف کے نام رونی حروف کے ناموں سے مشابہ ہیں لیکن ایسا کوئی رونی خط موجود نہیں ہے جسے "سلاقی" کہا جا سکے۔

بہرحال ۱۸۹۸ء میں ڈاکٹر آئزک ٹیلر نے جو نظریہ پیش کیا تھا وہ سلاقی عالموں میں کافی مقبول ہوا۔ یعنی سرلیک خط نویں صدی کے یونانی کے بڑے حروف پر مبنی تھا اور گلاگولٹک خط کا ماخذ کوئی اس سے بھی پرانا گھسیٹ یونانی خط تھا اس کے بعد کچھ اور نظرئے پیش کئے گئے لیکن اب مسلمہ نظریہ سر ایلس۔ ایچ منس (Sir Ellis Minns) کا پیش کردہ ہے۔ اُن کا کہنا ہے کہ کونسٹانٹائن، سرلیک اور گلاگولٹک دونوں ہی کا موجد تھا کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ دو مختلف آدمی الگ الگ ایسے دو خط ایجاد کریں جو ہر بات میں مشابہ ہوں، حروف کی شکلوں، اُن کی عددی قیمتوں اور خصوصاً آوازوں میں جبکہ سلاقی زبان میں بہت زیادہ اصوات پائی جاتی ہیں ——— کانسٹانٹائن کی ایجاد کا مقابلہ سینٹ میسروب کی ایجاد سے کیا جا سکتا ہے جس نے ارمنی اور گرجی خط ایجاد کئے تھے[1] اگرچہ یہ سب خط اپنے پیشرو خطوں پر مبنی تھے لیکن ضروری نشانات کا انتخاب، اُن کی اشکال و اصوات میں ضروری تبدیلیاں اور نئی علامتوں کا وضع کرنا وہ چیزیں نہیں جنھیں مخصوص لوگوں نے انجام دیا اور اس طرح وہ نئے خطوں کے موجد مان لئے گئے۔ یقیناً فنِ تحریر کی تاریخ میں سینٹ میسروب اور سینٹ کونسٹانٹائن کا مقام بلند ہے۔

(باقی)

محمد اسحاق صدیقی

---

[1] ملاحظہ ہو نگار بابت دسمبر ۱۹۵۳ء

نقشہ نمبر ۲۹

نام	آواز	عددی قیمت	یونانی کے بڑے حروف	سریانک	گھسیٹ یونانی	گلاگولیٹک	
						ابتدائی	موخر
اَز	اَ	۱	Α	ܐ ܐ	Α ⍺ ⍺ ⍺	ⰰ ⰰ	ⰰ ⰰ
بکی	ب	۲	Β Β	ܒ .	Β ⍵ ⍵	ⰱ ⰱ	ⰱ
ویدی	و	۳		ܒ	Β ⍵ ⍵	ⰲ ⰲ	ⰲ
گلاگول	گ	۴	Γ	ܓ	⍴ ⍴ ⍴	ⰳ ⰳ	ⰳ ⰳ
ڈوبرو	د	۵	Δ	ܕ	Δ δ δ	ⰴ ⰴ	ⰴ
ایست	اِ	۶	Ε	ܗ	⍷ ⍹ ⍹ ⍹	ⰵ ⰵ	ⰵ ⰵ
ژہویت	ژہ	۷	Ζ ζ	ܙ ܙ	Ζ ⍹	ⰶ ⰶ	ⰶ
ذیلو	ا۔ذ	۸	Η	ܚ ܚ	Η Η Η	ⰷ ⰷ	ⰷ
زیلیا	ز	۹	Θ	ܛ	⊖ ⊖	ⰸ ⰸ	ⰸ
اِزہے	اِی	۱۰	Ι	ܝ	Ι Ι Ι	ⰹ ⰹ	ⰹ
ای	ی	۲۰	Κ	ܟ ܟ	Κ = ι ⍳ = ⍳	ⰺ ⰺ	ⰺ ⰺ
ڈِی۔تی	ڈ،ت	۳۰	Λ (ζ)	ܠ		ⰻ ⰻ	ⰻ
دَجرو	دج (ض)				ΤΥ (τυ)	ⰼ ⰼ	ⰼ
کاکو	ک	۴۰	Κ	ܟ	Κ κ κ	ⰽ ⰽ	ⰽ ⰽ
لیوڈی	ل	۵۰	Λ	ܠ ܠ	λ ⍶ ⍶	ⰾ ⰾ	ⰾ
موسلائٹ	م	۶۰	Μ	ܡ M	Μ ⍴ ⍴	ⰿ ⰿ	ⰿ ⰿ
ناشس	ن	۷۰	Ν	Ν Ν	Ν Ν Ν	ⱀ ⱀ	ⱀ ⱀ
اون	او	۸۰	Ο	Ο	ο ⊖ ⊖	ⱁ ⱁ	ⱁ ⱁ
پوکائے	پ	۹۰	Π	Π	Π Π Γ	ⱂ ⱂ	ⱂ ⱂ
ایسی	ر	۱۰۰	Ρ	Ρ	Ρ ⍴ ⍴	ⱃ ⱃ	ⱃ ⱃ
سلوود	س	۲۰۰	C	C	⍉ ⍉ ⍴	ⱄ ⱄ	ⱄ
ٹواڈو	ٹ	۳۰۰	Τ	Τ	Τ Τ ⍦	ⱅ ⱅ	ⱅ

نام	آواز	عددی قیمت	یونانی کے بڑے حروف	سریلک	گھسیٹ یونانی	گلاگولیٹک ابتدائی	گلاگولیٹک موخر
اُک	اُ	۴۰۰	Θ	Θ Y γ	Θ Θ		
فرت	ف	۵۰۰	Φ	Φ	Φ		
تھیٹا	تھ	۹	Θ	Θ	θ		
کھر	کھ، کش	۶۰۰	X	X	X Y Y		
اوت	او	۷۰۰	ω	ω	ω ϖ		
شا	ش	—	Ш (σσ)	Ш	ш		
شتا	شت	۸۰۰	Ψ (σσΤ)	Ψ	ψ (σ̈σ)		
تسی	ص، تس	۹۰۰	Ч Z (σΙ)	Ч	Ч		
تشرو	تش	۱۰۰۰	Ϥ (Τσ)	Ϥ	ϥ		
تیر	او-ی	—	?	Ъ	ο Ъ (ο+ει)		
یَری	ی	—	?Ι	ЪІ	ο+ει+η		
یَریک	ا، ای	—	Ь	Ь	ε+ει		
یت	ے	۸۰۰	Ь Ч	Ь Ч	Ъ Ъ (ε+ει)		
یو	یو	—	ΙΟ	ΗΟ	Ч Ο (ου)		
اینس	اینگ	۹۰۰	Ι Ι	Λ Ι Ι	ϵ ϵ ϰ (ευ)		
مِنس	ینگ	—	Ι+Λ	ΙΛ	ε+ευ		
انس	اونگ	—	Ι (ο+ιν)	Ж	ο+ευ		
یانس	یانگ	—	Ι+Ж	ЖІ	η+ο+ευ		
ازیسا	ای، یو	—	V	V Y	ει+ν Ъ+ν		
	ے	—	ΙΕ	Ιε			
کسی	کس	۶۰	Ξ Ξ Ξ	Ξ Ξ			
پسی	پس	۷۰۰	Ψ Ψ Ψ	Ψ Ψ			

(صفحہ نمبر ۲۱۲ سلسلہ)

وعدہ شکن

سرزمینِ چین کی ایک عبرتناک داستان

(۱)

سلطنتِ کوریا (چین) کے گوشے گوشے میں چوداَنگ کی محبت پرستی کا شہرہ پہونچ گیا تھا، اور اس کی پاک اور حقیقی محبت لوگوں کے لئے ایک عجیب اور نادر مثال بن گئی تھی۔ چوداَنگ حسن و جمال میں بھی نہایت ممتاز تھا اور حکمت پر بھی کامل دسترس رکھتا تھا۔ قسمت سے اُسے بیوی بھی نہایت شریف اور نیک طینت اور پاک باطن ملی تھی اور وہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ اپنی وفا شعاری اور شوہر پرستی میں یکتائے زمانہ تھی، دُنیا ان کی محبت پر رشک کرنے لگی تھی۔

چوداَنگ جب کبھی سیر و تفریح کو جاتا تو ہانسی کو بھی اپنے ساتھ لے جاتا اور ہانسی کی تمام خوشیوں اور مسرتوں میں چوداَنگ اس کا جلیس رہا کرتا۔ جب وہ کسی جلسے یا دعوت میں شریک ہوتے تو وہ دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے رہتے اور انبساط و سکون ان کے چہروں سے ظاہر ہوتا۔ جب وہ گفتگو کرتے تو ان کی زبان سے ایک ہی الفاظ نکلتے۔

وہ محبت کے مزاج ہائے پنہاں اور رموز مخفی سے بھی بخوبی آشنا ہو گئے تھے اور کسی کو کبھی یہ خیال بھی نہ ہو سکتا تھا کہ ان کے اس سکون میں کوئی چیز خلل انداز ہو سکتی ہے۔

(۲)

ایک شام ہر طرف سکوت چھایا تھا۔ پرندے اپنے اپنے آشیانوں میں چہچہاتے جا رہے تھے اور ہر طرف اس وقت سناٹا طاری تھا۔ شہر سے باہر ایک قبرستان میں انتہائی خاموشی حکمراں تھی۔ اور اس عالم سکوت میں اور ایسے بھیانک مقام پر، ایک عورت سفید لباس میں ملفوف، ایک بہت بڑا بکھا اپنے مرمریں نازک ہاتھوں میں لئے ہوئے، ایک قبر پر جھکے میں مصروف تھی اور کسی خیال میں یکسر محو تھی۔ اس کا چہرہ نہایت دلکش اور خوبصورت تھا اور شباب کی رعنائیاں اس کے عضو عضو سے جھلک رہی تھیں وہ اس لباس میں ایک حور خیال سے کم نظر آتی تھی۔ تاہم وہ کسی قدر سنجیدہ اور بے قرار تھی۔ وہ بار بار اپنا چہرہ اُٹھا کر آسمان کی طرف دیکھتی۔ آہ سرد بھرتی اور پھر خاموش ہو جاتی اور پنکھا جھلنے لگتی۔

اسی اثناء میں قبرستان کی چار دیواری کے قریب ایک انسانی شکل متحرک نظر آئی۔ وہ بدستور حرکت کرتی رہی ــــ پھر چند منٹ تک ایک مقام پر ٹھہر گئی اور پھر متحرک ہوئی اور آخر اس عورت کے قریب پہونچ گئی۔ عورت نے پُر ارمان نگاہوں سے آنے والے کی طرف دیکھا اور پھر سر جھکا کر اپنے کام میں مصروف ہو گئی۔ آنے والا شخص اس عورت کو کچھ دیر تک دیکھتا رہا اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کسی گہرے خیال میں مستغرق ہے پھر کچھ دیر کے بعد وہ چونکا اور اس نے نہایت جرأت کر کے اس جوان عورت سے نرم لہجے میں پوچھا: "تم یہاں کیوں کھڑی ہو اور اس قبر پر پنکھا جھلنے سے تمہارا کیا مطلب ہے؟"

عورت نے غمگین لہجے میں جواب دیا (اس کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا رہے تھے)۔ "مہربان اس ہمدردی کا شکریہ جو دل سے ادا کرتی ہوں، لیکن آپ پوچھ کر کیا کریں گے؟"

چوداَنگ بولا: "مگر آپ کو بتلانے میں کیا عذر ہے، میں اس لئے دریافت کر رہا ہوں کہ شاید آپ کی مدد کر سکوں۔"

عورت نے آنسو بہاتے ہوئے کہا: "آہ افسوس اب دُنیا میں مجھے ایسا شوہر کہاں ملے گا جو اس قبر میں راحت ابدی کی نیند سو رہا ہے۔ میرا پیارا شوہر، ایک نہایت رحمدل، اور نیک خصلت انسان تھا۔ مرتے وقت اس نے مجھسے کہا تھا کہ جب تک اس کی مٹی خشک نہ ہو جائے اسوقت تک میں دوسری شادی نہ کروں۔ اس وقت آپ مجھے اُسی حکم کی تعمیل میں منہمک دیکھ رہے ہیں۔"

چودانگ نے پوچھا: "ہاں مٹی تو ضرور خشک ہو جائے گی مگر پنکھا جھلنے کی کیا ضرورت محسوس ہوئی؟"

عورت نے جواب دیا: "اس لئے کہ مٹی جلد سوکھ جائے، اس کام میں میں نے دو دن صرف کر دئے ہیں اور یہ ارادہ کر لیا ہے کہ جب تک اس وعدہ کی تکمیل نہ ہو جائے دوسری شادی نہ کروں گی۔ خواہ اس قبر کے سوکھنے میں اور چار دن کیوں نہ لگ جائیں۔"

چودانگ، بیوہ کے حسن سے متاثر ہو چکا تھا۔ اور اب تک نہایت سنجیدگی اور احترام کے ساتھ اس سے گفتگو کر رہا تھا۔ مگر بیوہ کے اس عجلت کے خیال سے وہ مسکرا دیا۔ تاہم فوراً ضبط کر کے اس نے نہایت ہمدردی کے انداز سے کہا: "محترمہ، اگر آپ میری ناچیز التجا کو نگاہِ مشکوک سے نہ دیکھیں تو میں یہ عرض کروں گا کہ میرے غریب کدے پر تشریف لے چلئے۔ میری بیوی آپ کو دیکھ کر بہت مسرور ہوگی اور آپ کی تشفی اور دلداری کرے گی۔"

عورت نے شرمگیں انداز سے جواب دیا: "مہربان آپ کی اس عنایت کی ممنون ہوں۔ میں آپ کے اس جذبۂ ہمدردی کو احترام کی نظر سے دیکھتی ہوں۔ مجھے آپ کی شرافت پر کامل اطمینان ہے اور چلنے میں کوئی عذر نہیں۔

(۳)

ہانسی اپنی خلوت گاہ میں ایک مسہری پر دراز تھی، سرہانے ایک چھوٹی خوبصورت میز پر ایک شمع جھلمل کر رہی تھی اور وہ کسی کتاب کے مطالعہ میں محو تھی۔

چودانگ کمرہ میں داخل ہوا اور آہستہ آہستہ اس کے قریب پہونچ گیا۔ ہانسی اُسے دیکھ کر اُٹھ کھڑی ہوئی اور چودانگ اس کے برابر بیٹھ گیا اور بولا: "پیاری ہانسی، ایک بات کہنے آیا ہوں، سنوگی اور میرا کہنا مانوگی؟"

ہانسی نے مسکراتے ہوئے جواب دیا: "تمھارے بات سننے سے کبھی مجھے عذر ہو سکتا ہے اور میں نے تم سے انکار کس بات میں کیا ہے؟"

چودانگ نے کہا: "پیاری ہانسی۔ آج اتفاقاً میں قبرستان چلا گیا تھا، وہاں ایک بیوہ عورت کو غمگین حالت میں دیکھ کر میں بیحد متاثر ہو گیا ہوں۔"

ہانسی نے قدرے بیچین ہو کر پوچھا: "کس بات سے؟"

چودانگ نے جواب دیا: "اس کا شوہر مر گیا ہے اور مرتے وقت اس نے اپنی بیوی سے کہا تھا کہ جب تک اس کی قبر کی مٹی خشک نہ ہو جائے وہ دوسری شادی نہ کرے۔ چنانچہ وہ بیچاری قبر پر پنکھا جھل کر مٹی خشک کر رہی تھی، اُسے میں اپنے گھر لے آیا ہوں۔ تم اس کی تسلی اور تسکین کرو، یہ ایک انسانی ہمدردی ہے، مگر ہانسی ۔۔۔۔۔"

ہانسی اب تک چُپ چاپ سُن رہی تھی اور دل ہی دل میں اس عورت کو کوس رہی تھی۔ مگر اس نے بیچین ہو کر پوچھا: "کیوں چپ ہو گئے پیارے چودانگ کہو نا، کیا مجھ سے کوئی بات چھپانے کی ہے؟"

چودانگ بولا: "نہیں ہانسی تم سے کون راز پوشیدہ ہیں۔ ہاں میں کچھ کہنے والا تھا۔ مگر شاید تمھیں ناگوار گزرے۔"

ہانسی نے کہا: "نہیں، تمھاری کوئی بات مجھے ناگوار نہ گزرے گی، تم شوق سے کہو۔"

چودانگ نے کہا: "میرا یہ خیال ہے کہ اگر میرا بھی یہی انجام ہوا تو شاید تم بھی اسی بیوہ کی طرح کرو۔"

ہانسی یہ سن کر بے ساختہ رو پڑی۔ اس کے تمام جسم میں لرزش پیدا ہو گئی، وہ ہمہ تن غصہ بن گئی۔ اس نے بہ نگاہوں سے چودانگ کو گھور کر دیکھا اور بولی: "چودانگ۔ چودانگ، تم نے مجھے کیوں ایسا سمجھ لیا ہے۔ آہ مجھے تو تم سے ایسی بدگمانی کی کبھی بھی امید نہ تھی۔"

چودانگ نے تسلی دیتے ہوئے کہا:۔" پیاری ہانسی تم غصہ ہوگئیں۔ میں نے اپنا ایک خیال ظاہر کیا تھا۔ تمھیں اس سے صدمہ پہونچا پیاری ہانسی معاف کردو۔ میں تو سمجھتا تھا کہ تمھیں اس سے کوئی تکلیف نہ ہوگی"۔

ہانسی نے اشک آلود نگاہوں سے دیکھ کر جواب دیا:" چودانگ ان الفاظ سے تم نے میرے قلب کے ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالے، میں اب کس دل سے تم سے بات کروں۔ آہ، تم کس قدر ظالم ہو کہ بلا کسی وجہ کے ایسا فضول خیال قایم کرلیا۔ چودانگ میں اور میری جان صرف تمھارے لیئے ہے، میں کسی دوسرے سے محبت نہیں کرسکتی چودانگ۔ میری باتوں کو دل پر نقش کرلو۔ میں تم سے سچ کہہ رہی ہوں"۔

چودانگ نے متاثر ہوکر کہا:۔" ہانسی، پیاری ہانسی، مجھے تمھاری طرف سے ذرا بھی بدگمانی نہیں۔ معلوم نہیں کیوں یہ خیال آگیا تھا۔ اور میں چونکہ اپنے دل کی کوئی بات تم سے مخفی رکھنا نہیں چاہتا، اس لئے میں نے اس کا بھی اظہار کردیا۔ مگر خیر اب سے درگزر کرو پیاری ہانسی، چودانگ تم سے معافی مانگتا ہے"۔

ہانسی نے جواب دیا:۔" میں تمھیں معاف کرتی ہوں۔ لیکن میں قسم کھاکر کہتی ہوں کہ جہاں ایسی بے وفا اور بے شرم عورت رہے گی میں ایک لمحہ وہاں ٹھہرنا گوارا نہ کروں گی۔ اُسے ابھی نکال دو، اس کی وجہ سے میرا گھر ناپاک ہوجائے گا"۔

چودانگ نے کہا:۔" اچھا، تم اس قدر ناراض نہ ہو، اس قدر برہم نہ ہو۔ پیاری ہانسی میں کبھی تمھاری دلشکنی گوارا نہیں کرسکتا۔ میں ابھی اُسے نکالے دیتا ہوں۔ پیاری ہانسی، میری پیاری، اور یہ کہکر اس نے ہانسی کو آغوش میں لے لیا۔

(۴)

رات نہایت طوفانی اور سرد تھی۔ آندھی بہت زور شور سے چل رہی تھی اور رات زیادہ بھیانک ہوگئی تھی، بیچاری بیوہ عورت چپ چاپ گھر سے نکلی اور تاریکی میں کسی طرف روپوش ہوگئی۔

ایک گھنٹہ گزر گیا دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز آئی، دروازہ کھول دیا گیا، چودانگ کا ایک شاگرد، جسے چودانگ نے بہت عرصہ سے نہ دیکھا تھا۔ اندر داخل ہوا۔ دونوں اس کے خیر مقدم کے لئے اُٹھ کھڑے ہوئے، اور نہایت فرخندہ روی اور زندہ دلی سے پیش آئے ——— سب لوگ گفتگو میں مشغول ہوگئے۔

ایک نہایت بڑے اور آراستہ کمرے میں فرش بچھایا گیا، مختلف قسم کے کھانے دسترخوان پر چُنے گئے۔ اس وقت چودانگ اور ہانسی کے انداز و اطوار سے اطمینانِ قلب، فشاد و بہجت کے آثار ہویدا تھے اور ان کے اس اتحاد کی مسرت ان کے چہروں سے ظاہر ہو رہی تھی۔

یکایک چودانگ بیٹھے بیٹھے زمین پر گر پڑا اور بے ہوش ہوگیا اور اس کے قلب کی حرکت بند ہوگئی، تمام لوگ یہ منظر جانگداز دیکھ کر بہت مضطرب اور پریشان ہوگئے۔ کوئی ادھر دوڑنے لگا کوئی اُدھر۔ کوئی ڈاکٹر کو بلانے گیا کوئی پنکھا جھلنے لگا۔ چنانچہ چند ہی لمحوں میں ہر شخص پر حواس ہوگیا اور چودانگ کو ہوش میں لانے کی تدابیر کی جانے لگیں۔ بیحد دوا و دوش اور کوششوں کے بعد بھی کوئی مفید نتیجہ نہ نکلا اور سب نے چودانگ کو مردہ سمجھ لیا۔

شوہر پرست ہانسی پر اس صدمۂ جانکاہ سے ایک بجلی سی گر پڑی اور وہ سر پکڑ کر ایک کرسی پر گر پڑی ——— بہت دیر تک اُس پر پڑی رہی۔

۵

شاگرد اپنے استاد کی اس اچانک موت سے بہت سراسیمہ اور غمزدہ ہوگیا اسے کسی کل چین نہ آتا تھا۔ ہانسی، شاگرد کی اس حالت کو دیکھ کر بہت متفکر ہوگئی اور آخر کار چودانگ سے وفا شعاری کا وعدہ اس نے فراموش کردیا۔ بیوہ عورت کی حالت بھی اس کے دماغ سے محو ہوگئی اور اب وہ شاگرد کی بیچینی کو رفع کرنے میں محو ہوگئی۔

ایک دن گزر گیا ——— دوسرے دن وہ شاگرد سے نہایت دلچسپ گفتگو کرکے اس کی تسلی اور تشفی کرتی رہی۔ گفتگو میں اس قدر آزادی، اور عریانی خیال موجود ہوتی تھی کہ دونوں کے جذبات میں ایک ہل چل سی مچ جاتی تھی۔ تیسرے دن دونوں ایک دوسرے سے شادی کرنے پر

رضامند ہو گئے۔

(۶)

چودانگ کی آرام گاہ اس وقت غم و آلام کے آثار سے معرا تھی۔ مسرت کی رنگینیاں بہار کی طرح ساری فضا پر چھائی تھیں۔ نشاط و فرحت کی صدائیں ہر طرف سے بلند تھیں۔

چودانگ کی نعش ایک تابوت کے سپرد کر کے ایک تنہا کمرہ میں رکھدی گئی تاکہ جب تک عدالت سے دفن کرنے کا حکم نہ ملے۔ وہاں محفوظ پڑی رہے۔

دولھا اور دلھن نے نہایت بیش قیمت، زریں اور لباس فاخرہ زیب تن کئے۔ ہانتی نے ناک میں ایک بیش قیمت بُلاق پہنا۔ اور نوشہ نے مرحوم استاد کے ملبوس سے اپنے آپ کو آراستہ کیا۔ عقد کا وقت قریب آگیا۔ تمام خاندان اس آنے والی مسرت سے نہایت مسرور اور شاد نظر آرہا تھا اور تمام کمرے اور برآمدے اور دالان روشنی سے جگمگا رہے تھے۔ عطر و عنبر کی خوشبوؤں سے فضا معطر ہو رہی تھی۔

اس وقت ہانتی دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ ایک نہایت آراستہ خلوت کدے میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی اور اپنے نوجوان شوہر کا انتظار کر رہی تھی۔ اسی عالم فرحت و بہجت میں ایک ملازم نہایت متوحش اور مضطرب کمرے میں داخل ہوا اور اس نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا:

"ہمارا ــــ نوجوان آقا ــــ اچانک ــــ ایک سخت مرض ــــ میں ــــ مبتلا ہو گیا ــــ ہے ــــ مرض نہایت خطرناک ہے ــــ جب تک ــــ کسی مُردہ ــــ انسان کا دل ــــ اُس کے سینے ــــ پر نہ رکھا جائے اس ــــ کی زندگی کی کوئی ــــ امید نہیں"۔

ان الفاظ کو سنتے ہی ہانتی دفعۃً غم سے تڑپ کر کھڑی ہو گئی۔ اُسے ایسا معلوم ہونے لگا جیسے کوئی اس کی روح کو شکنجے میں کس رہا ہو اس کے مضمحل اور حسین چہرے پر اضطراب کی لہریں سیلاب کی طرح دوڑنے لگیں، وہ دیوانی سی ہو گئی۔ تاہم اُس نے جلد جلد اپنے لمبے چوڑے اور زمین پر گھسٹنے والے کپڑوں کو سمیٹا۔ وہاں سے نکل کر دوسرے کمرے میں گئی، ایک کلہاڑی لی۔ اور دوڑ کر اس کے کمرے میں جا پہونچی۔ جہاں اس کے شوہر کی نعش پڑی ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ مُردہ شوہر کا دل نکال کر زندہ شوہر کی روح کو موت کے چنگل سے چھڑا لے۔ وہ اس خیال میں کھوئی ہوئی تھی۔ اُسے انجام کی ذرا بھی فکر نہ تھی۔ وہ زور زور سے کلہاڑی صندوق پر مارنے لگی۔ چند ضربوں کے بعد صندوق ٹوٹ گیا۔ اور ساتھ ہی چودانگ کی نعش حرکت کرنے لگی۔ جسے تمام لوگوں نے مُردہ سمجھ لیا تھا۔ اس ہیبتناک منظر سے خوفزدہ ہو کر ہانتی نے کلہاڑی چھوڑ دی۔ اس کا تمام جسم اور جسم کا رونگٹا رونگٹا خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ وہ اس منظر کو زیادہ نہ دیکھ سکی اور وہاں سے بھاگ آئی۔

(۷)

چودانگ صندوق سے باہر نکل آیا اور اپنی بیوی کی اس غیر معمولی آرائش اور اس کی پریشانی دیکھ کر سخت متحیر ہوا۔ وہ کچھ دیر تک ساکت رہا لیکن جب ہانتی وہاں سے چلی گئی تو وہ وہاں سے نکل کر باہر آیا تاکہ اس آرائش کا سبب دریافت کرے۔ اُسے وہاں کوئی نہ ملا، وہ آگے بڑھا، اس اثنا میں دو ملازم داخل ہوئے اور انھوں نے چودانگ کو دیکھ کر بھاگنا چاہا۔ چودانگ نے ان کو پکارا اور وجہ دریافت کی۔ لوگوں نے اُسے بہت دیر کے بعد زندہ سمجھا اور گزشتہ واقعات بلاکم و کاست بیان کر دئے۔

چودانگ کو ملازموں کی باتوں پر یقین نہ آیا وہ اپنی بیوی کی ایسی باتیں سن کر بہت برہم ہوا اور ملازموں کو بُرا بھلا کہہ کر خود ہی ہانتی کو تلاش کرنے لگا۔ وہ چاہتا تھا کہ ان تمام واقعات کی حقیقت سے آشنا ہو وہ چاہتا تھا کہ ہانتی کے متعلق لوگوں کے بیانات غلط ثابت ہوں اور وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اگر یہ تمام واقعات سچے ہوں تو وفا شعار ہانتی سے اُس کی وعدہ شکنی کا تذکرہ کر کے اُس پر اظہار نفرت کرے۔

(۸)

ہانتی، نفس پرست اور وعدہ شکن ہانتی، بدنامی اور رسوائی کے خوف سے لرز گئی۔ اس کے لئے دُنیا میں اس سے بڑھکر اور کوئی ذلت نہ ہو سکتی تھی کہ اس نے اپنے عزیز شوہر سے وعدہ شکنی کی تھی۔

چودانگ اِدھر اُدھر تلاش کرتا رہا اور آخر کار پھر اُسی کمرے میں جا پہونچا جہاں اس کا تابوت رکھا تھا۔ اس نے دیکھا اور دیکھ کر چونک پڑا۔ اس نے دیکھا اور اپنا دل تھام کر رہ گیا۔ ہانسی نے ذلت، ندامت اور بے وفائی کا صدمہ نہ برداشت کر کے خودکشی کر لی تھی۔

چودانگ ایک فلسفی تھا۔ وہ نہایت عمیق نظر اور نکتہ رس اور دانشمند تھا۔ اُس نے یہ سب دیکھا۔ اُس نے اپنی مونس زندگی، اپنی رفیقۂ حیات اور محبوبۂ دلنواز کو خاک و خون میں آلودہ دیکھا۔ لیکن اس کی زبان سے اُف تک نہ نکلا۔ وہ جوں کا توں کھڑا رہا۔ اور واقعات پر غور کرنے لگا۔ یہ ایک ایسا منظر تھا کہ اکثر اس وقت اور کوئی شخص ہوتا تو رو دیتا۔ لیکن چودانگ اپنی ذات کو اس کمزوری سے افضل اور برتر سمجھتا تھا۔ وہ ساکت کھڑا رہا۔ کچھ دیر گزر گئی۔ اس کی باریک بیں نگاہوں نے سب کچھ دیکھ لیا۔ سارے راز یکے بعد دیگرے اس پر منکشف ہو گئے۔ اور اُس نے پُرانے تابوت کو درست کر کے اُس میں اپنی وعدہ شکن بیوی کی نعش رکھ دی۔

(۹)

چودانگ پھر خاموش ہو گیا۔ اور کسی سوچ میں پڑ گیا۔ پھر وہ اُٹھا۔ اس کے دماغ میں کوئی مفید تدبیر آ گئی تھی۔ اس نے تمام آرایش اور سازو سامان کو اسی حالت میں رکھ کر اُس پنکھے والی بیوہ عورت کو تلاش کیا اور اپنے گھر لے آیا۔ چونکہ دونوں ایک دوسرے کی فطرت اور اخلاق کی کمزوری سے واقف ہو چکے تھے۔ اس لئے وہ شادی کے بعد ایک دوسرے کی غلطی معاف کرنے اور عیوب سے چشم پوشی کرنے کے رموز سے بھی آشنا ہو گئے تھے۔

(گوارڈ استھ)

محشر عابدی

فلسفۂ مذہب

مولوی سید مقبول احمد صاحب کی وہ ہنگامہ خیز تصنیف جس نے علماء اسلام کی "کافر سازی" مجالس میں ٹیپل ڈالدی تھی اس میں مذہب کی ابتداء و ضرورت، مذہب، قومیت، قومیت۔ قومیت اسباب مذہب، ثبوت، مذہب و تکوین، مذہب و معاد، مذہب و تقریر، مذہب و اخلاق، مذہب و عبادات اور انجام مذہب پر نہایت محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے۔ قیمت دو روپیہ۔

ملک خطا کے شہزادے

وصی احمد بلگرامی کا وہ مشہور مقالہ جس میں انھوں نے اپنے مخصوص انداز بیان میں مسئلۂ حرمتِ حجر پر مولانا شبلی مرحوم کی تحریر پر اعتراض کیا تھا اور اڈیٹر نگار نے اس پر تبصرہ کیا تھا۔ قیمت ۱۲ر

مرثیہ نگاری اور میر انیس

ڈاکٹر محمد احسن فاروقی کا بسیط مقالہ جس میں جدید اصول نقد کے پیش نظر میر انیس کے فن مرثیہ نگاری کے بالکل نئے زاویوں سے روشنی ڈالی گئی ہے قیمت عہ

گلہائے جعفری

یعنی

جناب اثر لکھنوی کے ڈیڑھ سو اشعار

جو اڈیٹر نگار نے اپنے تعارفی مقدمے کے ساتھ بہت اہتمام سے شایع کئے تھے اس کی چند ہزار ہی اتفاق سے رہ گئی ہیں۔ ۸ر کے ٹکٹ ملنے پر انتخاب ذریعہ پوسٹ مل سکتا ہے۔

توقیت

تاریخ اسلامی نمبر کے سلسلہ میں اڈیٹر نگار نے یہ توقیت مرتب کی تھی۔ جس میں ۱ھ سے ۱۳۳۷ھ تک کے تمام اہم تاریخی واقعات تقویم عیسوی میں تبدیل کر دئے گئے ہیں۔ تاریخ کے طلبہ کے لئے بڑی کارآمد چیز ہے قیمت عہ

عورت اور اسلام

مالک رام صاحب اہم مسائل کی مشہور مورخانہ کاوش کا نتیجہ جس میں انھوں نے عورت کی زندگی کے ہر پہلو پر اسلامی نقطۂ نظر سے گفتگو کی ہے قیمت عہ

"گاہے گاہے باز خواں ——

روح کی حقیقت

مذہبی و علمی دنیا کے درمیان یوں تو بہت سے اختلافات پائے جاتے ہیں لیکن ان تمام اختلافات کی بنیاد مذہب کے صرف مابعد الطبیعی عقاید ہیں یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اگر اہل مذہب بقاء روح و حیات بعد الموت سے انکار کر دیں یا اہل علم اس کے قایل ہو جائیں تو پھر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔

مذہب والے کہتے ہیں کہ موت، زندگی کا اختتام نہیں ہے بلکہ ابتدا ہے دوسری زندگی کی یعنی جس طرح اس عالم آب و گل میں ایک انسان اپنی انفرادیت کا حامل ہوتا ہے اسی طرح مرنے کے بعد بھی اس کا تشخص باقی رہے گا، کیونکہ روح غیر فانی ہے اور اسی کے ماننے یا نہ ماننے کا نام مذہب و لامذہبیت ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ بقاء روح یا حیات بعد الموت کا عقیدہ دنیا کے مذہبی دور کی پیداوار ہے یا اس سے پہلے کی اور اس کا جواب تاریخ انسانی کے مطالعہ کے بعد ہم کو یہ ملتا ہے کہ مذاہب الہامی کے ظہور سے بہت پہلے جب انسان جہل و تاریکی کے دور سے گزر رہا تھا یہ عقیدہ پایا جاتا اور مذہب عالم نے اس میں کوئی تبدیلی ایسی نہیں کی جو الہام خداوندی کے بغیر ناممکن ہوتی یا جس کے ثبوت میں کسی تابانی دلیل کی ضرورت لاحق ہو۔ اس لئے اگر لامذہب جماعت اس عقیدہ کی مخالف ہے تو دراصل یہ مخالفت مذہب کی نہیں بلکہ انسان کے تاریک دور کے ایک خیال کی مخالفت ہے اور اگر اہل مذاہب یہ کہنے کے لئے تیار نہیں کہ عہد قدیم کے انسان کا یہ عقیدہ بھی الہامی تھا تو پھر عہد تاریک کے اس عقیدہ کو بدستور قایم رکھنے کی ذمہ داری اہل مذاہب پر عاید ہوتی ہے اور وہی اس کے جواب دہ ہیں۔

ابتداء آفرینش میں انسان کا علم و تجربہ دونوں بہت محدود تھے وہ کائنات کے طبیعی حادثات کو دیکھ دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا اور اپنی کوتاہ عقل کے مطابق اس کے سمجھنے کی کوشش کرتا تھا، دنیا کے حوادث میں سب سے پہلا اور اہم حادثہ جس سے اس کو دوچار ہونا پڑا غالباً اس کی اولاد یا دوسرے عزیزوں کی موت کا رہا ہوگا، اول اول اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا ہوگا کہ یہ جا کر آتا، چلتا، پھرتا، انسان کیوں اور کہاں چلا گیا، لیکن جب اس کے واہمہ نے خواب میں پھر اس کو زندہ دکھایا ہوگا تو اس نے خیال کیا ہوگا کہ آنکھوں سے اوجھل ہونے کے بعد بھی وہ زندہ ہے اور یہیں سے نہ صرف بقاء روح بلکہ حیات بعد الموت کے عقیدہ کی ابتدا ہوتی ہے جو اس وقت بھی مذاہب عالم میں اصل بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس عقیدہ کا دوسرے الفاظ میں یہ مفہوم قرار پاتا ہے کہ روح زندگی سے مختلف چیز ہے اور وہ زندگی ختم ہونے کے بعد بھی پائی جاتی ہے، حالانکہ علمی تحقیق سے زندگی کی جو حقیقت دریافت ہوئی ہے وہ اس خیال کی تردید کرتی ہے۔

تمام اونچے درجے کی حیوانی زندگی صرف ایک خلیہ (C E L L) سے شروع ہوتی ہے۔ یہ خلیہ دوسرے خلیہ سے ملتا ہے اور پھر ان سے اور بہت سے خلایا پیدا ہوتے رہتے ہیں یہاں تک کہ ایک خاص صورت کا حیوان شکل پذیر ہو جاتا ہے اور اس کی تمام حیوانی زندگی کے دوران میں کروروں بلکہ اربوں خلایا اس کے جسم میں بنتے بگڑتے رہتے ہیں یہاں تک کہ بیماری یا کہولت یا کسی حادثہ کی وجہ سے یہ خلایا بیکار ہو جاتے ہیں اور زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ خلایا میں روح ہوتی ہے تو بھی یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کیونکہ جس وقت استقرار حمل ہوتا ہے تو ماں کی طرف سے کم از کم دس ہزار خلایا اور باپ کی طرف سے اربوں خلایا کام کرنے کے لئے حرکت میں آجاتے ہیں، لیکن ان میں صرف ایک وہ خلایا انسانی زندگی کا باعث ہوتے ہیں اور باقی سب ضایع ہو جاتے ہیں اس لئے اگر خلایا اور جراثیم میں بھی روح کا وجود تسلیم کیا جائے گا تو کائنات میں روحوں کی تعداد غیر محدود تسلیم کرنا پڑے گی، علاوہ اس کے اگر روح کو حیات سے علٰحدہ کوئی چیز دوسری مانیں گے تو پھر یہ سوال پیدا ہوگا کہ انسان میں وہ روح، کب

کیونکر اور کہاں سے داخل ہوئی ۔ اور جسم سے جدا ہو جانے کے بعد وہ کہاں چلی جاتی ہے ۔

اس سے پہلے جب علم طب نے زیادہ ترقی نہ کی تھی تو ایک مُردہ بچہ پیدا ہوئے پر اسے دفن کر دیا جاتا تھا اور اس طرح ڈوبنے کے بعد جب انسان بیجان ہو جاتا تو اسے بھی سپرد خاک کر دیتے تھے لیکن اب بعض صورتوں میں بجلی یا دوسرے ذرائع سے ان کے ساکن قلب میں حرکت پیدا کر دی جاتی ہے اور زندگی عود کر آتی ہے ۔ اگر ہم روح کے وجود کو زندگی سے علٰحدہ تسلیم کر لیں گے تو ان صورتوں میں قدرتاً یہ سوال پیدا ہوگا کہ مُردہ روح کیا کہیں قریب ہی منڈلا رہی تھی جو ان کے جسموں میں داخل ہو گئی اور اگر ایسا ممکن تھا تو پھر وہ بغیر طبّی ذرائع اختیار کئے ہوئے از خود کیوں نہ آ گئی ، اگر یہ کہا جائے کہ ہم جس چیز کو زندگی سے تعبیر کرتے ہیں وہی دراصل روح ہے تو پھر حشرات و نباتات میں بھی روح کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا ، کیونکہ زندگی سے وہ بھی خالی نہیں ہیں ، حالانکہ اہل مذاہب سوا انسان کے کسی اور جاندار میں روح کا وجود تسلیم نہیں کرتے ۔

بہر حال اہل مذاہب کا یہ عقیدہ کہ روح زندگی یا حیات سے علٰحدہ کوئی ایسی چیز ہے جو فنا نہیں ہوتی ، اہل علم کے نزدیک قابل تسلیم نہیں اور اس اعتراف و انکار کے سلسلہ میں مذہب کی طرف سے کوئی معقول دلیل پیش نہیں کی جاتی ہے اور اہل علم انکار کے بہت سے دلایل اپنے پاس رکھتے ہیں ۔ مثلاً :-

(۱) اگر روح غیر فانی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ قدیم ہے اور ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی ، کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک چیز کی انتہا نہ ہو لیکن ابتدا ہو ، وجود کا ایک سرا اگر لامحدود ہے تو دوسرا بھی یقیناً لامحدود ہوگا ، اس لئے روح کو غیر فانی کہنا گویا اسے واجب الوجود تسلیم کرنا ہے حالانکہ یہ صفت صرف خدا کو حاصل ہے جس میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ۔

(۲) اگر روح حیات سے علٰحدہ کوئی چیز ہے تو پھر یہ امر غور طلب ہے کہ وہ کس وقت جسم انسانی میں داخل ہوتی ہے آیا اسی وقت جب نطفہ رحم مادر میں قرار پاتا ہے یا اس کے بعد کسی اور زمانہ میں ۔ اگر استقرار حمل کے وقت ہی کو آمد روح کا اولین لمحہ قرار دیا جائے تو چونکہ روح کو صاحب شعور و ادراک کہا جاتا ہے اس لئے جنین کو رحم مادر کے اندر بھی صاحب شعور و ادراک ہونا چاہئے حالانکہ ایسا نہیں ہے اور اگر آمد روح کا کوئی اور وقت مقرر کیا جائے گا تو پھر اس تعین کے کیا اصول ہوں گے ۔ جبکہ شعور و ادراک کے مسئلہ میں تمام انسان یکساں نہیں ہیں کسی میں شعور و ادراک بہت جلد پیدا ہو جاتا ہے ، کسی میں بہت دیر کے بعد ، کسی میں حافظہ ابتدا ہی سے قوی ہوتا ہے اور کسی کا آخر عمر تک کمزور رہتا ہے ، اور جو دیوانے پیدا ہوتے ہیں ان میں آخر عمر تک شعور و ادراک پیدا نہیں ہوتا حالانکہ روح ان کے اندر بھی پائی جاتی ہے ، اس صورت میں مجبوراً یہ ماننا پڑیگا کہ شعور و ادراک کا تعلق روح سے نہیں ہے جو عقیدۂ مذہبی کے خلاف ہے ۔

یہ بھی ماننا پڑے گا کہ وہ دماغی خرابی یا موت کے ساتھ ختم بھی ہو جاتی ہے ، حالانکہ یہ بقاء روح کے عقیدہ کے منافی ہے ۔

(۳) اگر یہ کہا جائے کہ روح اور حیات ایک ہی چیز ہے تو پھر حیات کے ساتھ اس کی ابتدا اور موت کے ساتھ اس کا اختتام بھی تسلیم کرنا چاہئے اور اس صورت میں روح کو غیر فانی نہیں کہہ سکتے ۔

(۴) اگر روح غیر فانی ہے تو ہم کو اس کے بقاء دوام کی نوعیت متعین کرنا پڑے گی اور اس کی کوئی صورت سمجھ میں نہیں آتی ۔ کیونکہ روح کے وجود کے لئے زمان و مکان کی تعین ضروری ہے اور جب زمان و مکان کی قید لگ جاتی ہے تو پھر اسے محدود ماننا پڑے گا اور ہر محدود چیز فانی ہے اس لئے روح کو بھی فانی ماننا پڑے گا ۔

(۵) اگر ہر انسان کی روح انفرادی طور پر علٰحدہ وجود رکھتی ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ وجود انسانی سے قبل بھی انفرادیت رکھتی تھی ۔ لیکن وہ انفرادیت کیا تھی ؟ اگر عقیدۂ تناسخ کی رو سے اس کا تشخص کسی اور ہستی کے تشخص کے ساتھ وابستہ تھا تو پھر ان تمام ہستیوں کا شعور و ادراک جن جن میں وہ روح داخل ہوئی تھی یکساں ہونا چاہئے حالانکہ ایسا نہیں ہے اور اگر یہ کہا جائے کہ جس شعور و ادراک کی روح جسم میں داخل ہوگی وہی شعور و ادراک انسان میں پیدا ہوگا تو پھر اس کا جواب دہ کون ہے کہ احمد میں کیوں احمقانہ روح داخل کی گئی اور محمود کو کیوں عقلمند روح سے سرفراز کیا گیا ۔

(۶) اگر یہ کہا جائے کہ روح میں پہلے سے کوئی شعور نہیں پایا جاتا بلکہ جسم انسانی میں داخل ہونے کے بعد شعور پیدا ہوتا ہے تو پھر یہ بتانا پڑے گا کہ اس شعور و ادراک کے پیدا ہونے کا کیا سبب ہوتا ہے اور کیا اس کا تعلق کسی اور روح سے ہے۔

(۷) اگر حیات اور روح کو ایک ہی چیز تسلیم کیا جائے تو جنین کی اولین جنبش و حرکت کے ساتھ اس کے آغاز کو ماننا پڑے گا اور انسان کی موت کے ساتھ اس کے اختتام کو، اور اس صورت میں روح کو فانی ماننا پڑے گا یا حیات کو غیر فانی اور یہ دونوں مسلمات مذہب کے خلاف ہیں، علاوہ اس کے ہم کو ان تمام مخلوقات میں بھی روح کا وجود تسلیم کرنا پڑے گا جو ذی حیات کہلاتے ہیں اور روح کی حامل نہیں۔

(۸) اگر یہ کہا جائے کہ روح انسانی، روح حیوانی، روح نباتی اور روح حشراتی سب ایک دوسرے سے مختلف ہیں تو اس صورت میں ان سب روحوں کو غیر فانی ماننا پڑے گا یا پھر اس کی وجہ بتانا پڑے گی کہ روح انسانی کیوں غیر فانی ہے اور دوسری قسم کی روحیں کیوں فانی ہیں اور اگر روح نباتی و روح حشراتی کے غیر فانی ہونے کو عقل قبول نہیں کرتی تو روح انسانی کے غیر فانی ہونے کو کیوں قبول کرے۔

(۹) اہل مذاہب اس کا ایک الزامی جواب یہ دیتے ہیں کہ جب مادیین، مادہ کو غیر فانی مانتے ہیں تو روح کو غیر فانی ماننے میں کیا حرج ہے یعنی اگر جسم کے اجزا و فنا نہیں ہوتے بلکہ صرف ہیئت بدلتے رہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ روح بھی انھیں مختلف تشخصات کے ساتھ نہ پائی جائے۔

اہل مذاہب کا یہ اعتراض اول تو خود ان کے عقاید کے خلاف ہے، کیونکہ اس صورت میں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ انسانی روح اپنی اصلی حالت پر قایم نہیں رہتی اور نہیں کہا جا سکتا کہ وہ کتنے کیڑوں یا پودوں کی روحوں میں منقسم ہوگئی اور اس طرح یوم آخرت میں انسانی روح کے جواب دہ ہونے کا عقیدہ باطل ہو جاتا ہے۔

(۱۰) مذاہب بقاء روح اور عذاب و ثواب کے ثابت کرنے میں ایک اخلاقی منطق سے بھی کام لیتے ہیں اور وہ یہ کہ مرنے کے بعد احیاء موتی، بقاء روح، حشر و نشر عذاب و ثواب کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر اس کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک شخص اس دنیا میں باوجود عصیاں کاری کے لطف و مسرت کی زندگی بسر کرے اور دوسرا شخص باوجود تقدس و نیکوکاری کے خراب و خستہ رہے، اس عدم توازن کے دور کرنے کی صورت صرف یہی ہو سکتی ہے کہ مرنے کے بعد ایک عدالت گاہ قایم کی جائے اور وہاں عذاب و ثواب سے دونوں پلے برابر کر دئے جائیں اس صورت میں خدا کے عادل ہونے کی صورت برقرار رہتی ہے۔

قطع نظر اس سے کہ یہ عقیدہ علمی حقایق و مسلمات اور فطری قوانین و مقادیر کے خلاف ہے، سب سے بڑا نقص اس میں یہ ہے کہ خدا کی مسئولیت اس عقیدہ کے بعد بھی دور نہیں ہوتی کیونکہ ایک انسان کو انسان، ایک حیوان کو حیوان اور ایک پودے کو پودا پیدا کرنے کی ذمہ داری بہرحال خدا ہی پر عاید ہوتی ہے اور اس لئے سبزہ فراہم کر سکتا ہے اسے کیوں سبزہ پیدا کر کے ہمیشہ پامال رکھا، ایک کیڑا شکایت کر سکتا ہے کہ اسے کیڑا پیدا کر کے کیوں چڑیوں اور جانوروں کا لقمہ بنایا۔ ایک جانور کہہ سکتا ہے اسے جانور بنا کر کیوں انسان کے بس میں دیدیا اور اگر ان کا جواب یہ دیا جائے کہ یہ خدا کی مصلحت ہے جیسے چاہا جیسا بنا دیا" تو پھر انسانی دنیا کے اس عدم توازن کا بھی یہی جواب ہو سکتا ہے کہ خدا مختار ہے دنیا میں جس طرح جس کو چاہا رکھا اگر اچھے کام کرنے والے کو تکلیف پہونچی تو کیا اور برے کام کرنے والے آرام سے رہے تو کیا؟ خدا بے نیاز ہے اور اس سے کوئی اخلاقی باز پرس نہیں ہو سکتی

حقیقت یہ ہے کہ انسان کے تمام مذہبی عقاید صرف اس کے اس پندار کا نتیجہ ہیں کہ وہ کوئی بہت بڑی چیز ہے اور اگر کسی کام کا نتیجہ اس کی خواہش کے مطابق نہیں نکلتا تو وہ اپنی تسکین اس طرح کرنا چاہتا ہے کہ یہاں نہیں تو وہاں اور اس وقت نہیں تو کسی وقت اور اس کی تلافی ہوگی اس نے اپنی دنیاوی زندگی کے لحاظ سے اچھائی اور برائی کی تعیین کی، اور اسی لحاظ سے اس نے آخروی عذاب و ثواب کی طرح ڈالی۔ ہر وہ شخص جس نے اس دنیا میں عیش کی ہے، کبھی یہ نہیں چاہ سکتا کہ اس سے اس عیش کوشیوں کی باز پرس ہو اور ہر وہ شخص جس نے اس دنیا میں ناکام زندگی بسر کی ہے، اپنی تسلی صرف اس طرح کر سکتا ہے کہ ایک دوسری دنیا فرض کر کے اس میں اپنے آپ کو عیش کرتا ہوا دیکھے۔ الغرض بقاء روح اور عذاب و ثواب کا عقیدہ خدا کی بے نیازی اور علم و عقل کو دیکھتے ہوئے ضرورت و مصلحت

اور قانون قدرت دونوں کے خلاف ہے اور اس کو تسلیم کرانے کے لئے نہ کوئی ربانی دلیل پیش کی جا سکتی ہے نہ اخلاقی و علمی۔

یہاں تک تو علمی بحث اس عقیدہ کے متعلق ہوئی۔ اب آیئے دیکھیں کہ اسلام نے اس گتھی کو کس طرح سلجھایا ہے اور چونکہ اسلامی لٹریچر میں صرف قرآن ہی ایک ایسی چیز ہے جس پر تمام مسلمانوں کا اتفاق ہے اس لئے ہم اپنی جستجو کو صرف آیات قرآنی ہی تک محدود رکھیں گے۔

قرآن مجید میں روح کا لفظ متعدد جگہ آیا ہے اور ضرورت ہے کہ اس کا صحیح مفہوم معلوم کرنے کے لئے ہم ان آیات کو اپنے سامنے رکھیں جن میں لفظ روح استعمال کیا گیا ہے۔

قرآن مجید کی متعدد آیات ایسی ہیں جن میں روح کا لفظ حضرت عیسیٰ سے تعلق رکھتا ہے مثلاً سورۂ بقر میں ارشاد ہوتا ہے :-

" وایدناہ بروح القدس" (یعنی ہم نے روح القدس سے ان کی مدد کی)۔ سورۂ مایدہ میں خطاب ہوتا ہے کہ: "ایذ تک بروح القدس" (ہم نے روح القدس سے تمہاری مدد کی)۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہوتا ہے: "عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ وکلمتہ القہا الی مریم وروح منہ"۔ اس آیت میں گویا عیسیٰ کے "روح اللہ" ہونے کی صراحت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ رسول اللہ اور کلمۃ اللہ کا بھی وہی مفہوم ہے جو روح اللہ کا۔

ہر چند ان آیات سے اس روح پر کوئی روشنی نہیں پڑتی جو زیر بحث ہے۔ لیکن اس سے کم از کم یہ ضرور ثابت ہوتا ہے کہ روح کا لفظ اپنے لغوی و اصلی معنی سے ہٹ کر مجازاً کسی دوسرے مفہوم میں بھی استعمال ہو سکتا ہے۔

سورۂ سجدہ میں ایک جگہ انسان کی پیدائش کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوتا ہے :- " ونفخ فیہ من روحہ" سورۂ شوریٰ میں خود قرآن کو روح سے تعبیر کیا گیا ہے: "کذالک اوحینا الیک روحا من امرنا" سورۂ مومن میں ارشاد ہوتا: "یلقی الروح من امرہ علی من یشاء من عبادہ" یعنی اپنے بندوں میں سے جس پر وہ چاہتا ہے روح نازل کرتا ہے۔

ان آیات سے صاف ظاہر ہے کہ یہاں روح کو بمعنی الہام، وحی یا فراست استعمال کیا گیا ہے اور اس روح سے اس کا کوئی واسطہ نہیں جو حیات انسانی سے تعلق رکھتی ہے، سورۂ بنی اسرائیل میں البتہ ایک آیت ایسی ہے جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ روح کی حقیقت کو ظاہر کرتی ہے وہ آیت یہ ہے " یسئلونک عن الروح قل الروح من امر ربی" (تجھ سے روح کے متعلق لوگ سوال کرتے ہیں، کہدو کہ روح حکم خداوندی کا نام ہے)

اول تو اس آیت کے بعد کی آیتوں سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں بھی روح سے قرآن یا وحی و الہام مراد ہے، کیونکہ بعد کی آیتوں میں صراحۃً وحی و قرآن کا ذکر موجود ہے لیکن اگر ہم سیاق کی دوسری آیتوں سے علیحدہ سمجھ کر یہاں، روح کے معنی واقعی روح کے لیں تو اس سے روح کی حقیقت صرف اس قدر ظاہر ہوتی ہے کہ وہ خدا کا حکم ہے اور ارشاد اس سے بہتر الفاظ میں روح کی حقیقت کو ظاہر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ آپ امر ربانی یا حکم خداوندی پر غور کریں گے تو قانون قدرت یا مقادیر الٰہیہ کے علاوہ کچھ نظر نہ آئے گا اور اس طرح روح کے معنی صرف اس حیات بازندگی کے رہ جائیں گے جو قانون قدرت کے مطابق پیدا ہوتی اور رفتا ہو جاتی ہے۔

مجھے تلاش سے کلام مجید میں کوئی آیت ایسی نہیں ملی جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ روح زندگی سے علیحدہ کوئی دوسری چیز ہے اور موت کے بعد وہ باقی رہتی ہے۔

سورۂ نباء میں بے شک ایک جگہ " یوم یقوم الروح والملائکۃ صفا " کہا گیا ہے لیکن ـــ غالباً یوم قیامت کا ایک منظر اس میں ظاہر کیا گیا ہے ـــ یہ پوری سورت مکہ میں نازل ہوئی تھی جب عہد رسالت کی ابتدا تھی اور کفار عرب نے رسول اللہ کو بہت پریشان کر رکھا تھا اس لئے یہ سورت دراصل رسول اللہ کی کامیابیوں اور کفار کی ناکامیوں کی پیشین گوئی ہے جس میں ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ وقت دور نہیں جب اجنبی اور بیرونی طاقتوں کا مقابلہ ہوگا اور کامیابی رسول اللہ کو ہوگی۔

انتخابِ کلام حضرتِ دل شاہجہانپوری

کیا جانے کس خیال سے چھوڑا بہ حالِ زار — مجھ پر بڑا کرم ہے مرے چارہ ساز کا
اُٹھ گیا پردۂ حائل فقط اتنا ہے خیال — کیا کہیں جلوہ کہ ناز میں بھر کیا دیکھا
سر اپنا ہے کسی کے آستاں پر — جبینِ عجز پہونچی آسماں پر

جانبِ در بروئے حرم کان لگے رہتے ہیں — کاش پردے ہی سے سنتے تری آواز کہیں
گوشِ دل کے لئے کچھ طور کی تخصیص نہیں — ہر جگہ ہم تری آواز سنا کرتے ہیں
دیا تھا عشق تو ہمت بھی یہ خدا دیتا — کہ ایک وقت میں ہم ترک آرزو کرتے
تلاشِ دوست کجا آرزوئے دید کجا، — ہمیں تو عمر ہوئی اپنی جستجو کرتے
تالِ عشق پہ دل مطمئن اگر ہوتا، — تو چھیڑ چھاڑ کے ناصح سے گفتگو کرتے
دریائے محبت میں پہونچائے خدا نہ تک — ڈوبے گی جہاں کشتی اپنا وہی ساحل ہے
سرِ طور اک برقِ حسن لہراتی نظر آئی — ذرا شوخی سے جھٹکا تھا کسی نے اپنے داماں کو
ہم کیا بتائیں کیا بتائیں کیا تھی تیری نگہ کی گردش — اک وجد کی سی حالت پہروں رہی ہماری
یاد ہے ہاں یاد ہے طرزِ نگاہِ مستِ یار — ایک تازہ پنکھڑی سے پارہ پارہ دل ہوا
اندازِ چشمِ تاب شکن تھا کہ الاماں، — اک پنکھڑی کی چوٹ سے دل چور ہوگئے
سن لیجئے حالِ دلِ مضطر دمِ آخر — ہوجائے گا ختم آج ہی افسانہ کسی کا
کنارے تک تو پہونچے گو کسی صورت سے بھی پہونچے — تلاطم بحرِ غم کے ڈوبنے والوں کو ساحل تھا
جو ہو نا آشنا رازِ خاموشی وہ کیا سمجھے — کہ ہے ناقابلِ تشریح اے دل داستاں میری
نگاہِ شوق رہی ہمزبانِ دل لیکن، — کسی طرح نہ بنا شرح آرزو کرتے
شوقِ دل جتنا بڑھا گرد اور بھی بڑھتی گئی — آگے آگے قیس کے دھوکا سا کچھ محمل کا ہے
انجام پوچھنا تھا ہمیں سوز و ساز کا، — اے اہلِ بزم، شمع سحر تو خموش ہے
ہماری کشتیِ عمر آہ ڈولتی تھی ادھر — اُدھر نجومِ فلک ڈوبتے اچھلتے تھے
اثر ہر ہر نفسِ سرد ہے افسانۂ دل — شدتِ غم ہیں کوئی جوشِ تمنا دیکھے
ہر دم ہے اسی محوِ تغافل کا تصور — عشق اور کسی کام کے قابل نہیں رکھتا
یہ بھیگی رات، یہ ٹھنڈا سماں یہ کیفِ بہار — یہ کوئی وقت ہے پہلو سے اُٹھ کے جانے کا
وقتِ رخصت تسلیاں دے کر — اور بھی تم نے بے قرار کیا

آغازِ محبت سے انجامِ محبت تک — گزرا ہے جو کچھ ہم پر تم نے بھی سُنا ہوگا
دلسوز اگر ہنو تو دکھائیں، جگر کے داغ — تم چارہ ساز ہو تو کہیں ماجرائے دل
وہ خود غرض سُنے نہ سنے اس سے کیا غرض — کہنا ہے بار بار ہمیں مدعائے دل
دفعتہً پھر بھول جاتے ہیں جو کچھ آتا ہے یاد — ہم کسی کے سامنے کیا جانے کیا کہنے کو ہیں
ہم کو بے چین کئے جاتے ہیں، ہائے کیا شے وہ لئے جاتے ہیں — جفا کے بعد وہ عہدِ وفا کریں تو سہی
محال ہے کہ مرے دل کو اعتبار نہ ہو — نگاہِ مست سے او مڑ کے دیکھنے والے
تجھے تو ہے، مجھے اپنی خبر نہیں نہ سہی — کچھ خبر ہم کو نہیں، کون تھا وہ حضرتِ دل
چل دیا دل ابھی سینہ میں مسل کر کوئی — پردہ اُٹھا دیا یہ عجب اُس نے چال کی
دیکھا تو ہم میں تاب نہ تھی عرضِ حال کی — کسی کی یاد تھی آنکھوں سے اشک ڈھلتے تھے
اسی خیال میں ہم کروٹیں بدلتے تھے — روز آ آ کر تسلّی دل کو دے جاتا ہے کون
کچھ سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ سمجھاتا ہے کون — شوق سے تقویٰ شکن بن جاؤ تم اے دل مگر
یہ سمجھ لو آج پی تو جامِ کوثر رہ گیا — فقط ہے وعدہ ہی وعدہ نہیں وہ آنے کا
پکارتا ہے یہ انداز مسکرانے کا — نہ پوچھ حالِ شبِ غم نہ پوچھ اے دلسوز
نہیں نہیں وہ فسانہ نہیں سنانے کا — سوئے صحرا، تہ تربت، پسِ دیوارِ حبیب
ہم بھی تقدیر پہ شاکر ہیں جہاں ہو، جانا — ہمصفیرو فصلِ گل آنے تو دو،
خود بہ خود ہو جائیں گے طیار پر — حق تو یہ ہے کہ خطا تم سے ہوئی اے منصور
تمھیں چھپانے کی جو باتیں وہ بہ آواز کہیں — حسرتِ راحتِ دل تھی جو اے دلِ روح پرور تھی
وہی اب گوشۂ دل میں نہیں معلوم ہوتی ہے — بنے گا قصۂ عبرت کسی زمانہ میں
مرا نیاز ترا شیوۂ ستم نظری — سمجھ رہا ہوں تقاضا، عشق نادانوں کو
یہ امتیاز اثر ہے نہ حسن بے اثری — خیال و خواب ہوا رخصتِ بہار کے بعد
وہ انبساطِ عنادل وہ نغمۂ سحری — ستم جو حد کے اُٹھا دو تو فیصلہ کو یاد کرو
آل ہستیِ اہلِ وفا کو یاد کرو — جو بے حسی کبھی بڑھ جائے قابِ ضبط کی
کرشمۂ نگہِ فتنہ زا کو یاد کرو — تو دل آزار رہا، درد آشنا نہ ہوا
چارہ سازِ خلشِ ناوکِ مژگاں نہ ہوا — اک زمانہ وہ بھی تھا، وحشت اثر کوئی نہ تھا
محوِ نیرنگِ نگاہِ عشوہ گر کوئی نہ تھا — تا دمِ یار پہونچنا تھا کہ رخصت ہوئی روح
رہ گئی آرزوِ عرضِ تمنا باقی،

حضرت دل شاہجہاں پوری کا مجموعۂ کلام "ترانۂ دل"

جس میں عہدِ حاضر تک کا کلام شامل ہے۔ شایع ہو چکا ہے اور شفیق حسن خاں صاحب، محلہ باغبھی تھانہ شاہجہانپور سے تین روپیہ آٹھ آنہ میں مل سکتا ہے۔

ذکی لکھنوی :-

اس طرح دیکھ کے ہنستے ہیں قفس میں اب تو — جیسے واقف ہی نہیں اہلِ گلستاں مجھ سے
نظر اور اُس پہ محبت بھری نظر ساقی — نثار ایسی نظر پر ہزار پیمانے
ملو گے ایک نہ اک دن یہ اعتبار تو ہے — مگر ابھی سے قیامت کا انتظار تو ہے
ترے غم کے صدقے میں ملتی ہے ہم کو — وہ لذت کوئی نام جس کا نہیں ہے
جہاں پر چلتے چلتے خود بخود ٹھہریں قدم اپنے — وہ منزل ہو نہ ہو میں تو اُسے منزل سمجھتا ہوں
تڑپ دیکھ کر روحِ بجلی کی ہم — شمیں بنانے کو جی چاہتا ہے
کلی جب ہنسی پھول جب مسکرائے — تمہاری قسم تم بہت یاد آئے
بہت بچ کے آئی ہے طوفاں سے کشتی — کہیں جا کے ساحل سے ٹکرا نہ جائے
پوچھے جلنے کے لئے شمع سے پروانہ کیا — شمع جلتی ہے کہیں پوچھ کے پروانے سے
ہو گئے کچھ ایسے ہی مجبورِ دردِ دل سے ہم — ورنہ کب کے اٹھ گئے ہوتے تری محفل سے ہم
جانے والے کیا پلٹ کر دیکھنا بھی ہے گناہ — کہ سکے اتنا ہی اور وہ بھی بڑی مشکل سے ہم
دم ذرا لیں رہ محبت میں — کوئی ایسا مقام ہے کہ نہیں

شفقت کاظمی :-

یادِ گیسوو رخسارِ یار گزری ہے — بڑے مزے میں شبِ انتظار گزری ہے
زہے تصورِ خوباں کہ زندگی اپنی — غمِ حیات سے بیگانہ وار گزری ہے
اُسی کی یاد ہے شفقت متاعِ جاں اب تک
وہ زندگی جو سرِ کوئے یار گزری ہے

انجم رضوانی :-

اے کہ مشہور تو لطف و کرمِ عام میں ہے — میرا حصہ بھی کوئی دُرِ دِ تہِ جام میں ہے
باوجود یکہ حوادث سے مسلسل ہوں دو چار — ہمت افزا کوئی شے ہے کہ ترے نام میں ہے
شیخ، تحقیر نہ کر عشق کے دیوانوں کی — اصل راز ان کے جنوں کا خردِ خام میں ہے
بے حقیقت سہی انجم کی جبیں سائی ۔ مگر
تیرا کہلانے کی خواہش دلِ ناکام میں ہے

بشر نواز :-

جلوۂ شوق کی رسوائیوں پہ ختم ہوئی — وہ داستاں جو چھڑی تیرے مسکرانے سے
بایں وفورِ محبت، بایں خلوصِ وفا — کبھی کبھی تو تری یاد تک نہیں آئی
سکونِ بے حسی آتا نہیں خوش میری فطرت کو — ہزاروں بار لوٹ آیا ہوں طوفانوں میں ساحل سے
بعد پروانوں کے ہوتی گئیں شمعیں بھی خموش — کون کرتا ہے شہیدانِ وفا کا ماتم ——؟

ندیم جعفری (بہ طرزِ حسرت)

حریفِ گریۂ بے قصد و اختیار نہ تھے، — بجا کہ تیری محبت میں اشکبار نہ تھے
نہ ہم سے ہو سکا نظارۂ بہارِ چمن — بہار آئی تو ہم واقفِ بہار نہ تھے
ندیم راس نہ آئی ہمیں فضائے بہشت، — وہ اس لئے کہ ہوس میں شریکِ کار نہ تھے
وہ اک نگاہ جو مرہونِ صد پیام ہوئی، — بنائے سلسلۂ شوقِ ناتمام ہوئی
ہمارے بعد کوئی کامگار ہو نہ سکا، — اگرچہ رسمِ محبت جہاں میں عام ہوئی
ہزار حیف ہے اُس دل کی خود پسندی پر — وہ جس کو عشق میں پروائے ننگ و نام ہوئی

پاکستان کے حالات سے متاثر ہو کر

(یوسف قریشی پاکستانی)

فصلِ گل ہے اور چمن شعلوں سے ہم آغوش ہے — آگ گلشن کی بجھائے۔ کس کو اتنا ہوش ہے؟
شمع سے سیکھا ہے ناموسِ وفا کا احترام — سر سے شعلہ اُٹھ رہا ہے اور زباں خاموش ہے
ہا کجا ایسے نشیمن کا تحفظ تا کجا؟ — جس کی شاخِ گلفشاں بھی صاعقہ بردوش ہے
کاش اتنا ہی سمجھتی اہلِ دانش کی نگاہ! — پھول میں بھی نیش ہے اور خار میں بھی نوش ہے
ہم کو اتنا یاد ہے اک برق سی چمکی تو تھی — ہوش کب جاتے رہے تھے اس کا کس کو ہوش ہے

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۵۲ء (حسرت نمبر)

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد و شعرا نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کلیات حسرت کے بغیر بھی کمی محسوس نہ کریں گے شاعر نگار مرتبہ جلوم حسرت کیلئے اسکا مطالعہ ضروری ہے

قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سنہ ۱۹۴۸ء
جنوری، فروری

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت، رفعت اور تمدن اسلام کے بلند خیالی کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے۔ جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوتی تھی

قیمت دو روپے
علاوہ محصول

سنہ ۱۹۴۹ء
جنوری، فروری

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیے

قیمت دو روپے
علاوہ محصول

سنہ ۱۹۵۱ء
جنوری، فروری

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں ارس ہنڈی کی مشہور عالم کتاب ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ اقتباس ہے جس میں انہی ایران مصر، عراق فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور ساتھ ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ اڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اسکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت عہ

علاوہ محصول

سنہ ۱۹۲۶ء
فروری، مارچ

جو فن اقتصاد پر ملک کے بہترین اہل قلم ارباب نگار کے مضامین پر مشتمل ہے قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

سنہ ۱۹۵۳ء
جنوری، فروری

(داغ نمبر)

جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رام پور، قیام حیدر آباد کے زمانہ کے علاوہ ان کی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور انکے فن، شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سنہ ۱۹۴۳ء
جنوری

اس نمبر میں یاس خیر آبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے سند شاعر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ یاس کی شاعری کیا تھی۔ قیمت عہ علاوہ محصول

سالنامہ سنہ ۱۹۵۴ء

(طوفان و ہدایت اسلام نمبر)

یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لیکر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر انکے اسباب عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ در اصل تاریخی کتاب ہے۔ جو ہر گھر کے پڑھے کے پاس ہونا چاہیئے۔ قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

سالنامہ سنہ ۱۹۵۵ء

(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر) مع تتمہ

جس میں اسلامی علوم و فنون پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات دے کر ان کی علمی خدمات اور تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سنہ ۱۹۲۸ء
سالنامہ

(سوسی نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ جو فن کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپے

مکتوباتِ نیاز

(تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، انگینی اور ایسپریشن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل نئی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۸ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے

قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے وہ مضامین جمع کئے گئے ہیں جن میں

(۱) چند گمنام فلاسفہ قدیم کی زندگیوں کا تذکرہ ہے۔

(۲) ہندی فلسفہ کا مختصر مگر نہایت مفید اور مکمل جائزہ لیا گیا ہے۔

نیز ایک روپیہ علاوہ محصول

تقاب اٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے ان انسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے باوبان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اتحاد حیات کے لیے کس درجہ مہلک قاتل ہے، زبان، بیان انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ جس کی دلکشی کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس کی بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی

تازہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

جذباتِ بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے اُن کی اپنی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے، اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول ڈاک

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان، تکمیل، اس کی نزاکت بیان اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچی ہے یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت دو روپے

علاوہ محصول ڈاک

مذاکراتِ نیاز

پنے حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات، تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا آخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے قیمت ایکروپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول ڈاک

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ نہایت مفید چیز ہے۔ ایران و ہندوستان کا اثر جو شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر ایرانی تقلید اور غزل گوئی کی عہد بہ عہد ترقی، نقشہائے رنگ رنگ (خاص کی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، فنون ادبیہ و حقیقت نگاری

قیمت چار روپے علاوہ محصول

فراست الید

مؤلفہ نیاز فتحپوری

اس کے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، عزت و حیات و بیماری، شہرت و نیک نامی پر بحث پیش کر سکتا ہے

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ [illegible] مذہب کا تذکرہ کیا ہے اور دنیا میں کیونکر ہوا اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود نہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی بابندی کا کچھ بھی [illegible] روپیہ، علاوہ محصول

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی ۱۰ر

سالانہ چندہ پاکستان و ہندوستان
آٹھ روپیہ چھ آنے (مع سالنامہ)

تصانیف نیاز فتحپوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان کے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد مضامین غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس آڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کئے گئے ہیں جو پچھلے آڈیشنوں میں نہ تھے اسلئے ضخامت بھی زیادہ ہے۔ قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

من و یزداں

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے۔ جس میں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطہ نظر نہایت بلند انشائیاں اور پر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے

قیمت سات روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

جمالستان

اڈیٹر نگار کے انسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا ہر افسانہ ہر حرف اپنی جگہ جزوۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے اس آڈیشن میں افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے آڈیشنوں میں نہ تھے

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

حسن کی عیاریاں اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخ اور انشائے لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ پر واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنہیں حضرت نیاز کی اڈیشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہبی استفسارات و جوابات کا

مجموعہ

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ و کرامت (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) جوان لوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس ہاروں (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) ہاروت (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) گوسالہ (۱۵) لقمان (۱۶) عالم برزخ (۱۷) یاجوج ماجوج (۱۸) ہاروت ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پرمیشر (۲۲) آتش نمرود و غیرہ

ضخامت ۲۰۰ صفحات کاغذ سفید دبیز

قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے

ترغیبات جنسی یا شہوانیات (مجلد)

اس کتاب میں نواشی کی تمام نظری اور غیر نظری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ نواشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو بہت سے واقعات نظر آئیں گے۔ نیا آڈیشن

قیمت چار روپیہ علاوہ محصول

۵۶ء میں دو خاص نمبر

شایع ہوں گے

ایک "خدا نمبر" جنوری ۵۶ء میں دوسرا "اُردو نمبر" جولائی ۵۶ء میں۔ ہو سکتا ہے کہ "اُردو نمبر" جنوری میں شایع کیا جائے اور "خدا نمبر" جولائی میں۔ اس کا فیصلہ قارئین نگار پر چھوڑا جاتا ہے

"خدا نمبر" کے بابت بعض تفصیلات آپ کو معلوم ہو چکی ہیں۔ "اُردو نمبر" کے بعض عنوانات یہ ہوں گے:

اُردو زبان ـــــ اُردو دکن اور دہلی میں ـــــ اہلِ دہلی اور اہلِ لکھنؤ ـــــ اُردو کے تنزل کے اسباب ـــــ اُردو کے ارتقائی منازل ـــــ اُردو نثر سو سال میں ـــــ اُردو ادب کا سماجی پس منظر ـــــ ہندوستانی اور اُردو ـــــ اُردو قومی زبان کی حیثیت سے ۔ وغیرہ

منیجر

پاکستان کے خریدارانِ "نگار"

سالانہ چندہ (۱۲ روپے) ذریعہ منی آرڈر ذیل کے پتہ پر روانہ فرمائیں اور رسید ڈاک خانہ ہمارے پاس لکھنؤ بھیجدیں ۔ ہماری مطبوعات بھی اسی پتہ پر خط و کتابت کرنے سے مل سکتی ہیں:

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی ۔ ۱۰۵، سوبھ راج جیتومل روڈ ۔ ویسٹ گارڈن ۔ کراچی

اگر ۱۵ر تک کسی ماہ کا پرچہ آپ کو نہ ملے

تو اطلاع ملنے پر آیندہ ماہ کے پرچہ کے ساتھ ہم اپنے صرف سے فراہم کر دیں گے لیکن اگر آپ اس سے قبل چاہیں گے تو میرا خط روانہ ہوگا (کیونکہ مہینے کے اندر اندر پیڈ بھیجنے میں ہم کو وہ گنا محصول ادا کرنا ہوگا) اس لئے جب آپ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع دیں تو یہ ضرور لکھ دیجئے کہ آپ فوراً چاہتے ہیں یا اگلے پرچے کے ساتھ۔

منیجر نگار لکھنؤ

بعض کمیاب کتابیں

سوانح اُردو

۱- آثارِ غالب --- شیخ محمد اکرام --- معہ
۲- غالب --- غلام رسول مہر --- معہ
۳- یادگارِ غالب --- حالی --- معہ
۴- انغرائی --- شبلی --- سے
۵- تذکرہ کاملانِ رامپور --- عہ
۶- تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی --- صہ
۷- مشاہیر عالم طبقۂ حکماء --- صہ
۸- الہارون --- مصباح الدین --- سے
۹- حیات انیس --- اشہری --- معہ
۱۰- واقعات انیس --- احسن --- سے
۱۱- قاموس المشاہیر حصّہ اول --- عہ
۱۲- البرامکہ --- عبدالرزاق --- عہ
۱۳- نورجہاں بیگم --- اشہری --- معہ
۱۴- سیرۃ النعمان --- شبلی --- سے
۱۵- سیاحت خسرو --- صہ
۱۶- [illegible] --- نظر کاکوری --- سے

تنقید اُردو

۱۷- گلِ رعنا --- عبدالحی --- سے
۱۸- سخن شعراء --- نساخ --- عہ
۱۹- گلشنِ ہند --- ڈاکٹر زور --- معہ
۲۰- آبِ بقا --- عشرت --- للعہ
۲۱- بہارِ سخن --- سندرلال --- عہ
۲۲- تذکرۂ شعراء --- شفیق --- عہ
۲۳- نفیات کارسان تاسی --- عہ
۲۴- سراپا سخن --- محسن علی --- عہ
۲۵- تذکرۂ ہندی --- مصحفی --- عہ
۲۶- دستور الفصاحت، یکتا --- عہ
۲۷- پنجاب میں اُردو --- شیرانی --- عہ
۲۸- [illegible]
۲۹- [illegible] --- مہر

۳۰- سیر و سیاحت --- ڈاکٹر برنیر --- سہ

ادب اُردو

۳۱- دیوان میر حسن --- عہ
۳۲- خمخانۂ عشق --- امیر مینائی --- معہ
۳۳- مراۃ الغیب --- امیر مینائی --- مہ
۳۴- کلیات ناسخ --- معہ
۳۵- تاج سخن --- جلیل --- سے
۳۶- کلیات سودا --- سے
۳۷- دیوان مجروح --- مہ
۳۸- کلیات تسلیم --- صہ
۳۹- نشتر --- یاس عظیم آباد --- عہ
۴۰- آیات وجدانی --- یگانہ --- سے
۴۱- کلیات میر --- سہ
۴۲- کلیات مومن --- سہ
۴۳- دیوان ولی دکنی --- صہ
۴۴- کلیات نظیر } شہباز --- سہ
۴۵- زندگانی بے نظیر }
۴۶- دیوان قلق --- مہ
۴۷- نقش چغتائی --- سہ
۴۸- کلیات نظیر --- مہ
۴۹- کلیات تراب --- سہ

تاریخ اُردو

۵۰- گنج شایگاں --- تاریخ سکہ جات مصور --- صہ
۵۱- احسن التواریخ، تاریخ اودھ --- تمنا --- معہ
۵۲- تاریخ الاسلام --- احسان اللہ --- عہ
۵۳- آثار الصنادید، پہلا ایڈیشن --- سہ
۵۴- تاریخ ڈھاکہ --- طیش --- عہ
۵۵- صنادید عجم، مہدی حسین، ادب فارسی کی تاریخ --- سے
۵۶- تاج التواریخ تین جلد مصور، نصرت علی --- مہ
۵۷- دربار اکبری --- آزاد --- سہ

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ ستمبر میں ختم ہوگیا اور اکتوبر کا "نگار" آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں وی، پی ہوگا جس میں سالنامہ ۵۶ء کی قیمت (مع مصارف رجسٹری) بھی شامل ہے

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۸ | فہرست مضامین ستمبر ۵۵ء | شمار ۳

ملاحظات ..... اڈیٹر ۳
نیاز کی مضمون نگاری ..... محمد خورشید عاصم .. ۵
"پیام کیف" میری نظر میں ..... رشید حسن خاں ... ۱۳
فارسی ڈرامہ کی بنیاد ..... رغیب حسین ... ۲۲
فضا کی شاعری اور "وطنیت" ... نور مظفر ... ۲۶
یادِ رفتگاں ۳۲
شفا گوالیاری ..... کوثر چاندپوری ... ۳۴
فن تحریر کی تاریخ ... محمد اسحاق صدیقی ۳۷
عورت اور تعلیم ... اڈیٹر ۴۱
مشاعرۂ نگار ۴۶
منظومات: فضا ابن فیضی، پروفیسر شور، ساقی جاوید، حامد بھوپالی، راغب مرادآبادی، ساحل بلگرامی، نفیس قادری، حیات لکھنوی، مقسط حیدری ۴۸
مطبوعات موصولہ ۵۲

ملاحظات

مشرقِ وسطیٰ اور برطانوی سیاست

ہندوستان کی آزادی کے بعد جب برطانیہ کی استعماری ساکھ ختم ہوئی اور بین الاقوامی سیاست امریکہ و روس میں تقسیم ہوگئی، تو برطانیہ نے امریکہ کا دامن پکڑنا مناسب سمجھا، کیونکہ اس کی اقتصادی زبوں حالی اور مدافعانہ کمزوری کو امریکہ ہی دور کرسکتا تھا، لیکن اسی کے ساتھ اسنے یہ کوشش بھی شروع کی کہ مشرقِ وسطیٰ میں جو اثرات اس کے قایم ہوچکے ہیں وہ زایل نہ ہونے پائیں اور عراق کی پٹرولی دولت اس کے ہاتھ سے جانے پائے اس مقصد کی تکمیل کے لئے اس نے مشرقِ وسطیٰ کی دفاعی تنظیم کی تحریک شروع کی جس میں عراق و ترکی تو جلد ہی شامل ہوگئے اور پاکستان نے بھی اس پر کچھ دنوں بعد اپنی رضامندی ظاہر کردی گو اپنے اندرونی جھگڑوں کی وجہ سے وہ اس پر اب تک مہر توثیق ثبت نہیں کرسکا۔ یہی حال امریکہ کا ہے کہ وہ بھی اس مسئلہ پر ابھی غور کر رہا ہے۔ کیونکہ سعودی حکومت نے اس تنظیم میں شرکت سے انکار کردیا ہے اور امریکہ کے لئے سعودی حکومت کی خاطرداری وہاں کے پٹرولی چشموں کی وجہ سے از بس ضروری ہے۔

سعودی حکومت کے علاوہ مصر کی شرکت بھی اس تنظیم میں ضروری تھی اور برطانیہ کو توقع تھی کہ وہ بھی جلد یا بدیر اس تنظیم میں شریک ہوجائیگا لیکن اتفاق سے اسی زمانہ میں جنیوا کانفرنس منعقد ہوگئی اور بلگانن کے اس بیان نے کہ "غیر جانبدار رہنے والے اور کسی عسکری بلاک میں شامل نہ ہونے والے ممالک کی حفاظت روس کا فرض اولین ہوگا" اور پھر اس کے بعد ہی اس خبر نے کہ جنرل ناصر روس کی دعوت پر ماسکو جارہے ہیں برطانیہ کی وزارت خارجہ کو بہت تشویش میں ڈال دیا، ہرچند کرنل ناصر کی طرف سے یہ خیال نہیں کیا جاسکتا کہ وہ اشتراکی بلاک میں شامل ہوجائیں گے کیونکہ مصر میں اشتراکی تحریک کو پسند نہیں کرتے، لیکن بلگانن کے بیان سے فایدہ اٹھاکر غیر جانبداری بلاک میں شامل ہوجانے کے امکانات مصر کے لئے

زیادہ قوی ہوگئے ہیں۔

برطانیہ کی وزارت خارجہ کا خیال ہے کہ ماسکو اور مصر کے درمیان اس ربط کے محرک نہرو ہیں یعنی ایک طرف انھوں نے ماسکو میں بلگانن کو کرنل ناصر کے بلانے کا مشورہ دیا اور جب نہرو، روس سے لوٹتے ہوئے قاہرہ آئے تو دوسری طرف کرنل ناصر کو آمادہ کیا کہ وہ اس دعوت کو قبول کرلیں اور نہرو نے یہ سب کچھ اس لئے کیا کہ مارشل ٹیٹو کی طرح 'نیوٹرل بلاک' میں وہ مصر کو بھی شامل کرسکیں، بہرحال اس سے انکار ممکن نہیں کہ اگر سعودی عرب اور مصر دونوں نے غیر جانبدار رہنے کا فیصلہ کرلیا تو مشرق وسطیٰ کی دفاعی تنظیم کا خواب مشکل ہی سے شرمندۂ تعبیر ہوسکے گا۔

اس سلسلہ میں ایران کے سامنے بھی یہ سوال پیش کیا گیا لیکن اس نے اس پر زیادہ آمادگی ظاہر نہیں کی کیونکہ اُسے روس سے گیارہ ٹن سونا ملنا تھا اور بعض سرحدی مسایل بھی طے کرنا تھے پھر اب کہ روس نے اسے سونا بھی دیدیا ہے اور سرحدی مسایل طے کرنے پر وہ اس حد تک آمادہ ہوگیا ہے کہ اس نے شاہ ایران کو اپنے یہاں آنے کی دعوت بھی دیدی ہے، ایران سے یہ توقع کرنا کہ وہ روس کے خلاف مشرق وسطیٰ کی تنظیم میں شریک ہوجائے گا، صحیح نہیں، کیونکہ اول تو ایران کا مفاد اسی میں ہے کہ وہ روس و برطانیہ دونوں میں سے کسی کو اخیر وقت تک مایوس نہ ہونے دے اور ادھر یا اُدھر کوئی فیصلہ کبھی نہ کرے، دوسرے یہ کہ ایران کے حدود روس سے اس قدر قریب ہیں کہ وہ اس سے بگاڑ کر برطانیہ کی مدد کے بھروسہ پر جو بہت دور واقع ہے، کبھی اپنے آپ کو محفوظ نہیں سمجھ سکتا۔

الغرض جنیوا کانفرنس کے بعد روس نے دُنیا میں غیر جانبداری اور دوسرے ممالک میں عدم مداخلت کی پالیسی کا اعلان کرکے دُنیا کی گرد آلود فضا کو بڑی حد تک صاف کردیا ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا یہ وہ ہتھیار ہے جو آٹم بم سے زیادہ مفید و کارگر ثابت ہوگا اور بہت سے ممالک کو منطقۂ اشتراکیت میں کھینچ لائے گا۔

پاکستان کا دورِ وزارت

آزادی کے بعد پاکستان کی یہ چوتھی وزارت اور چوتھی سیادت عظمیٰ ہے جو حال ہی میں کرنل اسکندر مرزا اور چودھری محمد علی کی وزارت میں قایم ہوئی ہے، اس سے قبل کی وزارتوں پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کے عہد میں اچھا یا برا جو کچھ وہ سب کو معلوم ہے، البتہ اس نئے دور کے متعلق ضرور قیاس آرائی کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور لوگ قیاس آرائی سے کام بھی لے رہے ہیں۔

ہم ہندوستان میں رہکر پاکستان کے اندرونی معاملات کو نہ اچھی طرح سمجھ سکتے ہیں اور نہ ان پر چنداں غور کرنے کی ضرورت ہے، لیکن جس حد تک ہندوستان و پاکستان کے باہمی تعلقات کا سوال ہے قدرتاً ہم کو وہاں کے ہر انقلاب پر غور کرنے کو جی چاہتا ہے اور صرف اس توقع پر کہ ممکن ہے اب بھی ہندوستان و پاکستان دو بھائیوں کی طرح مل جل کر زندگی بسر کرنا سیکھ جائیں اور موجودہ دور تذبذب کسی طرح ختم ہوجائے۔ اس لئے اس خواہش کو سامنے رکھکر جب ہم پاکستان کی نئی وزارت پر غور کرتے ہیں تو ہم کو ایک گونہ امید کی کرن بھی پھوٹتی نظر آتی ہے، اس لئے نہیں کہ وہاں کے اندرونی اختلافات ختم ہوگئے ہیں، وہاں کی جماعتی و صوبائی عصبیت دور ہوگئی ہے۔ وہاں کی جاگیردارانہ ذہنیت بدل گئی ہے، یا وہاں صحیح معنی میں جمہوریت پیدا ہوگئی ہے بلکہ صرف اس لئے کہ وہاں کے موجودہ وزیر اعظم اور گورنر جنرل دونوں کسی خاص سیاسی جماعت سے گہرا تعلق نہیں رکھتے اور ہوسکتا ہے کہ آیندہ یہی کم "تعلقی" کوئی صحیح راہ تلاش کرسکے۔ چودھری محمد علی، یقیناً سیاسی آدمی نہیں ہیں لیکن کام کے آدمی ضرور ہیں۔ وہ اپنی ذات سے بڑے محنتی، بیحد صفائش اور خلوص کے ساتھ ان تھک کام کرنے والے انسان ہیں اور اس وقت پاکستان کے اندرونی اختلافات کو دور کرنے کے لئے ایسے ہی آدمی کی ضرورت تھی۔ رہی وہاں کی سیاست خارجہ سو وہ یقیناً اسکندر مرزا کے ہاتھ میں ہوگی اور چونکہ وہ دفاعی طبقہ سے تعلق رکھنے کی وجہ سے اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ جنگ کتنی بڑی تباہی ہے، اس لئے گمان غالب یہی ہے کہ وہ پاکستان کی آیندہ ترقی و استقامت کے لئے صلح و آشتی ہی کا راستہ اختیار کریں گے اور اس قسم کی لان و گزاف کو پسند نہ کریں گے جس سے ان کے پیش روؤں کے زمانہ میں بارہا کام لیا گیا ہے اور جس نے ہمیشہ نفع کی جگہ نقصان ہی پہونچایا ہے۔ پاکستان کی کابینہ میں ایک ہندو کا وزیر قانون بنایا جانا اور روپیہ کی قیمت کو گھٹا کر ہندوستانی سکہ کی سطح پر لے آنا، پہلے مبارک اقدامات اس وزارت کے ہیں اور ہمیں امید ہے کہ چودھری محمد علی آیندہ اس سے زیادہ وسعت نظر سے کام لینے کی کوشش کریں گے۔

نیاز کی مضمون نگاری

انگریزی تسلط نے جہاں ہندوستان کی تہذیب و تمدن کو متاثر کیا وہاں ادب بھی ان اثرات سے محفوظ نہ رہ سکا۔ خواہ یہ ادب نظم ہو یا نثر۔ بعض چیزیں تو ایسی ہیں جو انگریزی اثرات کی وجہ سے اُردو ادب میں نئی پیدا ہوئیں اور بعض جو ہمارے پاس موجود تھیں۔ ان میں ان اثرات کی وجہ سے ایک تغیر سا پیدا ہوگیا۔ نئی اصناف مثلاً مختصر افسانہ، ناول، نظم، آزاد شاعری اور مضمون نگاری وغیرہ وہ چیزیں ہیں جو اُردو ادب کے لئے نئی کہی جا سکتی ہیں۔ ہمارے ہاں کی داستانیں تو تھیں لیکن افسانے اور ناول نہ تھے، بڑی مثنویاں اور دیوان موجود تھے۔ لیکن آزاد شاعری سے ہمارے شعرا واقف نہ تھے۔ یہی حال مضامین کا ہے۔ مضمون نگاری تقریباً ناپید تھی۔

اُردو ادب میں مضمون نگاری کی ترویج کا سہرا سرسید کے سر ہے۔ سرسید ۱۸۶۹ء میں جب انگلستان گئے تو وہاں ان کو سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کے پرانے پرچے دیکھنے کا موقعہ ملا اور انھوں نے ان میں شائع شدہ مضامین کا مطالعہ کیا۔ اس مطالعہ نے انھیں بہت متاثر کیا انھوں نے دیکھا کہ ٹیٹلر اور سپیکٹیٹر میں مختلف مجلسی، علمی اور ادبی موضوعات پر چھوٹے چھوٹے مضمون ہیں۔ جن میں اُس دور کے انگلستان کی کئی بُرائیوں اور کئی نقائص پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بغرض اصلاح تنقید کی گئی ہے۔ مضمون نگاری گو اصلاً اٹلی کی پیداوار تھی[1] لیکن اس موجودہ صورت فرانس میں اختیار کی اور مونٹنگنے MONTIGNE کو موجودہ صنف مضمون نگاری کا موجد مانا جاتا ہے[2]۔ ۱۶۰۰ء کے ارگرد مونٹنگنے کے مضامین انگلستان میں بڑے ذوق وشوق سے پڑھے جاتے تھے اور ان کا ترجمہ انگریزی میں کیا جا رہا تھا۔ مضمون نگاروں میں سب سے پہلا مشہور انگریز بیکن ہے۔ جس نے انگریزی میں اس صنف کی طرح ڈالی۔ خیال ہے کہ بیکن، مونٹنگنے کے مضامین سے اچھی طرح آگاہ تھا۔ بہرحال انگلستان میں بیکن کی وجہ سے مضمون نگاری کو وسعت اور مقبولیت حاصل ہوئی[3]۔ تاہم اس کی ترقی میں سب سے زیادہ سپیکٹیٹر اور ٹیٹلر کا ہاتھ ہے۔ جو بالترتیب ۱۷۱۱ اور ۱۷۰۹ میں نکلے تھے۔ ۱۷۱۷ کے بعد گارڈین بھی اس زمانہ میں سٹیل نے ایڈیسن کی مدد سے نکالا[4]۔ ان پرچوں میں لکھنے والے اپنے زمانہ کے اور مابعد کے زمانہ کے بہت بڑے ادیب سٹیل پوپ اور ایڈیسن تھے۔ ان پرچوں نے جہاں اس دور کے اہم مجلسی اور علمی مسایل پر روشنی ڈالی تھی اور ان موضوعات پر مضامین پیش کئے تھے۔ وہاں انگریزی نثر کو بھی متاثر کیا تھا[5]۔ بالخصوص سپیکٹیٹر نے طرز تحریر لوگوں کو سکھا دی[6]۔ یہی چیزیں تھیں جو سرسید کو پسند آئیں اور انھوں نے اس انداز پر ایک پرچہ ہندوستان میں بھی جاری کرنے کا تہیہ کر لیا۔ ۱۸۷۰ء میں ہندوستان واپس آئے تو انھوں نے تہذیب الاخلاق جاری کیا اور اس میں مذہبی اور علمی مضامین شایع کرنے شروع

---

[1] TYPICAL FORM OF ENGLISH LITERATURE ص ۱۱۷

[2] " "

[3] " "

[4] " "

[5] تہذیب الاق - جلد دوم - ص ۴۰۴ — [6] تہذیب الاخلاق - جلد دوم - ص ۴۰۸

[7] " " صفحہ ۴۰۳ -

کئے۔ ظاہر ہے کہ یہ مضامین قوم کی مجلسی، معاشرتی۔ مذہبی اور اخلاقی اصلاح کے نقطۂ نظر لکھنے شروع کئے گئے اور ساتھ ہی ساتھ اردو زبان میں ایک سادہ اور بے تکلف طرزِ نگارش کی ترویج کو بھی خاص اہمیت دی گئی۔ جس میں مرعا نگاری کا اصول سب سے پہلے نمایاں تھا۔

تہذیب الاخلاق میں لکھنے والے سرسید کے علاوہ بھی کئی اصحاب تھے جن میں سے نواب محسن الملک۔ نواب وقار الملک۔ مولانا حالی۔ نواب اعظم یار جنگ۔ مولوی ذکاء اللہ۔ مولوی نذیر احمد۔ علامہ شبلی نعمانی وغیرہ خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ ۲۰ سال کے عرصہ میں جو مضامین وقتاً فوقتاً اس پرچہ میں شایع ہوئے ان کی تعداد ۲۲۶ ہے اور ان میں سرسید کے خود نوشت مضامین ۱۱۲ شمار کئے جاتے ہیں[1] ان مضامین میں زیادہ تعداد مذہبی مضامین کی ہے۔ کیونکہ سرسید اور ان کے رفقا مسلمانوں کی اصلاح چاہتے تھے اور یہ محسوس کرتے تھے کہ مسلمان مذہبی توہمات اور تاویلات کی وجہ سے زوال پذیر ہیں۔ اس لئے انھوں نے ان مسایل پر زیادہ توجہ کی۔ اور اس طرح قوم کی تجہالت کے قید و بند سے نجات دلانے کی کوشش کی۔ سرسید نے تہذیب الاخلاق کے پہلے پرچہ میں لکھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کو کامل درجہ سویلائزیشن یعنی تہذیب اختیار کرنے پر راغب کیا جائے تاکہ جس حقارت سے سویلائزڈ یعنی مہذب قومیں ان کو دیکھتی ہیں وہ رفع ہو۔ اور وہ بھی دنیا میں مہذب کہلائیں[2]۔ ان مضامین میں جو اخلاقی اور تمدنی نقطۂ نظر کے ماتحت لکھے گئے، چند ایک مضامین یہ ہیں: بحث و تکرار۔ خوشامد۔ رسم و رواج۔ طریقہ تناول طعام۔ خط و کتابت وغیرہ اور اسی طرح مذہبی اور علمی مضامین میں سے چند ایک یہ ہیں:۔ مذہب اور عام تعلیم۔ دین اور دنیا کا رشتہ۔ احادیث غیر معتمد۔ مسئلہ تبرا و اختیار۔ عقاید اہل اسلام وغیرہ۔

سرسید کے مضامین کو اپنے زمانہ میں خاص شہرت حاصل ہوئی۔ کیونکہ ان میں پرانے رسم و رواج اور عقاید پر خاص چوٹیں کی گئی تھیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تہذیب الاخلاق کے خلاف کئی اخبار نکالے گئے[3]۔ ازالۃ الاوہام۔ مزید الاوہام۔ نور الآفاق۔ نور الانوار وغیرہ ان مخالف اخبارات میں سرسید اور ان کے رفقا کے لکھے ہوئے مضامین کا جواب دیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ مضمون نگاری کی صنف کو قبولیت اور وسعت نصیب ہوئی۔ تہذیب الاخلاق کے بند ہونے کے بعد کئی اخبارات میں وقتاً فوقتاً مضمون نکلتے رہے۔ جن میں مولانا عبدالحلیم شرر کا دلگداز، محشر اور مہذب کافی مشہور ہیں۔ ان میں شایع شدہ مضامین کتابی صورت میں جمع ہو کر کئی جلدوں میں شایع ہو چکے ہیں۔ اسی طرح "اودھ پنچ" میں لکھنے والے سجاد حسین، رتن ناتھ سرشار، احمد علی کسمنڈوی، پنڈت جوالا پرشاد اور مرزا مچھو بیگ ستم ظریف خاص طور پر مشہور ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ "اودھ پنچ" میں شایع شدہ مضامین کا لہجہ ظریفانہ اور طنزیہ ہوتا تھا۔

سرسید کے رفقا میں سے بعض احباب ابھی تقلید حیات ہی تھے کہ نیاز نے بھی مضمون نگاری شروع کی۔ نیاز صاحب کے مضامین کا بھی حصہ اکثر مذہبی مضامین پر مشتمل ہے۔ باقی مضامین میں کچھ علمی ہیں کچھ تنقیدی ہیں، کچھ تاریخی اور بعض ایسے ہیں جنھیں مضمون سے زیادہ انشائے لطیف کا نام دیا جائے تو بجا ہوگا۔ مذہبی مضامین میں سے بعض وہ ہیں جو جوابِ استفسار میں مختلف اصحاب کی جانب سے مختلف اوقات میں استفسارات کے جواب میں لکھے گئے۔ اور بعض وہ ہیں جو اپنے نظریات کی وضاحت اور اشاعت کے لئے لکھے۔ چند ایک مضامین یہ ہیں۔ مثلاً:۔ مذہب یا نہیں۔ ہمارے علمائے کرام کا دینی نظریہ۔ مذہب والحاد۔ بقائے روح۔ معاد۔ خدا نے دنیا کو کیوں پیدا کیا۔ قرآن کے کلام خدا ہونے کا صحیح مفہوم۔ روایت و معجزہ وغیرہ۔

سرسید کی طرح نیاز کے مضامین میں بھی عام طور پر مروجہ مذہبی عقاید کے خلاف ایک بغاوت کا جذبہ پایا جاتا ہے، لیکن سرسید کا حملہ اتنا سخت نہیں تھا جتنا نیاز کا۔ سرسید نے بعض روایات کی تردید کی اور بعض اعتقادات کی عقلی نقطۂ نظر سے تاویل پیش کی۔ غلط روایات میں سے تعصب اور رسم و رواج کا قلع قمع مقصود تھا اور عقاید میں سے جن، فرشتے، قیامت، معجزات حور و غلمان وغیرہ وغیرہ کی تاویلات تھیں لیکن نیاز، سرسید سے بھی آگے بڑھ گئے۔ انھوں نے خود خدا کو بھی عقلی نقطۂ نظر سے سمجھنے کی کوشش کی ہے اور خدا کے وجود کے اثبات و عدم اثبات پر

---

[1] بحوالہ مسلمانوں کا روشن مستقبل صفحہ ۲۰۲ ۔ [2] حیات جاوید صفحہ ۲۲ ۔ [3] محشر ۱۹۱۸ء میں جاری ہوا ۔ محشر ص ۱۲۸

گئی بحثیں کی ہیں اور آخر یہ کہا ہے کہ خدا کے وجود سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ یہ اور بات ہے کہ نیاز صاحب کے ہاں خدا کی تعریف مولویوں کی عام مروجہ تعریف سے مختلف ہے۔ وہ مولویوں کے خدا کا مذاق اڑاتے ہیں کہ انھوں نے اپنی شکل میں ایک بھاری بھرکم غضب ناک آنکھوں والا قہار بادشاہ اختراع کر رکھا ہے۔ جو دنیا کو تباہ و برباد کرنے سے اور انسان کو عذاب دینے سے خوش ہوتا ہے۔ جس کا کوئی اصول اور قانون نہیں بدکار مسلمانوں کو عقیدہ کی وجہ سے بخش دے اور نیک غیر مسلموں کو عذاب دے۔ نیاز، خدا کو محض ایک قوت سمجھتے ہیں۔ جس نے یہ دنیا پیدا کی۔ جس کو نہ عبادات کی ضرورت ہے نہ خوشامد کی جو کسی کو بہشت عطا کرتا ہے اور نہ سزا دے کر دوزخ میں ڈالتا ہے، نیاز اس خیال کے پیرو ہیں کہ انسان جو کچھ کرتا ہے۔ اس کا پھل اسے اس دنیا میں مل جاتا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ برائی کرنے سے بوجہ ذہنی اذیت ہوتی ہے وہی انسان کا دوزخ ہے۔ اچھے کاموں سے جو فرحت نصیب ہوتی وہ بہشت ہے۔

اس کے بعد ایک عجیب بحث قرآن کے متعلق ہے کہ قرآن واقعی خدا کا کلام ہے یا نہیں اور اگر ہے تو اس کا کیا مفہوم ہے۔ علاوہ ازیں قرآن کے ماخذ پر بھی بحث کی گئی ہے اور یہ چیز اردو ادب میں اس سے پہلے شاید کبھی موضوع بحث نہیں بن سکی تھی۔ باقی مذہبی مضامین۔ جیسے کہ پہلے عرض کیا گیا ہے۔ یہ اعتبار موضوعات سرسید سے بڑی حد تک مماثل ہیں۔ لیکن نیاز کا دائرہ سرسید کی بہ نسبت وسیع تر ہے۔

نیاز اور سرسید کے مذہبی مضامین میں بنیادی فرق جو محسوس ہوتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ سرسید کا انداز ترغیبی ہے۔ اور نیاز کا بالعموم مجادلانہ۔ چوٹیں سرسید بھی خوب کرتے ہیں۔ لیکن نیاز کا طنز زیادہ سخت ہے۔ سرسید بھی الزامات کا جواب دیتے تھے۔ لیکن نیاز کے جواب سوالیہ ہوتے ہیں۔ اور ان کی مدافعت میں اقدام کا جذبہ زیادہ کارفرما ہوتا ہے۔

ایک اور فرق یہ ہے کہ سرسید کی عقلیت پرستی میں ایک کھرا پن اور رکھائی پائی جاتی ہے۔ سیدھی سی عبارت میں وہ اپنے مقاصد کو بیان کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس میں جذبات کی آمیزش سے اکثر پرہیز کرتے ہیں۔ لیکن نیاز کے تعقل میں بھی جذبانیت پوری طرح جلوہ گر دکھائی دیتی ہے۔ وہ کہیں خطیبانہ رنگ اختیار کر لیتے ہیں اور کہیں ویسے ہی تلخ ہو جاتے ہیں۔ جس سے مضامین میں ایک سکون اور نرمی نہیں رہتی۔ یہ در اصل ان کی طبیعت کا اقتضا ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں :-

" اس سوال کا جواب سورج کے طلوع و غروب سے، چاند کے پیدائش و فنا سے، پوچھ آبشاروں کی روانی اور دشت و صحرا کی ویرانی سے دریافت کرو، پہاڑوں کے سکوت اور دریاؤں کے شور سے طلب کرو۔"

" موسموں کا باقاعدہ تغیر و تبدل، بہار و خزاں کا لطف و رعنائی، نباتات کی نمو، حیوانی و حیوانی وجود کی طبیعی زندگی، نوع انسانی کے قوائے کامل، فضائے بسیط کے شمار سے، کائنات کی لامتناہیت وسعت، نظم و شکیل، ذرہ و آفتاب اور ان سے فروتر انسانی مساعی کی مختلف صورتیں (جن کا نام ہم نے علم طبیعات الارض۔ علم الجو۔ علم الافلاک۔ علم الکیمیا، علم وظائف الاعضاء۔ علم الحیات۔ نفسیات وغیرہ رکھا ہے) بتا رہی ہیں کہ کوئی ایسی قوت ہے جس کے سمجھنے کے لئے ہم اپنی عقل کو عاجز و بے بس پاتے ہیں [1] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ "

اس کے علاوہ ان کی بحثوں میں بھی تلخی آجاتی ہے۔ مثلاً علماء اور مولویوں کے بارے میں لکھتے ہیں :-

" ان میں باہم دگر ایسی سریفانہ کشمکش پائی جاتی ہے کہ عوام کے لئے یہ فیصلہ دشوار ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کن کے خطبوں پر اعتبار کیا جائے جمعیت العلماء کانپور کی ہدایت پر عمل کیا جائے یا جمعیت العلماء دہلی کے مشورہ پر لیکن اگر یہ اختلاف و تصادم نہ ہو تو بھی ان کے وجود کا کوئی افادی پہلو ہماری سمجھ میں نہیں آتا۔ میں اکثر سوچتا رہتا ہوں کہ اگر شہر کے بہشتی، موذن اور

---

[1] من و یزداں اول ص ۴ ۔

کشش دو زباتی نہ رہیں تو لوگوں کو واقعی تکلیف پہونچے۔ لیکن اگر مولویوں کی جماعت فنا ہوجائے تو قوم کو کیا نقصان پہونچ سکتا ہے[1]..."

اور پھر یہ کہ سرسید کی طرح سیدھا سادہ طریقۂ بیان اختیار نہیں کرتے بات کو طرح طرح سے اور رنگین بناکر پیش کرتے ہیں، مثلاً:

" اے خدا اس وقت بھی جب قرونِ مظلمہ کی دنیا مجھے صرف آگ برسانے والا دیوتا سمجھتی تھی۔ مجھے تیرے دونوں ہاتھ لطف اور راحت کے پھولوں اور عطوفت کے ہاروں سے لدے ہوئے نظر آتے تھے[2]"، حالانکہ سرسید ہوتے تو یہی کہہ کہتے کہ وہ لوگ تجھے ظالم سمجھتے تھے اور میں مہربان۔

لیکن ان مضامین کے لئے مضامین سے زیادہ مقالات کا نام زیادہ موزوں ہے۔ کیونکہ مضمون میں کسی موضوع کا وضاحت سے بیان ہوتا ہے۔ اور مقالے میں لکھنے والے کا اس موضوع کے بارے میں اپنے خیالات کا بیان اس لئے مضمون بالعموم غیر شخصی ہوتا ہے جس کی مثالیں ان کے ہاں بھی ہیں جو ابھی پیش کی جائیں گی لیکن مقالے میں شخصی رنگ زیادہ پایا جاتا ہے۔ مقالہ نگار اپنے موضوع کے بارے میں جو بھی تحقیق و تفتیش کرتا ہے اس سے درحقیقت اپنے نظریہ کو تقویت دینا اور اپنے دعوے کا جواب پیش کرنا مقصود ہوتا ہے۔ یہی چیز سرسید کے مضامین کے بارے میں کہی جاسکتی ہے کہ وہ مضامین سے زیادہ مقالے ہیں۔

اس کے بعد مضامین کی وہ قسم ہے جسے علمی، تاریخی اور تنقیدی تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ علمی مضامین سے مراد یہاں وہ مضامین ہیں جن میں بعض کے اکتشافات پر بحث کی گئی ہے۔ مثلاً " داستانِ ابرو باد"، " دنیا کی سب سے بڑی دو رہیں"، " دنیائے آب کی کہانی"، " شعاعوں کے حیرت انگیز استعمالات" وغیرہ اور کچھ وہ مضامین ہیں جنھیں فلسفیانہ مضامین کہا جاسکتا ہے۔ مثلاً " فلسفہ مٹھی پر ایک نظر"، " وقت و زمان کی حقیقت"۔ اور بعض عام اطلاعی مضامین ہیں جیسے " مغرب کا نظامِ تعلیم"۔ " سیاحتِ مغرب کی حیرت ناک داستان"، " تمدنِ جدید کی دردناک داستان"، " عورت کے ساتھ دنیا کا سلوک"، " عورت اہلِ فارس کے نزدیک"[3] وغیرہ۔ اس کے بعد وہ مضامین ہیں جنھیں عہدِ گزشتہ سے متعلق مختلف اطلاعات بہم پہونچائی گئی ہیں۔ ان مضامین کو تاریخی مضامین کا نام دیا جاسکتا ہے۔ مثلاً " زنگاری یا چینی جماعت کے دلچسپ حالات"، " باب وہبا"، " انڈس کے آثارِ علمیہ"[4]، " فرانس کی اعاظم پرستی"، " فراعنۂ مصر کی خوابگاہیں"، " مضمونیات یونان و روما"۔

نیاز کے مضامین میں کثرتِ تعداد کے لحاظ سے مذہبی مضامین کے بعد سب سے زیادہ اہمیت ان کے تنقیدی مضامین کو دی جاسکتی ہے۔ ان مضامین میں انھوں نے ادب کے متعلق، بالخصوص شعر کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ یہ مضامین کچھ تو انتقادیات حصۂ اول و دوم اور باد و آعلیہ میں شامل ہوکر کتابی صورت میں شائع ہوچکے ہیں، اور کچھ ابھی نگار کے پرچوں میں منتشر ہیں ان مضامین میں بیشتر ان کی تنقیدی آرا ہیں۔

آخر میں ان مضامین کا ذکر کیا جاسکتا ہے۔ جو اپنے خصائصِ معنوی کے لحاظ سے سب سے پہلے مذکور ہونا چاہئے تھے۔ یہ مضامین کی وہ قسم ہے جنھیں رومانیت کا حامل کہا جاسکتا ہے۔ اور جو انشائے لطیف میں شمار ہوسکتے ہیں۔ ان مضامین میں سے اکثر نگارستان کے مجموعہ میں شائع ہوچکے ہیں۔ یہ اس دور کے مضامین ہیں جبکہ نیاز کی طبیعت ٹیگور سے زیادہ متاثر تھی۔ اس زمانہ میں سید سجاد حیدر یلدرم اپنے رومانی افسانوں کی تصنیف میں مشغول تھے۔ خود نیاز کے وہ افسانے جو انھوں نے اس دور میں لکھے۔ مثلاً " کبوتر و سایکی"، " قربانگاہِ حسن" وغیرہ ان رومانی مضامین میں کوئی علمی۔ ادبی۔ تنقیدی۔ تاریخی بحثیں نہیں ہیں۔ بلکہ احساسات لطیف و جذبات رنگین کا بیان ہے۔ مصنف کسی منظر دلکش کو دیکھتا ہے۔ وہ چمن ہو۔ اس کی بہار، ابر ہو قافلۂ سحر ہو یا طلوع و غروبِ آفتاب و مہتاب، نغمہ آہنگ ہو یا محفلِ رقص و طرب۔ غرض ہر چیز ایک حسن کی طرف دھیان دیتی ہے۔ اور ہر ذرہ میں کیف و مستی کی دنیائیں آباد نظر آتی ہیں۔ مصنف ان مناظر میں محو ہوجاتا ہے اور اپنے خیالات کی دنیا میں آباد ہوکر اپنے دل سے سرگوشیاں کرنے لگتا ہے۔ اس طرح اپنی تمنائیں۔ اپنی آرزوئیں، اپنا درد اور اپنا سوز لطیف پیرایہ میں اور

---

[1] من و یزداں اول ص ۳۴۵ - [2] من و یزداں اول ص ۱۰۷ - [3] مطالعاتِ نیاز - [4] تاملاتِ نیاز - [5] تاملاتِ نیاز -

دل آویز انداز میں پیش کرتا ہے۔ ان مضامین میں درحقیقت نیاز نے نثر میں شاعری کی ہے۔ شاعری کیا ہے۔ جذبات و احساسات کا ایک پیرایۂ لطیف کے ساتھ بیان کیا ہے اور یہ وصف ان مضامین میں پوری طرح جلوہ گر ہے اور ایک شاعرانہ روح ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاری و ساری ہے۔ ان مضامین میں سے چند ایک کے نام یہ ہیں:- "ایک رقاصہ سے"۔ "برسات"۔ "ایک قافلۂ سحر کو دیکھ کر"۔ "طلوع آفتاب سے پہلے"۔ "سرزمین دکن کی ایک دلنواز شام"[1] وغیرہ۔

اس نوع کے مضامین اور افسانوں کو دیکھ کر اُردو ادب کے نقادوں نے نیاز فتحپوری کو ادب برائے ادب کا علم بردار قرار دیا تھا۔ جیسے عزیز احمد نے لکھا ہے کہ اگر جدید اُردو ادب میں واقعتاً ادب برائے ادب کسی کا مسلک رہا ہے، تو نیاز فتحپوری کا[2]۔ لیکن اس رائے کا اطلاق تو ان کے تمام مضامین پر کیا جا سکتا ہے اور نہ تمام افسانوں پر۔ ہاں شروع شروع میں نیاز کی روش ایسی ہی تھی۔ جس میں بعد ازاں خاصی تبدیلی واقع ہو گئی۔ جیسا کہ ان کے مضامین کی مختلف اقسام سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے علمی، ادبی، تاریخی مضامین کی افادیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔

ان مضامین کی ساخت کا جہاں تک تعلق ہے۔ ان میں اپنی نوع کے اعتبار سے ایک دوسرے کی بہ نسبت تفاوت پایا جاتا ہے، مثلاً مذہبی مضامین میں چونکہ نیاز اپنے عقائد۔ احساسات اور تصورات مذہبی بیان کرتے ہیں۔ اس لئے وہاں وہ مضمون کی ساخت کے بارے میں کوئی احتیاط عمل میں نہیں لاتے۔ مثلاً تمہید، نفس مضمون کی ساخت کے بارے میں کوئی احتیاط عمل میں نہیں لاتے۔ مثلاً تمہید، نفس مضمون اور انجام یہ چیزیں اپنے اقتضائی مقام اور اہمیت کی مالک نہیں ہیں۔ تمہیدیں عام طور پر طویل ہیں۔ "روایات و مجزوہ" "کورانہ تقلید" "خدا ہے یا نہیں ہے" کی قسم کے مضمون بطور نمونہ پیش کئے جا سکتے ہیں۔ کورانہ تقلید میں قریباً ۳/۴ حصہ تمہید پر مشتمل ہے۔ اور ۱/۴ حصہ کورانہ تقلید کے موضوع پر۔ "خدا ہے یا نہیں ہے" کے مضمون میں خدا کے وجود و عدم پر کوئی فلسفیانہ یا عقلی دلیل پیش نہیں کی گئی۔ شروع میں یہ کہا گیا ہے کہ سورج، چاند، پہاڑ، آبشار، دشت و صحرا کی ویرانی سے پوچھو۔ اسی طرح وحوش و طیور سے خدا کے وجود و عدم کے بارہ میں استفسار کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ یعنی عجیب خطیبانہ اور شاعرانہ طرز بیان اور طریقہ استدلال ہے پھر اس کے بعد یہ ہے کہ خدا کو پیش کس طرح کیا جاتا رہا ہے اور از روئے اسلام خدا کا تصور کیا ہے۔ یعنی اس میں جو بھی بحث ہے۔ اس سے ہٹ کر ہے، کہ خدا ہے یا نہیں ہے مضمون کے اختتام سے قبل وطن کا مسئلہ زیر بحث لایا جاتا ہے۔ کہ ہم وطن کو جمیل کہتے ہیں، جب وہ قوی ہوتا ہے۔ ہم اُسے عظیم کہتے ہیں جب اس کے افراد مہذب اور شائستہ ہوتے ہیں یہ قول TARDE کی کتاب المنطق الاجتماعی سے نقل کیا گیا ہے۔ پھر اس کا انجام اس طرح ہے کہ سرزمین ہندوستان بھی جمیل تھی۔ جب کرشن کی تعلیم نے حریت و آزادی کی روح پھونک رکھی تھی اور اب ہندوستان پر غیر حکومت کا قبضہ ہے اور ہندوستان کی آزادی کے طلب گار اپنے فطری اور ملکی خصوصیات کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مضمون کا اپنے عنوان سے کوئی معنوی تعلق نہیں ہے[3]۔

علمی اور اطلاعی مضامین جو اکثر ترجمے ملخصات یا ماخوذات معلوم ہوتے ہیں۔ مضمون کی ٹیکنیک پر پورے اُترتے ہیں۔ کیونکہ ان مضامین میں نیاز کے خیال کی جولانیاں ایک خاص نہج کی پابند ہو جاتی ہیں اور اس طرح وہ جذبات کی رو میں بہہ کر حدود کو توڑ نہیں سکتے۔ کیونکہ یہاں خیال سے بحث نہیں ہوتی بلکہ ٹھوس حقایق کا بیان ہوتا ہے۔ فرق موضوع کے تقاضوں سے پیدا ہوتا ہے۔ اگر موضوع ہی دنیا سب سے بڑی دوربین ہو، اور مضمون خود اپنے ذہن کی پیداوار نہ ہو۔ بلکہ ماخوذ ہو تو ظاہر ہے کہ شاعری کی گنجایش باقی نہیں رہتی مثلاً "علم الافلاک کے بعض دلچسپ حقایق" میں مضمون کو اس طرح شروع کرتے ہیں کہ پہلے یونان کے جن حکما نے کرۂ ارض اور سیاروں کے بارہ میں غور کرنا شروع کیا ان کا ذکر ہے۔ پھر اس زمانہ کی تحقیقات کے پیش نظر زمین کے قطر، حجم۔ وزن کا مقابلہ زہرہ، عطارد وغیرہ سے کرتے ہیں

---

[1] نگارستان ص - [2] ترقی پسند ادب ص ۱۶ - [3] من و یزدان صفحہ ۳

پھر عطارد - زہرہ - مریخ - مشتری - زحل - آفتاب وغیرہ کے بارہ میں جو معلومات ہیں ان کا ذکر کیا ہے اور اسی ضمن میں مختلف لوگوں کی آراء بھی نقل کی ہیں کہ ان کروں کی ساخت کیسی ہے - ان میں کوئی زندگی ہے یا نہیں - ان تک پہونچا جا سکتا ہے یا نہیں وغیرہ - ان حقایق کو معلوم کرنے میں دوربین اور لاسلکی وغیرہ سے جو کام لیا جا رہا ہے یا لئے جانے کی توقع ہے - اس کا ذکر کیا ہو اور اس پر مضمون ختم ہو جاتا ہے[1]

ان علمی اور معلوماتی مضامین کو چھوڑ کر باقی تمام مضامین خواہ وہ مذہبی مضامین ہوں یا تنقیدی، نیاز کے ذاتی رجحانات خیالات کے حامل ہیں - اور اس طرح جذبات استدلال سے زیادہ کارفرما دکھائی دیتے ہیں - تنقیدی مضامین جو خالص ادبی ہوتے ہیں - ان میں بھی نیاز اپنی رائے سے اِدھر اُدھر نہیں ہوتے - موضوع خواہ غزل ہو یا عام شعر یا بذاتِ خود "تنقید" وہ اپنی پسند و ناپسند کو سامنے رکھتے ہیں اور عام مروجہ اصولوں کی بہت کم پروا کرتے ہیں -

وہ تنقید کرتے وقت رد و قبول کے پیمانے خود اپنی جانب سے اختراع کرتے ہیں - اور انہی کے مطابق حکم لگاتے ہیں - یہاں تک کہ بعض وہ اصول جو کبھی انھوں نے اپنے خطوط میں بیان کئے ہیں - یا دیگر تنقیدی مضامین میں جن میں وہ شاعری یا ادب کو جانچنے کے نئے معیار اور طریقے کی طرف اشارہ کرتے ہیں - لیکن تنقید کرتے وقت وہ خود اپنے ہی اصول کی خلاف ورزی کر جاتے ہیں -

رہے وہ مضامین جنھیں ہم ان کے رومانی مضامین کہتے ہیں وہ ان کے شخصی جذبات و احساسات کے آئینہ دار ہونے کی وجہ سے کسی ٹیکنیک کے پابند نہیں ہیں کیونکہ ان مضامین میں وہ کسی موضوع پر بحث نہیں کر رہے ہیں - وہ اپنے احساسات کے بیان میں کھو جاتے ہیں - اور شروع سے آخر تک ایک ہی طرح کی لے جاری رہتی ہے - جہاں جہاں ان کے خیال کا سلسلہ ان کی رہنمائی کرتا ہے - وہ چلے جاتے ہیں اور جو جو چیز انھیں اس وقت سوجھتی ہے - اس کو بیان کر دیتے ہیں - اور یہ سارا عمل کسی اصول یا نظام کا پابند نہیں ہوتا[2] OF HAM اور ہم ایسے مضامین کو Lyric جذباتی نظموں سے مماثل قرار دیتا ہے - وہ کہتا ہے کہ کوئی چیز مثلاً کسی کی کتاب کا کوئی نقرہ کسی مکالمے کا کوئی جزو - خیال کے اس سلسلہ کو بیدار کر دیتا ہے یا مصنف کے دل میں کسی مطلوب تجزیہ کے قابل نقطۂ نظر کو برق پاش کر دیتا ہے[3] - اس کے بعد اور ہم بطور مثال لیمب LAMB اور ہیزلٹ HAZLITT کے ایک دو مضامین کی طرف اشارہ کرتا ہے -

نیاز نے روانی مضامین بھی کسی واقعہ یا منظر سے متاثر ہو کر لکھے ہیں اور ان میں اپنے خیالات کے سلسلہ کو بے کم و کاست بیان کرتے چلے جاتے ہیں - "ایک رقاصہ" - "ایک شب کی قیمت" - "عورت" - "برسات" - "ایک قافلہ صحرا کو دیکھ کر" - "طلوع آفتاب سے پہلے" - "سرزمین دکن کی ایک دلنواز شام" وغیرہ اس قسم کے مضامین ہیں - اپنے مضمون "ایک رقاصہ" کو شروع ہی ایسے کرتے ہیں کہ رقاصہ کو دیکھنے سے جو ردِ عمل ان پر ہوا - اس کا تذکرہ شروع کر دیتے ہیں اور پھر خیالات کی رَو میں بہ جاتے ہیں - اس مضمون کو وہ اس طرح شروع کرتے ہیں - "اے رقاصہ تو اپنا رقص کر میں منع نہیں کرتا - مگر مجھے اپنی محفل سے اُٹھ جانے دے کہ میں تیرے رقص کو برداشت نہیں کر سکتا - میری طبیعت بگڑتی ہے - اے معنیہ تو گا میں نہیں روکتا - مگر خدا کے لئے مجھے اپنی بزم سے چلا جانے دے ۔۔۔۔ جب تو اپنے سانچے میں ڈھلے ہوئے مجسمۂ برنزی حیات کی کشیدہ قامتی اور اپنی قد آدم تصویر کی رعنائی کو لے کر محفل میں کھڑی ہو جاتی ہے تو میں چاہتا ہوں کہ اس فتنۂ سرکش اس سحر خوش قامت - اس قیامتِ بلند و بالا کو نہ دیکھوں، مگر دیکھتا ہوں اور کانپتا ہوں - جب تو اپنی آواز میں ایک داد خواہ بیچارگی ایک مسترحم نشیب پیدا کر کے اپنے نغمہ کو میرے دل کی سب سے پنہاں رگ میں ڈبو دی جاتی ہے - تو میں چاہتا ہوں کہ اس صدائے بے پناہ کی طرف

---

[1] مطالعات نیاز ص ۱۳۱

[2] TYPICAL FORMS CEE NGISH LITERATURE ص ۱۴۲

سے اپنے کان بند کرلوں۔ لیکن ایسا نہیں کرسکتا۔ سنتا ہوں اور تڑپتا ہوں ۔۔۔۔۔ جس وقت تو اپنے حنائی پاؤں میں سے ایک پاؤں کو زمین پر قایم رکھ کر دوسرے پاؤں کی ایڑی اُٹھا کر صرف پنجہ کی ہلکی ہلکی ٹھوکر سے اپنی گھنگروؤں کی آواز کو تال و سم کے ساتھ ملا کر موا میں منتشر کر دیتی ہے تو میں اس منظر سے جان بچا کر کسی طرف نکل جانا چاہتا ہوں۔ مگر نہیں نکل سکتا ۔۔۔۔۔ پھر ۔۔۔۔ اگر میں تیرے رقص سے جس کو میں محرام نغمہ یا نغمۂ حراں کہہ سکتا ہوں۔ کانپتا ہوں، ڈرتا ہوں تو مجھے معذور سمجھ کہ واقعی میری کمزور طبیعت اس کی تاب نہیں لاسکتی۔ لیکن اگر تجھے مجھ سے ضد ہے۔ تو میرا کہنا نہیں مانتی تو صرف ایک کام کرے گا مگر رقص نہ کر ہر پند تیرا نغمہ بھی مجھے ہلاک کرنے کے لئے کافی ہے۔ اور میری روح کو اندر ہی اندر تحلیل کرسکتا ہے۔ جب تو آمادۂ رقص ہوتی ہے۔ اور ساز کی تال سم کے ساتھ تیری بوٹی بوٹی پھڑکنے لگتی ہے، تو میں بھی اپنے اعضا میں تپش محسوس کرتا ہوں۔ اور بے اختیار یہ چاہنے لگتا ہوں کہ میں بھی تیرے ساتھ رقص کروں ۔۔۔۔۔" نیاز اسی طرح خیالات میں کھوئے ہوئے تھے کہ انھیں یک دم خیال آگیا کہ اس رقاصہ تک تو ہر کسی کی رسائی ہے۔ اس سے تخیلات کا دھارا دوسری طرف مڑ جاتا ہے اور وہ کہنے لگتے ہیں:۔

"ہر چند میری روح تیری نگاہوں کے ان ہلکے ہلکے جرعوں کے لئے تشنہ ہے۔ مگر وہ تشنہ ہی رہے گی۔ کیونکہ انھیں ہر شخص چکھ سکتا ہے۔ اور میں اس لذت کو صرف اپنے لئے مخصوص کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی جوانی کا وہ نشہ جو تیرے بستر کی شکنوں پر ہر شخص کو میسر آسکتا ہے مجھ پر نہ ڈال" پھر ان کا خیال صنعت کاری کی طرف چلا جاتا ہے۔ اور کہنے لگتے ہیں کہ لوگ تیرا رقص نہیں دیکھتے بلکہ مجھے حالتِ رقص میں دیکھتے ہیں۔ اس لئے تو اُنسے بچ۔ ان لوگوں کی مثال اُس بچے کی سی ہے۔ جو ہر تتری پر جان دیتا ہے۔ مگر جب اسے پاجاتا ہے تو مل کر پھینک دیتا ہے۔ تیری دو حیثیتیں ہیں۔ ایک صرف عورت ہونے کی۔ یعنی تیری نسائیت کی اور دوسری صرف تیرے رقاصہ اور مغنیہ ہونے کی۔ اور ان دونوں حیثیتوں کو ایک دوسرے سے جدا رکھ۔ تو صرف اس وجہ سے نغمہ و رقص کو اختیار نہ کر کہ عورت ہے تو صرف اس لحاظ سے اس فن کی نمایش نہ کر کہ تیری نسائیت میں اس سے زیادہ دلکشی و دلربائی پیدا ہوجاتی ہے بلکہ تو گا محض گانے کے لئے، رقص کر صرف رقص کی غرض سے، تو اگر عصمت فروش ہے تو ہو مگر اپنے فن کی معصومیت کو مجروح نہ کر تو اس کے ذریعہ سے اپنے بازارِ حسن کو رونق نہ دے۔ کوئی قابل ہو یا نہ ہو۔ مگر میں تو قابل ہوں کہ تیرا رقص معجزہ ہو اور میں اس معجزہ پر ایمان لانے کے لئے طیار۔ لیکن کاش اس معجزہ سے تو صرف معجزہ کا کام لیتی اور کوئی قیمت اس کی مقرر نہ کرتی۔ کیونکہ جس وقت صنعت بازار میں آجاتی ہے۔ صنعت باقی نہیں رہتی۔ بلکہ وہ بازار کی ایک جنس ہوجاتی ہے۔ جو لاکھ گراں ہونے پر بھی کم قیمت ہے۔ اور پھر اس سے التجا کرنے لگتے ہیں کہ "اپنے لبوں کی شراب چھلکا مگر ہر کسی کو نہ چکھنے دے۔ اور ہر بازو کو کمر کا احاطہ کرنے کی اجازت نہ دے کیونکہ لبوں کے لئے ساحل کا وجود قطع روانی ہے۔ الغرض تو جو چاہے بن مگر آزاد و رمیدہ، آغوش سے دور معانقہ سے الگ اور پھر مجھ سے پوچھ کہ تو کیا ہے دنیا کی پروا نہ کر اس کے اصول پر نہ جا اور وہ کر جو میں کہتا ہوں پھر تو میرا کام ہے کہ تیرے مجسموں کی پرستش عالم کے ہر ہر گوشے میں اور تیری خدائی ساری دنیا میں قایم کردوں۔ اب تجھے اختیار ہے۔ خواہ پرستیدۂ عالم بن یا پرستارۂ دنیا"[1]

من حیث المجموع نیاز کے مضامین اُردو ادب میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں۔ اندازِ بیان کے لحاظ سے بھی اور موضوعات کے تنوع کے اعتبار سے بھی۔ ان کے مضامین پڑھتے ہوئے یکسانی کا احساس پیدا نہیں ہوتا۔ جس سے پڑھنے والا بیزار ہوجائے یا اکتا جائے۔ کہیں تاریخ کے مسئلہ پر بحث ہے۔ کسی مقام پر شرع کا کوئی حکم پیشِ نظر ہے۔ کسی موقع پر جنت و دوزخ کا معاملہ متنازع فیہ ہے۔ کہیں واردات عشق و محبت سے واسطہ ہیں۔ اور کسی جگہ خالص سائنس کے کمالات پر اظہارِ خیال ہے۔ الغرض موضوعات محدود نہیں۔

ان میں سائنس اور فلسفہ و تاریخ سے تعلق رکھنے والے مضامین کا حصہ اکثر نا خوندہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ غیر زبانوں کے جواہر سے اُردو زبان کا دامن بھرنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ اُردو زبان کی بہت بڑی خدمت ہے۔ زبانیں اسی طرح ترقی کرتی ہیں۔ کیونکہ تراجم و ماخوذات سے جہاں مختلف معلومات حاصل ہوتی ہیں وہاں ہزاروں الفاظ بھی ساتھ ہی چلے آتے ہیں۔ اسی طرح بذاتِ خود زبان کی لفظی حیثیت بھی

---

[1] نگارستان ص ۴۷، ۵۰

اضافہ ہوتا ہے۔

نیاز کی نثر نگاری کی سب سے بڑی خصوصیت روانی اور برجستگی ہے۔ وہ بعض اوقات مشکل الفاظ بھی استعمال کرتے ہیں۔ کسی کسی موقع پر نئی ترکیب بھی اختراع کرتے ہیں۔ جو ذہنوں سے قریب نہیں ہوتی لیکن اس کے باوجود عبارت ایک تیز رَو دریا کی طرح ٹھاٹھیں مارتی چلی جاتی ہے جو بھی باعثِ دلچسپی ہوتا ہے اور مطالعہ کرنے والا لطف حاصل کرتا ہے۔

نیاز کے مضامین ایک اور اعتبار سے بھی اہم ہیں، بالخصوص وہ مضامین جن میں مذہبی مباحث ہیں۔ وہ اس طرح کہ انھوں نے کچھ لکھا اسکے جواب میں دوسروں نے لکھا اور بحث چل کھڑی ہوئی۔ فرنگی محل والوں نے اعتراض کیا۔ دارالمصنفین والے پیچھے رہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی سے نوک جھونک ہوئی۔ اس بحث کا حاصل مذہبی، شرعی یا علمی طور پر مفید ہو یا نہ ہو اور نیاز کا موقف غلط ہو یا صحیح لیکن اس چیز سے انکار ممکن نہیں کہ اس سبب سے کتنے ہی نئے مضامین کا اُردو میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ اس اعتبار سے نیاز کے مضامین کی حیثیت بھی سرسید کے مضامین کی سی ہو جاتی ہے۔ سرسید کے مضامین جو تہذیب الاخلاق میں چھپے ان کی تعداد ان مضامین کا عشر بھی نہ ہوگی جو ان کے جواب میں لکھے گئے۔ غرض نیاز کے مضامین کا اُردو ادب کی ترقی میں ایک نمایاں حصہ ہے۔

(ادبی دُنیا) محمد نور رشید عاصم

یادگار تصانیف نیاز فتحپوری اطباعی قیمت

من و یزداں	مذہبی استفسارات و جوابات	جمالستان	نگارستان	شہوانیات
۸ عہ	۸ عہ	۸ عہ	۸ عہ	۸ عہ
مکتوبات نیاز تین حصے	انتقادیات	حسن کی عیاریاں	مالہ و ماعلیہ	شہاب کی سرگزشت
۱۲ عہ	۸ عہ	۸ عہ	۸ عہ	۸ عہ
فلاسفۂ قدیم	مذاکرات نیاز	فراست الید	مذہب	نقاب اُٹھ جانیکے بعد
۸ عہ	۸ عہ	۸ عہ	۸ عہ	۸ عہ

میزان
صفحات ۳۲۰
۸ عہ

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف چالیس روپے میں مل سکتی ہیں

منیجر نگار لکھنؤ

"پیامِ کیف" میری نظر میں

مشہور ادیب و نقاد مرزا احسان احمد صاحب احسان اعظم گڑھی کا مجموعۂ کلام "پیامِ کیف" میرے سامنے ہے۔ احسان صاحب لکھنوی دبستان کی بے روح شاعری کو ہمیشہ سے برا کہتے آئے ہیں۔ وہ اصغر گونڈوی مرحوم کے حد سے زیادہ عقیدت مند ہیں اور ان کی رائے میں تغزل کا صحیح معیار یہ ہے کہ اس سے روح کو سرمایۂ نشاط حاصل ہو۔ ان کا خیال ہے کہ سوزِ غم بجائے خود پیامِ کیف ہے اور اس سے دل میں کیفِ محبت کا اضافہ ہونا چاہیئے۔

لکھنؤ کے دبستانِ شاعری پر ایک دور ایسا گزرا ہے جس میں غم کی ہر لے "آوازۂ مرگ" کے تاثرات پر ختم ہوتی تھی اور یہ رنگ اتنا غالب ہوگیا تھا کہ ہر شاعر ڈوبتی ہوئی نبضوں سے لے کر کافور کفن تک ہر منزل کا پورا پورا بیان کرنا اپنا فرض سمجھتا تھا۔ پھر چونکہ لکھنؤ میں اس وقت خاص حالات کی بنا پر ایسا ماحول تھا جس میں ہر چیز غلط جذباتیت اور تصنع کے رنگ میں رنگ چکی تھی۔ اس لئے آہ صبح گاہی کے بجائے "گریۂ نیمروز" اور فغانِ نیم شبی کے بجائے "نالۂ سرمجلس" نے سند قبول حاصل کی۔ طبیعتوں کو عشق کے اضطراب پنہاں کے بجائے لاش و کفن کے بیان میں زیادہ دلکشی معلوم ہوئی اور لوگوں نے تصویرِ درد بننے کے بجائے "تختۂ مشق ستم" بننا زیادہ پسند کیا۔ آپ اس دور کے کسی لکھنوی غزل گو کا دیوان اٹھا لیجئے اس میں ایک بات صاف طور پر معلوم ہوگی کہ غمِ محبت کا تعلق اضطرابِ دل کے بجائے رنگ روئے بیمار سے ہے۔ اس رنگ تغزل کا ردِ عمل بہت جلد ہوا، اس اعتبار سے احسان صاحب کا یہ کہنا کہ:

ہوا صنعتیں ایجاد لکھنؤ نے کیں　　سرورِ روح کا لیکن نشاں نہیں ملتا

کچھ غلط نہیں ہے۔ اس لئے مرزا صاحب نے ہر جگہ سختی سے اس بات کا لحاظ رکھا ہے کہ تغزل میں غمِ محبت کا ایسا بیان ہو جس سے پاکیزگیٔ محبت میں مدوجزر اور جو محبت کرنے والے دل کو دل حسرت زدہ بنانے کے بجائے جذباتِ کیف سے لبریز کردے۔

احسان صاحب شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب و نقاد بھی ہیں۔ ان کو تو یہ بات معلوم ہونا چاہیئے کہ سوز و گداز غزل کا ایک بنیادی عنصر ہے۔ محبت کا تعلق اگر اسی دنیائے آب و گل کے کسی سانس لیتے ہوئے محبوب سے ہے تو اس کے بیان میں مختلف النوع جذبات کا اظہار لازمی سا ہے۔ ایک محبت کرنے والا شکوۂ ہجر سے لے کر نشاطِ وصل اور دردِ اضطراب سے لے کر مسرتِ یقین تک کی ہر منزل سے گزرتا ہے۔ اور وہ ان سارے جذبات کو پرجوش انداز سے بیان کرتا ہے۔ اب اگر آپ اس سے مطالبہ کریں کہ وہ نشاطِ وصل یا یقینِ وعدہ کی مسرت کا تو بیان کرے، لیکن غمِ ہجر کا بیان نہ کرے۔ یا پھر اس کو اس طرح بیان کرے کہ اس سے "بوئے خوں" نہ آتی ہو، تو یہ ایک غیر معقول مطالبہ ہوگا۔ سوز و گداز اور گرانشگی و پریشانی عشق کی سب سے زیادہ مشتعل کیفیت ہے۔ پھر یہ کس طرح ممکن ہے کہ وہ جذبہ جو بہ نسبت دوسرے جذبات کے زیادہ متاثر کرنے والا ہے۔ اس کا بیان اس طرح کیا جائے کہ اس میں سے دل دکھا دینے والے عناصر ختم ہو جائیں۔

اصل میں ایسے مقامات پر ایک مغالطہ ہو جاتا ہے، محبت کے مختلف مدارج ہیں۔ بعض لوگ اپنی ہی جنس کے کسی فرد سے محبت کرتے ہیں۔ کچھ لوگ انسانی ہمدردی سے دامن کش ہو کر ذات قدسی صفات کی وسعتوں میں گم ہو جانا پسند کرتے ہیں اور بعض لوگ ایسے ہیں جو دنیا کی ہر خوبصورت چیز کے متعلق صرف اظہارِ خیال ہی کرنا مناسب سمجھتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کیفیات کا بیان ایک [illegible] ہوگا۔ مثلاً میر کی محبت اسی گھوارۂ غم سے متعلق تھی جسے دنیا کہتے ہیں اور [illegible] پرواز سدا پردۂ حریمِ قدس کی جانب تھی۔ اگر کوئی شخص کہے

کہ میر کا درد عشق درد و اصغر کے عشق پاکیزہ تک نہیں پہونچتا ہے، تو یہ ایک مہمل سی بات ہوگی۔

دبستانِ لکھنؤ کے شعراء کے یہاں جو بیان درد ہے وہ ان میں سے کسی بھی نوع کی محبت سے متعلق نہیں۔ بلکہ اس کو بیان درد کہنا بھی نہیں چاہئے۔ ان شعراء کے یہاں تو ہر چیز تصنع سے گرانبار ہوتی تھی اس لئے ان کے غم کو غم محبت سمجھ کر اس پر تنقید کرنا یا اس سے اظہار نفرت کرنا صحیح نہیں ہے، لکھنؤ کے عام ماحول پر عیش و عشرت کا رنگ چھایا ہوا تھا۔ لیکن عقیدت و رسم کے طور پر ابتدا ہی سے سوگواریت سے دست و گریباں رہنا پڑتا تھا۔ ان دو متضاد محرکات کے دو مختلف اثرات کارفرما رہتے تھے۔ چونکہ ذہنی طور پر یہ شعراء اس رنگ میں اتنے رنگ چکے ہوتے تھے کہ ان میں دوسرے محرکات کو جزو اعظم کی حیثیت سے قبول کرنے کی صلاحیت نہیں رہتی تھی۔ لہذا مختلف مواقع پر ان دونوں مختلف النوع جذبات کا اظہار ہوتا رہتا تھا اس لئے لکھنوی رنگ تغزل میں صرف بیانِ غم پر اعتراض کرنے کے بجائے اس پورے ادب اور اس کے محرکات پر اعتراض یا گفتگو کرنے کی ضرورت ہے۔

احسان صاحب، اصغر مرحوم کے پرستار اور ان کے رنگِ سخن کے شیدائی ہیں۔ اصغر کے یہاں جو نشاط آفریں کیفیت ہے وہ اُردو غزل میں آپ اپنی مثال ہے۔ لیکن اصغر کے یہاں جو نشاطیہ کیفیت پائی جاتی ہے۔ اس کا تعلق اندازِ بیان اور تخیل ملکوتی سے ہے اس کو کیفیاتِ محبت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اصغر اسی دُنیا کے فرد تھے۔ لیکن ان کے تخیلات ہمیشہ لاہوت و جبروت پر پرواز کرتے رہتے تھے۔ ان کے یہاں اس غم محبت کا بیان نہیں ہے، جو دو دلوں کے دھڑکنے سے پیدا ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان کا غم نشاط روح پیدا کرتا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ ہر غم نشاط روح پیدا کرے تو یہ انسانی نفسیات سے ناواقفیت ہوگی۔

مدعا یہ ہے کہ نشاطیت بہت عمدہ عنصر سہی لیکن حقیقتاً محبت کی قلمرو میں اس کا گزر بہت کم ہوتا ہے۔ احسان صاحب نے لکھنوی شعراء کے یہاں جو بیان غم دیکھا۔ وہ اس کو واقعی غم محبت کا بیان سمجھے اور اس طرح انھوں نے طے کر لیا کہ وہ بیان غم جو دل میں المیہ جذبات پیدا کرے مردود ہے۔ اور اصغر کی شاعری سے استناد کیا۔ حالانکہ ان کو سمجھنا چاہئے تھا کہ اصغر کا رنگ سخن ہی دوسرا ہے۔ نیز لکھنوی شاعری کا وہ غم جو مرثیوں کے بستر پر نمایاں ہوتا ہے غم محبت نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ احسان صاحب کے یہاں ایسے اشعار میں صرف نصیحت ہی نصیحت ہے۔ شعریت و شگفتگی بیان مفقود ہے اور اسی غلط فہمی نے ان کے کلام کو شعری عناصر سے معرا کر کے بے کیفی و بے اثری سے معمور کر دیا ہے۔

جب کوئی شخص کسی خاص مقصد کو سامنے رکھ کر کوئی بات کہتا ہے تو اس کو خیال رکھنا پڑتا ہے کہ کہیں مقصد کے خلاف کوئی پہلو نہ پیدا ہو جائے اس لئے اس کی گفتگو میں وہ بے تکلفی و بے ساختگی نہیں پیدا ہو پاتی جو خلوص کی جان ہے۔ احسان صاحب کے ذہن میں لکھنوی شاعری کی مذمت ہمہ وقت موجود رہی اور وہ قدم قدم پر اس کو برا کہتے رہے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کو اس بات کا بھی خیال رکھنا پڑا کہ کہیں ان کے خیالات پر اس قبیلے کا کوئی بر تو نہ پڑ جائے۔ اس لئے انھوں نے دوسرے اسالیب اختیار کئے۔ لیکن اس جذبۂ نفرت و ضد کی بنا پر ان کے اندر بے ساختگی نہ پیدا ہو سکی جس کی وجہ سے ان کا سارا کلام شعریت و شگفتگی اور دلکشی و تاثیر سے معرا ہو کر رہ گیا آگے چل کر چند مثالوں سے اس کا صحیح اندازہ ہوگا۔ اگر وہ غم و مسرت کی اس منطق سے کچھ دیر کے لئے قطع نظر کر لیتے تو شاید ان کے کلام میں یہ بے نمکی نہ ہوتی۔

غزل میں حسن خیال سے زیادہ حسن بیان کا کرشمہ ہوتا ہے۔ خیال کتنا ہی بلند ہو لیکن اگر اس کو مناسب الفاظ میں نہ ادا کیا جائے تو اس کی کوئی قیمت نہیں رہتی ہے۔ خصوصاً جذبات و کیفیاتِ محبت کو ان کو ادا کرنے کے لئے تو نہایت نرم و نازک لہجے کی ضرورت ہوتی ہے۔ غزل درحقیقت آبگینۂ نازک مزاج ہے۔ جس کی نزاکت کسی ٹھیس کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اسی لئے کہا جاتا ہے کہ جن لوگوں کو یہ کمال شیشہ گری نہیں آتا، ان کو اس کارگہ شیشہ گراں میں آنا ہی نہیں چاہئے۔ جناب احسان نے خیال رکھا ہے کہ ان کی غزلوں میں ایسے عناصر نہ آئیں جن سے یاس و الم کے جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی غزلیں گریہ و ماتم سے خالی ہیں۔ لیکن ان میں کیف و نشاط بالکل نہیں ہے۔ جس کی وجہ

اوپر لکھ چکا ہوں - اس کے ساتھ ساتھ ان کی غزلیں اس حسن سے بھی معرا ہیں جو لکھنؤ اسکول کی بے مثل خصوصیت ہے -

لکھنؤ کی اس مخصوص شاعری میں خیال میں کتنا ہی ابتذال سہی، لیکن اس میں حسنِ زبان، اسلوبِ ادا اور طرزِ بیان کی جو خوبیاں پائی جاتی ہیں - وہ بہرطور قابلِ لحاظ ہیں - احسان صاحب کے یہاں وہ خوبیِ زبان بالکل نہیں ہے جو دوسرے عناصر کو چمکا دیتی ہے - ان کے پورے بیان میں ایک کرخت و درشت لہجہ ہے - اور غیر دل کش اسلوب - مثال کے طور پر میں بعض اشعار پیش کرتا ہوں - یہ وہ اشعار ہیں جن میں انھوں نے علی الرغم دبستانِ لکھنؤ غمِ محبت کو سرود انگیز بنا کر پیش کیا ہے اور اس راہ کی سختیوں کو تازیانۂ شوق سے تعبیر کیا ہے:

یہ جلوہ گاہ عشق ہے بزمِ عزا نہیں — مستانہ آ ہجومِ تمنا لئے ہوئے
کچھ اور کر بلند ذرا ذوقِ عاشقی — غم بھی ہے اک نشاط کی دنیا لئے ہوئے
مستانہ وار مشہدِ اُلفت میں رکھ قدم — چہرہ پہ اک تبسمِ رعنا لئے ہوئے
مضرابِ سوزِ غم سے ذرا چھیڑ سازِ دل — ہر تار میں ہے شعلۂ سینا لئے ہوئے

راحتِ روح ملی دولتِ کونین ملی، — کشتۂ درد و اسیرِ غمِ پنہاں ہو کر
دیکھ پھر ہوتی ہے کیا بارشِ الطافِ کریم — مشہدِ عشق میں آ سربہ عریاں ہو کر
وادیِ عشق میں یہ نالۂ دستِ یزداں کیسا — ہاں اُٹھا گام طلب ہے خود و رقصاں ہو کر
کاش رہ جائے جگر میں یہ مرا داغِ جنوں — اک نشاطِ ابدی کا چمنستاں ہو کر

وہ دل ہے ننگِ محبت کہ درد میں جس کو — نشاطِ زندگیِ جاوداں نہیں ملتا
کسی شہیدِ محبت سے پوچھ لذتِ غم — کہ بوالہوس کو یہ کیفِ نہاں نہیں ملتا
فسردگی جس سے ہو دل مشتعل ہو جس سے دماغ — وہ اہلِ ذوق کا طرزِ فغاں نہیں ملتا

ان اشعار میں غمِ محبت کا گو رستا نی بیان نہیں ہے، لیکن وہ نشاط و کیف بھی نہیں ہے - جس کا احسان صاحب نے بار بار ذکر کیا ہے کسی شعر کو پڑھ کر دل پر کوئی اثر نہیں ہوتا، بلکہ اس التزام نے ان کی غزلوں کو شروع سے آخر تک بے کیفی کے رنگ میں رنگ دیا ہے - آپ جو غزل دیکھیں گے اس میں بھی یہی سستی دیکھنے کو ملے گی، منتشر اشعار سے شاید اس کا صحیح اندازہ نہ ہو سکے - اس لئے میں ان کی ایک مکمل غزل نقل کرتا ہوں، جس سے یہ رنگ زیادہ واضح ہو گا -

چھیڑ وہ نغمہ اے جنوں جس سے ہو دورِ مشتعل — مست نشاط ہو دماغ ولولہ آفریں ہو دل
پھونک دے اے جمالِ یار خرمنِ آرزو مرا — اپنا مگر دکھا مجھے جلوۂ کیف مستقل
اس کی حریمِ ناز کا پایہ بہت بلند ہے — کم نہیں اپنا بھی مگر حوصلۂ جبینِ دل
اس کی عنایتیں نہاں اس کے ستم میں ہیں مگر — ہو جو نگاہ جلوہ سنج ہو جو ادا شناسِ دل
تیرے نشاطِ درد کی چاہیے ایک لہر بس — پھر نہ یہ جہان ہو ملول پھر نہ یہ دل ہو منفعل
جس کا ہر ایک ذرہ ہے رقص گہِ جمالِ قدس — ہے وہی آستاں مرا سجدہ گہِ نیازِ دل
ہے وہ شرارِ معنوی ذرۂ خاک میں مرے — جلوۂ روحِ قدسیاں جس سے ہے پر تپاں فعل

احسان صاحب کی غزلوں میں دوسرا بڑا عنصر تصوف ہے اور یہ بھی اصغر کا اثر ہے - غزلوں کا دامن بہت وسیع ہے - اس کے اندر حیات و کائنات کے سارے مظاہر کا بیان سما سکتا ہے - اور فلسفہ و تصوف کے تمام اسرار و رموز پوری رنگا رنگی کے ساتھ داخل کئے جا سکتے ہیں - شرط یہ ہے کہ اندازِ بیان میں شعریت باقی رہے اور مفہوم اس طرح ادا کیا جائے کہ الفاظ اس کا ساتھ دے سکیں - ایسا نہ ہو کہ فلسفہ و تصوف کے مسایل صرف مدعیانہ طرز سے بیان کر دئے جائیں اور غزل کی زبان اور اس کے مزاج کا لحاظ نہ رکھا جائے -

احسان صاحب تصوف کے دلدادہ ہیں، لیکن کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ ذوق صرف ذہنی لگاؤ کی حد تک ہے وہ چونکہ ایک طرف لکھنؤ کے رنگ سخن سے بیزار ہیں۔ لیکن دوسری طرف اس دل گداختہ سے بھی محروم ہیں جو فطرت کا انعام خاص ہوتا ہے۔ اسلئے وہ حریم تصوف میں پناہ لیتے ہیں۔ تصوف اگر حال سے متعلق ہو تو ایک بلند کیفیت ہے۔ لیکن اگر وہ صرف قال کی حد تک ہو تو پھر شاعر کے حصہ میں اس کی چند اصطلاحات اور غیر شاعرانہ الفاظ ہی آتے ہیں اور وہ اس ارتعاش خفی سے محروم رہتا ہے۔ جس سے کلام میں گرمی پیدا ہوتی ہے جناب احسان کے کلام میں وہی اصطلاحات ہیں، وہی الفاظ ہیں، اور وہی بعض سمجھ میں نہ آنے والی باتیں۔ لیکن وہ کیفیت نہیں ہے جو تصوف کی جان ہے۔ انھوں نے اصغر کی تقلید میں بیسیوں جگہ لاہوت و ناسوت کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ لیکن ان سے کلام کی بے نمکی و بیوست میں اور اضافہ ہوگیا ہے۔ میں مثال کے طور پر ان کے چند اشعار نقل کرتا ہوں۔ جس سے اندازہ ہوگا کہ ان کے یہاں جہاں تصوف کا بیان ہے وہاں صرف الفاظ کی درشتگی یا بیان کی ژولیدگی ہے اور کچھ نہیں۔ اور جہاں دوسرے اخلاقی و فکری مسایل کا ذکر ہے۔ وہاں کبھی شعریت مفقود ہے صرف پند گستری و سخن بافی باقی رہ گئی ہے۔ غم و مسرت کے جذبات کا اوپر ذکر کیا جا چکا ہے:

دیکھ رہا ہے حسن کے جلوۂ بے مثال کو، عشق بھی اک لئے ہوئے لذت لازوال کو
وہ مہ و مہر ہیں کہاں شعلۂ برق میں کہاں جلوہ دیا ہے تو نے جو قلب شکستہ حال کو
میری نگاہ شوق کی سحر طرازیاں نہ پوچھ دیتی ہے خود پیام کیف جلوہ گہ جمال کو
جلوۂ لطف خاص کی ہے یہ نگہ اداشناس اور بھی پائمال کر سینۂ پائمال کو
آئینۂ جمال میں دیکھ رہا ہوں میں ترے، اپنے ہی آب و رنگ کو اپنے ہی وجد و حال کو

لذت شناس دل جو ہو کچھ سوز و ساز کا، ہر خار زار فرش ہے گلہائے ناز کا
ادنیٰ سا یہ کرشمہ ہے ذوق نیاز کا، ہر ذرہ محو رقص ہے اس بزم ناز کا
اک نکتۂ لطیف ہے اس بزم ناز کا ہر نغمہ میرے ٹوٹے ہوئے دل کے ساز کا
اک انبساط روح کی دنیا چمک اٹھی بھڑکا جو شعلہ تیرے غم جانگداز کا
اک لے میں ورنہ تھیں یہ کہاں شعلہ باریاں فیض اثر ہے خود ہی لب سوز و ناز کا
جس کو اٹھا کے لے گئی خود رحمت ازل اک سجدہ تھا وہ میرے سر بے نیاز کا

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ ان کے یہاں بیوست و غیر شاعرانہ کیفیت کس حد تک ہے، الفاظ کا ذخیرہ ہے، لیکن شعریت کا پتہ نہیں فارسی تراکیب ہیں، لیکن حسن سے معرا، وہی پامال و فرسودہ خیالات ہیں جو عموماً کتابی تصوف کے سرمست شعرا کے یہاں پائے جاتے ہیں اور جو عموماً حسن ادا و کیف بیان سے بھی داماں ہوتے ہیں۔

یہاں تو ان کی شاعری کا عمومی پہلو تھا، اب میں ان کی شاعری کے ایک خاص حصہ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ ہر شاعر کے کلام کو سب سے پہلے اس اعتبار سے دیکھا جاتا ہے کہ اس کے اندر محاسن کی کیا نوعیت ہے اور پھر یہ کہ معائب کا کیا حال ہے۔ غلطیاں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک زبان کی اور دوسری معانی و بیان کی۔ اول الذکر قسم کی غلطیاں مبتدی و نومشق شعرا کے یہاں ملتی ہیں۔ ہاں دوسری قسم کی غلطیاں بعض اچھے شعرا کا دامن زبان کی معمولی خامیوں سے ضرور پاک ہوتا ہے۔ لیکن نہایت افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ جناب احسان کے اس مجموعہ میں زبان کے ایسے فحش عیوب ملتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے۔

احسان صاحب شاعر ہونے سے پہلے ادیب و لقاد ہیں۔ ایک ایسا شخص جو نقد و ادب سے ذوق رکھتا ہو اور لوگ اس کی اس حیثیت سے اچھی طرح واقف بھی ہوں۔ اس کے کلام میں مکتبی اغلاط سخت تکلیف دہ چیز ہے۔ نقاد تو خوب و زشت کا فیصلہ کرتا ہے۔ لیکن وہ خود ہی ایسے نقایص و معائب سے دست و گریباں ہو جو نہایت درجہ معمولی ہوں۔ تو پھر دوسروں کو کیا کہا جائے گا۔ پھر یہ بھی ہے کہ کسی ناقد کے

زبان و بیان کی معمولی معمولی غلطیوں کا وجود عام لوگوں کے لئے اس بات کی دلیل بن سکتا ہے کہ شعر میں زبان و بیان کی خامیاں ہونا اور بات ہے۔ ایسے بعض مقامات کو مختصر اشارات کے ساتھ لکھتا ہوں۔ دیوان کی ابتدا منظومات سے ہوتی ہے۔ پہلی نظم کا عنوان ہے "دعا" فرماتے ہیں:

اِک ذوقِ جنوں مجھے عطا کر　　پابندیِ ہوش سے رہا کر
ڈوبا ہوا ذوقِ آرزو میں　　اک ذوقِ نظر مجھے عطا کر

دونوں جگہ اک زاید ہے۔ یہ عیب شاید ان کو اصغر کے کلام کی مداومت سے بطور تاثر ملا ہے۔ کیونکہ اصغر کے یہاں ایسے حشو و زاید کے عیوب عام ہیں:

ہے تشنۂ ذوقِ روح میری　　اک میکدۂ نشاط وا کر
اسرار کی جلوہ ریزیوں سے　　معمور نظارۂ فضا کر

پہلے شعر کا انداز بیان صحیح نہیں۔ مفہوم یہ ہے کہ "میری روح تشنۂ ذوقِ معرفت ہے۔ اس کو میکدہ معرفت کا راستہ دکھا" لیکن یہ مفہوم پورے طور پر ادا نہیں ہو سکا۔ کیونکہ تشنۂ ذوق سے یہ مفہوم نہیں نکلتا۔ جب تک کہ ذوقِ معرفت یا ایسا ہی کوئی دوسرا لفظ نہ لایا جائے۔ نیز ذوق کو میکدۂ نشاط سے کوئی تعلق نہیں، یا پھر ذوق کے ساتھ کوئی ایسا لفظ آنا چاہئے جس سے نشاط کا تعلق ظاہر ہو۔ دوسرے شعر کے مصرعِ ثانی میں نظارہ بیکار ہے۔ مطلب صرف یہ ہے کہ "جلوہ ہائے اسرار سے فضا کو معمور کر دے"۔ لیکن اس کو اس طرح کہنا کہ "نظارۂ فضا کو معمور کر دے"

جو رنگ ہے میری زندگی کا　　لبریزِ فروغِ سادگی ہے
بستانِ شعور و ہوش میرا　　پروردۂ فیضِ بے خودی ہے

دوسرے شعر میں بے خودی بے محل آیا ہے۔ مقتضائے کلام تو یہ ہے کہ یہاں کسی صفتِ محمود کا ذکر ہو۔ بے خودی مذموم صفت ہے اور ظاہر ہے کہ بے خودی سے جو چیز پیدا ہوگی وہ مذموم تر ہوگی۔

میرے ظاہر سے نہ کر اندازۂ باطن میرا　　قلب ہے میرا منور ہے نظر میری حسیں

یہاں دونوں مصرعوں میں تناسب بیان نہیں ہے۔ پہلے مصرعہ میں کہا گیا ہے کہ میرے ظاہر سے میرے باطن کا اندازہ نہ کر، مطلب یہ ہے کہ میں بہ ظاہر بے سر و سامان سہی۔ لیکن درحقیقت مجھ کو کمال حاصل ہے۔ اس اعتبار سے دوسرے مصرعہ کا پہلا جزو "قلب ہے میرا منور" تو ٹھیک ہے کہ اس سے ایک کیفیت پنہاں کا اظہار کیا گیا ہے۔ لیکن پھر یہ کہنا کہ "ہے نظر میری حسیں" صحیح نہیں۔ اس کے بجائے یا تو اپنی ظاہری بے سر و سامانی کا بیان ہونا چاہئے یا پھر کسی خوبیِ باطنی ہی کو بیان کیا جائے۔ قلب اگر منور ہے تو یہ خوبیِ باطنی ہوئی۔ اور نظر اگر حسیں ہے (جو بجائے خود محلِ نظر ہے) تو یہ خوبیِ ظاہری ہے، کیونکہ قلب کے مقابلہ میں نظر ظاہر سے مناسبت رکھتی ہے۔ اس کے علاوہ اس بات کا کہیں ذکر نہیں ہے کہ قلب کس چیز سے منور ہے۔ اور نہ اس سے پہلے کسی ایسی چیز کا ذکر کیا گیا ہے۔

جس کا ہر جرعہ بڑھا دیتا ہے ذوقِ تشنگی　　میرے وسعتِ شوق میں وہ جامِ تند و تیز ہے
پردۂ فطرت میں پنہاں ہے مرے وہ اک نوا　　جو سراپا ذوقِ نامحدود سے لبریز ہے

پہلے شعر میں جامِ تند و تیز کے بجائے مئے تند و تیز ہونا چاہئے۔ دوسرے شعر میں نوا کا مفرد استعمال خلافِ فصاحت ہے۔ نوائے شوق۔ نوائے عشق۔ نوائے راز وغیرہ آنا چاہئے۔ پھر سراپا کی بدولت اس پر مزید اضافہ ہے۔ نیز یہ بات بھی تشریح طلب ہے کہ "ذوقِ نامحدود" سے مراد کس چیز کا ذوق ہے۔ ان سب باتوں کے علاوہ مصرعۂ اول میں اک حسبِ معمول زاید ہے۔

لے کے آیا ہوں ازل سے وہ دلِ آتش نشاں　　جس میں ہیں قندیلِ بامِ عرش کے جلوے نہاں
ہوں وہ رندِ بادہ کش وہ مست صہبائے ازل　　جس کی مے بے نام اور میخانہ جس کا بے نشاں
گلشنِ فطرت کا ہوں وہ طائرِ عالی نظر　　جس کا ہے آغوش طوفانِ حوادث آشیاں

پہلے شعر کے مصرعۂ اول میں کہا گیا ہے کہ "میں ازل سے وہ دل آتش فشاں لے کر آیا ہوں" لہٰذا دوسرے مصرعہ میں اس دل کی آتش فشانی کا ذکر ہونا چاہئے، لیکن اس کے بجائے اس میں قندیلِ بامِ عرش کے جلوے نہاں بتائے گئے ہیں۔ جو تناسب مضمون سے عاری ہے۔ نیز قندیلِ بامِ عرش سے شاعر نے کیا چیز مراد لی ہے یہ سمجھ میں نہیں آیا۔ اس کے علاوہ بامِ زاید ہے۔ صرف قندیلِ عرش کافی ہے۔

دوسرے شعر کے مصرعۂ اول میں اپنے آپ کو مست صہبائے ازل کہا ہے۔ لیکن دوسرے مصرعہ میں کہتے ہیں کہ "جس کی مے بے نام ہے" جب اپنے آپ کو مست صہبائے ازل کہہ دیا تو مے بے نام کہاں رہی۔ اس کے علاوہ مصرعۂ اولیٰ کا پہلا جزو "ہوں وہ رندِ بادہ کش" زاید ہے۔ بات صرف اتنی ہے کہ "میں وہ مست صہبائے ازل ہوں جس کی مے بے نام ہے"۔

تیسرے شعر میں شاعر نے اپنے آپ کو گلشنِ فطرت کا طائرِ عالی نظر بتایا ہے، لیکن دوسرے مصرعہ میں عالی نظری کا مظاہرہ اس طرح کیا ہے کہ اپنے آشیانے کو آغوشِ حوادث میں بتایا ہے۔ ظاہر ہے کہ آغوشِ حوادث میں زندگی بسر کرنا اور عالی نظر ہونا دو علیحدہ باتیں ہیں۔ پہلے مصرعہ کی عالی نظری کا تو مقتضا یہ تھا کہ دوسرے مصرعہ میں بلند پروازی یا صفت شاہبازی کا ذکر کیا جاتا۔ حوادث میں زندگی بسر کرنا سخت کوشی یا قوتِ تحمل کا مظاہرہ ہے۔ اس کو عالی نظری سے کیا تعلق۔

ہوں وہ مجروحِ ستم وہ کشتۂ ذوقِ وفا — دیکھ کر جو مسکرا دیتا ہے غم کی بجلیاں
ہوں میں وہ آشفتہ سر وہ بے خود جوشِ طلب — جس کو حاجت راہبر کی ہے نہ ذوقِ آستاں
وہ اسیرِ درد ہوں جس کو نہیں فکرِ خلاص — ہوں میں وہ بے تاب غم جو کر نہیں سکتا فغاں

پہلے شعر کے مصرعِ ثانی میں نہایت بھدی تعقید ہے۔ دوسرے شعر کے مصرعۂ ثانی میں ذوقِ آستاں صحیح نہیں۔ اس کے بجائے فکرِ آستاں یا اس کا ہم معنی کوئی مرکب آنا چاہئے۔ پہلے مصرعہ میں شاعر نے اپنے آپ کو بے خود جوشِ طلب کہا ہے۔ اگر ذوقِ آستاں نہ ہوتا تو جوشِ طلب کیسے پیدا ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ میں جوشِ طلب سے اتنا بے خود ہوں کہ مجھ کو پروائے منزل یا فکرِ آستاں نہیں ہے۔ لیکن ذوق نے اس مفہوم کو الٹ دیا۔ تیسرے شعر میں فکرِ خلاص صحیح ہونے کے باوصف وضاحت سے معرا ہے۔

میرے صہبائے محبت میں ہے وہ موجِ شراب — دیکھتا ہوں برق لاہوتی کی جس میں آب و تاب

احسان صاحب نے صہبا اور شراب دو مختلف المعنی لفظ فرض کئے ہیں۔ حالانکہ یہ دونوں مرادف الفاظ ہیں۔ پھر صہبا کو مذکر لانا اس سے بھی بڑی ستم ظریفی ہے۔ اس کے علاوہ مفہوم میں وہی متصوفانہ اہمال موجود ہے۔

جس کی ہر موج شرر ہے اک سراپا سیلِ نور — جل رہا ہوں عشق کی اس آتشِ بے دود میں
ہے وہ چشمِ شوق میری جس کو آتا ہے نظر — اک چمن رنگینیوں کا شعلۂ نمرود میں

پہلے شعر میں سراپا زائد ہے۔ دوسرے شعر میں "شعلۂ نمرود" کے بجائے آتشِ نمرود ہونا چاہئے۔

ہوں میں وہ خود رفتۂ و شوریدۂ و خانہ خراب — اک جہانِ حسن ہے بگڑی ہوئی جس کی ادا
ہے فغانِ درد میری وہ خروشِ آرزو — کنگرے دیتا ہے جو عرشِ معلیٰ سے ہلا

دونوں اشعار میں تعقید کا جو مظاہرہ ہے وہ شاعر کی عدمِ قدرتِ بیان کا غماز ہے۔

بارگاہِ حسن کا ہوں وہ گدائے بے نیاز — جس کے آئینِ جنوں میں ہے تقاضا نا روا
اس تماشا گاہِ ہستی میں ہوں وہ حرماں نصیب — رفعتِ ذوقِ نظر سے ہے جو محروم لقا

پہلے شعر میں آئینِ جنوں غلط ہے۔ کیونکہ گدا کا جنوں سے کوئی تعلق نہیں۔ اس کے بجائے آئینِ طلب یا اس کا ہم معنی کوئی لفظ آنا چاہئے دوسرے شعر کے محروم لقا میں لقا حشو ہے۔ مفہوم صرف یہ ہے کہ "میں وہ حرماں نصیب ہوں جو رفعتِ ذوقِ نظر سے محروم ہے"۔ اس کے علاوہ یہ پوری نظم تناسبِ بیان سے عاری ہے۔ اور جگہ جگہ معنوی تضاد ہے۔ ان چند اشعار سے ان کی نظم نگاری کا ایک اندازہ کیا

جاسکتا ہے۔ اب میں حصۂ غزلیات سے کچھ شعر پیش کرتا ہوں :

صفحہ ۲۹ ۔ مضراب سوزِ غم سے ذرا چھیڑ سازِ دل ہر تار میں ہے شعلۂ سینا لئے ہوئے

تعقید کے علاوہ شعر نہایت سلست اور قدرتِ بیان سے آزاد ہے ! ۔

صفحہ ۳۰ ۔ پھونکدے اے جمالِ یار خرمنِ آرزو مرا اپنا مگر دکھا مجھے جلوۂ کیفِ مستقل
جس کا ہر ایک ذرہ ہے رقص گہِ جمالِ قدس ہے وہی آستاں مرا سجدہ گہِ نیازِ دل

پہلے شعر کا دوسرا مصرعہ تعقید کا شاہکار ہے ۔ نیز اس کے جزو اول (اپنا مگر دکھا مجھے) میں پہلوئے ذم چٹکی زن ہے۔ دوسرے شعر میں لفظ میرا نہایت غلط طور پر داخل کیا گیا ہے ۔ اس کی نثر یوں ہوگی ۔ " وہی آستاں سجدہ گہِ نیازِ دل ہے جس کا ہر ایک ذرہ رقص گہِ جمالِ قدس ہے"۔ اور ظاہر ہے کہ اس میں میرا کی کہیں گنجایش نہیں معلوم ہوتی ۔ ہاں اگر " نیازِ دل" کو نکال دیا جائے تو البتہ "میرا سجدہ گہ" آسکتا ہے ۔

صفحہ ۳۱ ۔ ہے وہ شرارِ معنوی ذرۂ خاک میں مرے جلوۂ روحِ قدسیاں جس سے ہے پست و منفعل

مصرعۂ ثانی میں جس سے اور پست و منفعل دونوں ٹکڑے غلط ہیں ۔ جس سے کے بجائے " جس کے سامنے" صحیح ٹکڑا ہے اور پست و منفعل کے بجائے بے نور یا اس مفہوم کا کوئی دوسرا لفظ ۔ مفہوم یہ ہے کہ " میرے ذرۂ خاک میں وہ شرارِ معنوی ہے ، جس کے سامنے جلوۂ قدسیاں بے نور نظر آتا ہے ۔ جلوۂ روح کو انفعال یا پستی سے کوئی نسبت نہیں ۔ اس کے علاوہ " ذرۂ خاک" بھی روزمرہ کو آنکھیں دکھا رہا ہے

صفحہ ۳۴ ۔ کچھ ایسی لذتِ پنہاں ملی محبت میں ، کہ ہو سکی نہ زباں خوگرِ بکا میری
وہ رندِ خاک نشیں ہوں کہ وقتِ سرمستی حریمِ قدس ہے ہمراز و ہم نوا میری
پیامِ دار رہی اب اس کو ذوقِ تسکیں دے ، اچھل رہی ہے یہ کب سے رگِ وفا میری

پہلے شعر میں نوگر یکا غزل کی زبان نہیں ہے ۔ دوسرے شعر میں حریمِ قدس ہے کے بجائے ہوتی ہے کا محل ہے ۔ نیز حریمِ قدس کا ہمراز ہونا بھی تکلف سے خالی نہیں ہے ۔

تیسرا شعر عجیب ہے ۔ میں نے آج ہی پڑھا کہ رگِ وفا کو بھی پیامِ دار دیا جاتا ہے ! علاوہ ازیں پہلے مصرعہ میں ذوقِ اور دوسرے مصرعہ میں یہ حشو ہیں اور معنوی اعتبار سے یہ دونوں شعر مہمل ہیں ۔

صفحہ ۳۵ ۔ ہجومِ درد میں کیا مجھ کو خوفِ تنہائی وہ برقِ حسن ہے خود شمع رہ نما میری

دونوں مصرعے دو لخت ہیں ۔ برقِ حسن سے رہنمائی کا جو کام لیا گیا ہے وہ یہاں بے محل ہے ۔ شمع رہ نما کا ذکر اس وقت صحیح ہو سکتا تھا کہ ظلمتِ شب میں قطعِ راہ کا تذکرہ ہوتا ۔ ہاں اگر مصرعہ اول میں ہجومِ درد کے بجائے کوئی ایسا لفظ لایا جائے جس سے ظلمت کا مفہوم پیدا ہو سکے تب شمع کا ذکر صحیح ہوگا ۔ لیکن شمع رہنما پھر بھی محلِ نظر رہے گا ۔ نہایت تعجب کی بات ہے کہ احسان صاحب نے خوفِ تنہائی اور ہجومِ درد کے مقابل شمع رہ نما جیسی غلط اور غیر متعلق چیز کا تذکرہ کیا ۔

صفحہ ۴۱ ۔ تجھ کو گرنا تھا مرے قلب پہ اے برقِ جمال ، کیا ملا طور پہ تجھ کو شرر افشاں ہو کر

بے اختیار غالب کا مشہور شعر یاد آگیا :

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی نہ طور پر ، دیتے ہیں بادہ ظرفِ قدح خوار دیکھ کر

صفحہ ۴۲ ۔ وہ دل ہے ننگِ محبت کہ درد میں جس کو نشاطِ زندگی جاوداں نہیں ملتا

نشاط نہیں ملتا کے بجائے نشاط نہیں ملتی زیادہ فصیح ہے ۔

یہ راہِ عشق ہے ایثار نفس ہے درکار کہ ہر جبیں کو ترا آستاں نہیں ملتا

ایثارِ نفس اور حبیں میں کوئی تعلق نہیں ہے۔

ہر ایک قطرہ ہو جس کا ستارۂ سحری وہ اشک دیدۂ گوہر فشاں نہیں ملتا

اس شعر کی نثر اس طرح ہوگی۔ "وہ اشک، دیدۂ گوہر فشاں نہیں ملتا جس کا ہر قطرہ ستارۂ سحری ہے"۔ اشک دیدۂ گوہر فشاں کا قطرۂ سرا سر مہمل بات ہے۔ قطرۂ اشک، یا اشکِ خونیں کا ہر قطرہ تو مستعمل ہے، لیکن اشک بہ طور واحد استعمال کر کے اس سے قطرے پیدا کرنا غلط کاری کے سوا کچھ نہیں۔

صفحہ ۴۵۔ دیکھ رہا ہے حسن کے جلوۂ بے مثال کو عشق بھی اک لئے ہوئے لذتِ لازوال کو
لذتِ غم نے اک تری سب کو مٹا کے رکھ دیا شکوۂ دردِ ہجر کو آرزوئے وصال کو

دونوں تعقید کا بری طرح شکار ہیں۔ معلوم ہوتا ہے جیسے شاعر کو اتنی بھی قدرتِ کلام حاصل نہیں ہے کہ وہ الفاظ معمولی طور پر ترتیب دے سکے۔

صفحہ ۴۷۔ سیراب جس کے فیض سے ہے روحِ قدسیاں وہ جام ہے ترے غم راحت نواز کا،

دوسرا مصرعہ بہ اعتبارِ انداز بیان صحیح نہیں ہے۔ اگر اس کی نثر کی جائے تو صحیح ترتیب یوں ہوگی "ترا غم راحت نواز وہ جام ہے جس سے روحِ قدسیاں فیضیاب ہے"۔ غم راحت نواز کو جام قرار دینا تکلف سے خالی نہیں ہے۔ ہاں اگر جام کو کسی ترکیب کے ساتھ لایا جائے تو البتہ ایک بات ہو سکتی ہے۔

صفحہ ۴۸۔ یہ عالمِ شکستگیٔ آشیاں مرا، اور اس پہ کیفِ رقص تری برقِ ناز کا

"شکستگیٔ آشیاں" کی ترکیب صحیح نہیں ہے۔ آشیاں شراب کا جام یا عاشق کا دل نہیں جو ٹوٹ جائے۔ وہ اُجڑتا ہے، برباد ہوتا ہے ٹوٹتا نہیں۔ دوسرا مصرعہ تصنع اور آورد کی نہایت بھدی مثال ہے۔

یونہی نہ جانئے مرے اس تارِ اشک کو اک سلسلہ ہے موجِ گہر ہائے راز کا

یہاں لفظ موج صحیح نہیں۔ موتی کی آب کے لحاظ سے اس کے لئے موج لا سکتے ہیں لیکن پہلے مصرعہ کے تارِ اشک سے اس کی مناسبت باقی نہیں رہے گی۔

صفحہ ۴۹۔ اک انبساطِ روح کی دُنیا چمک اُٹھی بھڑکا جو شعلہ تیرے غمِ عاشقانہ ناز کا
اک سانس میں ورنہ تھیں یہ کہاں شعلہ بایاں فیضِ اثر ہے خود بہ لبِ نے نواز کا

دونوں شعروں میں اک زائد ہے۔ نیز دوسرے شعر کے مصرعۂ ثانی میں فیض اور اثر میں سے بھی ایک لفظ زائد ہے۔

صفحہ ۵۰۔ جس کو اُٹھا کے لے گئی خود رحمتِ ازل اک سجدہ تھا وہ میرے سرِ بے نیاز کا

رحمتِ ازل کا سجدے کو اُٹھا لے جانا نہایت غیر شاعرانہ انداز بیان ہے۔ سجدہ کوئی بیشقہ گراں نہیں ہوتا جس کو اُٹھانے کے لئے رحمت ازل زحمت حمالی برداشت کرے۔ نیز اس محل پر "سرِ بے نیاز" کی ترکیب بھی مقصود فانہ استعمال کی ہے۔

صفحہ ۵۴۔ در حرم پہ بیٹھ کر نصیب اہلِ ہوش کو کہاں وہ سجدہ ریزیاں جبینِ بادہ خوار کی
ہر ایک ذرہ روکشِ جمالِ برق طور ہے اڑا کے دیکھ اے صبا چمک مرے غبار کی

پہلے شعر میں کرشمۂ تعقید نمایاں ہے۔ معلوم ہوتا ہے احسان صاحب کی رائے میں جملے کی ترتیب کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتی۔ اور شعر میں جو لفظ جہاں جہاں چاہیں لا سکتے ہیں۔ اس شعر کی نثر اس طرح ہوگی۔ "اہلِ ہوش کو درِ حرم پہ بیٹھ کر جبینِ بادہ خوار کی سجدہ ریزیاں کہاں نصیب ہو سکتی ہیں"۔ اب شعر میں اس پر حیں طرح مشقِ ستم کی گئی ہے وہ داد طلب ہے۔ دوسرے شعر میں صبا کو ذرہ ہائے غبار کی چمک اُڑانے کا جو چیلنج دیا گیا ہے وہ بجائے خود صحیح نہیں ہے۔ صبا کا کام غبار یا ذرہ ہائے غبار اُڑانا ہوتا ہے نہ کہ

درہ ہائے غبار کی چمک -

یہ مجموعۂ کلام دو سو صفحات پر مشتمل ہے - جس میں سے صرف چوّن صفحات پر سرسری نظر ڈالی گئی ہے - اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ باقی حصّے کا کیا حال ہوگا - ایک ادیب و نقاد اور پڑھے لکھے شاعر کا عیوب سے اتنا گراں بار ہونا جتنا حیرت خیز ہو سکتا ہے وہ ظاہر ہے - حرفِ آخر کے طور پر میں آخر میں ان کی ایک پوری غزل نقل کرتا ہوں - اس غزل میں وہ سارے عیوب مجموعی طور پر موجود ہیں جن کا تذکرہ کر چکا ہوں - اور اس سے زیادہ واضح طور پر اسقام و معائب کا اندازہ کیا جا سکتا ہے :-

دیکھ رہا ہے حسن کے جلوۂ بے مثال کو — عشق بھی اک لئے ہوئے لذتِ لازوال کو
وہ مہ و مہر میں کہاں شعلۂ برق میں کہاں — جلوہ دیا ہے تو نے جو قلبِ شکستہ حال کو
میری نگاہِ شوق کی سحر طرازیاں نہ پوچھ — دیتی ہے خود پیامِ کیف جلوہ گہِ جمال کو
جلوۂ لطف خاص کی ہے یہ ادائگہ شناس — اور کبھی پائمال کر سینۂ پر ملال کو
آئینۂ جمال میں دیکھ رہا ہوں میں ترے — اپنے ہی آب و رنگ کو اپنے ہی وجد و حال کو
لذتِ غم نے اک تری سب کو مٹا کے رکھ دیا — شکوۂ درد ہجر کو آرزوئے وصال کو
عشق میں کام آگئی کچھ یہی عجز و خستگی — لے گئی باغِ قدس تک مرغِ شکستہ بال کو
ایک نشاط بے حسی ایک سرور بے دلی — دیکھ رہا ہوں عشق کے معجزۂ کمال کو
یاد یہ کس کی آگئی برق سی اک چمک گئی — کس نے یہ جگمگا دیا عرصۂ گہِ خیال کو

رشید حسن خاں

گلہائے جعفری

یعنی

جناب اثر لکھنوی کے ڈیڑھ سو اشعار

جو اڈیٹر نگار نے اپنے تعارفی مقدمہ کے ساتھ بہت اہتمام سے شایع کئے تھے اس کی چند جلدیں اتفاق سے رہ گئی ہیں - آٹھ آنے کے ٹکٹ ملنے پر انتخاب ذریعہ پوسٹ مل سکتا ہے -

فلسفۂ مذہب

مولوی مقبول احمد صاحب کی وہ ہنگامہ خیز تصنیف جس نے علماء اسلام کی "کافر ساز" مجالس میں ہلچل ڈال دی تھی اس میں مذہب کی ابتدا و ضرورت ، مذہب ، قومیت ، قومیت و الٰہیات ، مذہب و نبوت ، مذہب و تکوین ، مذہب و معاد ، مذہب و تقریر ، مذہب و اخلاق مذہب و عبادات اور انجام مذاہب پر نہایت محققانہ و عالمانہ بحث کی گئی ہے - قیمت دو روپے -

ملک خطا کے شہزادے

وصی احمد بلگرامی کا وہ مشہور مقالہ جس میں انھوں نے مخصوص انداز بیان پر حرمتِ خمر پر مولانا شبلی مرحوم کی تحریر پر اعتراض کیا تھا اور اڈیٹر نگار نے اس پر تبصرہ کیا تھا - قیمت بارہ آنے -

توقیت

تاریخ اسلامی ہند کے سلسلہ میں اڈیٹر نگار نے یہ توقیت مرتب کی تھی جس میں ۱۲ھ سے ۹۳۷ھ تک کے تمام اہم تاریخی واقعات بتقدیم سنہ عیسوی یکجا کر دئے گئے ہیں - تاریخ کے طلبہ کے لئے بڑی کارآمد چیز ہے - قیمت ایک روپیہ

نگار بکس ایجنسی لکھنؤ

فارسی ڈرامے کی بُنیاد

ڈرامہ یا تمثیل اُس نقل کو کہا جاتا ہے، جسے لوگوں کے سامنے پیش کرکے انسانی جذبات، کا اظہار کیا جائے، کبھی اس میں ہمدردی غیرت و جرأت کے واقعات پیش کئے جاتے ہیں، کبھی سوسائٹی کے محاسن و معائب کو مختلف پیرایوں سے دکھایا جاتا ہے اور تمثیل یا ڈرامہ میں ان کا اثر دور رس ہوتا ہے۔

مثل دیگر فنون کے تمثیل کی بھی کئی قسمیں ہیں :-

(۱) المیہ۔ جس کا انجام تباہی، بربادی و مصیبت ہوتا ہے، اس میں قصہ کا تمام پلاٹ اس طرح کا ہوتا ہے کہ تمام کردار ایک منضبط اخلاقی قوانین کے تحت انتہائی حزن و ملال اور رقت آمیز منظر کو پیش کرتے ہیں۔

(۲) ابتہاجیہ۔ جس کا انجام خوشی یا مسرت ہوتا ہے، اس میں قصہ کی ابتدا ظلمت و تاریکی سے شروع ہوتی ہے، لیکن بتدریج یاس انگیز حالات مبدل بہ یاس انگیز ہونے لگتے ہیں۔

(۳) تاریخی تمثیل۔ اس تمثیل کا مواد تاریخی ذرایع سے حاصل کیا جاتا ہے، یہ المیہ یا ابتہاج دونوں قسم کے ہوسکتے ہیں۔

تمثیل ابتہاج کی ذیلی تقسیم بھی کردی گئی ہے :-

(الف) تمسخری (FARCE) اس میں ابتہاج کے مناظر بغیر کسی پلاٹ کے پیش کئے جاتے ہیں۔

(ب) رومان۔ ایسی تمثیلوں میں محبت کی بنیاد قرار دیا جاتا ہے۔

(ج) المیہ ابتہاج۔ ایسی تمثیلوں میں مصائب کے اندوہناک واقعات سحر انگیز طریقہ سے ایسا رخ بدلتے ہیں کہ نازک حالتوں میں پڑکر اچانک مبدل بہ ابتہاج ہوجاتے ہیں۔

(س) تمثیل طنز آمیز۔ ان میں مصنف افراد یا قوم کے اخلاق و اطوار کو درست کرنے کے لئے ایسے طریقے اختیار کرتا ہے جن سے طنز یا ہجو آمیز پیرایہ میں برائیوں کو دور کیا جاسکے۔

تمثیل کے متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ مغرب سے مستعار ہے، اس دعوے میں کہاں تک صحت و صداقت ہے، ہماری بحث سے خارج ہے مشرق میں تو سب سے پہلے ہماری نظر سامی ممالک یعنی عرب، فلسطین اور ایشیائے کوچک پر پڑتی ہے، جہاں تک تاریخ ہماری رہنمائی کرتی ہے، اہل عرب نے اپنی تمام صلاحیتیں شعر و شاعری پر صرف ہوتی تھیں، لیکن وہ ڈرامہ سے ناآشنا تھے۔ قبل از اسلام، ایران میں بھی ڈرامہ کا وجود نہیں پایا جاتا۔ اگرچہ ایران کی رنگین سرزمین اس کی نشوونما کے لئے ہمیشہ موزوں تھی۔

لیکن اسلام اختیار کرنے کے بعد ایرانی تہذیب تمام و کمال اسلامی رنگ میں ڈوب گئی اور جب ایرانی گھنڈروں پر عباسی حکومت قایم ہوئی تو علم و فن کے ہر شعبہ میں ترقی کی راہیں کھل گئیں، خلفاء کی سرپرستی نے علم و ہنر کا کوئی گوشہ تشنۂ التفات نہ رکھا۔ اس کے بعد زمانہ کے اوراق اُلٹتے رہے، ہلاکو نے عباسی خاندان کا چراغ گل کیا، طوائف الملوکی پھیلی، تیمور نے کیانی الملکی بجایا، اسی ہنگامہ خیز زمانہ میں سعدی بھی پیدا ہوئے اور حافظ بھی مگر کسی نے ڈرامہ یا تمثیل کا اشارتاً بھی ذکر نہیں کیا۔

مورخوں کا اس امر پر اجماع ہے کہ بغداد میں امام حسین کی عزاداری، اعلان و اجتماع کے ساتھ معز الدولہ دیلمی کی تحریک سے ۹۶۳ء میں شروع ہوئی، نوحہ و ماتم اور جذبات غم و الم کو نظم سے جو نظری مناسبت ہے اس کی بنا پر یہ امر قرین قیاس ہے کہ ایران

میں مرثیہ گوئی کی بنیاد دیلمیوں کے زمانہ میں پڑی، ماتمیوں کے گروہ سر برہنہ نکلتے تھے، خوب گریہ وزاری کرتے تھے اور سر پر خاک ڈالتے تھے، ایسا نہ ہوتا تو سوگواروں کے اس گروہ کو یہ سب باتیں کرتے ہوئے دیکھ کر مصائب ائمہ کی طرف ذہن منتقل نہ ہوتا۔

صفوی بادشاہوں نے اپنے مذہبی عقاید اور سیاسی مصالح کی بنیاد پر آل رسول سے عقیدت اور اُن کے مخالفین سے نفرت کے جذبات کو اُبھارنے اور ترقی دینے کی تدبیریں اختیار کیں، اور اس زمانہ کے شعراء نے مرثیہ گوئی شروع کر دی اور مصائب رسول کا ذکر کرنے والے روضہ خواں کہلائے عوام والہانہ عقیدت سے ماتم کرتے تھے، اور جذبات غم کا اظہار کرتے تھے، اس میں کسی تمثیل یا نقل وغیرہ کا شائبہ بھی نہیں پایا جاتا۔ قرآن اور احادیث نبوی کے ارشاد کے خلاف کوئی مسلمان تمثیل کی طرف رجوع نہ کر سکتا تھا، اور مسلمان اجتناب کا پہلو اختیار کئے رہے۔

مسلمانوں کے لئے زندہ چیزوں کی تصاویر بنانا منع ہے اس لئے نہ تو رسول صلعم کی تصویر بنائی گئی اور نہ آئمہ کی۔ مسلمان کبھی گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص حضرت محمد صلعم، آئمہ اطہار یا بزرگان دین کا پارٹ ادا کرے یا اُن کی نقل اُتارے، یہی وجہ ہے کہ ماہ محرم میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ڈرامہ نہیں کہا جا سکتا، جو کچھ ہوتا ہے والہانہ غم والم کا اظہار ہوتا ہے۔

اٹھارویں صدی میں مغربی طاقتوں کا سیلاب ایشیا والوں کو اپنی بے پناہ گرفت میں لے چکا تھا، مشرق اور مغرب کے تصادم سے ایشیائی سلطنتوں کے قصر و ایوان متزلزل تھے، ایسی حالت میں ایران اور ہندوستان پہلی بار مغربی فنون سے واقف ہوئے۔ فن ڈرامہ جو اس وقت یورپ میں اپنے عروج پر پہونچ چکا تھا، ہم دیکھتے ہیں کہ اُنیسویں صدی کے اوایل میں ایران اور ہندوستان سے بیک وقت اس سے روشناس ہوئے، ہندوستان میں "جانعالم پیا" واجد علی کو سب سے پہلے اس طرف توجہ ہوئی اور ایران میں ۱۸۲۹ء کے لگ بھگ پہلی بار ایک تمثیل بہجت ( ) "انعام زن" طہران میں ظہور پذیر ہوئی۔

ایران میں جنوبی سمت سے انگریز اپنا اثر جمانے کی فکر میں مصروف تھے تو شمال کی طرف روسیوں کی دست درازی دم نہ لینے دیتی تھی "قفقاز" اور شمالی ترکستان، زار روس کے قلمرو میں شامل ہو گیا، تفلیس میں ۱۸۵۰ء میں ایک تھیٹر قایم ہوا۔ جس میں روسیوں کی تفریح طبع کے لئے روسی زبان میں یورپین ڈرامے کھیلے جاتے تھے، ایرانی جو روسی زبان سے آشنا تھے، جنھوں نے روسی زبان میں جدید تعلیم حاصل کی تھی، اُن میں یہ ڈرامے بہت مقبول ہوئے، اس دلکشی نے اُن کو آمادہ کیا کہ وہ فارسی زبان میں اس صنف ادب کو جگہ دیں۔

مرزا فتح علی اخوندزادہ باشندۂ تفلیس اسی تعلیم یافتہ گروہ کا ایک نوجوان تھا، یہ روس کی رعیت اور روسی حکومت کی ملازمت میں منسلک تھا، جدید تعلیم سے بہرہ ور مغربی ڈرامہ کے فن کا ماہر اور بہت بڑی باکمال شخصیت کا مالک تھا۔

اس ماحول سے مرزا فتح علی اخوندزادہ بہت متاثر ہوا۔ مرزا خود تو تاتاری النسل تھا، اُس کے آباؤ اجداد "قراجہ داغ" میں رہتے تھے، وہ خود یورپین تہذیب کا دلدادہ تھا، اور اپنی حسن کارکردگی کی وجہ سے گورنر کے عہدہ پر فایز تھا، اور اسی وجہ سے اُسے یورپین رسوم و تہذیب کو بہت نزدیک سے مطالعہ کرنے کا عمدہ موقع ہاتھ آیا، اپنی زبان کی کم مایگی پر اُس نے توجہ کی، بالآخر تفلیس میں قیام کر کے آذری ترکی میں "قصہ شاہ یوسف سراج" اور چھ ڈرامے لکھے:

(۱) ملا ابراہیم خلیل کیمیا گر ۱۸۵۵ء (۱۲۷۲ھ) میں
(۲) موسیو ژوردان یا حکیم نباتات ۱۸۵۰ء یا ۱۲۷۲ھ میں
(۳) خرس قولادر بلسان ۱۸۵۱ء ـ ۱۲۶۸ھ میں
(۴) مرد خسیس ۱۸۵۲ء ـ ۱۲۶۹ھ میں
(۵) وزیر خان لنگران ۱۸۵۱ء ـ ۱۲۶۹ھ میں
(۶) وکلائے مرافعہ ۱۸۵۵ء ـ ۱۲۷۲ھ میں

مرزا نے ان سب کو یکجائی طور پر شائع کر کے اپنے افسر جنرل ہزر بائنس کے نام پر معنون کیا۔

اسی زمانہ میں کچھ عرصہ پہلے جلال الدین مرزا پسر فتح علی خاں قاجار مرحوم نے نامۂ خسروان ایک کتاب مشتمل برحالات شاہانِ ایران خاص فارسی میں لکھی جو عربی الفاظ کی آمیزش سے یکسر پاک تھی، اس کی ایک جلد شاہزادہ نے مرزا فتح علی کو بھی بوجہ تناسب علمی بھیجی، اس کے جواب میں مرزا فتح علی نے شاہزادہ کو اپنی تمثیلات کی ایک جلد بھیجی اس کے ساتھ ایک درخواست بھی لکھ دی کہ اگر اُن کا ترجمہ فارسی میں کردیا جائے تو مناسب ہے، لیکن ایک عرصہ تک یہ کتاب طاقِ نسیاں میں پڑی رہی۔

مرزا جعفر کی پیدائش ۱۸۳۴ء میں شہر قراجہ داغ میں ہوئی، یہ ایک علم دوست، صاحب ذوق اہلِ قلم تھا، شہزادہ جلال الدین کے دربار میں اس باکمال کی بڑی قدردانی تھی، اس کی نظر سے جب مذکورۃ الصدر مجموعہ گزرا تو اُس نے فارسی کا جامہ پہنانا شروع کیا، چنانچہ ۱۸۸۵ء میں ملا ابراہیم خلیل کیمیاگر اور موسیو ژوردان کا فارسی ترجمہ ختم کرلیا لیکن شہزادے کی بروقت موت نے مرزا کو بہت مایوس کردیا۔

مسٹر سٹفی چرچل نے جنرل آف رایل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۸۶ء میں مرزا کے خود بیان کردہ واقعات شرایع کئے ہیں، جس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اُس کی بیوی مری تو اُس نے ایک لڑکی اپنی نشانی چھوڑی، مرزا اس کو بہت چاہتا تھا جب وہ پڑھنے لکھنے کے قابل ہوئی تو اُسے فکر دامن گیر ہوئی کہ کوئی ایسا نصاب طیار کیا جائے جس سے صحیح قابلیت پیدا ہو، کیونکہ وہ ایرانی طریقۂ تعلیم کو ناپسند کرتا تھا اسی زمانہ میں شاہزادہ کے کتب خانے میں اُس کی فتح علی کی تمثیلات پر پڑگئی اُس کو پڑھ کر اسے بے انتہا مسرت ہوئی، چنانچہ سب سے پہلے اُس نے ملا ابراہیم خلیل کیمیاگر کا فارسی ترجمہ شاہزادہ کی خدمت میں پیش کیا، شاہزادہ اُس کی خوبیاں دیکھ کر بہت مسرور ہوا اور مترجم کا حوصلہ بڑھایا اور باقی حصوں کے ترجمہ کی تاکید کی۔ چنانچہ ۱۸۶۹ء میں موسیو ژوردان کے ترجمہ کی تکمیل ہوئی، ابھی ان ترجموں کے شایع ہونے کی نوبت بھی نہ آئی تھی کہ شہزادہ نے رحلت کی اور مرزا کس مپرسی کی حالت میں رہ گیا۔

مرزا کو بہت سی دشواریاں پیش آئیں مگر اُس نے ہمت نہ ہاری اور ترجمہ کے کام کو جاری رکھا اور شایع کرتا رہا۔

۱۸۸۶ء میں فرانسیسی قونصل متعینہ تبریز نے اصل مصنف (مرزا فتح علی) اور مترجم (مرزا جعفر) کے سوانح حیات کے بارے میں کچھ نوٹ حاصل کئے موسیو باربیر ڈی مینارڈ نے ان نوٹوں کو اپنے دیباچہ میں درج کیا ہے، اس کا ترجمہ[1] یہاں درج کرتے ہیں:

"مرزا فتح علی ایک دیہاتی ملّا یا مولوی کا لڑکا تھا یہ قصبہ دہشر کے صوبہ میں بچیرۂ خضر کے قریب تھا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ الخ جیسا کہ مذکور ہوچکا ہے، طفلس میں مرزا جعفر سے فتح علی کی ملاقات ہوگئی جس نے اتحاد کی شکل اختیار کرلی۔ مرزا جعفر بغرض حج اُس راستہ سے مکہ جارہا تھا، یہاں اُس کی ملاقات چند آزاد پیشہ ایرانی فلسفیوں سے ہوگئی۔ اُن کی صحبت سے متاثر ہوکر اُس نے حج کا ارادہ ترک کردیا، یہاں رہ کر حکومتِ روس کی ملازمت میں منسلک ہوگیا، اور یہیں اُس نے مرزا فتح علی کی تمثیلات کا ترجمہ فارسی زبان میں کیا، ۱۸۶۳ء میں اُس کا انتقال ہوگیا، دس ہزار تومان (تقریباً چار ہزار روپے) چھوڑے، اس کے ورثاء نے جو ایران میں رہتے تھے قفقاز کا سفر کرکے رقم حاصل کی، اتفاق سے قابل ترکی مصنف اصل ۱۸۸۶ء میں زندہ تھا لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اُس کے ڈرامے کہیں اسٹیج پر نہیں دکھائے گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ بہت ہی مواقیہ ہیں زبان عوامی اور سوقیانہ ہے، اہلِ زبان ایسی زبان کو کب سراہنے والے تھے، دوسری وجہ یہ تھی کہ ان ڈراموں میں درویش ملّاؤں، نجومیوں، کیمیاگروں کی ہجو اُڑائی گئی تھی حالانکہ عام اہلِ ایران کے دلوں میں اُن کا انتہائی احترام تھا، اس لئے وہ تاب نہ لاسکتے تھے۔"

ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں مصنف اور مترجم کی سعی بارآور نہ ہوسکتی تھی، ان کتابوں کو محض اصلاح معاشرت کی غرض سے لکھا گیا تھا، مگر اس سے ایک بہت بڑی غرض پوری ہوگئی۔ ایران کے عہدِ حاضرہ کے جدید محاورات و مصطلحات، طرزِ ادا اور زبان کی

---

[1] جنرل رایل ایشیاٹک سوسائٹی ۱۸۸۶ء

واقفیت حاصل کرنے کے لئے ایک بہترین ذریعہ ہیں، ان سے ترکستان و ایران کے سرحدی قبایل کی معاشرت کا بھی اندازہ ہوتا ہے، غیر اقوام نے ان ڈراموں کو ہاتھوں ہاتھ لیا اور فارسی زبان کے سیکھنے والوں نے بہت فایدہ اُٹھایا - فرانس، انگلستان اور جرمنی میں ان کی اشاعت ہوئی مترجم اور فرہنگیں مرتب ہوئیں -

رغیب حسین

---

(1) The Wazir of Lankran edited with a Translation, Notes & a Vocabulary By. D. Haggard & G. K. Strange. (London, 1882).

(2) Trois Comedis Persanes. Pioblicsance Un glossaire et des. des notes sare Bartier de Meynard et. S. Guyard (Paris, 1886)

"نگار" کے پچھلے فایل

۱۹۳۲ء =	جولائی تا دسمبر =		عـ۱۰ر
۱۹۳۶ء =	جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ ہندی شاعری نمبر) =	عـ۲۰ر
۱۹۳۷ء =	جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ اصحاب کہف وخلافت نمبر) =	عـ۲۰ر
۱۹۳۹ء =	جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ مصحفی نمبر) =	عـ۲۰ر
۱۹۴۱ء =	جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ نظیر نمبر) =	عـ۲۰ر
۱۹۴۴ء =	جولائی تا دسمبر =		عـ۱۰ر
۱۹۴۶ء =	جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ انتقاد نمبر) =	عـ۲۰ر
۱۹۴۷ء =	جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ ماجد ولین نمبر) =	عـ۲۰ر
۱۹۴۹ء =	جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ افسانہ نمبر) =	عـ۲۰ر
۱۹۵۰ء =	جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ تنقید نمبر) =	عـ۲۰ر
۱۹۵۲ء =	جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ حسرت نمبر) =	عـ۲۰ر
۱۹۵۳ء =	جنوری تا دسمبر =	(سالنامہ داغ نمبر) =	عـ۲۰ر

(نوٹ) صرف ایک ایک فایل موجود ہے اور سب سے پہلے جس کا آرڈر پہونچے گا اُسی کو دیا جائے گا۔ قیمت محصولڈاک کے علاوہ ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

فضا کی شاعری اور "وطنیت"

سردار جعفری کا خیال ہے کہ "جب ادب عوامی بن جائے گا تو ایسے بے شمار شاعر اور ادیب آئیں گے جو اپنے جذبات کا اظہار کرنا چاہیں گے لیکن "ہیئت" پر انھیں قابو نہ ہوگا۔ انھیں میں سے پھر اچھے شاعر اور ادیب پیدا ہوں گے۔ پتھروں کے بغیر پھول اور پھل نہیں ہو سکتے اچھے شاعر و ادیب چند ہوتے ہیں اور معمولی بہت اس لئے معمولی شاعر و ادیب کو حقارت کی نظر سے نہیں دیکھنا چاہئے ورنہ اچھے شاعر و ادیب کبھی پیدا نہ ہوں گے۔"

سردار جعفری نے نئے ادیب و شاعر کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے اس کے "ہیئت" پر قادر نہ ہونے کو معاف کر دیا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ الفاظ شاعر کے مزاج، اس کی تربیت اس کے ماحول اور اس کے مقام کا صحیح پتہ دیتے ہیں، موضوع اور خیالات کی منزل پر پہونچنے کے لئے الفاظ ایک شاہراہ کی طرح ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اس پر راہ میں ہزاروں پیچ و خم اور دشواریاں ہیں۔ کسی بھی ادیب اور شاعر کے لئے اس راہ کو طے کرنا ضروری ہے۔ بعض "قدم اولین" کے بعد ہی گمراہ ہو جاتے ہیں۔ بعض تھوڑی دور چل کر راستے سے پھر آتے ہیں۔ بعض تھک کر بیٹھ جاتے ہیں اور بعض اس ہمت خواں کو طے کر کے اس منزل پر پہونچ جاتے ہیں جہاں خیالات اور موضوعات۔ احساسات اور جذبات زندگی کے دھندلکے میں لپٹے ہوئے ملتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین"

قاضی عبدالغفار کا خیال ذرا مختلف ہے۔ کہتے ہیں:۔ "یہ تصور ہی غلط ہے کہ کوئی شاعر اپنے وقت سے پہلے یا بعد پیدا ہو سکتا ہے۔ حسن کار، ادیب اور شاعر اپنے زمانہ کی اولاد ہوتا ہے۔ اگر وہ اپنے آرٹ میں اپنے وقت کے صحیح نقش و نگار پیش نہ کر سکے تو وہ فن کار یا حسن کار تو ہو سکتا ہے مگر ترجمانِ حقیقت نہیں ہو سکتا۔"

فضا ابن فیضی نہ صرف فنکار اور حسن کار ہے، ترجمانِ حقیقت بھی ہے بلکہ حسن کار کم اور ترجمان حقیقت زیادہ ——— لیکن بندش الفاظ کے کمالات اور شاعرانہ و فنی خوبیوں سے قطع نظر میں فضا کے جذبات سے بحث کرنا چاہتا ہوں کیونکہ اسکی شاعری کی عمر تھوڑی ہے اور اس سے فنی لغزشوں کا سرزد ہونا قرین قیاس بھی ہے ——— فضا ابن فیضی اُردو ادب میں ایک نیا سا نام ضرور ہے۔ لیکن جب ہم اس کے کلام پر نظر کرتے ہیں تو نئی پود کا یہی اُبھرتا ہوا شاعر ایک کہنہ سال ماہر کی طرح زمانہ کی نبضوں کو ٹٹولتا ہوا ملتا ہے۔ آج کل کے نئے شعراء کے لئے پروفیسر شور نے خوب کہا ہے کہ:۔

عشق کے خط و خال مصنوعی ہجر و وصال مصنوعی
حال مصنوعی قال مصنوعی سر سے پا تک جمال مصنوعی
درک اپنا نہ اپنے احساسات
وہی کہنا سُنی سُنائی بات

یا پھر:

حالِ مزدور پر کہیں رونا کہیں ہیوہ کے غم میں جی کھونا
آپ سرمایہ دار سے برہم اور ہمیں کھا گیا کسان کا غم
شاعرِ انقلاب بن بیٹھے
تو فضیلت مآب بن بیٹھے

لیکن فضا نے اپنے لئے ایک نئی راہ متعین کی ہے - اور خالص وطنیت کے جذبہ سے اپنی شاعری کا آغاز کر کے اپنے لئے نئی فکر کی داغ بیل ڈالی ہے - اور سابقہ روایات سے منہ موڑ لیا ہے - بلکہ اپنے جذبات کے اظہار کے لئے "گل و بلبل" کے اشاروں کو بھی نہیں اپنایا اور نہ "مشاہدۂ حق کی گفتگو" کے لئے "بادہ و ساغر" کو استعمال کیا ہے - بلکہ اپنے وطن میں اس نے جو کچھ شدت سے محسوس کیا خواہ وہ سیاسی واقعات ہوں یا مذہبی اسکو نہایت خلوص کے ساتھ شاعری کے قالب میں سمو دیا ہے - اس کی شاعری کا مطالعہ کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ اسے نہ عشق و جمال سے سروکار ہے نہ ہجر و وصال سے نہ وہ مزدور پہ آنسو بہاتا ہے نہ بیوہ اور کسان کا اسے کوئی غم ہے - اسے اپنے وطن کے ہر انسان سے محبت ہے اور وہ اس کے غم کو اپنا غم سمجھتا ہے - نئی پود کے بیشتر شاعروں سے اس کے احساسات جداگانہ ہیں وہ انقلاب چاہتا ہے، لیکن اس کی منزلِ مقصود "اشتراکیت" نہیں ہے بلکہ انسانی اخوت کا وہ عالمگیر دور ہے جہاں ایک انسان دوسرے کا حق غصب نہ کرے اور یہی فضا کی "انفرادیت" ہے - فضا کو اپنے وطن سے لگاؤ ہی نہیں بلکہ عشق ہے اور ایک حساس انسان کا اپنے وطن سے محبت کرنا فطری امر ہے -

"وطنیت" کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ آج کل کے تمام شعراء کے دل میں جاگزیں ہے لیکن جتنی بھی غزلیں یا نظمیں "وطنیت" کے جذبہ کے تحت کہی جاتی ہیں وہ زیادہ تر تقلیدی ہوتی ہیں - اُردو ادب میں وطنی ترانوں اور گیتوں کی کمی نہیں لیکن ان میں وطن کے سرسبز میدانات - سونا اُگلتی ہوئی زمین، آسمان سے باتیں کرتے ہوئے پہاڑ - قابل قدر دریا اور صحت بخش آب و ہوا کے تذکروں اور شاندار ماضی کی داستانوں کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا - "شاعر اپنے دور کا عکاس ہوتا ہے" اگر کوئی شاعر اپنے دور کی عکاسی نہ کر سکے تو یہی معلوم ہوگا کہ اس کے احساسات اس کے اپنے نہیں ہیں بلکہ جھوٹے ہیں - ایک واقعی شاعر کے کلام میں اپنے دور کے تمام خارجی و داخلی اثرات کا موجود ہونا لازمی امر ہے - یہی بات ہمیں فضا کے یہاں ملتی ہے اس نے وطن اور "اہلِ وطن" کو سامنے رکھ کر بہت کچھ کہا ہے - اور وطن سے بہت سی امیدیں وابستہ کئے ہوئے ہے :-

میرے افق پر لرز رہی ہیں بہت سی تعمیر نو کی کرنیں
وطن کے مستقبل حسیں کا ستارہ ہوں جگمگا رہا ہوں

لیکن معاملہ صرف "وطن کے مستقبل حسیں" تک ہے - ورنہ جب وہ اس خوش آیند خواب سے چونک کر اپنے وطن کا جائزہ لیتا ہے تو اس کا دل غم و غصہ سے بھر جاتا ہے لیکن نیاز فتحپوری کے الفاظ میں "سچا شاعر وہی ہے جو مشاہدات کی تلخیوں سے "نوشِ جاں" پیدا کرتا ہے - فضا کو قنوطیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے بلکہ اس کا ایمان "انقلاب در انقلاب" میں ہے - فضا کا نعرۂ انقلاب بھی ملاحظہ فرمائیے جس میں "سرخ سویرے" کی ضرورت کا اعلان نہیں بلکہ موجودہ جمود کو توڑ ڈالنے کا عزم ہے -

جمود کے شعبدوں کو میں اعتبار کی حد پہ لا رہا ہوں
کہ بعد از انقلاب بھی انقلاب کے گیت گا رہا ہوں

وہ دیکھتا ہے کہ اس کا وطن جو ابھی ابھی ایک غیر معمولی اور اہم ترین انقلاب سے گزرا ہے، ایک بار پھر ایسے حالات کا شکار ہو رہا ہے جو ایک نئے انقلاب کا پیش خیمہ ہیں :

ہیں دماغوں میں وہی ناسور شخصیت ابھی
ہیں کچھ انسانوں میں اوصافِ بہیمیت ابھی
سب بدل جانے پہ بھی بدلی نہیں نیت ابھی
جانئے جمہوریت کی ذمہ داری کا بھی ہوش
لیکن اس خوئے تغافل پر کسے الزام دوں ؟

فضا کے حساس دل و دماغ میں اس بات کا علم ہے کہ اس کا وطن ایک عظیم ملک ہے جہاں مختلف فرقے بستے ہیں جن کے مذہبی عقاید

الگ الگ ہیں اور جن کا کلچر بھی ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اس کو محبت اپنے وطن اور وطن کے ہر انسان سے ہے۔ لیکن وہ دیکھ رہا ہے کہ ملک کو غلامی سے تو نجات مل چکی ہے مگر چند لعنتیں اس ملک میں رواج پاتی جا رہی ہیں اور اگر ان کا سدباب نہ ہوا تو اس کا وطن ترقی نہ کر سکے گا۔ اس لئے وہ انقلاب ہی کی دعوت نہیں بلکہ بغاوت کی بھی ترغیب دیتا ہے کہ اس کا ملک ان قابلِ نفرت ذلتوں سے چھٹکارا پا جائے اور "انسان دوستی" کا تقاضا بھی یہی ہے۔

ڈاکٹر سلامت اللہ کے ان الفاظ کو دیکھئے "ہندوستان کے ادب میں "ہندوستان دوستی" کی روایات بہت پرانی ہیں۔ یہاں کلاسیکی ادب میں اور جدید ادب میں بھی انسان دوستی کے بہت اچھے نمونے ملتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ نہیں سمجھنا چاہئے کہ انسان دوستی کا مفہوم ہمیشہ یکساں رہا ہے۔ ہر دور کے سماجی حالات کے مطابق ادب میں انسان دوستی کا مفہوم بدلتا رہتا ہے۔ مثال کے طور پر اگر رامائن اور مہابھارت میں اس کا اظہار کسی راجہ کی انصاف پروری، خدا ترسی اور فیاضی کے ذریعہ ہوتا ہے تو موجودہ زمانہ میں یہ چیز ہمیں پریم چند جیسے ادیبوں کی کہانیوں میں ملتی ہے۔ جہاں وہ زمیندار اور سرمایہ دار طبقہ کے مظالم کی تصویر کھینچتے ہیں۔ اور یہ دکھاتے ہیں کہ کسان اور مزدور کس طرح دکھ بھری زندگی گذار رہے ہیں۔ یا ایک قدم اور آگے بڑھئے تو انسان دوستی کے رنگ روپ میں کچھ اور ہی نکھار آجاتا ہے اور کرشن چندر جیسے مصنفین کے یہاں انسانیت اپنی پوری توانائی کے ساتھ ظلم اور تشدد کے خلاف برسرِ پیکار نظر آتی ہے۔" فضا کی شاعری میں بھی یہ عنصر موجود ہے۔ انسان دوستی کے لئے وہ جن موضوعات سے جنگ کرتا ہوا ملتا ہے ان کا مختصر سا جائزہ ضروری ہے۔

اس میں شک نہیں کہ "فرقہ پرستی" سیاسی اُلجھاؤ کی پیداوار ہے اور سیاست میں مذہب کے نام پر یہ زہر انسانی ذہنوں میں جگہ پا گیا اور وطن کا وہ عظیم ترین "المیہ" ظہور میں آیا جو کتنی ہی بربادیوں اور تباہکاریوں کا باعث ہوا۔ فرقہ پرستی کی بنا پر وطن کے ٹکڑے کر ڈالے گئے۔ لیکن تقسیم سے پہلے اور بعد میں بربریت کے جو ننگے ناچ ہوئے ان کا تصور کر کے ہی ایک حساس انسان کو تلخی اور نفرت کا شدید احساس ہوتا ہے۔ فرقہ پرستی نے حیوانیت کا روپ دھار کر اس قدر جانی، مالی اور اخلاقی تباہکاریاں مچائی ہیں کہ اس دور کا کوئی انسان مشکل سے بھی اس تلخ ترین حقیقت کو فراموش نہ کر سکے گا۔ بلکہ حسن عسکری کے الفاظ میں "ہر عظیم ہندوستان کے فسادات ایک پیچیدہ چیز ہیں اور صدیوں کی تاریخ اور صدیوں آگے کے مستقبل سے بُری طرح اُلجھے ہوئے ہیں" اور "آتش و خون" کے اس دور نے فضا کے وطن کو کیا عطا کیا ہے اسی کی زبانی سنئے:۔

جمود زارِ حیاتِ انساں، خموشیِ وویرانی جلوہ گاہیں
بھٹکتی آہیں تڑپتے نالے، جھلستی سڑکیں دہکتی راہیں
رگوں میں ڈوبے ہوئے سے نشتر جگر میں چبھتی ہوئی سی آہیں
جبیں کی ہر ایک شکن پہ قایم رُکے ہوئے ولولے خونوں کے
بسے ہوئے تیوروں کے پل میں وہی مقاماتِ کشمکشوں کے
یہ زندگی کا کفن ہے شاید
یہی ہمارا وطن ہے شاید

لیکن آج بھی اس زہر کو انسانی ذہن سے نوچ کر الگ نہیں کیا جا سکا ہے۔ اور وطن کے واقعات اور انسانی کردار میں اس خونچکاں واقعہ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ گو اس دور کو گزرے ہوئے ایک زمانہ نہیں لیکن بہت دن ضرور ہو چکے ہیں۔ انسانی خوئے اخوت کا تقاضا یہی ہے کہ اس المناک واقعہ کو بھلا کر مختلف فرقے شانہ بشانہ ملک کی خوشحالی کے لئے کوشاں ہوں لیکن آج بھی وہی "رقصِ ابلیس" اپنے پورے شباب پر ہے اور آج بھی فرقہ پرستی اپنی گھڑی ہوئی شکل میں نہیں بلکہ اپنے صحیح خط و خال کے ساتھ جلوہ گر ہے اور یہ "جلوہ نمائی" ہی فضا کو خونزدہ کئے ہوئے ہے کیونکہ فرقہ پرستی کی لعنت وطن کو ترقی کی راہوں سے موڑ کر خانہ جنگی کی حدوں پر لا سکتی ہے۔

کچھ طبیعت میں ہیں خوئیں حوصلے باقی ابھی
نامرادی ناملائم ..... ولولے باقی ابھی
ورنہ کیوں دست و گریباں ہیں بہم ابنائے قوم
لیکن اب اس خانہ جنگی پر کسے الزام دوں؟

شخصیت آہنگ ہے آئینِ جمہوری ابھی
عین مرکز پر بھی مرکز سے ہے دوری ابھی
ہیں مرادف لفظ "آزادی و مجبوری" ابھی
ملک میں فرقہ پرستی کے عناصر ہیں ابھی
لیکن اس فرقہ پرستی پر کسے الزام دوں؟

اسی طرح فضا جابجا فرقہ پرستی کے خلاف نعرے لگاتا ہوا ملتا ہے۔

تعصب بھی انسانی عظمت کے ماتھے پر کبھی نہ مٹنے والا سیاہ ترین داغ ہے وہ قومیں ترقی نہیں کر سکتیں جہاں تعصب اور جہل اپنی جڑوں کو مضبوطی سے پھیلا چکے ہیں۔ تعصب اور جہل وطن کی خوشحالی کی راہوں کو محدود ہی نہیں کر دیتے بلکہ وطن کی ترقی و عروج کے بھی سخت دشمن ہیں۔ اور جب تعصب کا زہر تجارت۔ مذہب اور سیاست وغیرہ تمام شعبوں میں جاری و ساری رہتا ہے تو ملک ایک عجیب سی کشمکش کی زد میں آجاتا ہے لیکن کیا کیا جائے کہ:۔

اب بھی جلتے ہیں ضمیروں میں تعصب کے چراغ
اب بھی جہل و ابلہی کے ثبت ہیں چہروں پہ داغ
بادۂ جمہوریت سے اب بھی خالی ہیں ایاغ
پیچھے پھرتے ہیں فریبِ وطن اپنا ضمیر
لیکن اس قومی تجارت پر کسے الزام دوں

آج بھی ہے اشتراکِ درد کا ہر لب خموش
اب بھی سینوں میں نہیں حفظِ اخلاقیت کا جوش
آج بھی موجود ہیں اقوام میں ایماں فروش
آڑ میں ٹٹی کے کھیلا جا رہا ہے یہ شکار
لیکن اس "کہر سیاست" پر کسے الزام دوں

آج جبکہ فرقہ پرستی اور تعصب کی لعنتیں غرور جمہوریت سے انتقام لے رہی ہیں ان لعنتوں کو دور کرنے کی شدید ضرورت ہے اور فضا کے جذبۂ وطنیت کا ان لعنتوں کے خلاف اعلانِ جنگ قابلِ عزت ہے۔

اولین شئے جو ملک کی ترقی و خوشحالی میں معاون و معاون ہے "اقتصادی خوشحالی" ہے، جب ملک مالی حیثیت سے مضبوط ہوتا ہے خود بخود ترقی کی شاہراہوں پر گامزن ہو جاتا ہے، لیکن چونکہ ہم ابھی ابھی تقریباً ڈیڑھ سو سالہ غلامی سے آزاد ہوئے ہیں اس لئے ہم اقتصادی خوشحالی سے محروم ہیں جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ہزاروں انسان "آہ و ہو" کی زندگی کاٹ رہے ہیں۔ اقتصادی گراوٹ ایک دردناک واقعہ ہے انسان اپنا ضمیر ہی نہیں ایمان تک بیچ دیتا ہے اور کتے کی سی زندگی کاٹنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے۔ عصمت فروشی کی لعنت عام ہو جاتی ہے اور گلی گلی "رخسار و دہن" بکنے لگتے ہیں۔ مہلک بیماریاں جنم لیتی ہیں اور زندگی میں بے چینیاں اور کراہیں بھر جاتی ہیں۔

دورِ جدید کی شاعری اس گراوٹ اور سرمایہ پرستی کے خلاف برسرِ پیکار ہے لیکن عہدِ نو کی شاعری کا محرک "سیاسی جذبہ" ہے جو اقتصادی گراوٹ کو سامراجی نظامِ حکومت کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ وطنیت کے جذبہ میں اتنی وسعت، اتنی گہرائی اور اتنا پھیلاؤ ہے کہ تمام سیاسی، مذہبی اور اخلاقی جذبات کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے اور یہاں فضا کا نام دیگر ترقی پسند شعراء کے ساتھ لیا جا سکتا ہے کیونکہ فضا ان انسانوں کو بھی "انقلاب" کے لئے اُکساتا ہے جو اس گراوٹ کا شکار ہیں۔ اس کا وطن ایسے انسانوں سے بھرا پڑا ہے:-

نظر پریشاں اُداس چہرے — پھٹے ہوئے چیتھڑے بدن پر
جبیں کے ہر موڑ پر تباہی — قدم قدم ایک تازہ ٹھوکر
جھکے سے تیور زبان سوکھی — کمر پہ ہاتھ اور شکم پہ پتھر
ہے بات کرنا بھی جس کو مشکل — ہے سانس لینا بھی جس کو دوبھر

نہ جانے کس طرح جی رہے ہیں تڑپ تڑپ کر یہ جینے والے
خود اپنی سوکھی ہوئی رگوں کا لہو زمانے میں پینے والے

ایک اقتصادی چبھن ہے شاید
یہی ہمارا وطن ہے شاید

وطن پرستی اور انسان دوستی کے جذبات اس بات کے مقتضی ہیں کہ وطن میں ان لعنتوں کو اپنے لئے جگہ نہ پیدا کرنے دی جائے ورنہ ملک خوشحال نہ بن سکے گا۔ ع

رہیں یونہی محوِ خواب ہم تو سکوں میسر نہ آسکے گا
کہ اور ملکوں کے "ہند اپنا" کبھی برابر نہ ہو سکے گا

کیونکہ انھیں قابلِ نفرت جنمیلوں میں اُلجھ کر ملک اپنا قومی مفاد کھو رہا ہے طبیعتیں اُچاٹ ہوتی جا رہی ہیں۔

افادیت کی حدوں سے باہر — جہالتِ علم و فن کا پیکر
طبیعتوں سے کھو چکا ہے — نفاستوں کا لطیف جوہر
جو توڑ دیتا ہے زندگی کی — حقیقتوں کا بلور ساغر

طلسم سا بن رہا ہے کوئی فضا پہ اک گرد چھا رہی ہے
نئی اُمنگیں کہاں ہوں پیدا شباب کو نیند آ رہی ہے

فضا کو اپنے وطن کے لئے کس قدر "تشویش" ہے نمایاں اس کا اندازہ ہو چکا ہوگا۔ وطنیت کا یہ "خاص جذبہ" بہت کم شاعروں کے یہاں کارفرما ہے۔ فضا کو چونکہ اپنے وطن سے بے پناہ محبت ہے وہ ان زہریلے عناصر کو مزید پھیلنے پھولنے کا موقع نہیں دے سکتا جو "امن" اور "غیر جہوری" میں وطن کی خوشحالی کا راز اسی میں ہے کہ انسانیت پسندی اپنی پوری قوت و توانائی کے ساتھ ظلم و تشدد کے خلاف "میدانِ جنگ" میں آجائے فضا "اجتماعی جدوجہد" پر ایمان رکھتا ہے اور چاہتا ہے کہ علمِ بغاوت بلند کر کے اپنے وطن کی سلامتی اور خوشحالی کے لئے وطن کے "بیوت" "امن دشمن" عناصر اور مکر سیاست" کے قلعوں پر حملہ بول دیں۔

بغیر سچ کے مفر نہیں ہے — جو سچ کہے تو زباں کٹے اب
وطن کی افسردہ محفلوں میں — کنول تمدن کے جل چکے اب
بہ عافیت طے نہ ہو سکیں گے — سیاستوں کے جو مرحلے اب

شفق کے ماتھے سے خون ٹپکا نیا عذاب آ رہا ہے کوئی
بہت خطرناک دور انگیز انقلاب آ رہا ہے کوئی

اور وہ اس انقلاب کے نتیجہ سے پوری طرح مطمئن بھی ہے۔ ان ظلمتوں سے جنگ کر کے اسے کیا حاصل ہونے والا ہے اس کی بھی پیشین گوئی کرتا ہے:

ہر ایک ذرہ سے خاک کے جگمگاتے سورج ابھر سکیں گے
میں عصر حاضر کی ظلمتوں میں کچھ ایسے جلوے دکھا رہا ہوں

یہی نہیں بلکہ وہ اپنے وطن کے ہر نوجوان کو "انقلاب نو" کے لئے آمادہ کرنا چاہتا ہے۔ اب ہم آزاد ہو چکے ہیں ہم نے ننگ غلامی کی زنجیروں کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا ہے ایک بار پھر ہمیں اسی ہمت اور جرأت کا مظاہرہ کرنا ہے:

نیا کوئی گیت شجاعت کی خموشیوں میں بکھیرتا اٹھ
اٹھ اس طرح انقلاب در بر رخ زمانہ کا موڑتا اٹھ
وہ شعبدے ہو چکے ہیں باطل جنون ہوشیار ہو چکا ہے
جہاں کا نقشہ بدل چکا ہے زمانہ بیدار ہو چکا ہے

اور وطن کی اسی آزاد سرزمین پر اس کے عزم اور بلند حوصلے پروان چڑھتے جا رہے ہیں وہ اس دور نارواں میں جہاں ظالموں کے لئے آگ برسانا چاہتا ہے وہیں مظلوموں کے لئے رحمت بن جانے کا بھی اشتیاق رکھتا ہے۔ وہ اپنے وطن کو خوش سے خوشتر دیکھنا چاہتا ہے ذرا اس کے عزائم ملاحظہ فرمائیے:

یہ وسعتیں کچھ نہیں ہیں کوہ آزما حوصلوں کے آگے،
میں دھوپ بنکر جو پھیلتا ہوں غبار بنکر بھی چھا رہا ہوں
بلند آہنگ ہمتیں ہوں تو حادثات زمانہ کیا ہیں
لرز رہے ہیں جہاں پہ شعلے وہیں کھڑا مسکرا رہا ہوں
فضا میں اک شمع انقلاب وطن کبھی جل اٹھی تھی جس سے
میں اپنے شعلوں کے سانپ پروہ رجز ابھی گنگنا رہا ہوں
غضب غضب زندگی کی راہوں میں اس طرح تم بھٹک رہے ہو
میں موت کی وادیوں میں بھی زندگی کو رستہ بتا رہا ہوں

اس مختصر سے جائزہ میں معلوم ہو جاتا ہے کہ "وطنی ترانے" لکھنے والوں کے جذبۂ وطنیت میں اور فضا کی وطنیت میں کتنا فرق ہے۔ میرا یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے شاعروں کے یہاں جذبۂ وطنیت بالکل مفقود ہے اور نہ مجھے ان کے اس جذبہ کے خلوص پہ شبہ ہے۔ فضا کے یہاں جو جذبہ کارفرما ہے وہ منفرد ہے وہ "وطن پرست" شاعر ہے اس کے احساسات زندہ ہیں۔ اور وطن کی صورت حال کا صحیح جائزہ لے کر اس کے متعلق اپنے جذبات کا بے باکانہ اظہار کرتا ہے۔ وطن کے لئے تعمیری جذبہ ایک مبارک جذبہ ہے اور وطن کی تخریب پسند سرگرمیوں کو ختم کرنے کا عزم قابل احترام ہے اور یہی وجہ ہے کہ فضا کی شاعری میں وطنیت کا جو "شعلۂ جوالہ" ہے وہ دیگر نوجوان وطن پرست شعراء کے لئے "مشعل راہ" کی حیثیت رکھتا ہے ع

میرے افق پہ لرز رہی ہیں بہت سی تعمیر نو کی کرنیں
وطن کے مستقبل حسیں کا ستارہ ہوں جگمگا رہا ہوں

نور مظفر

یادِ رفتگاں

اختر شیرانی اور سلمائے گجرات

(۱۹۲۸ء کا ایک صحیفۂ محبت)

اختر شیرانی

سلمائے گجرات سے

"دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو"

تمھیں ستاروں نے اختیار دیکھا ہے! شریر چاند نے بھی بار بار دیکھا ہے!
کبھی، چمن میں گئی ہو تو مست پھولوں نے نگاہِ شوق سے آئینہ وار دیکھا ہے!
روپہلی چاندنی نے رات کو کھلی چھت پر ادا سے سوتے ہوئے بار بار دیکھا ہے!
بہار صبح کی رنگینیوں میں کھوئے ہوئے! نسیم نے تمھیں، مستانہ وار دیکھا ہے!
سنہری دھوپ کی کرنوں نے بام پر تم کو بکھیرے گیسوئے مشکیں بہار دیکھا ہے!
قریبِ شام، تمھیں طائرانِ گلشن نے ہزار بار، سرِ لالہ زار دیکھا ہے!!
بہشتِ حسن کی ننھی کلی کے دھوکے میں! سحر نے بھی تمھیں دیوانہ وار دیکھا ہے!
سنہرے پانی میں، چاندی سے پاؤں لٹکائے شفق نے تم کو سرِ جوئبار دیکھا ہے!
ہمیشہ رات کو، محوِ مطالعہ تم کو! نگاہِ شمع نے پروانہ وار دیکھا ہے!
کبھی جو اٹھی ہو گیسو سنوارنے کے لئے تو آئینے نے تمھیں ہمکنار دیکھا ہے!
گھٹا نے دامنِ کہسار میں تمھیں اکثر اسیرِ زمزمۂ آبشار، دیکھا ہے!
عروسِ برق نے اپنا نقاب اُلٹ کے تمھیں غرقِ مستیِ ابرِ بہار، دیکھا ہے!
کسی خیال میں کھوئے تمھیں اکثر، نگاہِ گل نے تہ شاخسار، دیکھا ہے!
نسیمِ باغ نے زیب النسا سمجھ کے کبھی تمھیں بہ گلکدۂ شالامار دیکھا ہے!
غرض۔ مظاہرِ فطرت نے ہر طرح تم کو! ہزار بار، نہیں! لاکھ بار دیکھا ہے!
مگر، مری نگہِ شوق کو شکایت ہے! کہ اُس نے تم کو فقط ایک بار دیکھا ہے!!!

دکھا دو! ایک جھلک، اور ــــ بس نگاہوں کو!!!
"دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس" نگاہوں کو!!!

سلمائے گجرات

"اختر شیرانی سے"

کوئی کیوں دیکھے ؟

کسی کی عرض ہوس آشکار کیوں دیکھے ؟ غریب، بھول کے کوئی "نگار" کیوں دیکھے ؟
دوبارہ دیکھنے کی ہے ہوس نگاہوں کو، کوئی یہ سرخیِ افسانہ کار کیوں دیکھے ؟
ہمیں ستاروں نے دیکھا، یونہی سہی لیکن کوئی نگاہِ ہوس آشکار کیوں دیکھے ؟
ہمارا آئینہ کیوں ، ہم سے ہمکنار نہ ہو؟ خدا نہ کردہ، تمھیں ہمکنار، کیوں دیکھے ؟
ہیں پردہ دارِ سرا پردہ ہائے عفت ہم! شفق بھی ہم کو سرِ جوئبار کیوں دیکھے ؟
چلو، وہ چاند نے دیکھا ہے یا نہیں دیکھا ؟ کسی کا دیدۂ گستاخ وار کیوں دیکھے ؟
کبھی نہ جائیں گے اب سے چمن میں بھول کے ہم نگاہِ گل ، ہمیں آئینہ وار کیوں دیکھے ؟
روپہلی چاندنی اور اُس کی اس قدر جرأت ؟ وہ ہم کو سوتے ہوئے بار بار کیوں دیکھے ؟
حیا سے دیکھتے ہی پانی پانی ہو جائیں ہمیں گھٹا بھی سرِ آبشار کیوں دیکھے ؟
عروسِ برق ہے ہمجنس ، پر نہیں منظور وہ غرقِ مستیِ ابرِ بہار کیوں دیکھے ؟
قسم ہے آج سے گر بام پر چڑھیں ، سورج ہمارے گیسوئے مشکیں بہار کیوں دیکھے ؟
نہیں ، کہ غیر ہے لیکن ہمارے جلووں کو نگاہِ گل بھی تہ شاخسار کیوں دیکھے ؟
بُری نظر سے جو دیکھے تو آنکھیں ہی پھوٹیں؟ بھلا کوئی ہمیں مشتاق وار کیوں دیکھے ؟
یہ جُرم کم ہے کہ "اِک بار" ہم کو دیکھ لیا! کوئی "شریر" ہمیں "بار بار" کیوں دیکھے ؟

لٹاؤ یوں نہ کہیں بے سبب نگاہوں کو!
قلم کو ضبط سکھاؤ! ادب نگاہوں کو!

شفا گوالیاری

اس دوران میں دو بار بھوپال جانا ہوا اور منجملہ اور بہت سی ترقیوں کے (جن کا ذکر آیندہ کسی وقت تفصیل کے ساتھ کروں گا) وہاں کے نوجوانوں میں ذہنی و ادبی ترقی کے بھی آثار میں نے پائے۔ چونکہ بھوپال سے مجھے بہت گہرا تعلق ہے، اس لئے قدرتاً میرا جی چاہا کہ یہاں کے نوجوانوں میں علم و ادب کی خدمت کی جو اُمنگ پیدا ہوئی ہے اس کو اُبھارا جائے اور یہاں کے شاعروں اور ادیبوں کو جو اپنے اندر ترقی کی اہلیت رکھتے ہیں، ملک سے روشناس کرایا جائے۔ اس وقت میرے عہد کے تین مشہور ادیب و شاعر یہاں موجود ہیں، حضرت محوی لکھنوی۔ جناب کوثر چاندپوری۔ حضرت حامد بھوپالی اور میں چاہتا تھا کہ وہی اس خدمت کو انجام دیں۔ خوشی کی بات ہے کہ جناب کوثر چاندپوری نے بھوپال کے ایک نوجوان شاعر شفا گوالیاری کا تعارف کرکے اس کی ابتدا کی ہے۔ امید ہے کہ مولانا محوی اور جناب حامد بھی اپنے وطن کے نوجوان ادیبوں کو سامنے لانے کی سعی فرمائیں گے۔

نیاز

غزل شاعری کی ایک ایسی مقبول اور روح میں تیر جانے والی صنف ہے جو شدید مخالفتوں کے باوجود زندہ ہے اور غالباً ہمیشہ زندہ رہیگی اس کی پائدار زندگی کا سبب صرف یہی نہیں ہے کہ اس میں عشق و محبت کے اُن جذبات کی ترجمانی ہوتی ہے جو انسان کی فطرت بن چکے ہیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ زندگی کے تمام مسایل پر چھا جانے کی صلاحیت بھی اس میں پائی جاتی ہے۔

حیاتِ انسانی میں بڑا تنوع ہے، وہ ایک سمندر کی حیثیت رکھتی ہے جس میں ہر لمحہ نئی نئی لہریں اُٹھتی ہیں، جس کی سطح پر ان گنت حباب مچلتے ہیں اور نہ جانے کتنے موتی جنم لیتے رہتے ہیں، اس میں ڈبو دینے کی قوت بھی ہے اور اُبھار دینے کی صلاحیت بھی، اس میں موت کے بھنور بھی ناچتے ہیں اور زندگی کے مدوجزر بھی پیدا ہوتے ہیں، اور غزل زندگی کی انھیں بے شمار کیفیات کے اظہار کا ذریعہ ہے، جس میں سماجی و معاشی احساس کی دھڑکنیں بھی ہوتی ہیں، خوشی کے قہقہے بھی اور غم کے آنسو بھی، یہاں تک کہ تاریخ، تصوف، فلسفہ اور اخلاق کی گنجائش بھی اس میں نکل آتی ہے۔

شفا گوالیاری کو میں اس دور کے ایسے ہی غزل گو شاعروں میں شمار کرتا ہوں جو غزل کے مزاج میں ان تمام عناصر کو توازن و تناسب کے ساتھ شامل رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، اگرچہ شفا کا علمی پس منظر زیادہ وسیع نہیں ہے، اُن کے مطالعہ میں بھی زیادہ گہرائی نہیں ہے اُنکی غزلوں کے بعض اشعار سے پتہ چلتا ہے لیکن انکا شعور، زندگی کی کھلی ہوئی فضاؤں میں پھیل جانے کی تڑپ اپنے اندر ضرور رکھتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ اس میں وہ طاقتِ پرواز نہ ہو جو پوری کامیابی کے ساتھ ان پہنائیوں کو ناپ سکے۔

شفا فطری طور پر وہ صلاحیتیں رکھتے ہیں جو ایک غزل گو شاعر میں ہونی چاہئیں۔ ان میں ایک نوع کی گھبراہٹ سی پائی جاتی ہے جو ان کی ہراداسے نمایاں ہے اور غالباً نتیجہ ہے شدتِ احساس اور فطری علم پذیری کا۔

شفا کے لہجے اور پڑھنے کے انداز سے پتہ چلتا ہے کہ اگر انھیں دورِ حاضر کے سماجی اور معاشی مسایل کی تلخی سہارا نہ دیتی تو وہ صرف مرثیے کہتے، اور اس طرح اپنے فطری سوز کی چنگاریوں کو اپنے ہی آنسوؤں سے بجھا لیتے، شفا عرصہ تک پرانے ڈگر پر چلتے رہے ہیں، اُس وقت کے کلام

میں تصوف کے روایتی مسایل ہیں اسی قسم کی اصطلاحات کا التزام ہے، تجنیس لفظی ہے اور الفاظ کے مناسب الفاظ لانے کی ایک مسلسل کوشش۔ لیکن آگے چل کر ان کا رنگ بدلا وقت کے تقاضے ان کے کانوں میں گونجے اور زندگی کی ضروریات پر نگاہیں پڑیں اور ان کا شاعرانہ رجحان بھی بدلا۔ اگرچہ حسن و عشق غزل کا بنیادی موضوع ہے لیکن جو لوگ اس مادی دنیا میں جی رہے ہیں جہاں قدم قدم پر مصیبتیں ہیں اور ان کے ساتھ افلاس و غربت کی وہ مشکلات ہیں جو اعصاب سے عشق و محبت کی ساری رنگینیاں نچوڑ لیتی ہیں اور رگوں میں دوڑتے ہوئے ولولوں کو منجمد کر دیتی ہیں، اسی لئے وہ جانتے ہیں کہ غم حیات بہت بڑی چیز ہے۔ اس کا شعور بڑی بڑی شاہراہوں پر دوڑنے کا عزم پیدا کر دیتا ہے۔ اس خیال کو وہ اس طرح ظاہر کرتے ہیں:۔

انھیں کو زندہ کہلانے کا حق ہوتا ہے دنیا میں ۔۔۔ جو مرنے پر بھی اپنی زندگی کی بات رکھتے ہیں

انسان زندگی کا مظہر اتم ہے وہ ایک ایسا جوہر ہے جو اپنی ذاتی کوششوں کے سہارے ہی قایم ہے، وہ تیرگی میں روشنی بن کر چمکتا ہے اور جب کائنات پر اندھیروں کی چادریں تن جاتی ہیں تو وہی انھیں چاک کر کے سورج کی روشنی لاتا ہے لیکن جب اس کے دل سے اس عظمت کا احساس فنا ہو جاتا ہے، خودی کی چنگاری بجھ جاتی ہے تو اس کی ساری عظمتیں سرنگوں ہو جاتی ہیں اور اس وقت شاعر احساس کو جھنجھوڑ کر اس میں خودی کا شعلہ فروزاں کر دیتا ہے، شفا ایک، ایسے ہی نازک مقام پر لطیف طنزیہ انداز میں اس سے سوال کرتے ہیں ؎

کیا ہوئی تیری نگاہِ مہر ساز ۔۔۔ کیوں افق سے مانگتا ہے تو سحر

انسان اپنی عظیم صلاحیتوں سے واقف نہیں ہوتا تو روشنی کی کرنیں اپنے وجود کے باہر ڈھونڈنے لگتا ہے اور زندگی کے تاریک راستوں میں اُجالا پھیلانے کے لئے چاند سورج سے تنویریں مانگنے لگتا ہے۔ شفا اس التجا کو توہین انسانیت سمجھتے ہیں وہ انسان کے اندر ایسی مستقل روشنی دیکھتے ہیں جو ہر اندھیرے کو روشن کر سکتی ہے ؎

چاند سورج کا نہ انسان محتاجی بن کر رہے ۔۔۔ اپنی راہوں میں خود اپنی روشنی بن کر رہے

جو لوگ اپنی عظمت کو نہیں سمجھتے ان کی دنیا میں صبح کی تخلیق چاند سورج پر ہی منحصر ہوتی ہے ان کی ذاتی کوششوں کو اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ ؎

آج تک ہم نے فروغِ دل پہ نظریں ہی نہ کیں ۔۔۔ مہر و مہ پر منحصر اپنی سحر سمجھا کئے

فراق گورکھپوری کہتے ہیں کہ ادب اُسی وقت زندہ رہ سکتا ہے اور ترقی کر سکتا ہے جب وہ جمہور کی ترقی میں مددگار ہو۔ ایمرسن کہتا ہے کہ ہر دور کو اپنا قومی ادب ( ) پیدا کرنا چاہئے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ادبی فن پارے عصری رجحانات کا ہونا ضروری ہے اور شاعر اور ادیب کا سب سے بڑا ترقی پسندانہ اقدام یہی ہے کہ وہ اس راز کو سمجھے اور وقت کے تقاضوں سے چشم پوشی نہ کرے۔

شفا اس بات کو جانتے ہیں اور غم دوراں کو خوشی کا ایک پیام سمجھتے ہیں ؎

اے غمِ عالم تری اس دلنوازی کے نثار ۔۔۔ تیرے نزدیک آ کے جیسے ہر خوشی تک آ گئے

زندگی میں ہر لمحہ مسابقت جاری رہتی ہے اور جب اس میں کوئی ہار جاتا ہے تو اس کا ولولۂ عمل ٹھنڈا نہیں ہوتا بلکہ اور بھڑک اُٹھتا ہے۔ حوصلہ مند کبھی شکستوں سے ڈرا نہیں کرتے۔ ہار کا خطرہ انھیں کو ہوتا ہے جن کے دلوں میں زندگی، عزم اور حوصلہ کی آگ بجھ چکی ہے زندہ اور عملی آدمی کے حوصلے شکست کی چوٹ کھا کر ہی بڑھتے ہیں ہار سے ڈرنے والے فتح کی مسرت سے محروم رہ جاتے ہیں ؎

جہاں زندگی کو شکستوں کا ڈر ہے ۔۔۔ وہیں زندگی کو سہارے ملیں گے

اس شعر میں زندگی کی ٹکرا سے کافی لطف پیدا ہو گیا ہے اور یقین کی قوت بڑھ گئی ہے۔

شفا کا تغزل کافی نکھرا ستھرا اور پاکیزہ ہے، وہ حسن و عشق کی بات کرتے وقت بہکتے نہیں اور ان حدود میں داخل نہیں ہوتے جو متانت اور سنجیدگی کو پیچھے چھوڑ جاتی ہیں۔ صوفیانہ اور عامیانہ انداز بیان سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔ رندی اور سرمستی کے جذبات سے

بھی گریز کی کوشش کرتے ہیں۔ تغزل اُن کے یہاں ہے ضرور مگر اس حد تک نہیں ہے کہ زندگی کے دوسرے مسایل کا احساس باقی نہ رہے وہ غزل میں مٹھاس اور ترنم پیدا کرنے کے لئے ہی عام طور پر اس کا استعمال کرتے ہیں۔ اس قسم کے چند اشعار دیکھئے ؎

شبِ فراق کچھ ایسے بھی حادثے گزرے ۔ چراغ جلتے رہے اور روشنی نہ رہی
مرے ذوقِ تجسّس کی وہ منزل کونسی ہوگی ۔ نظر جب اُن کو پاکر بھی انھیں کو ڈھونڈھتی ہوگی
خرد کی راہ سے دیوانگی تک بات کیوں پہونچے ۔ شعورِ غم کی آشفتہ سری تک بات کیوں پہونچے
کدھر ہے غیرتِ غم کچھ مجھے سہارا دے ۔ وہ مجھ سے پوچھ رہے ہیں "تری خوشی کیا ہے"
حقیقت کو زیادہ جاننے سے ۔ حقیقت بھی نہ بن جائے فسانہ
اب اور کون سے گُل رہ گئے ہیں کھلنے کو ۔ الٰہی خیر ہو کیوں مسکرائے دیوانے
خودیٔ حسن تھی یا بیخودیٔ عشق تھی یہ ۔ کہ عمر بھر وہ ہمیں ۔ ہم اُنھیں نہ پہچانے
ہوا چمن میں پھر اعلانِ آشیاں بندی ۔ ابھی کی بات ہے اک امتحاں سے گزرے ہیں
کچھ اس ترکیب سے اب آشیاں برباد ہوتے ہیں ۔ کہ بربادی کا خود اپنے ہی سر الزام آتا ہے
شگفتِ[1] گل کا کچھ شبنم پہ بھی الزام آتا ہے ۔ کہاں کی یاد کس کا ذکر ان کی بزم رنگیں میں
اب تک نگاہ میں ہے کپکپی نگاہ اُن کی ۔ ہنستی رہی محبت لٹتا رہا زمانہ
کوئی غم ہو شفا فطرت کا اک انعام ہوتا ہے ۔ کہ اس سے زندگی کے سارے امکاں جاگ اُٹھتے ہیں
چھپائی حسن سے بھی عشق کی آشفتگی میں نے ۔ نظر جب اُن کی اُٹھی تو نظر خود پھیر لی میں نے
اُس کو ہی مسکرانے کا حق ہے حقیقتاً ۔ آنکھوں میں جس کی اشک ہوں اور مسکرا سکے
جو کر دیتی ہے ساری عمر کی تاریخ کو روشن ۔ حیاتِ مختصر میں اک گھڑی ایسی بھی ہوتی ہے
مسلّم دوقِ آزادی بھی، آدابِ اسیری بھی ۔ قفس تک اڑ کے خاکِ آشیاں آئی تو کیا ہوگا

کوثر چاندپوری

[1] شگفت: معنی شگفتگی جمع نہیں، شگفت عجب کی جگہ استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ بھی غلط العوام کی جگہ ہے۔ (ایڈیٹر)

نگار کی ایجنسی حاصل کرنے کے قواعد

۱ - نگار کے معمولی پرچوں کی قیمت ۱۰ رفی پرچہ ہے - ایجنٹوں سے ۱۲ رفی جاتے ہیں، لیکن مصارف رجسٹری بھی انھیں کے ذمے ہوتے ہیں۔

۲ - پانچ پرچوں سے کم کے لئے ایجنسی قایم نہیں کی جاتی۔ اور ایجنٹوں کو ۵ پرچے ذریعہ وی پی پی روانہ کئے جاتے ہیں - غیر فروخت شدہ پرچے واپس نہیں لئے جاتے۔

۳ - سالناموں کی قیمت ہر سال مختلف ہوتی ہے۔ جس میں ایجنٹوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن دیا جاتا ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

فنِ تحریر کی تاریخ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

البانوی رسمِ خط (ALBANIAN.ALPHABET)

۱۹۰۸ء میں البانیہ میں سرکاری طور پر لاطینی خط بعض تبدیلیوں کے بعد اختیار کر لیا گیا۔ اس سے پہلے قدرے ترمیم شدہ یونانی خط مستعمل تھا جس کی تین قسمیں تھیں:-

(۱) ایلباسن خط (ELBASAN) جس میں ۵۳ حروف کام آتے تھے یہ ایلباسن (جنوبی البانیہ) اور اُس کے جنوب یعنی بیرات میں مروج تھا۔

(۲) بُوتھا کوکائی خط (BUHTHAKUKYE) جسے اِسی نام کے شخص نے گزشتہ صدی کے وسط میں ایجاد کیا تھا۔

(۳) آرگی روکاسٹرن خط (ARGYROKASTRON) جو اسی نام کے مقام پر جنوبی البانیہ میں مروج تھا۔ اس میں ۲۲ حروف کام آتے تھے۔ البانیہ کے ایک امیرزادہ مسمّی ویسوبے (VESO.BEY) نے جو علیست پاشا (ALISOT.PASHA) کے خاندان سے تھا اس خط کے وجود سے آسٹریا کے قونصل فان ہان (VON.HAHN) کو ۱۸۵۰ء میں مطلع کیا تھا۔ دراصل مسٹر ہان کو البانوی زبان اور رسمِ خط سے بڑی دلچسپی تھی اور اُنھیں کی بدولت ہمیں مذکورۂ بالا خطوں کا علم حاصل ہوا ہے۔

یہ تینوں خط چھوٹے یونانی حروف کی گھسیٹ شکلوں پر مبنی تھے جن میں کافی حذف و اضافہ کیا گیا تھا، دو یا تین حروف کو بطور ایک جوڑ کے ملا کر بھی نئے حروف (LIGATURES) وضع کئے گئے تھے۔ ڈاکٹر ڈیوڈ ڈرینگر کی رائے میں ان کا تعلق مرموز نویسی سے تھا۔ ترکی افسران کی مداخلت سے بچنے کے لئے باہمی نامہ و پیام کے واسطے البانوی آبادی نے انھیں ایجاد کیا تھا۔

البانوی رسومِ خط صرف مقامی اہمیت کے حامل تھے۔ ان کی قدیم صورتوں کا علم نہ ہونے کی وجہ سے ان کے حروف کا جن میں سے بعض مرکب ہیں) یونانی حروف سے تعلق صحیح طور پر نہیں قایم کیا جا سکتا۔ اس لئے نقشہ نمبر ۲۷ کو جو آئرک ٹیلر کی کتاب سے ماخوذ ہے محض آزمائشی یا تجرباتی (TENTATIVE) سمجھنا چاہئے۔

رونی رسمِ خط (RUNIC.SCRIPT)

وجہ تسمیہ: قدیم ناروِک زبان کے لفظ رونن، آئس لینڈ کے رونر اور قدیم جرمن زبان کے لفظ رونا کے معنی "راز" یا "بھید" کے تھے چونکہ اس خط کے حروف طلسمی صفات کے حامل مانے جاتے تھے اور انھیں لکھنے پڑھنے کے علاوہ جادو ٹونے کے لئے بھی استعمال کیا جاتا تھا لہٰذا ان کو (RUNES) کہنے لگے۔ نیچے رونی خط کی مختلف اقسام کا علٰحدہ علٰحدہ ذکر کیا جاتا ہے:-

(۱) ابتدائی ٹیوٹانی یا گوتھک رونی خط اس کے تقریباً ۱۰۰ کتبے موجود ہیں جو بیشتر تیسری سے آٹھویں صدی عیسوی تک کے ہیں۔ یہ خط ۲۴ حروف پر مشتمل تھا جو آٹھ آٹھ کے تین مجموعوں میں منقسم تھے ہر مجموعہ کو (ETT) کہتے تھے اس لفظ کے معنی "آٹھ" کے ہیں۔ پہلے چھ حروف کی رعایت سے یہ خط (FUTHORC) کہلاتا تھا یونانی حروف کی طرح ہر رونی حرف کا ایک نام تھا اور سامی حروف کی طرح ان کے معنی تھے۔ یہ نام اینگلو سیکسن مسودوں میں محفوظ ہیں۔ (ملاحظہ ہو نقشہ نمبر ۲۸) بظاہر نام کی شکلوں اور معنی میں کوئی تعلق نہیں ہے۔

پہلے یہ خط دائیں سے بائیں کو لکھا جاتا تھا لیکن بعد میں بائیں طرف سے لکھنے لگے۔ کتابت کی سخت سطحوں (لکڑی، دھات اور پتھر) نے

حروف کی شکلوں کو زاویہ دار بنا دیا اور گولائیاں غائب ہوگئیں۔ چونکہ یہ خط صدیوں مستعمل رہا اور مختلف ملکوں میں اس کی اشاعت ہوئی اس لئے ہمیں تعجب نہ ہونا چاہئے کہ ہر زمانہ اور ہر ملک کے حروف کی شکلوں میں قدرے فرق ہے

سویڈن کے ماہر جغرافیات (B. SALIN) کی تحقیقات کے مطابق رونی خط کا آغاز جنوبی مشرقی یورپ کے گوتھ لوگوں میں ہوا تھا۔ یہ لوگ بحیرۂ اسود کے قریب اور دریائے ڈنیپوب کے نشیبی حصے میں آباد تھے۔ چنانچہ اس دریا کی وادی نیز رومانیہ میں رونی خط کے متعدد کتبے پائے گئے ہیں۔ اس لئے یہ ممکن ہے کہ بحیرۂ اسود کے شمالی مغربی ساحل سے اس خط کا رواج گوتھ حکومت کے آخری سرے تک پہنچ گیا جسے انھوں نے تیسری اور چوتھی صدی عیسوی میں بحیرۂ اسود اور باتک کے درمیان قایم کیا تھا۔ غالباً پانچویں صدی عیسوی میں رونی خط ڈنمارک سے جرمنی اور انگلستان پہونچا۔

(۲) انگلو سیکسن رونی خط۔ سیکسن وہ قوم تھی جس نے پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی میں انگلستان کو فتح کر لیا تھا۔ اور وہاں کے قدیم باشندوں سے مخلوط ہوگئی تھی۔ یہی مخلوط النسل لوگ انگلو سیکسن کہلائے۔ انگلو سیکسن رونی خط ۲۸ حروف پر مشتمل تھا اور نویں صدی عیسوی تو یہ تعداد بڑھ کر ۳۳ تک پہونچ گئی۔ اس رسم خط کا علم ہمیں نہ صرف کتبوں سے حاصل ہوتا ہے، بلکہ بعض مسودے بھی محفوظ ہیں جو نویں سے گیارھویں صدی عیسوی تک کے ہیں۔ انگلستان میں رونی خط کا استعمال پورے انگلو سیکسن عہد میں جاری رہا۔ آخری دور میں بعض رونی حروف رومن خط کے ساتھ ساتھ قدیم انگریزی کتابات میں استعمال کئے جاتے رہے مثلاً حروف تھارن (تھ) اور وین (ڈبلیو) نارمن حملے کے بعد بھی مستعمل رہے۔

(۳) اسکینڈی نیویائی رونی خط - یہ خط ڈنمارک، سویڈن، ناروے، کمبرلینڈ اور آئل آف مین میں رائج تھا۔ انگلو سیکسن خط کے برخلاف اس میں حروف کی تعداد گھٹانے کا رجحان پایا جاتا ہے۔ اسکینڈی نیویائی خطوں میں ۸۰۰ء کے بعد سے ۱۶ حروف کام آتے تھے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک ایک حرف متعدد آوازیں ظاہر کرتا تھا مثلاً ک اور گ، ت اور د چار آوازوں کے لئے مخص دو نشانات تھے۔ حروفِ علت کا حال اس سے بُرا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان لوگوں کی زبان میں تیس یا چالیس آوازیں تھیں جبکہ اصل رونی خط میں حروف کی تعداد محض ۲۴ تھی۔

حروف کی تعداد گھٹانے کے لئے غیر ضروری نشانات ترک کئے گئے مثلاً ا۔

اور بعض مشکل حروف کی جگہ سہل نے لے لی :-

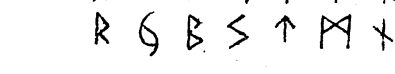

اس خط میں بعض حروف کے نام انگلو سیکسن ناموں سے مختلف ہیں جیسے تیسرے حرف کو تھرس (thurs) کہتے تھے بمعنی "دیو" بجائے تھارن (thorn) کے بمعنی "کانٹا"، اسی طرح پانچویں کو کون (Kaun) کہتے تھے بمعنی "رسولی"۔ "پھوڑا" بجائے کین (Caun) کے جس کے معنی "مشعل" کے ہیں۔ اسی طرح بعض دوسرے حروف کے نام اور اُن کے معنی بھی مختلف ہیں جیسا کہ بتایا جا چکا ہے حروف کے معنی اور اُن کی شکلوں میں کوئی تعلق نہیں ہے۔

(باقی)

محمد اسحاق صدیقی

آواز	بوتھا کو کائی	ایلباسن	ممکن یونانی ماخذ
ا		A	a
ب		ᗑ	β
ج		ᗐ	γ
دھ		ᗅ	δ
ای		ᗉ	ε
ز		ᗊ	ζ
ای			η
تھ		ᗕ	θ
ا		I	ι
ک		C	κ
ل		ᗷ	λ
ر		ᗡ	μ

آواز	بوتھا کو کائی	ایلباسن	ممکن یونانی ماخذ
ش		V	ν
		8	ξ
او		O	ο
پ		ᗣ	π
ر		ᑭ	ρ
س		ᑕ	σ
ت		ᑌ	τ
او		ᑎ	υ
ف		ᑐ	φ
کھ		ᕮ	χ
او		ᘺ	ω

آواز	بوتھا کو کائی	ایلباسن	ممکن یونانی ماخذ
د		ᒪ	β
د		ᐱ	δ
ی		ᐳ	ε
ی			η
س			σ
او			υ
گھ		h	κ
ای		i	ι
او		o	ο
را		ᖴ	ρ

مرکب حروف

بوتھا کو کائی		ایلباسن			
کائی	= κ + ι	اس	دیش	= α + σ	
کس	= κ + σ	پس	نیش	= π + σ	
وز	= s + σ	میں	شہ	= μ + β	
دس	= θ + σ	ست	دس	= σ + τ	
تندئی	= τ + σ ι	شش	ندس	= σ + σ	
نگ	= η + ν	شائی	نگھ	= σσ + ε	
		شت	گائی	= σσ + τ	
		ت	نگائی	= τ + ε	
		قس	لائی	= τ + σ	
			کائی	= κ + ι	

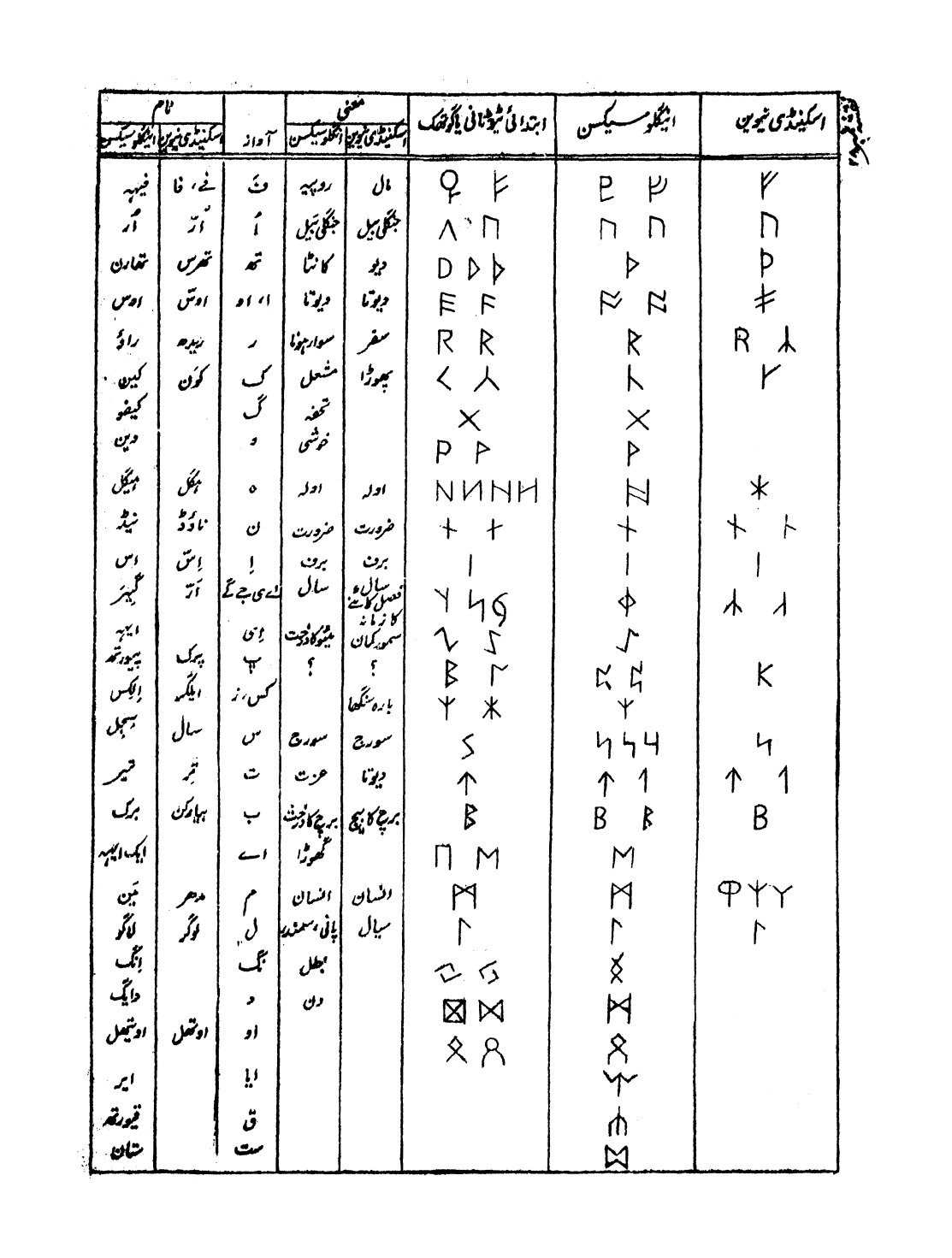

اسکینڈی نیوین	اینگلو سیکسن	ابتدائی شوٹانی یا گوتھک	معنی: اسکینڈی نیوین	معنی: انگلو سیکسن	آواز	نام: اسکینڈی نیوین	نام: اینگلو سیکسن
ᚠ	ᚠ	ᚠ	مال	روپیہ	ف	فے، فا	فیہہ
ᚢ	ᚢ	ᚢ	جنگلی بیل	جنگلی بیل	اُ	اُر	اُر
ᚦ	ᚦ	ᚦ	دیو	کانٹا	تھ	تھرس	تھارن
ᚨ	ᚩ	ᚨ	دیوتا	دیوتا	ا، او	اوس	اوس
ᚱ	ᚱ	ᚱ	سفر	سوار ہونا	ر	ریدھ	راؤ
ᚲ	ᚳ	ᚲ	پھوڑا	مشعل	ک	کون	کین
				تحفہ	گ		کیفو
				خوشی	و		وین
ᚺ	ᚻ	ᚺ	اولہ	اولہ	ہ	ہگل	ہیگل
ᚾ	ᚾ	ᚾ	ضرورت	ضرورت	ن	ناؤڈ	نیڈ
ᛁ	ᛁ	ᛁ	برف	برف	اِ	اِسّ	اس
ᛃ	ᛄ	ᛃ	فصل کاٹنے کا زمانہ	سال	ے ی جے گے	اَر	گیر
ᛇ	ᛇ	ᛇ	سمور کان	میٹھو کا دودھ	اِی		ایہہ
ᛈ	ᛈ		؟	؟	پ	پیرک	پیورتھ
ᛉ	ᛉ	ᛉ	بارہ سنگھا		کس، ز	ایلگز	ایلکس
ᛋ	ᛋ	ᛋ	سورج	سورج	س	سال	سیول
ᛏ	ᛏ	ᛏ	دیوتا	عزت	ت	تیر	تیر
ᛒ	ᛒ	ᛒ	برچ کا پیڑ	برچ کا درخت	ب	ہیارکن	برک
ᛖ	ᛖ	ᛖ	گھوڑا		اے		ایک، ایہہ
ᛗ	ᛗ	ᛗ	انسان	انسان	م	مدھر	مین
ᛚ	ᛚ	ᛚ	سیال	پانی، سمندر	ل	لوگر	لاگو
ᛝ	ᛝ			بطل	نگ		انگ
ᛞ	ᛞ			دن	د		دایگ
ᛟ	ᛟ				او	اوتھل	اوتیل
					ایا		ایر
					ق		قیورتھ
					ست		ستان

عورت اور تعلیم

(ایک استفسار کے جواب میں)

ہر چند ضمنی طور پر میں اپنا خیال اس مسئلہ پر بارہا ظاہر کر چکا ہوں لیکن براہ راست اس بحث پر کبھی گفتگو نہیں کی گئی نہ صرف اس خیال سے کہ اس گفتگو میں اب کوئی لذت باقی نہیں رہی بلکہ اس لئے بھی کہ عورتوں کی تعلیم اور اُن کی آزادی اپنی نوعیت کے لحاظ سے خواہ کتنی ہی غور طلب کیوں نہ ہو، اب اُس کو مناسب حدود کے اندر رکھنا دشوار ہے اور اس کے خلاف آواز بلند کرنا سیلِ زمانہ کا مقابلہ کرنا ہے جس کا نتیجہ معلوم۔ لیکن باوجود اس احتراز و احتیاط کے

ہتوں کے باب میں آخر کلام آ ہی گیا

اس لئے میں ایک حد تک اپنے خیالات ذرا واضح طریق پر ظاہر کر دینا مناسب سمجھتا ہوں۔

آپ کے خیالات کا خلاصہ صرف اس قدر ہے کہ: "عورتوں کو بالکل مردوں کی طرح تعلیم حاصل کرنی چاہیئے اور بہرہ آزادی جو تعلیم سے پیدا ہوتی ہے اُن کے لئے روا رکھنی چاہیئے"۔ میں کہتا ہوں کہ "عورتوں کی تعلیم ضرور مکمل ہونی چاہیئے، لیکن وہ تعلیم ایسی نہ ہو جو ان کے اندر آزادی کی بیجا خواہش پیدا کر دے"۔ بالکل یہی نظریہ میرا مردوں کی تعلیم کے متعلق بھی ہے، یعنی جس طرح میں عورتوں کی نارواآزادی کو پسند نہیں کرتا، اسی طرح مردوں کی بیجا خود سری بھی مجھے پسند نہیں آتی۔

اس لئے اب سوال صرف یہ رہ جاتا ہے کہ بیجا آزادی کیا ہے۔ "بیجا آزادی" نام ہے "داعیات فطرت و اخلاق" کے خلاف عمل کرنے کا اور اس لئے ہر وہ تعلیم (خواہ اس کا تعلق حکمت نظریہ سے ہو یا حکمتِ عملیہ سے) جو اس عمل پر مجبور کرتی ہے یا ایسے عمل سے باز نہیں رکھتی بیجا آزادی کا باعث کہلائے گی۔

اچھا آیئے اب ایک نگاہ "داعیات فطرت و اخلاق" پر بھی ڈال لیں اس سے غالباً آپ کو بھی انکار نہ ہوگا کہ فطرت صرف یہ چاہتی ہے کہ تمام افرادِ انسانی نظامِ تمدن میں بہیئت اجتماعی کے لئے مفید ثابت ہوں، اس لئے میرے نزدیک یورپ کی موجودہ ترقی جسے آپ ذہنی ترقی کہتے ہیں اور میں اُسے صرف میکانکی ترقی سمجھتا ہوں، اقتضائے فطرت کے خلاف ہے، کیونکہ وہ نظامِ تمدن کے لئے مفید ثابت ہونے کے بجائے مضرت رساں ہے اور بجائے ہمدردی و اخوت کے جو ہیئت اجتماعی کے قیام کی اولین شرط ہے وہ بغض و عناد، مکر و فریب، حیلہ و سیہ کاری سکھاتی ہے، اس پر زیادہ بحث کی ضرورت نہیں کیونکہ ادنیٰ عقل سے ہر شخص اس کو سمجھ سکتا ہے اور نود یورپ کے بعض سنجیدہ دماغوں نے اس کا اعتراف کر لیا ہے، اس لئے اب یہ امر بالکل واضح ہے کہ نوعِ انسان کی نجات یورپ کی تقلید میں نہیں ہے، بلکہ ہمیں کسی ایسے نظامِ عمل کی ضرورت ہے جو ہماری ذہنی ترقی کے ساتھ ساتھ روحانی ترقی بھی پیدا کرے۔ اگر یہ مشکل ہے کہ آپ روحانی ترقی کے سلسلہ میں شیخ کا حوالہ دیتے ہیں اور میں "صدیق و فاروق" کو پیش کرتا ہوں:

من از آتش دخاں بنیم تو آتش از دخاں بینی

یہ تو آپ بھی تسلیم کرتے ہوں گے کہ دنیا کا نظام تقسیم عمل پر منحصر ہے اور ہر شخص یا ہر جماعت دنیا کے تمام کاموں کو انجام نہیں دے سکتی

یہی سبب ہے کہ فطرت نے ہر شخص کے دماغ کو ایک خاص کام کے لئے وضع کیا ہے اور اس کے خلاف جب کوئی دوسرا کام اختیار کرتا ہے تو اس میں کامیاب نہیں ہوتا، پھر ظاہر ہے کہ جب ایک ہی جنس کے افراد کا دماغی اقتضاء ایک نہیں ہے تو دو مختلف جنس کے متعلق فطرت کے داعیات کیونکر یکساں ہو سکتے ہیں ــــ اگر قدرت کا مقصود یہ ہوتا کہ عورتیں بھی تمام وہی کام انجام دیں جو عام طور پر مرد انجام دیتے ہیں، تو دونوں کی جسمانی ساخت، دماغی ترکیب، نفسیاتی میلان ایک ہوتا، لیکن چونکہ اس کا مقصود شروع ہی سے واضح طور پر اس تفریق کو نمایاں کر دینا تھا، اس لئے مرد عورت کے درمیان صورت و سیرت دونوں اعتبارات سے اس قدر کھلا ہوا فرق پیدا کر دیا کہ وحشی سا وحشی انسان بھی بیک نظر اسے سمجھ سکتا ہے، پھر اب غور کیجئے کہ اس فرق سے کیا مراد ہے اور وہ کیا تقسیم عمل ہے جو دونوں کو ایک دوسرے سے جدا کر کے باہم تعاون و ہمدردی کا باعث ہوتی ہے۔

مرد کی جسمانی ساخت کہہ رہی ہے کہ وہ زیادہ محنت و جفاکشی اور زیادہ صعوبت و سختی برداشت کرنے کے لئے پیدا ہوا ہے (ان چند مثالوں سے بحث نہ کیجئے کہ بعض عورتیں اپنی کوشش سے بہت سے مردانہ کاموں میں برابر کا حصہ لے رہی ہیں، جس طرح میں ان بعض ضعیف مردوں سے بحث نہیں کرتا جنھوں نے اپنے اوپر نسائیت طاری کر لی ہے) جس کا ثبوت ارتقائے عالم کی تاریخ سے بھی ملتا ہے، برخلاف عورت کے کہ اس کی جسمانی و دماغی ترکیب کا اقتضاء صرف رقت و ملاطفت، نرمی و محبت ہے، پھر ایک مرد کے لئے میدان ترقی وہی ہے جہاں اُسے زیادہ محنت سے کام لینا پڑے اور عورت کا ارتقاء یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو زیادہ تسلی بخش، زیادہ باعث سکون بنائے۔

یہ امر واقعی آپ سے مخفی نہ ہوگا کہ جس طرح دنیائے عمل میں حرکت کے ساتھ قیام حرکت یا استمرار حرکت کے لئے کسی اور محرک یا قوت کی ضرورت ہے، اسی طرح مرد کی محنتوں اور صعوبتوں کے ساتھ کسی ایسی چیز کی بھی ضرورت ہے جو ان محنتوں کو قایم رکھے، جو ان صعوبتوں کو مرد کے لئے ناقابل برداشت نہ بننے دے، یعنی اگر مرد دن بھر محنت کرتا ہے تو رات کو اسے سکون کی بھی ضرورت ہے یعنی اگر وہ آفتاب کی گرمی میں سخت کاموں سے اپنے آپ کو تھکاتا رہتا ہے، تو چاند کی برودت میں اُسے کسی ایسے بات کی بھی ضرورت ہے جو اس کی خستگی دور کرے اور آئندہ صبح کی محنتوں کے لئے اس میں پھر تازہ قوت و جوش پیدا کر دے، پھر کیا کوئی شخص اس سے انکار کر سکتا ہے کہ ایک مرد کے لئے سب سے زیادہ سکون بخش چیز صرف عورت کا ہاتھ ہے اور مادی ایذا کی خاصیت صرف عورت ہی کی روحانیت دور کر سکتی ہے، پھر چونکہ یہ تقسیم خود قدرت کی قایم کی ہوئی ہے اس لئے ہمیں اسی کو معیار بنانا چاہئے، اور اسی معیار کے مطابق ایک مرد کی مردانگی اور ایک عورت کی نسائیت پر حکم لگانا چاہئے

فرض کیجئے کہ ایک گھر میں صرف دو میاں بیوی ہیں اور آپ کے خیال کے مطابق دونوں ترقی یافتہ ہیں، اگر مرد سارا دن مکانیکی تجربات میں اپنے آپ کو تھکاتا رہتا ہے، تو عورت بھی کیمیائی معمل میں اپنا سر کھپاتی رہتی ہے، شام کو دونوں خستہ و منحمل ہو کر گھر واپس آتے ہیں اور دونوں کو اپنی اپنی جگہ آرام کی ضرورت ہے، لیکن چونکہ وہ گھر میں میسر نہیں آ سکتا، اس لئے دونوں اسی خستگی کے عالم میں رات بسر کر دیتے ہیں اور پھر صبح کو اپنے کام میں لگ جاتے ہیں، آپ سمجھتے ہیں کہ اس نوع کی زندگی کب تک بسر ہو سکتی ہے، یا وہ کب تک اسی طرح اپنے اپنے مشاغل میں کامیابی کے ساتھ مصروف رہ سکتے ہیں، میرے خیال میں تو اس کی عمر بہت کم ہے اور تھوڑے زمانہ میں دونوں دماغوں کو بیکار ہو جانا چاہئے۔ بلکہ میری مراد اُس تسکین سے ہے جو روحانی انبساط کو دور کر سکے، اب اسی کے ساتھ اگر آپ اولاد کو بھی پیش نظر رکھیں گے تو اور زیادہ نمایاں طور پر آپ کو رجالی و نسوانی فرایض کا فرق معلوم ہو جائے گا۔

یقیناً اس حد تک آپ میرے موافق ہوں گے لیکن دل ہی دل میں یہ بھی کہہ رہے ہوں گے کہ اس سے آزادی نسواں یا ترقی نسواں کیونکر ممنوع قرار دی جا سکتی ہے مگر غور کرنے سے فیصلہ اسی جگہ ہو جاتا ہے، کیونکہ میرے نزدیک وہی آزادی نسواں مبغوض ہے جو عورت کو اپنے فرائض و وظائف فطری کی طرف سے غافل کر دے اور عورت کی موجودہ تعلیمی و تربیتی بدقسمتی سے اسی نوع کی آزادی پیدا کر رہی ہے۔

عورت کا اپنے آپ کو دماغی اعتبار سے مرد کے برابر سمجھنے کا حق یقیناً حاصل ہے، لیکن میرے نزدیک اس حق کا وہ مفہوم نہیں ہے جو آپ نے متعین کیا ہے کہ "خواہ وہ شاعری و فسانہ نگاری شروع کر دے یا راہ نجات و بہشتی زیور کی تفسیر" کیونکہ یہیں سے اُس ناروا جسارت یا آزادی کی بنیاد شروع ہو جاتی ہے جسے میں اقتضاء فطرت کے خلاف سمجھتا ہوں۔ بلکہ اس برابری کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح مرد

اپنے دماغ سے کام لیکر مادی ذرایع ترقی فراہم کرنے کا اہل ہے اسی طرح ایک عورت اپنے دماغی مساعی سے روحانی اسباب راحت وسکون مہیا کرنے کی اہلیت رکھتی ہے پھر اب فیصلہ آسان ہے کہ یہ مقصود اس کی فسانہ نگاری سے پورا ہوتا ہے یا راہِ نجات و بہشتی زیور کی تفسیر سے۔

عورتوں کی تعلیمی و ذہنی ترقی کی حمایت کی جا رہی ہے، اس کا تعلق صرف انگریزی تعلیم سے ہے یعنی زیادہ زور اسی پر دیا جا رہا ہے کہ لڑکیاں انگریزی مدارس میں بھیجی جائیں، کالجوں میں پڑھیں اور مردوں کی طرح مخصوص امتحانات میں کامیابی حاصل کریں، اس کے علاوہ اور کوئی نقطۂ نظر حامیانِ تعلیم نسواں کا نہیں ہے، لیکن میں اس کا مخالف ہوں، اس لئے نہیں کہ انگریزی زبان سیکھنا گناہ ہے، یا اور دوسرے علوم جن کی کالجوں میں تعلیم دی جاتی ہے غیر ضروری ہیں بلکہ صرف اس بنا پر مخالفت کرتا ہوں کہ اس تعلیم سے نہ صرف یہ کہ عورت اپنے فرایض سے آگاہ نہیں ہوتی بلکہ اپنی نسائیت بھی کھو بیٹھتی ہے۔

انگریزی تعلیم کا سب سے پہلا اثر جو عورتوں پر ہوتا ہے وہ احساس فرائض کا ضعف ہے، ابھی ابتدائی تعلیم کے مدارج بھی طے نہیں ہوتے کہ سب سے پہلے یہ خیال اُن کے دماغ میں مرتسم ہو جاتا ہے کہ مرد ہمارے اوپر ظلم کر رہے ہیں حالانکہ انھیں کوئی حق ہمارے اعمال کے احتساب کا نہیں ہے، جہاں تک میں نے غور کیا ہے یہ نتیجہ تعلیم کا نہیں ہے بلکہ اُس ماحول کا ہے جہاں وہ تعلیم حاصل کرتی ہیں۔ انگریزی مدرسوں اور کالجوں کی فضا میں وہ انھیں عورتوں کو دیکھتی ہیں جو دُنیا میں آزاد ہیں، اخلاقیات سے عملاً منحرف ہیں، مادیات میں پھنسی ہوئی ہیں اور جن کی تہذیب وشائستگی کا بڑا معیار اُن کے لباس کی پاکیزگی اور اوضاع آرایش کا تنوع ہے۔ اس لئے جو لڑکیاں وہاں جاتی ہیں اُن میں بھی قدرتاً یہی خواہش پیدا ہوتی ہے کہ وہ بھی اپنے آپ کو ویسا ہی بنائیں، پھر اگر وہ غریب یا متوسط طبقہ کی ہیں تو ان کے والدین ان بیجا خواہشوں کے مصارف پورے نہیں کر سکتے اور لڑکیاں جو نا سمجھ ہوتی ہیں اس مجبوری کو بھی ظلم ہی سمجھنے لگتی ہیں اور اس طرح ایک قلبی بغاوت والدین کی طرف سے شروع ہو جاتی ہے، نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس وقت لڑکی اسکول کی تعلیم سے فارغ ہو کر نکلتی ہے اس کے دل میں والدین کی محبت اور ان کا احترام باقی نہیں رہتا، یہاں تک کہ نکاح کے مسئلہ میں بھی وہ اپنے آپ کو آزاد سمجھ کر خود ہی اپنے انتخاب پر اعتماد کرنا چاہتی ہے جو اسکی ناتجربہ کاری کی وجہ سے اکثر و بیشتر نامناسب و غلط ہوا کرتا ہے اور اگر اتفاق سے کوئی مرد اسی کا ہم خیال مل گیا تو چند دن کے بعد جب عارضی اذیتیں ختم ہو کر روحیں حقیقی موانست کی جستجو کرتی ہیں تو ان تمام مصائب کا سامنا ہو جاتا ہے جو لازمی نتیجہ ہیں ایسے غیر حقیقی اتصال کا۔

اس میں شک نہیں کہ ایک تعلیم یافتہ لڑکی (آپ کے نقطۂ نظر سے) بظاہر نہایت دلکش، حد درجہ جاذب قلب و نگاہ اور ہر لحاظ سے ایک ایسا پیکر جمیل نظر آتی ہے کہ مشکل سے ایک مرد اپنی جذبات فتادگی پر قابو حاصل کر سکتا ہے لیکن چند دن نہیں گزرتے کہ یہ طلسم ٹوٹ ہو جاتا ہے اور پھر اُس وقت معلوم ہوتا ہے کہ جس چیز کو ہم نے دارو ئے دل سمجھ کر حاصل کیا تھا وہ صرف بلاہتِ زندگی ہے اور جس کو ہم نے اس قدر جمیل و دلکش سمجھا تھا اس کا یہ حال ہے کہ:-

خسِ شش ہمہ قتل است و نگاہش ہمہ خون است

میں کیسے سمجھوں کہ مسئلہ نسائیات کے متعلق آپ نے اہل مغرب کے جدید افکار کو ملاحظہ نہیں فرمایا اور اگر ملاحظہ فرمایا ہے تو کیونکر یقین کر سکتا ہوں کہ آپ پھر بھی آزادیِ نسواں کے حامی ہیں، کیا آپ کو علم نہیں کہ یورپ کا مرد عورتوں کی اسی آزادی کی بدولت زندگی سے بیزار ہے اور عورتوں کی اسی حقوق طلبی، اسی حریتِ فکر اور اسی دماغی و ذہنی ترقی نے وہاں کی حیاتِ انسانی کا توازن اس قدر خراب کر دیا ہے کہ ایک گھر کو حقیقی آرام نصیب نہیں، اب مغرب کی عورت جو اسی تعلیم و آزادی کا انتہائی نمونہ ہے (جس کی ابتدا ہندوستان میں بھی ہو گئی ہے اور جس کے آپ اس قدر دلدادہ نظر آتے ہیں) بقول ایک انگریز مصنف کے "عورت تو رہی نہیں، اور مرد بھی اسے نہیں کہہ سکتے، اس لئے وہ ایک تیسری جنس ہے، جسے خود مرد نے اپنے ہاتھ سے پیدا کیا ہے" اور اب آپ اس کے ہاتھوں نالاں ہیں۔

انسانی معیشت و معاشرت ایک ایسی گاڑی ہے جسے مرد و عورت دونوں برابر قوت سے کھینچتے ہیں، یعنی اگر مرد کماتا ہے تو عورت کا فرض ہے کہ وہ اس کی کمائی کا انتظام کرے، بچوں کی پرورش کرے، امور خانہ داری کا خیال رکھے، شوہر کے آرام و آسایش کی فکر کرے

جو بجائے خود بڑا کام ہے اور مرد کے فرائض سے کسی طرح کم نہیں ہے اس لئے اگر عورت میں یہ احساس ضعیف ہو جائے اور وہ بھی مرد کی خدمات انجام دینے لگے تو نظام عالم کیونکر قائم رہ سکتا ہے اور نسل انسانی کیونکر ترقی کر سکتی ہے۔

اغراض مقصود صرف یہ ہے کہ اگر عورت اپنے فرائض سے غافل ہے تو اس سے زیادہ مضر چیز دنیا میں کوئی نہیں۔ عام اس سے کہ غفلت فہیم ہو جہل کا یا علم کا اگر جہل کی وجہ سے یہ عیب پیدا ہوا ہے تو اُسے دور کرنا چاہئے اور اگر علم سے یہ مرض ظہور میں آتا ہے تو اس کو خیرباد کہنا چاہئے۔

مسلمانوں میں اس سے قبل قرونِ وسطیٰ اور قرونِ اولیٰ میں بھی عورتوں کی تعلیم کا رواج تھا اور تاریخ شاہد ہے کہ عہدِ اسلامیہ نے کیسی کیسی ذہین و قابل عورتیں پیدا کیں، لیکن اُن میں شاید ایک مثال بھی ایسی نہ ملے گی کہ اس نے اپنے حقیقی فرائض کو نظر انداز کر دیا ہو، اس لئے ثابت ہوا کہ نفسِ تعلیم تو کبھی مضرت رساں نہیں ہو سکتی، البتہ اس کے ساتھ تربیت کا فقدان بُرے ماحول کا اثر اور عام درسگاہوں کی فضا اس خرابی کا باعث ہوا کرتی ہے، جس کے ثبوت میں اس وقت سارا یورپ اور اس کی تمام عورتیں پیش کی جا سکتی ہیں، ہاں اگر ہندوستان کے انگریزی مدارس کا نصاب تعلیم مغربی نصاب کے علاوہ کچھ اور ہوتا یا معلمات کی ذہنیت کچھ اور ہوتی یا تعلیم گاہوں کی فضا سے کچھ بھی اخلاق کا پتہ ٹپکتا کسی اور نتیجہ کی توقع ہو سکتی تھی، لیکن جبکہ یہاں بھی وہی سب کچھ ہے جس نے یورپ کی عورت کو ایک تیسری جنس بنا دیا، تو کوئی وجہ نہیں کہ ہندوستان کی عورت بھی اس نامشرقی جنس میں شامل ہونے سے باز رہے اور مشرق اُس بلا سے محفوظ رہے جس میں آج کل مغرب گرفتار آ رہا ہے۔

اب رہا میرا خصوصیت کے ساتھ غزل نگاری اور عشقیہ فسانہ نویسی کی مخالفت کرنا سو اس کا سبب سوا اس کے کچھ نہیں کہ جن لڑکیوں میں ابتدا ہی سے یہ ذوق پیدا ہو جاتا ہے وہ آگے چل کر کبھی مفید عضو نہ بن سکتیں۔ اگر کوئی عورت اپنی تعلیم ختم کرنے کے بعد، متاہل زندگی کے فرائض بخوبی ادا کرتی ہوئی پختہ عمر میں جا کر یہ مشغلہ اختیار کرے، تو میں اس کو چنداں مضرت رساں نہیں سمجھتا اگرچہ مناسب یہ بھی نہیں ہے اور اس سے گھر کی لڑکیوں کے متاثر ہونے کا اندیشہ ہے، لیکن گمنی کے زمانہ میں جبکہ ابھی ابتدائی مدارج بھی تعلیم کے ختم نہیں ہوئے ہیں، لڑکیوں میں یہ ذوق پیدا ہو جانا قیامت ہے۔

چشم اگر ایں ست و ابرو ایں و ناز و عشوہ ایں
الفراق اے ہوش و تقویٰ الوداع اے عقل و دیں

سو حضرت میں نہ مخالف تعلیم کا ہوں اور نہ مناصب آزادی کا۔ لیکن ڈرتا ہوں اس کے نتائج سے۔

من از عقرب نمی ترسم بہ از نیش می ترسم

اب اس جگہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر لڑکیوں کی تعلیم کا کیا انتظام ہونا چاہئے اور اس کی بہترین صورت کیا ہے؟ میں نے جہاں تک غور کیا ہے اور غور کرنے کے بعد عمل کیا ہے، عمدہ تدبیر یہ ہے کہ پہلے لڑکیوں کو گھر میں تعلیم دی جائے اور یہ تعلیم کیسے فوراً ہی اخلاقی ہونی چاہئے، اسی سلسلہ میں فارسی اور عربی کی بھی تعلیم ضروری ہے (جس کا نصاب ہر شخص کو لڑکی کی ذہنی حالت اور فطری ذوق کے لحاظ سے مرتب کرنا چاہئے) اگر پانچ سال کی عمر سے بھی اس کی ابتدا کی جائے تو دس بارہ حد تیرہ سال کی عمر میں یہ مرحلہ ختم ہو سکتا ہے، اس کے بعد انگریزی شروع کرائی جائے اور اسی کے ساتھ ریاضی، جغرافیہ اور تاریخ کو بھی شامل کر لیا جائے لیکن یہ سب کچھ گھر ہی میں ہونا چاہئے، اگر گھر میں ممکن نہیں ہے تو کسی اچھے مدرسہ میں داخل کرانا چاہئے بشرطیکہ آنکہ اس پر پہلے کافی رنگ اخلاق کا چڑھ گیا ہے لیکن اگر اطمینان نہیں ہے یا مدرسہ میں داخل کرنے کے بعد لڑکی کا ذوق نامناسب عروج کی طرف مایل ہوتا ہوا نظر آتا ہے تو مدرسہ کی تعلیم فوراً ترک کرا دینی چاہئے۔ ہر چند جب شروع میں تربیت اچھی ہو جاتی ہے تو بعد کو اس نوع کی خرابیاں کم پیدا ہوتی ہیں۔ تاہم ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ بعض طبائع پر برا رنگ بہت جلد چڑھ جاتا ہے اور اچھے اثرات جلد زایل ہو جاتے ہیں اس لئے مدرسہ میں داخل کرنے کے بعد لڑکیوں کی طرف سے غافل ہو جانا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

میں لڑکیوں کے لئے امتحانات میں شریک ہو کر اسناد حاصل کرنا غیر ضروری سمجھتا ہوں، جبکہ قابلیت کے لحاظ سے حامل اسناد لڑکے بھی کچھ نہیں ہوتے لیکن اگر کوئی شخص اس کو ضروری خیال کرتا ہے، تو اس کی بھی بہترین صورت یہی ہے کہ پرائیویٹ طور سے تعلیم حاصل کر کے امتحانات میں شرکت کی جائے جس کی بعض مثالیں ہندوستان میں پیش کی جاتی ہیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر کوئی زنانہ کالج ایسا منتخب کیا جائے جہاں اوہام سے زیادہ حقایق کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی ہو۔ اگر ان تمام شرائط کو ملحوظ رکھا جائے تو فی الحال شاید چند لڑکیاں ہندوستان میں ایسی نکلیں گی جن کا مدرسہ میں داخل کرنا روا سمجھا جائیگا ورنہ اکثر کا حال اسی کا مقتضی ہوگا کہ پہلے ان کی تعلیم و تربیت گھر میں کی جائے، مجھے اس جگہ یہ بیان کر دینا چاہئے کہ اس وقت جتنے زنانہ مدرسے ہندوستان میں پائے جاتے ہیں ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو یا تو کسی چرچ مشن سے تعلق رکھتے ہیں یا حکومت کے قایم کئے ہوئے ہیں اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ سب کے سب ناقص ہیں، اس لئے ضرورت ہے کہ قوم کی طرف سے ایسے مدرسے قایم کئے جائیں اور ان کا نصاب کامل غور کے بعد مقرر کیا جائے، لیکن یہ اسوقت ممکن ہے جب ہمارے دلوں میں سچا درد پیدا ہو جائے اور عورتوں کی اصلاح کا حقیقی خیال پیش نظر ہو ورنہ اگر ہمارے خیالات کی بلندی یہی ہے اور اصلاح کا مفہوم صرف اس قدر ہے کہ لڑکیاں مشن اسکولوں میں جا کر تھوڑی سی انگریزی اور بہت سی فیشن طرازی سیکھ لیں تو نتیجہ معلوم اور عورتوں کے ساتھ مردوں کا حشر بھی متحقق۔

دریغ آبروئے دیر گر غالب مسلماں شد

پردہ کی بات پردہ میں

میری رائے میں بعض مباحث ایسے ہیں جن میں متانت و سنجیدگی کا دخل بالکل نہ ہونا چاہئے اور انھیں میں سے ایک پردہ بھی ہے، کیونکہ میں ایسا محسوس کرتا ہوں کہ جہاں معاشرتی، اخلاقی یا مذہبی نقطۂ نظر سے اس پر گفتگو کی گئی اور سارا لطف خاک میں مل گیا، نتیجہ جو کچھ ہوتا ہے وہ تو ظاہر ہے کہ اگر اب جبرئیل بھی ہمالیہ کی سب سے بلند چوٹی پر کھڑے ہو کر خدا کا یہ حکم پہونچائیں کہ: "پردہ عورت کے لئے ضروری ہے" تو بھی عورت اب ماننے والی نہیں ہے، کہتے ہیں کہ آدم اسی کے بہکانے سے بہشت سے باہر نکلے، لیکن عورت کی شکایت آدم سے یہی ہے کہ میں نے بہکایا تھا تو سارا الزام اپنے سر لے کر خود ہی نکل جاتے مجھے اپنے ساتھ کیوں شامل کر لیا" وہ تو ضرور بدلے گی، خواہ آپ کی شاعری یا حسن و عشق کی دنیا ویران ہی کیوں نہ ہو جائے وہ زمانہ گزر گیا جب کسی کو یہ فکر رہتی تھی کہ ؎

چہ سان نقاب ز رخسار دوست برگیرم

اور کوئی اپنی کامیابی کے اس پہلو سے خوش ہو جایا کرتا تھا کہ: ؎ "بگرفتش کنار و برانداختم نقاب"

ظہوری غریب یہ کہتا ہی رہا کہ ؎

مکش پردہ بر چہرہ اے رشک ماہ
کہ دارد نقاب از تجرم نگاہ

لیکن اُس کے عہد کے کسی حسین نے کہنا مانا اور نہ اب کوئی مانے گا۔ پھر جب حالت یہ ہے کہ دعا یہی مانگنا چاہئے کہ خدا کرے پردہ جلد اُٹھ جائے، کسی آرزو کے پورے نہ ہونے پر غالب کا یہ فلسفہ مجھے بہت پسند ہے:

حریفِ مطلبِ مشکل نہیں فسونِ نیاز
دعا قبول ہو یا رب کہ عمر خضر دراز

خضر کی درازیِ عمر ہماری دعا کی محتاج نہیں لیکن جب ہماری التجا سے اُن کی عمر کم نہیں ہو سکتی تو پھر اُن کی درازیِ عمر ہی کی دعا مانگنا چاہئے گو ان پر احسان نہ سہی تو کم از کم اپنی خفت ہی کم ہو جائے گی۔

یورپ میں تو خیر یہ مسئلہ اس حد سے گذر گیا ہے کہ اس پر کسی قسم کی گفتگو ہو سکے اور میں مغرب کی تعریف اسی لئے کرتا ہوں کہ جو کچھ اُسے کرنا ہوتا ہے کر گذرتا ہے اور "کروں یا نہ کروں" کے اندیشہ میں اپنا وقت ضایع نہیں کرتا، ہر فلاں ہندوستان کے کہ یہاں سد یاں تیور ہی دکھانے میں عمر جاتی ہیں اس لئے میں تو یہی کہوں گا کہ یہاں کی عورتیں بھی جس قدر جلد اس جھگڑے کو مٹا دیں اچھا ہے اُن کا پردہ "دنیوری" تو ہو ہی گیا ہے لیکن ضرورت اس کے "کافوری" ہونے کی ہے اور اسی میں دیر ہونے کی وجہ سے آپ کبھی کبھی گھر لکھ کر یہ سوال کر بیٹھتے ہیں مگر میں دیکھتا ہوں کہ یہاں کی عورتیں کچھ یونہی سی ہیں اور خواہ مخواہ اپنے آپ کو مہذب و شایستہ سمجھتی ہیں:-

لے بھی جائیں دل کہیں ہم سے کہ قصہ پاک ہو
یہ حسینانِ جہاں بھی دلربا کہنے کو ہیں

مشاعرۂ نگار

اکرم دھولیوی :-

دلفگاری ہے محبت کا تقاضا، سچ ہے — تم کو منظور نہ تھا خونِ تمنا کرنا
راہِ منزل نہ کہیں جوشِ طلب میں کھو جائے — اے دل اتنی بھی نہ منزل کی تمنا کرنا

پیمان کانپوری :-

کس نے دیکھا ہے ترے وعدۂ فردا کا آل — اک قیامت ہے شبِ غم کا سویرا کرنا

حبیب آروی :-

عظمتِ دردِ محبت پہ یقیں آ ہی گیا — سہل ہے اب مجھے غم تیرا گوارا کرنا

رحمت امروہوی :-

شدتِ غم سے چھلک آئے ہیں آنسو ورنہ — مدعا میرا نہیں آپ سے شکوا کرنا

شفقت کاظمی :-

عشق میں اور کسی کی نہ سُنی ہے نہ سُنیں — ہم کو ہر کام پہ ایماسے تمنا کرنا
جو گزرنی تھی محبت میں سو گزری مجھ پر — بعد میرے نہ مرے حال کا چرچا کرنا

صادق امروہوی :-

اُس نے اِس طور سے دیکھا دمِ پرسش مجھ کو — مجھ سے ممکن نہ ہوا ظلم کا شکوا کرنا

ضیاء انصاری :-

وجہِ تسکین تری یاد کا ہر پہلو ہے — کس کی تقدیر میں ہے تیری تمنا کرنا
نقشِ دیوار بنے بیٹھے ہیں اربابِ جنوں — نگہِ یار ذرا پھر تو اشارا کرنا

ظاہر بھڑگانوی :-

بے رخی میں ہے لگاوٹ تو لگاوٹ میں حیا — دیدنی ہے ترا اس طرح سے دیکھا کرنا

غریب دھولیوی :

آج تک یاد ہیں آغازِ محبت کے مزے — چپکے چپکے وہ تری یاد میں رویا کرنا
مشکلیں ڈوبنے والے کی کوئی کیا جانے؟ — بہت آسان ہے ساحل سے نظارہ کرنا

فائز آصفی :

زیست اک نکتۂ مبہم ہے زمانے کے لئے — عقدۂ گیسوئے خمدار ذرا وا کرنا

قاسم نوری :-
کتنا پُر لطف ہے ہم سے کوئی پوچھے قاسم — موسمِ گل میں بھی کانٹوں کی تمنا کرنا

کیف پرتاب گڈھی :-
بحرِ ہستی میں ہمیشہ رہو طوفاں کے حریف — خواہشِ مرگ ہے ساحل کی تمنا کرنا

مائل :-
فکرِ امروز سے فرصت ہی کہاں ہے مائل — آج ممکن نہیں اندیشۂ فردا کرنا

محمود درّانی :-
اب تو محمود وفا پر بھی بھروسہ نہ رہا — تا کجا اس دلِ مجبور کا کہنا کرنا

منظر معصوم :-
اس سے منظر دلِ مضطر کا عبث ہے شکوہ — جس نے سیکھا ہی نہیں غم کا مداوا کرنا

نومبر کے لئے ذیل کا مصرع طرح پیش کیا جاتا ہے، ۲۰ اکتوبر تک غزلیں پہونچ جانا چاہئے۔

کون ٹالے گا بھلا آپ کے فرمانے کو

قافیہ :- فرمانے ، دیوانے

"نگار" کے پچھلے تین سالنامے

سالنامہ ۳۱ء جس میں علم "فراست التحریر" کے اصول پیش کئے گئے تھے اور جن کو دیکھ کر آپ ایک شخص کا سواد خط دیکھ کر اس کے کیرکٹر کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں - صرف ایک کاپی باقی ہے ـــــ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۳۷ء اس میں "ڈراما اصحاب کہف" اڈیٹر کے قلم سے پورا شایع ہوا ہے اور "خلافت و امامت" کے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز ہوا ہے ـــــ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۳۸ء اس میں تاریخ اسلامی ہند کے عہد خلافت و امامت پر مختتم بحث کی گئی ہے جس کی ابتدا ۳۷ء میں ہوئی تھی ـــــ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

لطفِ مشیت

فضا ابن فیضی :

یہ سحر، دھندلکوں سے بے نیاز ہے کتنی
اے خدا! تری دُنیا دلنواز ہے کتنی،

یہ افق کے مینا سے ڈھل رہے ہیں جلوے سے
یا نقاب اُلٹ دی ہے زندگی نے چہرے سے

رنگ و نور کے عنواں طور طور بکھرے ہیں
بوئے گل کے افسانے دور دور بکھرے ہیں

مستیاں چھلکتی ہیں پھول کی نگاہوں سے
ابرِ تر گزرتا ہے میکدے کی راہوں سے

جلوۂ بہاراں سے لالہ زار سجتے ہیں،
آبجو کی موجوں میں جلترنگ بجتے ہیں،

برگِ گل پشیماں ہے التفاتِ شبنم سے
کس قدر محبت ہے زخمِ دل کو مرہم سے

رقص میں ہیں پیمانے چھاؤں میں گھٹاؤں کی
آہ! یہ طرب گاہیں دل کشا صداؤں کی

گھل رہا ہے کانوں میں رس سریلی "تانوں" کا
بج رہا ہے کانوں میں ساز عیش خانوں کا

مل کے مہر و شبنم نے آئینے تراشے ہیں
فتنہ گر بہاروں نے بتکدے سنوارے ہیں

سرخیِ شفق کا ہے عکس لالہ زاروں پر،
بادلوں کے جھرمٹ ہیں بھیگے کوہساروں پر

یہ نسیمِ صحرا کی کاوشِ گل افشانی،
یہ ہوائے ساحل کی سلسبیل سامانی،

رات اپنی زلفوں میں چاندنی سجاتی ہے
جھلملاتے تاروں میں صبح مسکراتی ہے

شمع و شاہد و صہبا معرکے ہیں مستی کے
کاروبار تازہ ہیں عشق اور مستی کے

یہ نگاہِ ساقی کی التفاتِ ارزانی،
یہ ہر ایک جرعہ میں میکدوں کی طغیانی

ابروؤں کی زیبائی، گیسوؤں کی شبتابی،
یہ حسین آنکھوں کی دعوتِ شکر خوابی

آنچل اس کا عنابی، اس کا پیرہن دھانی
عارضوں کے جلوے ہیں بائلِ زر افشانی

کائنات کی دوزخ کھو گئی بہشتوں میں
راحتیں پرو دی ہیں کس نے غم کے رشتوں میں

اتنی دلنشیں صبحیں، اس قدر حسیں شامیں
ہم تری مشیت کے ظلم سے پریشاں ہیں

آرزو کے خاکے میں رنگ بھر نہیں سکتے
زندگی کو جی بھر کر پیار کر نہیں سکتے

ہجومِ ظلمت و صبحِ وطن کی یاد کرو

چمن کی آڑ میں لَو دے رہے ہیں کاشانے
چمن کو پھونک کے سرو و سمن کی بات کرو

جو ڈوبتے ہی نہیں اُن نجوم کو دیکھو
جو پھوٹتی ہی نہیں اُس کرن کی بات کرو

ہزار سال سے اُلجھے ہوئے ہیں ظلمت و نور
ہجومِ ظلمت و صبحِ وطن کی بات کرو

حدیثِ حشر و حساب و کتاب رہنے دو
فسادِ آدمی و اہرمن کی بات کرو

یہ میکشوں کو اشارہ ہے چشمِ ساقی کا
لہو پیو تو شرابِ کہن کی بات کرو

بہار توڑ گئی موج رنگ و بو کا طلسم
ذرا سنبھل کے گل و یاسمن کی بات کرو

روش روش پہ بچھائے گئے ہیں ہوش کے دام
یہی ہے ہوش تو دیوانے پن کی بات کرو

جہاں فسانۂ جمشید و خسروی چھیڑو
ضرور بیکسیِ کوہکن کی بات کرو

حرم کی خاک پہ لات و منات کیا کم ہیں
یہ کیا ضرور کسی برہمن کی بات کرو

گناہِ عام ہے فکر و نظر کی آزادی
خلوصِ خاص سے دار و رسن کی بات کرو

یہ جبرِ طوق و سلاسل بحکمِ زہر و صلیب
کچھ اور زلفِ شکن در شکن کی بات کرو

ابھی ہے خاکِ شہیداں پہ رقصِ بے کفنی
یہ مصلحت "کلہ و پیرہن" کی بات کرو

حضورِ یزداں

بہار کا خونچکاں ہے دامن سلگ رہے ہیں ایاغ اب تک
گزر گئیں ہیں ہزار صدیاں جلے نہیں ہیں چراغ اب تک

جلے نہیں ہیں چراغ اپنک کسی صنم کے دیار میں بھی
کھلے نہیں ہیں کسی چمن میں گلاب اب تک بہار میں بھی

بہار میں بھی رہے ہیں ویراں گل و سمن کے نگار خانے
ازل سے اپنک نہ جانے کتنی حقیقتیں بن گئیں فسانے

عجیب خاکے ہیں زندگی کے یہ بادہ خانے یہ جلوہ گاہیں
ہیں ڈوبے ہوئے لہو میں معبد دھواں اُڑاتی ہیں خانقاہیں

دلیلِ عظمت یہ طاقِ کسریٰ، یہ نوشِ آذر، یہ تختِ ایواں
یہ نیل کا پُر جلال ساحل، یہ شہرِ سقراط کا سمستاں

یہاں نہ جانے مسیح کتنے صلیب پر چڑھ چکے ہیں اب تک
بلاکتوں کے نہ جانے کتنے فسانے ہم پڑھ چکے ہیں اب تک

نہ جانے کتنے حکیم آئے نہ جانے کتنے رسول گزرے
مگر یہ بہاروں کے راستوں سے کبھی سلامت نہ پھول گزرے

ہزار سجدے کئے ہیں لیکن کھلا نہ بابِ قبول اب تک
جمی ہوئی ہے جبینِ ریحان و گل پہ صدیوں کی دھول اب تک

یہ کون پوچھے کہ آدمی نے کیا ہے کیا معبدوں میں جا کر
ملا ہے ہم کو گماں کا تحفہ یقین کی بھی حدوں میں جا کر

حدودِ عرفاں میں بھی پہونچکر چراغ جلتے نہیں یقیں کے
بتا رہے ہیں مٹے مٹے سے خطوط انساں کی جبیں کے

مگر کسی نے کہا ہے ہم سے یہ روز و شب کے حصار بھی ہیں
یہ زندگی کے ستون بھی ہیں یہ روشنی کے منار بھی ہیں

شبوت کافی نہیں ہیں یارب نجوم و ماہ و گل و سمن کے
خرد کی صرصر بجھا چکی ہے چراغ تیری اس انجمن کے

اگر نہیں ہے دلیل کوئی تو پھر یقیں کا سوال کیسا
ترے فلک کا سوال کیسا تری زمیں کا سوال کیسا

اگر یہ سچے چراغ ہیں تو یہ قصر و ایواں کو پھونک ڈالیں
کلاہ و تاج و قبا جلا دیں ہر اک شبستاں کو پھونک ڈالیں

ہر اک شبستاں کو پھونک ڈالیں یہ روحِ برق و شرار بنکر
چمک اٹھیں یہ جبینِ انساں پہ اپنا خود شاہکار بنکر

ساقی جاوید

انتخاب کلام حامد بھوپالی

حامد سعید خاں، عجیب و غریب انسان ہیں، محفل سخن سے علیحدہ، عمر گزر جائے تو وہ شعر نہ سنائیں اور بزم مشاعرہ ہو تو اپنا کلام اس طرح پیش کریں، گویا وہ کسی بڑی سخت منزل سے گزر رہے ہیں۔ عام شعراء کی طرح وہ "علشت از بام فگندن" کے قایل نہیں۔ حالانکہ ان کا یا کیزہ ذوق سخن اسی کا مقتضی ہے۔

سنا ہے کہ ان کا دیوان زیر ترتیب ہے، لیکن معلوم نہیں کب تک شایع ہو اس لئے ان کے چند اشعار تو آپ اسی وقت سن لیجئے۔ نیاز

نزدیک ہیں وہ دن کہ پس پردۂ جلوہ — پابندیٔ آداب تماشا نہ رہے گی
سن کر کوئی تعبیر نہ دیدے کہیں ورنہ — پاکیزگیٔ خواب زلیخا نہ رہے گی
زندگی میں ایک دن تو ہم کو ملنا چاہئے — زندگی بھر جو یقین سست پیمانی کرے
اس طرح سے بارہا اٹھی ہے شرمگیں نظر — مگر یہ آج دفعتاً سکون دل کو کیا ہوا،
ہزار قافلے رواں ہیں آج راہِ شوق میں — جو ایک کارواں ملے میں بچھڑ گیا تو کیا ہوا
ڈوبنا میرے لئے پھر فرض ہی ہو جائے گا — جانب ساحل اگر طوفان نے پھیرا مجھے
سہی کہ برق تپاں ہے مگر ابھی اس کو — مزاج خار و حس آشیاں نہیں معلوم
کچھ اس طرح سے سجائی گئی تھی بزم جمال — کہ باریاب تماشا بھی باریاب نہ تھے
ضبط کی تلخیوں کے ساتھ ہلکی سی آہ بھی سہی — آؤ، جنون شوق میں ایک گناہ بھی سہی
جہاں تجھے عشق کے سجدے نہ حسن کی نخوت — میں اس مقام سے بھی آپ کو پکار آیا
تلاش ہے عرصۂ ہستی ترے دیوانے پر — اب یہ صحرا بھی باندازۂ سودا نہ رہا
ہر حسرت نگاہ تری جادہ گاہ ہیں، — اپنی جگہ پہ ایک مکمل سوال ہے
وہ ہر مقام جنوں دیکھنے کے قابل ہے — جہاں رکا ہوں جہاں سے گزر گیا ہوں میں
اسے تلاش کی معراج جانتا ہوں میں — کہ ان کو ڈھونڈھ لیا اور کھو گیا ہوں میں
سامنے کی بات ہے سود و زیاں عاشقی — یعنی کھوتے جائیے جتنا کہ پاتے جائیے
یہ بھی آداب محبت ہیں کہ حامد عشق میں — زخم کھاتے جائیے اور مسکراتے جائیے
وہ مضطرب کہ سر بام آج جلوۂ عام — میں فکر مند کہ پروردگار کیا ہوگا،
نئے چمن میں نئی وحشتیں نئے صحرا — جواب کے آئی تو حشر بہار کیا ہوگا
یہ دنیا ختم ہونے کو تو ہو ہی جائے گی لیکن — فرشتے مرتوں دہرائیں گے تاریخ انساں کی
ٹرکے ٹرکے سے ستارے ڈرا ڈرا سا جہاں — مگر مزاج جنوں برہمی پہ آیا ہے،
الٰہی خیر ہو زنداں کی اب کہ پہلی بار — تمام عمر میں دیوانہ مسکرایا ہے
فضائے شوق کی حد ختم ہو گئی ہے جہاں — دل آج ان کو وہاں تک پکار آیا ہے
اسیر اب کہیں ان تیلیوں سے رکتے ہیں — قفس میں اہل چمن کا سلام آیا ہے
وہ دیوانے حقیقت میں متاع موسم گل ہیں — کہ جن کی جستجو میں خود قفس لیکر بہار آئے
کبھی دامن شفق کے کبھی پردۂ سحر کے — وہ نقاب ڈالتے ہو جو نقاب ہی نہیں ہے

جیلوں میں اب کہ دست کو فن کیا ہوئی — اٹھے تو اور بڑھ کے تیسے آستاں سے ہم
افسانۂ اذل ہے بھی خود کہہ رہا ہوں میں — یہ سوچتا ہوں آدمی ہوں یا زمین کا ہے

راغب مرادآبادی :۔

یہ نقش وہ ہے کہ دل سے جسے مٹا نہ سکے
ہمیں جو بھول گئے، ہم اُنھیں بھلا نہ سکے

بساطِ دیر و حرم پر جو چین پا نہ سکے
وہ تیری بزم میں آئے تو آ کے جا نہ سکے

بتائے کون کہ اُن کے دلوں پہ کیا گزری
بہار میں بھی جو ناشاد مسکرا نہ سکے

ہزار مرتبہ رو دادِ غم کہی، لیکن
گزر رہی تھی جو دل پر اُنھیں سنا نہ سکے

وہ نامراد کہاں جائے، کچھ بتا ساقی!
رہے جو تشنۂ مے اور زہر کھا نہ سکے

ساحل بلگرامی :۔

کرم فروش مری تمکنت گھٹا نہ سکے
تھکے ہوئے بھی قدم میرے لڑکھڑا نہ سکے

فریبِ مرگ نے کچھ اتنا کر لیا مسحور
ہم اپنے حالِ زبوں پر بھی مسکرا نہ سکے

بہار آتے ہی یہ زندگی پر اُوس پڑی
کہ شاخِ گل کو بھی دم بھر گلے لگا نہ سکے

یہ زندگی کا عجب سانحہ ہے اے ساحل
گئے وہ ایسے کہ پھر ہم اُنھیں بُلا نہ سکے

نفیس قادری سونگیری :۔

ترے خیال میں دم بھر سکون پا نہ سکے
ہم اضطرابِ غمِ دل کبھی مٹا نہ سکے

غم و الم سے تھی معمور زندگی اپنی
ہزار شکر کہ پھر بھی تجھے بھلا نہ سکے

مقامِ عشق میں یہ بھی خبر نہیں ہم کو
قرار مل نہ سکا یا قرار پا نہ سکے

وہ تیرا راز تری بات ہی نہیں ایدوست
یقین بن کے مرے دل میں جو سما نہ سکے

وہ زندگی کے حقایق سے روشناس نہیں
جنونِ عشق کی جو عظمتوں کو پا نہ سکے

حیات لکھنوی :۔

مرے دل کی طرح روشن مرا گھر ہو تو جانے دو
کبھی پیشِ نظر ایسا بھی منظر ہو تو جانے دو

کوئی حد بھی تو ہو اس وعدۂ مبہم سے کیا حاصل
قیامت ہی سہی اک دن مقرر ہو تو جانے دو

مرا مقصود تو یہ ہے کہ جاں نذرِ تجلّی ہو
گراں یہ بھی تمھاری مصلحت پر ہو تو جانے دو

مجھے معلوم ہے میں درخورِ محفل نہیں پھر بھی
جبیں خم اپنے سنگِ آستاں پر ہو تو جانے دو

حیات امید کیسی انتہائے شامِ ہجراں کی
ابھی تو شام ہی ہے صبح محشر ہو تو جانے دو

مضطر حیدری :۔

کیوں پھول کھلے کیوں مرجھائے یہ سوچنا میرا کام نہیں
جب گردشِ دوراں کے ہاتھوں میں خود ہی بدلتا رہتا ہوں

رُکی زبان تو اشکوں نے آبرو رکھ لی
ہوا نہ ختم کبھی سلسلہ کہانی کا

ان سفینوں کا ڈوبنا بہتر
جن کو ساحل نظر نہیں آتا

عبث ہے تشنہ لبی کا شکوہ نظامِ فطرت سے میگسارو
نگاہِ ساقی بدل گئی ہے، شراب کی کچھ کمی نہیں ہے

وفورِ شوق میں ہم حدِّ امکاں تک تو آ پہونچے
نشانِ راہِ منزل اب خدا جانے کہاں تک ہے

نہ سہی میرا نشیمن رہے پر بہارِ گلشن
مجھے گلستاں کا غم ہے غمِ آشیاں نہیں ہے

سکوتِ بحر کو تم دائمی سمجھ لو مگر مضطر
سبک رفتاریِ موجِ رواں کچھ اور کہتی ہے

مطبوعات موصولہ

تاریخ انقلاب حیدرآباد مشاہدات

تقسیم ہند کے بعد تاریخ ہندوستان کا اہم ترین واقعہ "انقلاب حیدرآباد" تھا، جس کے صحیح تفصیلی حالات حکومت شایع ہی نہ کرسکتی تھی اور اہل حیدرآباد میں کسی کو اس کی جرأت نہ تھی۔ پھر ٹھیک اسی وقت جبکہ ہندوستان کی تاریخ کا نیا ورق اُلٹا جا رہا تھا اور سلطنت مغلیہ کی آخری یادگار (حکومت آصفیہ دکن) کے نقوش مٹنے جا رہے تھے۔ جناب ہوش بلگرامی (نواب ہوشیار جنگ) نے جو حضور نظام کے خاص درباری اور حیدرآباد کے تمام سیاسی تار و پود کے ایک ایک ریشہ سے واقف تھے۔ اپنی آنکھ بیداگرفی مرتب کرنا شروع کی جس کا اصل مقصود یہ تھا کہ حیدرآباد کی سیاست، دربار آصفی کی سازشوں اور وہاں کی جماعت اتحاد المسلمین کی سرگرمیوں اور ریشہ دوانیوں کی صحیح وجامع تاریخ مرتب کرکے ایک ایسا ریکارڈ پیش کیا جائے جسے ان کے سوا کوئی دوسرا پیش ہی نہ کرسکتا تھا۔

حیدرآباد میں حکومت ہند کا پولیس ایکشن بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے لیکن یہ اقدام کیوں اور کس طرح کیا گیا اور اس کے نتائج کیا پیدا ہوئے۔ یہ ایک بڑی دردناک داستان ہے جسے تمام جزئیات کے ساتھ وہی شخص لکھ سکتا تھا جو نظام اور حکومت ہند دونوں کے ارادوں اور اقدامات سے آگاہ ہو اور اُس وقت جبکہ حیدرآباد کے ایک ایک انسان کا دل دھڑک رہا تھا جناب ہوش بلگرامی ہی تنہا ایسے شخص تھے جن کے ذریعہ سے نظام اور نمایندگان حکومت ہند کے درمیان انتہائی رازدارانہ پیغام و مراسلت ہوا کرتی تھی اور جنھوں نے اپنی جان پر کھیل کر حیدرآباد کو تباہی و بربادی سے بچانے کی انتہائی کوشش کی۔

پھر اگر آپ اس عجیب و غریب داستان کے تمام تفصیلی حالات جاننا چاہتے ہیں تو "مشاہدات" ملاحظہ کیجئے جو علاوہ تاریخی اہمیت کے ادب و انشا کی حیثیت سے بھی خاص امتیاز کی مالک ہے۔

یہ کتاب نہایت نفیس کاغذ پر متعدد تصاویر کے ساتھ مجلد شایع ہوئی ہے اور مع محصول ڈاک کے بارہ روپیہ میں دفتر نگار لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

تاریخ زبان اُردو

تصنیف ہے ڈاکٹر مسعود حسین خاں استاد شعبۂ اُردو مسلم یونیورسٹی کی جس کا دوسرا اڈیشن کافی اضافہ کے بعد آزاد کتاب گھر دہلی نے شایع کیا ہے۔

اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۴۸ء میں شایع ہوا تھا اور اہل فکر و ذوق نے اس کو بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا تھا، اب دوسرا اڈیشن چونکہ مزید اضافوں کے ساتھ شایع ہوا ہے اس لئے اسے "پسندیدہ تر" ہونا ہی چاہئے۔

یہ کتاب چار ابواب میں منقسم ہے۔ پہلے باب میں آریائی زبان کی تاریخ اور اس کے مختلف ادوار سے بحث کی گئی ہے، دوسرے باب میں ہندوستان کی موجودہ آریائی زبانوں اور ان کی تقسیم و انشعاب کا ذکر ہے، تیسرے باب میں ہندوستانی کے منازل ارتقا اور اُردو کے نشو و نما کی تاریخ پیش کی گئی ہے اور چوتھے باب میں تقابلی مطالعہ کیا گیا ہے، برج بھاشا، دکنی، پنجابی کا اور اسی سلسلہ میں پروفیسر شیرانی کے لسانی نظریہ پر بھی فاضلانہ نقد و تبصرہ کیا گیا ہے۔

اس وقت تک زبان اُردو کی تاریخ پر متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں، بعض مختصر، بعض بسیط اور چند بسیط تر، لیکن یہ کتاب ہیں زاویۂ نظر سے لکھی گئی ہے وہ زیادہ وسیع ہے اور ۱۰۰۰ قبل مسیح سے لیکر عہد اورنگ زیب (۱۷۰۷ء) تک تقریباً دو ہزار سال کی لسانی تحلیل

وتحویل کی تاریخ پیش کرتی ہے۔

سب سے پہلے آزاد نے آبِ حیات میں اس نوع کی تحقیق کی ابتدا کی تھی اور ضرورت تھی کہ پچھلی نصف صدی میں جو نئی معلومات اس باب میں حاصل ہوئی ہیں ان کو سامنے رکھ کر آزاد کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر کوئی عمارت قایم کی جائی۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اسی خدمت کو انجام دیا ہے اور نہایت خوبی کے ساتھ۔

یونتو یہ کتاب مختصر ہے اور صرف ۲۶۰ صفحات کو محیط ہے، لیکن بہ لحاظ تحقیق استنتاج بڑا وزن رکھتی ہے اور ہر اس شخص کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیئے جو اس موضوع سے دلچسپی رکھتا ہے۔ قیمت چار روپیہ۔

افکارِ غالب تصنیف ہے ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کی جسے مکتبۂ معین الادب اُردو بازار لاہور نے نہایت اہتمام سے مجلد شایع کیا ہے۔ تقطیع ۱۸×۲۲، ضخامت ۳۵۵ صفحات۔ قیمت ۸ے

غالب کی زندگی، شاعری، اور اس کے فلسفہ پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے، مضامین کے ذریعہ سے بھی اور مستقل تصانیف کی صورت میں بھی، لیکن اب بھی ہر سال کوئی نہ کوئی قابلِ قدر کتاب اس کے متعلق شایع ہو جاتا ہے، چنانچہ حال ہی میں افکارِ غالب کے نام سے ایک کتاب شایع ہوئی ہے، جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے یقیناً ایک نئی تلاش کہی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب ملک کے مشہور نقادوں میں سے ہیں اور دُنیائے تصنیف و تالیف میں خاص شہرت رکھتے ہیں ان کا شاعرانہ ذوق، ان کا فلسفیانہ مطالعہ اور ان کی قوتِ نقد سب مسلمات میں سے ہیں اور اس کتاب میں ان تینوں باتوں کا اجتماع نظر آتا ہے۔

ان کی قوت نقد کا علم ہمیں کتاب کے مقدمہ سے ہو سکتا ہے جس میں انھوں نے نہایت بالغ نظری سے غالب کی شاعری کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اس کے بیان حکمت کو خصوصیت کے ساتھ بہت سراہا ہے۔ یہ مقدمہ ۷۰ صفحات پر مشتمل ہے اور بجائے خود ایک تصنیفی حیثیت رکھتا ہے۔

اس کے بعد انھوں نے کئی سو صفحات میں غالب کے اُردو فارسی کے حکیمانہ اشعار کا انتخاب کر کے ان کی شرح کی ہے اور پھر صرف فارسی کے حکیمانہ اشعار لیکر ان کی وضاحت فرمائی ہے۔ اس کے بعد "طوفانِ آرزو" کا عنوان علاوہ قایم کر کے اس کے مخصوص نظریۂ حکمت کو سامنے رکھ کر حکیمانہ انداز میں صراحت کی ہے۔ اخیر میں اس کے فارسی اُردو کے متفرق اشعار لے کر ان کا مطلب بیان کیا ہے اور اسی کے ساتھ چند رباعیاں بھی درج کی ہیں۔

کلام غالب کی سب سے پہلی شرح ہم کو حالی کی یادگارِ غالب میں نظر آتی ہے، اس کے بعد کافی زمانہ گزر جانے کے بعد اور لوگوں نے بھی اس طرف توجہ کی، لیکن اس کے فارسی کلام کو کسی نے نہیں چھوا اور یہ بڑی کمی تھی جسے اب خلیفہ صاحب نے پورا کیا ہے۔

فاضل مصنف نے اس کتاب میں غالب کے نظریۂ حیات اور اس کے مختلف نظریوں کو اتنی خوبی سے پیش کیا ہے کہ وہ بجائے خود فلسفہ کی تصنیف ہو کر رہ گئی ہے، لیکن اندیشہ یہ ہے کہ اس کے مطالعہ کے بعد لوگ کہیں غالب کی شاعری کے ان محاسن کی طرف سے بے پروا نہ ہو جائیں جو فلسفہ و حکمت سے قطع نظر اپنی اک جداگانہ مستقل حیثیت رکھتے ہیں اور اس طرح یہ کتاب خود غالب کی نگاہ میں "مانا بود یکے بدیر مرتبہ راضی غالب" کی حیثیت اختیار کرلے۔

بنگال میں اُردو مشرقی پاکستان کے موجودہ مسایل میں ایک اہم مسئلہ زبان کا بھی ہے اور مشرقی بنگال اس کے ماننے کے لئے طیار نہیں کہ اُردو وہاں کی مادری یا قومی زبان قرار دی جائے لیکن اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں کہ یہ اختلاف صحیح ہے یا غلط، تاہم یہ ضرور کہیں گے کہ اس مسئلہ میں اُردو کے بعض ادیبوں کو یہ خیال ضرور پیدا ہو گیا ہے کہ وہ اہلِ بنگال کے دل سے یہ بات نکال دیں کہ اُردو ان کے لئے بالکل اجنبی زبان ہے، چنانچہ کتاب زیر تبصرہ بھی اسی نقطۂ نظر سے لکھی گئی ہے اور اس میں بتایا گیا ہے کہ

اُردو بنگال کے لئے کوئی نئی چیز نہیں ہے بلکہ صدیوں سے وہ یہاں کی ادبی زبان بنی ہوئی ہے

فاضل مصنف نے اس تاریخ کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے، پہلا دور فورٹ ولیم کالج کا ۱۸۰۰ء سے ۱۸۲۵ء تک کا، دوسرا دور جب وہاں شاعری کا عروج ہوا (۱۸۲۵ء تک)، تیسرا دور ۱۹۰۱ء تک اور چوتھا ۱۹۵۰ء تک اور ان تمام ادوار کے ادیبوں اور شاعروں کا ذکر کرکے اُن شاعری و ادبی خدمات کا ذکر کیا ہے۔ اسی کے ساتھ انھوں نے یہ بھی بتایا ہے کہ بنگال کے کتنے اخبار اُردو کے جاری ہوئے اور کتنی انجمنیں قایم ہوئیں۔

یہ کتاب بنگال میں اُردو کے نشو و نما کی جامع تاریخ بھی ہے اور ایک بسیط تذکرہ بھی۔ وہاں کے متعدد ہندو مسلمان شعراء اور انکے منتخب اشعار کا۔ اور اس کے فاضل مصنف جناب وقار راشدی نے جس محنت و کاوش کے ساتھ اسے مرتب کیا ہے وہ یقیناً قابلِ ستایش ہے

ہمیں امید ہے کہ اُردو زبان سے دلچسپی رکھنے والے ضرور اس کا مطالعہ کریں گے اور نوجوان مصنف کا حوصلہ بڑھائیں گے تاکہ وہ اپنی تحقیق کا سلسلہ آیندہ بھی جاری رکھ سکیں۔

متعدد شعراء کی تصاویر نے اس کتاب کو اور زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ اس کی ضخامت ۹۶ صفحات ہے اور مکتبہ اشاعت اُردو حیدرآباد سندھ سے پانچ روپیہ میں مل سکتی ہے۔

سنگ میل دوسرا مجموعہ ہے جناب یعقوب عثمانی پروفیسر اورنگ آباد کالج کی ۳۲ نظموں اور متعدد غزلوں کا جو ۱۹۴۷ء سے ۱۹۵۳ء تک انھوں نے لکھی ہیں۔ یعقوب عثمانی ہیں تو اس دور کے نئے شاعر لیکن اتنے نئے نہیں کہ لوگ ان کے نام سے ناآشنا ہوں، اس سے پہلے ان کی غزلوں کا مجموعہ "شعر و نغمہ" کے نام سے شایع ہو کر تمام سنجیدہ ارباب ذوق کی داد حاصل کر چکا ہے، فرق یہ ہے کہ "شعر و نغمہ" میں وہ صرف غزل گوئی کی حیثیت سے سامنے آئے تھے اور سنگ میل میں ان کی "نظم نگاری" کا روشن رخ بھی ہمارے سامنے ہے۔

یعقوب صاحب کی شاعری ایک ایسے لکھے پڑھے شخص کی شاعری ہے جو حد درجہ مہذب و شایستہ بھی ہے اور مصلح و مودب بھی۔ ان کی شاعری کا مقصود الفاظ سے کھیلنا نہیں، بلکہ ان کے ذریعہ سے مقاصدِ حیات کی راہیں متعین کرنا اور شعر گوئی کا ایک سنجیدہ و دلکش معیار قایم کرنا ہے، ان کی غزلیں ہوں یا نظمیں سب میں زندگی جھلکتی ہے۔ اور ان کو پڑھ کر ایک خاص قسم کا سکون محسوس ہوتا ہے۔ اندازِ بیان کی ندرت، مضمون کی بلندی، الفاظ کی خوبصورت نشست، تراکیب کی حلاوت، ان کی شاعری کی وہ مخصوصیات ہیں جو ان کے پہلے مجموعہ میں بھی ہم کو جگہ جگہ نظر آتی تھیں، لیکن اس مجموعہ میں یہ رنگ اور زیادہ چوکھا ہو گیا ہے۔

یہ مجموعہ پروفیسر ہادی الفادری نظام کالج حیدرآباد اور یوسف عثمانی صاحب محلہ گھاٹی اورنگ آباد سے دو روپیہ میں مل سکتا ہے

تب و تاب مجموعہ ہے مولوی محمد یحییٰ تنہا کی نظموں اور غزلوں کا جسے علمی ادارہ ۔ راج گڑھ روڈ لاہور نے شایع کیا ہے

جناب تنہا نہ ادیب و شاعر نہیں ہیں، بلکہ کارانِ شعر و ادب میں ان شمار ہوتا ہے اور جنھوں نے ان کے مشہور تذکرہ "مرآۃ الشعر" کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ان کا مطالعۂ ادب کتنا وسیع ہے۔

ان کا رنگِ سخن یکسر اصلاحی ہے جو نتیجہ ہے حالی کے مطالعہ کا۔ وہ ہر بات کام کی کہنا چاہتے ہیں اور بالکل "کار آگہانہ" انداز سے اس لئے ان کے کلام میں شاعرانہ دلچسپی ہو یا نہ ہو، لیکن معلومات افزائی ضرور ہے جس کی آج کل ہمیں سخت ضرورت ہے۔

جناب تنہا میرٹھ کے رہنے والے ہیں لیکن تقسیم ہند کے بعد وہ لاہور چلے گئے اور اب ایک سال سے کراچی میں مقیم ہیں۔ ان کی زندگی کا مشغلہ صرف لکھنا پڑھنا ہے اور علم و ادب کی جو خدمت وہ یہاں ہندوستان میں انجام دیتے تھے، اب پاکستان میں انجام دے رہے ہیں۔

اس مجموعہ کی قیمت دو روپیہ آٹھ آنے ہے

ترانۂ دل دوسرا مجموعہ ہے حضرت دل شاہجہانپوری کی غزلوں کا۔ اس سے پہلے ۱۹۳۲ء میں نغمۂ دل کے نام سے ایک مجموعہ شایع ہو چکا تھا، لیکن ضرورت تھی کہ اس کے بعد جو غزلیں انھوں نے لکھی ہیں وہ بھی اس میں شامل کر دی جائیں اور اس طرح یہ مجموعہ کلیات کی حیثیت رکھتا ہے۔

حضرت دل کا شمار اس وقت کے مشہور و مستند اساتذہ میں ہے اور اس حیثیت سے کہ جناب امیر مینائی کی رحلت کے بعد متفقہ طور پر انھیں کو مرحوم کا جانشین قرار دیا گیا وہ صف اساتذہ میں بھی ایک خاص مرتبہ کے مالک ہیں حضرت دل اس عہد کی یادگار ہیں جب اردو تغزل میں داغ اور امیر و جلال کے رنگ میں ہر محفل شعر و سخن رچی ہوئی تھی۔

داغ کے بعد ان کے تلامذہ میں بیخود دہلوی اور نوح ناروی نے اپنے استاد ہی کے رنگ میں نام پایا اور سیماب نے بھی خاص شہرت حاصل کی لیکن پیرو داغ ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ اس رنگ کو چھوڑ دینے کی بنا پر۔ امیر کے بعد ان کے تلامذہ میں ریاض، جلیل اور دل شاہجہانپوری نے شہرت پائی اور ان میں سے ہر ایک نے بجائے خود استادانہ حیثیت حاصل کر لی۔ ریاض کا رنگ بہت کچھ اپنے استاد سے ملتا تھا، لیکن جلیل و دل کا انداز بدلا اور ماضی کی روایتی شاعری میں انھوں نے مستقبل کے امکانات کو بھی جگہ دی۔ جلیل کا ماحول ایسا تھا کہ وہ اپنے فطری میلان کی پوری رعایت نہ کر سکے، لیکن دل شاہجہاں پوری خود اپنے جذبات کے مالک تھے اور کسی ناموافق ماحول کے زیر اثر نہ تھے، اس لئے انھوں نے اپنے استاد کی ڈالی ہوئی داغ بیل پر ایک نئی عمارت قایم کی جو زیادہ دلکش اور زیادہ خوبصورت تھی۔

حضرت دل کے تغزل کی سب سے بڑی خصوصیت یہ نہیں کہ وہ اسقام و عیوب سے پاک ہے، کیونکہ یہ اس دور کے شاعر میں جب شعر ایک مستقل فن سمجھا جاتا تھا اور فن کی حیثیت سے اس پر عبور حاصل کیا جاتا تھا، بلکہ یہ بھی ہے کہ ان کے یہاں سوقیت و ابتذال کا پتہ نہیں اور ان جذبات کے اظہار میں بھی وہ متانت ہاتھ سے جانے نہیں دیتے جن کے اظہار میں ان کے استاد بھی کھل کھیلتے تھے۔ صبر و ضبط، احتیاط فطرت، دل کی فطرت ہے اور ان کی یہ فطرت ہر ہر شعر میں نمایاں ہے۔

ان کا کلام لفظی صناعت یا ابہام سے بالکل پاک ہے اور اپنے انداز بیان کے لحاظ سے گونا گوں دلکشی اپنے اندر رکھتا ہے۔ ملاحظہ ہو جون ۱۹۵۵ء کا نگار جس میں مینے ان کا مختصر سا انتخاب پیش کیا ہے۔ میرا ایک مبسوط مقدمہ بھی کلیات میں شامل ہے جس میں ان کی شاعری کی تمام خصوصیات پر مینے مفصل گفتگو کی ہے۔

یہ مجموعہ ہے میں شفیق حسن خاں صاحب محلہ ہاتھی خان، شاہجہاں پور سے مل سکتا ہے۔

جام فروزاں دیوان ہے سید بشیر حسین بشیر کا، جسے نہایت اہتمام کے ساتھ خود انھوں نے شایع کیا ہے۔ دیوان کھولتے ہی ہمیں سب سے پہلے مولانا آزاد سبحانی کا مقدمہ نظر آتا ہے، اس کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادی کا پیش لفظ اور پھر حضرت اثر لکھنوی کا تبصرہ۔ جناب بشیر، اکبر الہ آبادی کے نواسے ہیں، لیکن ان کا رنگ شاعری اپنے نانا سے بالکل مختلف ہے۔ اعتبار و بصیرت ہمیں اکبر کے یہاں بھی ملتے ہیں، لیکن رنگ، ظرافت میں، جناب بشیر کے یہاں یہ چیز بالکل برافگندہ نقاب نظر آتی ہے۔ بشیر صاحب بڑے خوش اوقات، بڑے مزاح، نہایت بلند اخلاق کے انسان ہیں اور انھیں خصوصیات کے ساتھ اک انتہائی درد مند دل بھی رکھتے ہیں، جس نے ان کی شاعری میں بلندی، پاکیزگی اور نفاست پیدا کر دی ہے۔ حقایق معرفت کا بیان ان کا خاص ذوق ہے، لیکن خشک اصطلاحی انداز کا نہیں، بلکہ صحیح عاشقانہ رنگ کا جس سے براہ راست ہمارا وجدان متاثر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ دوسری خصوصیات ان کے کلام کی یہ ہے کہ فنی حیثیت سے بھی وہ اسقام و عیوب سے پاک ہے۔

اخیر میں چند نظمیں بھی درج ہیں اور نظم کی تمام خصوصیات اپنے اندر رکھتی ہیں۔ یہ مجموعہ ۸ء میں انتظامی پریس کانپور سے مل سکتا ہے۔

ہندوستان میں مذہب اسلام پر نظر ثانی کی ضرورت اردو ترجمہ ہے جناب آصف فیضی کے ایک انگریزی مقالہ کا جو مڈل ایسٹ جرنل میں شایع ہوا تھا۔

مقالہ کا موضوع نام سے ظاہر ہے اور جس ضرورت کے پیش نظر موصوف نے یہ مقالہ لکھا ہے اس کی اہمیت سے کسی صاحب نظر کو انکار نہیں ہو سکتا۔ موصوف نے مذہب اسلام کے اصولی عقاید سے بحث نہیں کی ہے بلکہ صرف ان مسایل کو لیا ہے جو انصاب تعلیم اور قانون یا شریعت سے متعلق ہیں اور اس سے غالباً ہمارے بعض موجودہ علماء کو بھی اتفاق ہوگا کہ اقتضاء زمانہ کے [illegible] یقیناً ان میں تغیر و تبدل کا شدید ضرورت ہے۔ مقالہ میں اس تحریک کے تمام پہلوؤں کو سامنے رکھ کر اکابر علم کو غور کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور بعض ان اکابر علم و فضل کا بھی ذکر کیا ہے جو اس نوع کے تغیر و تبدل کی ضرورت کو اس سے قبل محسوس کر چکے تھے۔ اس میں شک نہیں یہ مقالہ باوجود اختصار کے بڑی جامعیت رکھتا ہے اور ہمیں امید ہے کہ اگر سب نہیں تو چند علماء دین ضرور اس طرف متوجہ ہوں گے۔ ترجمہ چودھری رحم علی ہاشمی نے کیا ہے۔ قیمت ۱۰ر۔ ملنے کا پتہ:۔ مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی۔

اغوا ناول ہے جناب حکیم کوثر چاندپوری کا جسے مکتبۂ جمالستان، چیا محل، دہلی نے شایع کیا ہے۔ کوثر صاحب ملک کے مشہور ادیب و انشا پرداز ہیں اور اس وقت تک وہ خدا جانے کتنے افسانے و ناول لکھ چکے ہیں۔ جب تک افسانوں کا دور رہا انھوں نے افسانوں کے ذریعہ سے ادب کی گرانقدر خدمات انجام دیں اور اب کہ ناول کی طرف ملک کو توجہ ہوئی ہے، وہ ناول لکھ کر اس فریضہ کو ادا کر رہے ہیں۔

اس ناول میں انھوں نے معاشی و جنسی گتھیوں کو نہایت خوبی سے سلجھایا ہے اور ناول نویسی کی تمام خصوصیات کو جو تجزیۂ کردار، ترتیب واقعات اور جذبات کے اُتار چڑھاؤ سے تعلق رکھتے ہیں، کسی جگہ ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ ناول کی بڑی خوبی اس کا تدریجی پھیلاؤ ہے جو اخیر میں ایک نقطۂ عروج پر پہونچ کر کسی خاص منزل کی طرف ہماری رہبری کرتا ہے اور یہ خصوصیت اس ناول میں بدرجۂ اتم پائی جاتی ہے بعض مقامات پر البتہ انھوں نے بعض غیر ضروری وضاحتوں سے کام لیا ہے، حالانکہ وہ انھیں باتوں کو زیادہ سنجیدگی کے ساتھ پیش کر سکتے تھے۔ امید ہے کہ کوثر صاحب کی ان ادبی کوششوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ ضخامت ۲۳۲ صفحات۔ قیمت تین روپیہ

توڑ دو زنجیریں ناول ہے حضرت کوثر چاندپوری کا جسے جھلک بک ڈپو علیگڈھ نے شایع کیا ہے۔ اس کا پس منظر وہ زمانہ ہے جب آزادی ہندوستان سے قبل تمام ملک اور خصوصیت کے ساتھ ریاستوں میں آزادی کے خلاف زیادہ سختیاں شروع ہو گئی تھیں اور ان زنجیروں کو توڑنے کے لئے عام ہیجان پیدا ہو چلا تھا۔

ایسے ماحول اور ایسے زمانہ میں جو جذباتی کشمکش پائی جاتی ہے، اس کو سامنے رکھ کر کوئی ایسا ناول لکھنا جو اعتدال و توازن کو قایم رکھ سکے آسان بات نہ تھی۔ لیکن چونکہ کوثر صاحب فطرتاً بہت سنجیدہ اور مفکر قسم کے انسان ہیں، اس لئے انھوں نے منزل کو بڑی کامیابی سے طے کیا اور ایسا پلاٹ تجویز کیا جس میں افادیت و دلچسپی دونوں اپنی اپنی جگہ قایم رہیں۔

زبان و مکالمہ کی خوبی اور جزئیات نگاری کے علاوہ اس میں ہم کو وہ ہوش و ولولہ بھی نظر آتا ہے جو ماحول کا صحیح اقتضا تھا۔ کہیں کہیں اس میں خطابت کا رنگ بھی پیدا ہو گیا ہے جو اپنی جگہ پر وزن رکھتا ہے۔ کوثر صاحب بڑے مشاق ناول نگار ہیں اور بڑے سلیقہ کے ساتھ وہ اپنے کرداروں کو آگے بڑھاتے ہیں۔

واقعات اور قصہ کے تار و پود کے لحاظ سے بھی یہ ناول کافی دلچسپ ہے۔ ضخامت ۲۱۶ صفحات۔ قیمت [illegible]

گنجایش کی کمی

کے وجہ سے بعض کتابوں کا ریویو اس مہینہ میں شایع ہونے سے رہ گیا۔ آیندہ مہینہ میں انھیں درج کیا جائے گا۔ منیجر

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۴۸ء
جنوری ، فروری

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی

قیمت دو روپے
علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۴۹ء
جنوری ، فروری

نگار کا افسانہ نمبر ہے جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کئے گئے ہیں۔ اس سالنامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جاسکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا سہاری فسانہ کیسا ہونا چاہیئے

قیمت دو روپے
علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۰ء (حسرت نمبر)

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد اور شعرا نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اصل مذاق سے کیا گیا ہے تاکہ آپ کلیات حسرت کو دیکھنے کی ضرورت نہ ہو گو کلیات حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم ہو سکے لیکے اسکا مطالعہ ضروری ہے

قیمت دو روپے علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۱ء
جنوری ، فروری

اس سالنامہ کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں اردو ہندی کی مشہور عالم کتاب ایک مستقبل کی تلاش کا ترجمہ اقتباس ہے جس میں ایران مصر عراق فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور ساتھ ہی بتایا گیا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہو اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ ادیب نگار کے قلم کا ہے جسمیں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اسکے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے قیمت عکر

علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۲ء
جنوری ، فروری ، مارچ

جو فن اقتصاد پر ملک کے بہترین اہل قلم اور ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے قیمت دو روپیہ

علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۳ء
جنوری ، فروری

(داغ نمبر)

جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کئے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رام پور، قیام حیدرآباد کے زمانہ کے علاوہ ان کی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور انکے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت دو روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۴ء
جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں یاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے تین شاعر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ یاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ۸ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۴ء
(فرمان روایان اسلام نمبر)

یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لیکر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر انکے اسباب عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ دراصل تاریخی کتاب ہے۔ جو ہر گھر کے پڑھے کے پاس ہونا چاہیئے۔ قیمت تین روپیہ

علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۵۵ء
(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر مع تتمہ)

جس میں اسلامی علوم و فنون پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم فنون کی ترقی میں کیا حصہ کیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات دے کر ان کی علمی خدمات اور تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے

قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۴۸ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے۔ مومن کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپے

مکتوباتِ نیاز

(تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو مذہب، سیاست، بیان، تنقید اور ادبیات کے لحاظ سے نئے انشاء میں بالکل نئی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں ان ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کر دیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر طباعت ہوئی ہے

قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ علاوہ محصول

نقاب اٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے چند افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ پردے کے پیچھے انسانوں کا اصلی چہرہ کیا ہے اور ان طریقت و خانقاہ کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرتی حیات کے لیے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ، انشاء کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ صرف دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔

قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ جس کی تمام نشو و نما عشق کیفیات اس سلسلے کی ایک جلد میں موجود ہے یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشاء کے لحاظ سے اس قدر بلند چیز ہے کہ دوسری جگہ اس کی نظیر نہیں مل سکتی تازہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط

قیمت بارہ آنے علاوہ محصول

جذباتِ بھاشا

جناب نیاز نے ایک دلچسپ تمہید کے ساتھ بہترین ہندی شاعری کے نمونے پیش کر کے اُن کی اپنی تشریح کی ہے کہ دل بیتاب ہو جاتا ہے، اُردو میں یہی سب سے پہلی کتاب اس موضوع پر لکھی گئی ہے جس میں ہندی شاعری کے بے مثل نمونے نظر آتے ہیں۔

قیمت بارہ آنے

علاوہ محصول ڈاک

شہاب کی سرگزشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم النظیر افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے اس کی زبان، تکمیل، اس کی نزاکت بیان اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوش خط ہے۔

قیمت دو روپے

علاوہ محصول ڈاک

مذاکراتِ نیاز

یہ حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے ایک بار اس کو شروع کر دینا اخیر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کا غذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے

علاوہ محصول ڈاک

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ جس میں شاعری پر ان کے نظریات ہیں۔ ایران و ہندوستان کا اثر جو ہماری شاعری پر پڑا ان زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تبصرہ، اردو غزل گوئی کی حد سے زیادہ ترقی، نقادانہ نگاہ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول نقد، فنون ادبیہ و حقیقت نگاری

قیمت چار روپے علاوہ محصول

فراست الید

مؤلفہ نیاز فتحپوری

اس کے مطالعہ سے ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اس کی لکیروں کو دیکھ کر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، صحت، عروج و فعالی، عمر، دولت، بیماری، شہرت و ننگ نامی پر بحث پیش کر سکتا ہے

قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ مشہور مضمون جس کو سرکار آلا نے ضبط کر لیا تھا اس میں انہوں نے دنیا کے مذہب کا تنقیدی مطالعہ کیا ہے اور دنیا میں کیونکر رائج ہوا اس کے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی

ہندی کا [illegible] ہے قیمت [illegible] علاوہ محصول

سالانہ چندہ ہندوستان و پاکستان
آٹھ روپیہ چھ آنہ (مع سالنامہ)

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی دس آنہ ۱۰/

تصانیف نیاز فتح پوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ 'نگارستان' نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد ضمائم غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کیے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہے۔
قیمت چار روپیہ للعہ/ (علاوہ محصول)

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات یورپی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا' ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے' اس ایڈیشن میں خود افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔
قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے صہر (علاوہ محصول)

من و یزداں

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک خیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے جس میں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور مخالف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی علمی' اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشائیاں اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے
قیمت سات روپیہ آٹھ آنے مجہ (علاوہ محصول)

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس و ایون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) (۱۶) عالم برزخ (۱۷) یاجوج ماجوج (۱۸) ہاروت ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) فور قہری (۲۲) آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۲۲۰ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت صہر

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشائیہ لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ واضح ہو گا کہ تاریخ کے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے' قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)

ترغیبات جنسی یا شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام فطری و غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی' نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو عبرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ایڈیشن۔ قیمت چار روپیہ للعہ/

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گمشدہ فلاسفہ قدیم کی روحوں کے ساتھ (۲) مانی کا مذہب' نہایت مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت (بکر روپیہ) علاوہ محصول

۵۶ء میں دو خاص نمبر

شایع ہوں گے

ایک "خدا نمبر" جنوری ۵۶ء میں دوسرا "اُردو نمبر" جولائی ۵۶ء میں۔ ہو سکتا ہے کہ "اُردو نمبر" جنوری میں شایع کیا جائے اور "خدا نمبر" جولائی میں۔ اس کا فیصلہ قارئین "نگار" پر چھوڑا جاتا ہے۔

"خدا نمبر" کے بابت بعض تفصیلات آپ کو معلوم ہو چکی ہیں۔ "اُردو نمبر" کے بعض عنوانات یہ ہوں گے:

اُردو زبان ــــ اُردو دکن اور دہلی میں ــ اہلِ دہلی اور اہلِ لکھنؤ ــــ اُردو کے تنزل کے اسباب۔ اُردو کے ارتقائی منازل ــــ اُردو نثر سو سال میں ــــ اُردو ادب کا سماجی پس منظر ــــ ہندوستانی اور اُردو۔ اُردو قومی زبان کی حیثیت سے ۔ وغیرہ

منیجر نگار

پاکستان کے خریدارانِ "نگار"

سالانہ چندہ (۴ روپے) ذریعہ منی آرڈر ذیل کے پتہ پر روانہ فرمائیں اور رسید ڈاک خانہ ہمارے پاس لکھنؤ بھیج دیں ۔ ہماری مطبوعات بھی اسی پتہ پر خط و کتابت کرنے سے مل سکتی ہیں:۔

ڈاکٹر ضیاء عباس ہاشمی ۔ ۱۰۵، سوبھ راج چیتول روڈ۔ ویسٹ گارڈن ۔ کراچی

اگر ۱۵ تک کسی ماہ کا پرچہ آپ کو نہ ملے

تو اطلاع ملنے پر آیندہ ماہ کے پرچہ کے ساتھ ہم اپنے صرف سے فراہم کر دیں گے لیکن اگر آپ اس سے قبل چاہیں گے تو بیرنگ روانہ ہوگا۔ (کیونکہ مہینے کے اندر اندر پیڈ بھیجنے میں ہم کو چھ گنا محصول ادا کرنا ہوگا) اس لئے جب آپ پرچہ نہ پہونچنے کی اطلاع دیں تو یہ ضرور لکھ دیجئے کہ آپ فوراً چاہتے ہیں یا اگلے پرچہ کے ساتھ۔

منیجر نگار لکھنؤ

بعض کمیاب کتابیں

سوانح اُردو

آثارِ غالب ---- شیخ محمد اکرام --- معہ
غالب ------- غلام رسول مہر --- معہ
یادگارِ غالب --- حالی ------ معہ
المغزالی ------ شبلی ------ ۳
تذکرہ کاملانِ رام پور ---------- عہ
تذکرہ شیخ عبدالحق محدث دہلوی ----- صہ
مشاہیر عالم طبقۂ حکماء ---------- صہ
الہارون ------ مصباح الدین --- ۳
حیاتِ انیس ---- اشہری ----- معہ
واقعاتِ انیس ---- احسن ------ ۳
قاموس المشاہیر حصّۂ اول ------- عہ
البرامکہ ------ عبدالرزاق --- عہ
نورجہاں بیگم ---- اشہری ----- ۳
سیرۃ النعمان ---- شبلی ------ ۳
حیاتِ خسرو ---------- صہ
مندر ادیب ---- ناظر کاکوری ---- ۳

تذکرہ اُردو

گلِ رعنا ------ عبدالحی ------ ۳
سخن شعراء نساخ ---------- عہ
گلشنِ ہند ------ ڈاکٹر زور ------ معہ
آبِ بقا ------ عشرت ---- للعہ
بہارِ سخن ------ سندر لال ---- عہ
چمنستانِ شعراء --- شفیق ------ عہ
خطباتِ گارساں دتاسی ---------- عہ
سراپا سخن ---- محسن علی ------ عہ
تذکرۂ ہندی ------ مصحفی ---- عہ
دستورالفصاحت --- یکتا ------- عہ
پنجاب میں اُردو --- شیرانی ------ عہ

سفرنامے اُردو

حکیم ناصر خسرو ---------- ۳

سیر و سیاحت --- ڈاکٹر برنیر ---- ۳

ادب اُردو

دیوانِ میر حسن ---------- عہ
خمخانۂ عشق ---- امیر مینائی ----- معہ
مراۃ الغیب ---- امیر مینائی ----- ۳
کلیاتِ ناسخ ---------- معہ
تاجِ سخن ------ جلیل ------ ۳
کلیاتِ سودا ---------- ۳
دیوانِ مجروح ---------- ۳
کلیاتِ تسلیم ---------- صہ
نشتر ------ یاس عظیم آبادی --- عہ
آیاتِ وجدانی ---- یگانہ ------ ۳
کلیاتِ میر ---------- ۳
کلیاتِ مومن ---------- ۳
دیوانِ ولی دکنی ---------- صہ
کلیاتِ نظیر / زندگانی بے نظیر --- شہباز ----- ۳
دیوانِ قلق ---------- ۳
نقشِ فغانی ---------- ۳
کلیاتِ نظیر ---------- ۳
کلیاتِ تراب ---------- ۳

تاریخ اُردو

گنجِ شائگاں ---- تاریخ سکہ جات مصور - صہ
احسن التواریخ - تاریخ اودھ --- تمنا --- معہ
تاریخ الاسلام --- احسان اللہ --- عہ
آثارالصنادید - پہلا اڈیشن ---------- ۳
تاریخ ڈھاکہ ---- طیش ------ عہ
صناديد عجم، مہدی حسین، ادب فارسی کی تاریخ .. ۳
تاج التواریخ - تین جلد مصور --- نصرت علی --- عہ
دربار اکبری ---- آزاد ------ ۳

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی
کہ آپ کا چندہ اکتوبر میں ختم ہوگیا اور نومبر کا "نگار"
آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں وی۔پی ہوگا جس میں

نگار

سالنامہ ۵۵ء کی قیمت (مع مصارف رجسٹری) بھی شامل ہے

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۸ | فہرست مضامین اکتوبر ۵۵ء | شمار ۴

ملاحظات ---------- ۳
نیتشے کی مفکرانہ حیثیت -- پروفیسر ڈاکٹر جعفر حسن -- ۵
ترکوں کے عہد کا ایک رومان --- "ق" ---------- ۱۷
لڑائیوں کی پیشین گوئیاں ---------- ۲۱
نوم طویل ---------- ۲۵
فنونِ لطیفہ اور علم الاخلاق ---------- ۲۸
نوجوان شاعروں کی ہدایت کے لئے ---------- ۳۱
فنِ تحریر کی تاریخ --- محمد اسحاق صدیقی ---------- ۴۰
گاہے گاہے باز خواں ---------- ۴۵
منظومات - ساقی جاوید۔ فضا ابن فیضی۔ جگیشؔ ناتھ ورما بیتابؔ۔ پروفیسر شوکت شفیق۔ روش صدیقی بسیفؔ۔ نورجہاں نصرتؔ۔ اکرم شفقتؔ ۴۹
مطبوعات موصولہ ---------- ۵۴

ملاحظات

کشمیر چلو ایک نعرہ ہے جو اس وقت پاکستان کی بعض جماعتوں کی طرف سے سننے میں آرہا ہے۔ یہ خیال اول اول اہلِ پاکستان کو گوا کی ستیاگرہ سے پیدا ہوا تھا۔ اس کے بعد جب ہندوستان نے اس تحریک کی مخالفت کی تو انھوں نے اس کی توجیہ یہ کی کہ ہندوستانی حکومت نے کشمیر چلو کی تحریک سے ڈر کر ایسا کیا ہے، حالانکہ اس کا سبب نہ پاکستان کا خوف تھا نہ پرتگالی حکومت کا بلکہ اس کا تعلق بالکل ستیاگرہ کے اصول سے تھا جس کو گوا کے ستیاگرہی سمجھ نہ سکے تھے۔

ستیاگرہ در اصل آزادی و حصولِ آزادی کا نہایت بلند اخلاقی و روحانی عمل ہے، جس میں مقاومت کا جذبہ انتہائی شدید ہوتا ہے، لیکن انتقام کا جذبہ بالکل مفقود۔ ایک سچا ستیاگرہی کبھی کسی پر غصہ نہیں کرتا، لیکن وہ کسی کے غصہ سے ڈرتا بھی نہیں، اس کا مسلک تیغ و سنان سنبھالنا نہیں بلکہ ان کے سامنے اپنا سینہ کھول دینا ہے جو بڑا مشکل کام ہے، کیونکہ غصہ و انتقام دونوں انسان کے فطری جذبے ہیں اور ان کو دبانے کے لئے فطرت سے بڑی جنگ کرنا پڑتی ہے۔

ستیاگرہ کی دوسری شرط یہ ہے کہ اس کا مظاہرہ اُس فریق کے خلاف کیا جائے جس نے کسی قوم کے جایز حقوق غصب کر لئے ہیں۔ گوا میں جاکر ہندوستان کے باشندوں کا ستیاگرہ کرنا اس شرط کے منافی تھا۔ کیونکہ معاملہ گوا کی حکومت اور گوا کے باشندوں کا تھا نہ کہ ہندوستان کے رہنے والوں کا۔ اس لئے ستیاگرہ کا حق صرف گوا کے باشندوں کو تھا اور اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر ہندوستان کی حکومت نے اسکی مخالفت کی۔

اب انھیں باتوں کو سامنے رکھ کر "کشمیر چلو" کی تحریک ستیاگرہ کو دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ وہ کسی طرح مناسب نہیں ہے

کیونکہ اول تو مسلمان بہت جلد مشتعل ہوجاتے ہیں اور وہ مشکل ہی سے جذبۂ نفرت و انتقام سے علٰحدہ ہوکر اس تحریک کو چلا سکتے ہیں۔ ممکن ہے کہ کچھ زمانہ تک وہ صبر و ضبط سے کام لیں، لیکن ان کا یہ جہاد بالنفس ہر وقت جہاد بالسیف میں تبدیل ہوسکتا ہے اور اس طرح ستیاگرہ کا جنگ کی صورت اختیار کرلینا یقینی ہے۔ ممکن ہے پاکستان کے لوگ یہ سمجھتے ہوں کہ حکومتِ پاکستان اس تحریک میں ان کا ساتھ دے گی اور اس طرح ان کی ستیاگرہ کامیاب ہوجائے گی۔ لیکن ان کا یہ خیال صحیح نہیں، کیونکہ پاکستانی حکومت کا اس میں حصہ لینا گویا ہندوستان کو لڑائی کا چیلنج دینا ہے اور اس کے لئے غالباً نہ وہ خود طیار ہے نہ بین الاقوامی سیاست اس کی اجازت دے سکتی ہے۔

علاوہ اس کے اگر ستیاگرہ کا حق کسی کو پہونچتا ہے تو وہ صرف کشمیر کی آبادی ہے، نہ کہ پاکستان کی آبادی۔ اگر کشمیری آبادی یہ سمجھتی ہے کہ ہندوستان اس کے حقوق کا غاصب ہے اور اس کو مکمل آزادی ملنا چاہئے تو بے شک اسے ستیاگرہ کا حق پہونچتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر کسی وقت اندرونِ کشمیر سے ایسی متفقہ آواز بلند ہوئی تو ہندوستان یقیناً اسے آزاد کردے گا۔ لیکن پاکستان کے باشندوں کا کشمیر کی طرف سے ستیہ گرہ شروع کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔

کشمیر میں بے شک مسلمانوں کی اکثریت ہے اور اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے تسلیم کرلیں کہ وہ بھارت کے زیرِ اقتدار رہنا پسند نہیں کرتے تو بھی اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ پاکستان کے زیرِ اقتدار رہنا پسند کریں گے، ہوسکتا ہے کہ وہ بھارت و پاکستان دونوں سے علٰحدہ ہوکر خود اپنی خود مختارانہ حیثیت علٰحدہ قایم کرنا چاہتے ہوں۔

بہرحال کشمیر چلو کی تحریک ہمارے نزدیک مناسب نہیں کیونکہ پاکستانیوں میں نہ ستیاگرہ کے بارِ گراں اُٹھانے کی اہلیت پائی جاتی ہے نہ انھیں اس کا حق پہونچتا ہے اور اگر انھوں نے محض وقتی جوش کے زیرِ اثر ایسا کیا تو وہ بالکل وقتی چیز ہوگی اور آخر میں ان کی ناکامی زیادہ رسوائی کا باعث ہوگی۔

گو کشمیر کا فیصلہ سیکورٹی کونسل کے ہاتھ میں دیدیا گیا ہے اور وہ شاید ہی کبھی اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرے لیکن پاکستان اور بھارت دونوں نے اس دوران رائے عامہ پر اس کا انحصار رکھا ہے اور ہوسکتا ہے کہ کسی وقت کوئی صورت اس کی پیدا ہوجائے۔ لیکن اگر پاکستان تادیر اس کا انتظار نہیں کرسکتا یا کسی باہمی فیصلہ ناممکن ہوجاتا ہے تو پھر اسے دوسرے زاویوں سے بھی سوچنے کا حق حاصل ہے، لیکن وہاں کی پبلک کو غالباً یہ حق کبھی حاصل نہیں ہوسکتا کہ وہ خود بخیر حکومت کی اجازت کے کوئی ایسا قدم اُٹھائے جو دونوں ملکوں کے تعلقات خراب کرنے کے علاوہ اور کوئی نتیجہ پیدا نہیں کرسکتا۔

اس دوران میں پاکستان کے بعض اخبارات نے اس بات میں جو کچھ لکھا ہے اس کے لب و لہجہ کو دیکھ کر ہمیں افسوس ہوا۔ ہم یہ تسلیم کرتے ہیں کہ ہندوستان کے بعض اخبارات بھی اس باب میں بہت غیر محتاط ہیں اور ان کا لب و لہجہ واقعی قابلِ ملامت ہے، لیکن گالی کا جواب گالی سے دینا کسی طرح مناسب نہیں۔ اگر بھارت کے اخبارات غیر شریفانہ روش اختیار کرتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ پاکستانی اخبارات بھی وہی روش اختیار کریں اور سنجیدگی و متانت ہاتھ سے دیدیں۔

پاکستان مسٹر غلام محمد کے بعد مسٹر غلام محمد نے اپنے دورانِ سیاست میں جو کچھ کیا، وہ اپنی جگہ کسی طرح نامناسب نہ تھا لیکن افسوس ہے کہ وہ صحت کی خرابی کی وجہ سے کسی نتیجہ خیز منزل تک نہ پہونچ سکے اور انھیں اس بارِ گراں سے سبکدوش ہونا پڑا۔ تاہم ان کی دانشمندی تھی کہ انھوں نے اپنا جانشین ایک ایسے شخص کو نامزد کیا جو ضرورت کے وقت ایک اچھا ڈکٹیٹر ثابت ہوسکتا ہے۔ اور اگر حالات موافق ہوں تو وہ جمہوریت کو بھی زیادہ مضبوط بنا سکتا ہے۔

نیتشے کی مفکرانہ حیثیت

(پروفیسر ڈاکٹر جعفر حسن حیدرآباد)

نیتشے، پچھلی صدی کا ممتاز مفکر اور ادیب گزرا ہے، جس کے خیالات کی اہمیت، ندرت اور سچائی کے علاوہ ان کی معنویت اور تاثیریت کے کارن ناقابلِ انکار ہے۔

نیتشے کا دل و دماغ کئی قابلیتوں اور صلاحیتوں کا حامل تھا۔ اسے مختلف موضوعوں سے دلچسپی تھی اور ہر ایک میں قابلِ لحاظ دخل تھا اس کی تصنیفوں کا تعلق سیاست، سماج، موسیقی اور شاعری، تنقید اور تاریخ، اخلاق اور مذہب، فلسفہ اور منطق سے ہے۔ وہ چاہے کسی موضوع پر تبصرہ کر رہا ہو، وہ چاہے کسی عنوان پر خیال آرائی کر رہا ہو، خواہ وہ کسی بات کی کھوج میں لگا ہو، چاہے وہ کسی نکتے کی تحقیق میں مگن ہو اس پر شعریت اور ادبیت ہمیشہ غالب رہتی ہے اور وہ ان ہی سے متاثر ہو کر کبھی شاعرانہ نقاد کے بھیس میں، کبھی ادیبانہ مبصر کی شکل میں، کبھی فلسفیانہ ادیب کے روپ میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ گویا نیتشے ادیب یا فلسفی یا شاعر اور نقاد، مفکر اور طنز نگار کا ایسا دلآویز امتزاج ہے کہ بسا اوقات یہ فرق کرنا بھی مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ در اصل ادیب ہے یا فلسفی، نقاد ہے کہ طنز نگار، مفکر ہے یا شاعر؟

نیتشے کی دنیوی زندگی کی مختصر سرگزشت یہ ہے کہ وہ ۱۸۴۴ء میں پیدا ہوا۔ ۲۴ برس کی عمر میں سوئٹزرلینڈ کی بازل یونیورسٹی میں لاطینی اور یونانی کا استاد مقرر ہوا۔ دس بارہ برس ملازمت کی۔ بیماری کی وجہ سے خدمت سے سبکدوش ہو کر اپنی آبائی جایداد، تصنیفی آمدنی اور بہنانہ امداد پر گزر بسر کرنے لگا۔ زیادہ تر بیماری کی حالت میں زندگی کے دن کاٹتا رہا، سچ پوچھئے تو اسے بیماریوں کی درمیانی مدت میں یا افاقے کی حالت میں لکھنے پڑھنے کا موقع ملتا تھا اور اسی کو غنیمت جان کر خوب محنت کرتا تھا، آخر کار ذہنی توازن سے محروم ہو کر اور اسی حالت میں تقریباً دس سال اپنی بہن کا مرہونِ احسان رہ کر پچھلی صدی کے آخری سال یعنی ۱۹۰۰ء میں رحلت پائی۔

اگرچہ دنیوی زندگی کے اعتبار سے نیتشے سترھویں صدی سے تعلق رکھتا تھا مگر ذہنی اعتبار سے وہ اپنے زمانہ سے بہت آگے تھا۔ چنانچہ اس کے بہت سے خیالات نہ صرف موجودہ زمانہ سے ہم آہنگ ہیں بلکہ بعض آج کے لئے بھی نامانوس اور قبل از وقت ہیں۔ ان کی قدر و منزلت کے لئے دنیا کو اور کئی کروٹیں بدلنی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ پچاس ساٹھ یا سو برس کے بعد ان کی صحیح قدر و قیمت معلوم ہو۔

نیتشے کی مفکرانہ اور ادیبانہ حیثیت اس کی اہم تصنیفوں کے ناموں ہی سے ظاہر ہوتی ہے۔ چنانچہ

"موسیقی کی روح سے المیے کی پیدائش"

"خوش خیالانہ علم"

"یورپی نہیلیت"

"قدروں کی بازقدری"

"انسانیت دوستی"

اور "اخلاق کی گم دیا"

نیتشے کی چند مشہور تصنیفوں کے مشہور ترنام ہیں۔

نیتشے کی ہر جہتی شخصیت

نیتشے کی ایک ممتاز خصوصیت اس کی ہر جہتی یا کئی نوعی شخصیت تھی۔ لوگوں کو نیتشے کے خیالات اور فلسفہ سے چاہے کتنا ہی اختلاف ہو اس حقیقت سے کسی نے انکار کرنے کی جرأت نہیں کی کہ جرمن زبان پر نیتشے کو پورا عبور حاصل تھا وہ اس زبان میں ایک نئے اور دلآویز سٹائل کا موجد اور اس کا بہترین انشا پرداز تھا اس کی تحریر کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ 'لفظوں کی موسیقی اور مصوری' ہے۔ وہ بھی اس اعلا درجے کی ہے کہ ترجمہ بلکہ ترجمہ در ترجمہ ہو کر بھی اس کے دلفریب فقرے اور جملے بادلوں کے بیچ بیچ میں سے جھلکنے والے چاند تاروں کی طرح اٹکھیلیاں کر کے خوش کرتے ہیں۔

نیتشے کے مخالف تاریخ نگار فلسفی فولینڈر نے اپنی "تاریخ فلسفہ" میں لکھا ہے کہ نیتشے:

"علمی مفکر سے کہیں زیادہ فنون لطیفہ کا صناع ہے"۔

نیتشے کے ایک مخالف نے لکھا ہے کہ:

"نیتشے کی کتابوں میں زبان ہی زبان ہے"۔

اس کا جواب کسی نیتشے پرستی نے ترکی بہ ترکی بلکہ عامیانہ طریقے پر یہ دیا:

"آپ کی اور آپ کے ساتھیوں کی کتابوں میں زبان بھی نہیں!"

نیتشے کی نثر نگاری کے علاوہ ادبیت کے لئے اس سے بہتر اور کیا ثبوت دیا جا سکتا ہے کہ نہ صرف اسکی عمدہ عمدہ نظموں کو بلکہ اس کی نثر کے عمدہ حصوں کو لوگ زبانی یاد کرتے ہیں، خاص کر اس کی کتاب "یوں کہا زرتشت نے"۔

ادبی اعتبار سے ایک لافانی چیز ہے اور یورپی ادب کے بہترین کارناموں میں شمار کئے جانے کی مستحق ہے۔

نیتشے کا کارنامۂ حیات

نیتشے کا کارنامۂ حیات مختلف سماجی علوم کی خدمت گزاری، قدیم زبانوں کی تحقیق اور جرمن ادب میں سحر نگاری ہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ نیتشے نے جو پیغام عمل دیا ہے وہ انسانیت کے لئے ایک بیش بہا تحفہ ہے۔

نیتشے مذہب اور مذہبیت خاص کر عیسائی مذہبیت کا سخت ترین مخالف تھا اور مذہبی دجالیت اور مذہبی عقیدت مندی اور اعتقاد پرستی سے اسے انتہائی بیر تھا، مذہبی تعصب سے پیدا ہونے والے جنون پر تبصرہ کرتے ہوئے اس نے سماجی نفسیات پر روشنی ڈالی ہے۔ خود فلسفے میں وہ جس فکری دبستان کا بانی ہوا اسے 'فلسفۂ فہم عامہ' کہا گیا ہے۔ اس کے نمایاں ترین رجحان۔

"قدروں کی بازقدری" Revaluation of Values

اور "اقتدار کی تڑپ" Will to Power

میں پائے جاتے ہیں۔

ہمیں نیتشے کا فلسفہ کا فلسفہ بیان کرنا مقصود نہیں مقصود ہوتا بھی تو کسی فلسفی یا فلسفے داں ہی سے یہ بن پڑتا۔ ہمیں تو یہ دکھانا ہے کہ نیتشے کی مفکرانہ حیثیت کیا تھی؟ اس کا تخیلی نظام کیا تھا؟ سوچ بچار کے نیتشیانہ مندر میں کون کون سی مورتیاں ہیں؟ ان مورتیوں کی پوجا کیسے ہوتی ہے؟ ان کے پجاری کیا کہتے ہیں؟ نیتشے کے من مندر میں کیا خوبیاں اور خصوصیتیں ہیں؟ ان میں کیوں اتنی کشش اور جاذبیت، دل کشی اور سچائی، حسن اور صداقت، سندرپن اور اچھائی ——— بھاؤپن اور ہردلعزیزی ہے؟

فلسفۂ سکھ پسندی

نیتشے کی مفکرانہ حیثیت کا سب سے ممتاز پہلو رجائیت یا سکھ پسندی کی تلقین و تبلیغ اور دکھ پسندی یا قنوطیت کی مخالفت اور تحقیر ہے یہ کس قدر تعجب انگیز بات ہے کہ ایک شخص جس کی آدھی زندگی جسمانی تکلیفوں اور بیماریوں میں گزری ہو زندگی بھر سکھ پسندی کی تبلیغ کرتا رہا۔ اس کی تصنیفوں میں جو عام خصوصیت پائی جاتی ہے وہ یہی سکھ پسندانہ فلسفہ ہے اس کا پرجا نیتشے نے اس شد و مد سے کیا کہ لوگوں کو غلط فہمی ہوئی اور وہ اسے دنیا پرست، حسیت کا پرستار، نفسانیت زدہ اور جبر و تشدد کا

پجاری سمجھنے لگے مگر واقعہ یہ ہے کہ نیتشے صرف سکھ پسند تھا اور لوگوں کو دنیا کا منور رخ دیکھنے، ہنسی خوشی سے زندگی گزارنے اور اٹل مصیبتوں یا ناگہانی آفتوں اور اتفاقی حادثوں کو ہنس کھیل کر گزارنے کا درس دیتا تھا۔

باربار نیتشے نے اپنی تمام تحریروں میں ان ہی خیالوں کا پرچار کیا اور مختلف طریقوں سے، مختلف پیرایوں میں، نت نئی مثالیں دے کر بھانت بھانت کی تشبیہوں کے ذریعے ایک سکھ پسند مفکر ہونے کا ثبوت دیا۔

اس کی ابتدا دراصل یوں ہوئی کہ جرمنی کے ایک معروف مفکر و ہم لائبنتس (W. Leibnitz) نے دنیا کو بہترین ثابت کرنے کی کوشش میں یہ تک کہا تھا:

"ہماری دنیا نہ صرف امکانی حد تک بہترین ہے، بلکہ اس سے بہتر دنیا کا پیدا کرنا ناممکن ہے"

اس کے برخلاف آرتھر شوپن ہاور (A. Schopenhauer) نے دنیا کو بدترین ثابت کرنے کی کوشش میں یہ کہا تھا:

"دنیوی زندگی ایک ایسا کاروبار ہے جس کے اخراجات زیادہ اور آمدنی کم، لہٰذا بیکار ہے!"

شوپن ہاور ہی خیالات پر مبنی نظریہ قائم ہوا جسے انسانی النسٹھارین کا نظریہ Theory of Incorrigibility of Man کہتے ہیں۔

اس نظریہ کے مطابق آپ چاہے کچھ کیجئے انسان نہ تو سدھرا ہے اور نہ سدھرے گا۔ بدھ سے لیکر گاندھی تک ان گنت رشیوں منیوں اور کملیوں نے انسانی تعلیم دی۔ مار پیٹ، خونریزی، قتل اور غارت گری سے منع کیا۔ ایک لاکھ چوبیس ہزار پیغمبر اور نہ جانے کتنے خلیفہ اور امام، گرو اور پیرنیت، مجدد اور رہبر، پیر اور ولی، مرشد اور ملا آئے۔ لوگوں کو لڑائی جھگڑوں سے دور رکھنا چاہا، امن اور انصاف، انسانیت اور بھلائی کا پیغام پہونچایا یا ان کی تاویلیں اور نئی تفسیریں پیش کیں۔ مذہب اور مذہبیات سے ہٹ کر فلاسفی دنیا و دیوت کے دائرے میں نظام [illegible] کنگ فوشو سے لے کر لین پیاؤ تک، کونت سے لے کر برگساں تک بیسیوں اور سیکڑوں نہیں ہزاروں اور لاکھوں فلسفیوں [illegible] محققوں نے عدل کے طریقے بتائے، قانونیات کے نکر سمجھائے، اخلاق کے درس دئے، "جیو اور جینے دو" کے راز سمجھائے، خدمتیے اور دوسروں کو پیٹنے دینے کے طریقے بتائے۔ الہامی کیفیتوں اور نظری دبستانوں کو چھوڑئے انسانی تنظیم میں بادشاہی اور شہنشاہی، چناؤ اور وراثت سب کے سب ناکام ہوئے، دیالو خدا (Benevolent Despotism) سے لے کر نراج تک، مگر کی ریاست سے لے کر سامراجی مملکتوں تک، قبیلائی تنظیموں سے لے کر ادارہ اقوام متحدہ تک بیسیوں راج کاجی اور کمیونزم، مارکسزم اور لینزم کی طرح دھن کاجی مسلکوں نے یا فرعونیت اور ہٹلریت کی طرح کئی راکشسی مملکتوں نے جنم لیا، رواج پایا، زور دکھایا اور ناکام ہوئے۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ساری کائنات کو فیض پہنچانے والے اصولوں کے مدعی اور مکمل نظام زندگی کی تلقین کرنے والے مذہبوں نے شرافت اور عقلمندی سے پرہیز کیا۔ توریت اور زبور، انجیل اور قرآن، اپنشد اور بھگوت گیتا، گرنتھ صاحب اور ژند اوستا، بسواپران اور میتارتھ پرکاش نامی کتابیں نازل ہوئیں اور تو اور بار بار اوتار دھار کر کے نزول اجلال خدا نما نہ ہوا، مگر انسانی سرشت نہ بدلنی تھی نہ بدلی۔

خونریزی اور تہمت بازی، سازشیں اور جھوٹ، غلط بیانی اور جھوٹ بانی، بے وفائی اور ریاکاری، بے ایمانی اور محسن کشی، فریب اور دغا، کاہلی اور جاہلی، عریانی اور بے حیائی، مکاری اور جلیبازی، خوشامد اور بے فیضی کہاں تک اور کس کس کا ذکر کیا جائے۔ ہم میں وہ تمام برائیاں اور خامیاں ہیں، وہ تمام خصوصیتیں اور خاصیتیں ہیں جو روز ازل سے اب تک ہمارے تخیال اور ددھیال میں، ہمارے سمدھیانے اور سسرال میں، ہمارے ساتھیوں اور پڑوسیوں میں، ہمارے بزرگوں اور بچوں میں پائی جاتی تھیں، پائی جاتی ہیں اور غالباً آخری انسانوں تک پائی جائیں گی۔

اگر حافظ نے کہا تھا:

ایں چہ شوریست کہ در دور قمر می بینم — ہمہ آفاق پر از فتنہ و شر می بینم
ہیچ رحمی نہ برادر بہ برادر دارد — ہیچ شفقت نہ پدر را بہ پسر می بینم
دختراں را ہمہ جنگ است و جدل با مادر — پسراں را ہمہ بدخواہ پدر می بینم
اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیر پالاں — طوق زریں ہمہ در گردنِ خر می بینم

تو ہمارے ہی ملک کے زمانہ شناس شاعر اور فلسفی حالی نے کہا ہے:

مجالس میں غیبت کا زور اس قدر ہے — کہ آلودہ اس خون میں ہر بشر ہے
نہ بھائی کو بھائی سے یاں درگزر ہے — نہ ملّا کو، صوفی کو اس سے حذر ہے
جنھیں چار پیسے کا مقدور ہے یاں، — سمجھتے نہیں ہیں وہ انساں کو انساں،
موافق نہیں جن سے ایام دوراں — نہیں دیکھ سکتے کسی کو وہ شاداں

نشے میں تکبر کے ہے چور کوئی
حسد کے مرض میں ہے رنجور کوئی

کسی جرمن پادری نے بڑے فخر سے کہا تھا:

"مذہب خاص کر عیسائی مذہب محبت ہی محبت پر مشتمل ہے، اس کی بنیاد رواداری، انصاف پسندی اور ہمدردی پر قایم ہے"

اس قول کا حوالہ دیتے ہوئے شوپن ہاور (Schopenhauer) نے اپنی قابلِ دید کتاب Parerga u. Paralipomena میں خوب لکھا ہے کہ:-

"رواداری اور عفو پسندی بلکہ وجدانیتی پرورش کی تلقین کرنا کیا اسے زیب دے سکتا ہے جو خود ناروادار اور انتقام پسند ہو؟ گواہ کی حیثیت سے میں کلیسائی عدالتوں، صلیبی جنگوں، مذہبی لڑائیوں کو اور برونو اور واینینی کی چتاؤں کو طلب کرتا ہوں۔"

ہم صلیبی جنگوں کی درندگی اور ظالمانہ بربریت سے زیادہ واقف نہیں۔ برونو اور واینینی پر جو کچھ بیتی تھی اس سے بھی مانوس نہیں۔ شوپن ہاور کی خیالات کی قدر و قیمت پہچاننے اور انھیں ذہن نشین، دل نشین بلکہ روح نشین کرنے کے لئے ایسے ناموں کا بھی حوالہ دینا ضروری ہے جن سے ہم پہلے ہی سے واقف ہیں اور جو مذہبی اعتقادیت، فرقہ واری مذہب زدگی اور تیز فرقائی اعتقاد پرستی کا بے رحمانہ شکار ہوئے ہیں۔

اس لئے شوپن ہاور کی طنز نگاری سے فایدہ اٹھاتے اور جملہ دل دادگانِ اقبال، پرستارانِ اقبال، حریفینگانِ اقبال بلکہ خود روحِ اقبال سے مخاطب ہوتے ہوئے میں یہ کہنے کی جسارت کر سکتا ہوں:-

"بجا ہے! چنانچہ اس قول کی شہادت میں کہ:

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا

میں سقراط اور حضرت عیسیٰ، میرا بائی اور دوشیزۂ اراکیاں، منصور اور گرو گوبند سنگھ، قرۃ العین اور بہاء اللہ کی روحوں کو طلب کرتا ہوں"۔

نہ صرف یہ بلکہ ذمہ داری کے پورے احساس کے ساتھ اور پوری سنجیدگی سے شوپن ہاور کی مزید تائید کرتے ہوئے یہ بھی کہہ سکتا ہوں:- "یروشلم کی پہاڑی پر ہتھیلیوں اور سیڑھیوں میں ٹھونکی ہوئی کیلوں نے، میدانِ کربلا کے تپتے ہوئے ریگستان پر پیاسے گلے

کی کشتی ہوئی رگوں نے، جمنا کے گھاٹ پر ایک چھلنی کلیجے میں سے آخر وقت تک ٹپکتے ہوئے خون کے قطروں نے یہ شہادت پیش کی کہ وہ ہزار سال میں انسان نے کچھ ترقی نہیں کی۔"

غرض اس فضا میں نیتشے نے جنم لیا اور اسی فضا میں اس کی پرورش ہوئی۔ عین اس وقت جب کہ نیتشے کے لڑکپن اور جوانی کا زمانہ تھا شوپن ہاور کی مقبولیت بڑھتی جا رہی تھی اور دنیا کے فلسفہ پر ہی نہیں بلکہ عام تعلیمیافتہ لوگوں پر اس کا گہرا اثر پڑ رہا تھا۔ جس وقت شوپن ہاور کا انتقال ہوا نیتشے کی عمر صرف ۱۶ سال کی تھی۔ شوپن ہاور مر چکا تھا مگر اس کے خیالات زندہ تھے، وہ قومی اور بار کا زمانہ تھا۔ جرمنی بھانت بھانت کی راج کاجی پریشانیوں میں مبتلا تھا۔ ملک کا شیرازہ بکھر رہا تھا۔ قوم ابتری میں بے حس ہو گئی تھی۔ ان مسئلوں کو حل کرنے کی ظاہرہ کوئی صورت نہیں تھی۔

ایسی حالت میں شوپن ہاور کے دکھ پسندانہ فلسفہ کو پنپنے کے لئے بہت ہی زرخیز اور شاداب زمین ملی۔ لوگوں سے نفرت کرنا، انسانوں کی تحقیر کرنا، زندگی کو بے کار، زندگانی کو بے سود، علم کو فضول، تہذیب کو لغو، کوشش کو ہیچ سمجھنا شوپن ہاور نے سکھایا تھا خود اس نے اقرار کیا ہے کہ:

"میں انسانوں سے نفرت کرنے والا نہیں، ان کی تحقیر کرنے والا ہوں۔"

جس گہرائی سے شوپن ہاور انسانوں کی تحقیر کرتا تھا اس کا اندازہ اس لفظ سے ہو سکتا ہے جو اس نے انسانوں کے لئے تراشا تھا۔ جس طرح ہم گایوں، بیلوں اور بھینسوں وغیرہ کو ان کی نمایاں ترین جسمانی خصوصیتوں کی بنا پر "چوپایہ" کہتے ہیں، اسی طرح شوپن ہاور انسانوں کو "Vierfüßler" کے قیاس پر "Zweifüßler" یعنے "دوپایہ" کہتا تھا۔ ہزاروں لاکھوں میں جو سچا عاقل اور بکا ایماندار ہے وہ بقول شوپن ہاور "ہزاروں لاکھوں شودروں اور پاریاؤں میں اک برہمن ہے۔"

اسی قسم کی دکھ بھری تلقین اور طرح بھی کی جا رہی تھی۔ جس فضا میں نیتشے کی نشوونما ہو رہی تھی وہاں کالوینیت (Calvinism) قسمت پرستی اور تاریکیت چھائی ہوئی تھی، جو لوگ غیر معمولی قابلیت کے ہوتے ہیں ان پر فضا اور ماحول کا زیادہ اثر نہیں ہوتا۔ چنانچہ اس حقیقت کے باوجود کہ نیتشے نے شوپن ہاور کی کتابوں کا مطالعہ بھی کیا اور ایک طرح اسے اپنا استاد بھی مانتا تھا پھر بھی اس نے اپنے لئے سیدھا راستہ ڈھونڈ نکالا اور لائبنٹس اور شوپن ہاور کے بین بین وہ راستہ اختیار کیا جو افراط اور تفریط سے مبرا، مبالغوں سے دور، اغلبیت سے قریب لہذا حقیقت سے قریب ترین تھا۔

قدرتی طور پر نیتشے کو سب سے پہلے تو یہ خیال آیا ہوگا کہ انسان کے انسدھارپن کا نظریہ جس قدر صحیح ہے، اسی قدر صحیح انسان کے ان برباد پن کا نظریہ Theory of Indestructibility of Man صحیح ہے یا ہو سکتا ہے۔

اس کا تعلق سائنس کے اس مشہور نظریہ سے ہے کہ مادہ ان برباد یعنے کبھی نہ برباد ہو سکنے والا ہے۔ مادہ ہمیشہ اپنی شکل بدلتا ہے، فنا نہیں ہوتا۔ لکڑی جلتی ہے، کوئلا راکھ ہو جاتا ہے، راکھ ہوا میں منتشر ہو کر کچھ اسی کا جزو ہو جاتی ہے اور کچھ زمین میں گھل مل کر جزو غذا یا پھول کا جزو بن کر کسی حسینہ کی ذات یا اس کا سنگھار بنتی ہے۔

اسی قیاس پر یہ سمجھ لیجئے کہ انسان کی اچھی خصوصیتیں کبھی برباد نہیں ہو سکتیں۔ رحم دلی، انسان پسندی، شرافت، علم دوستی، ملنساری، بے غرضی، خدا ترسی، خدمتگاری اور خدا فراموشی جیسی نیکیاں انسانی سیرت و کردار کی بیسیوں برائیوں کی طرح کبھی فنا یا مفقود نہیں ہوں گی۔

انسانی سیرت سے متعلق انسدھارپن کا نظریہ جس قدر صحیح ہے اسی قدر ان برباد پن کا نظریہ بھی صحیح ہے۔ لاکھوں پیغمبروں، اوتاروں ولیوں، رشیوں، منیوں اور فلسفیوں کو انسانی رذالت کے دور کرنے میں ناکامی ہوئی تو شیطان بھی تمام انسانوں کا بہکا نہ سکا اور نہ نفس کو بلا استثنا ہر دور میں سوفی سیکڑہ کامیابی ہوئی۔ یاجوج اور ماجوج، ابلیس اور راکشس، دجال اور راون بدھا جیسے

رہنماؤں، سرمد جیسے صوفیوں، کے سے بی ان کا (Casablanca) جیسے فرض شناسوں، ہریشچندر جیسے ست دھرمیوں اور سیتا جیسی پارساؤں کو ہر قسم کی دھمکیوں اور ترغیبوں کے باوجود بہکا نہ سکے۔ میر جعفر اور میر صادق کے توڑ پر عبدالرزاق لاری، قلی قطبہ اور ملکہ کیتھرین یا ماریا انتونیت اور مادام دیمپا دور کی زد میں پیمنی اور جھانسی کی رانی، تیمور اور ہلاکو، نادر شاہ اور نپولین کے برعکس اشوک اعظم، مدام دبارہی اور ماما جمیلہ کے جواب میں چاند بی بی یا روپا متی، یزید کے توڑ پر حسین، کورنگ جیسے رسوائے زمانہ عزت فروشوں کے برعکس ٹیپو سلطان جیسے سرفروش، بچہ سقہ جیسے غنڈوں کے جواب میں رابن ہڈ اور تانتیا ٹوپی جیسے دیالو اور شریف رہزن۔ ان گنت کپوتوں کے جواب میں بھرت جیسے سپوت، ہر فرعونی را موسیٰ کے مشہور قول کے مطابق ہر ملک کے ہر دور میں رہے ہیں۔ باہر جیسا باپ، ونڈسر جیسے پریمی، شاہجہاں جیسے شوہر، دروپدی جیسی بہو، علی جیسے داماد، ساوتری کی طرح دھرم پتنیاں، رام جیسے بیٹے، لچھمن جیسے بھائی، زینب کی طرح بہنیں، فاطمہ کی طرح بیٹیاں، عائشہ کی طرح بیویاں، گاندھی جیسے مہاتما اور مہاتما جیسے رہنما وقفے وقفے سے برابر پیدا ہوتے رہے اور ہمیشہ پیدا ہوتے رہیں گے۔

بیچ عہد میں اگر حریت اور جمہوریت کے شیدائیوں میں ولہلم ٹل جیسی ہستی تھی۔ انقلاب فرانس کے وقت سیکڑوں جانبازوں کے ساتھ مدام رولاں تھیں۔ پچھلی صدی میں میزینی اور گریبالڈی گزرے ہیں تو خدا ہمارے زمانہ میں ہزاروں راؤ صاحبوں اور خاں صاحبوں کے جواب میں بھگت سنگھ اور شعیب اللہ پیدا ہوئے ہیں اور آج بھی جواہر لال نہرو ہیں، جن کی بدولت Secularism کی لاج باقی ہے اور جن کے دم قدم سے مہا سبھائی اور جن سنگھی، مسلم لیگی اور سوک سنگھی، دل شر و منی اور دراوڑ کازگمی کہلانے والے فرقہ پرست، بہر حال دبے ہوئے اور دبکے ہوئے ہیں۔ اگر زمانہ پرست، موقع شناس، خدغرض، ریاکار، مطلبی، اصول فروش اور موقع پرست آدمیوں کی تعداد میں پائے جاتے ہیں تو سچے وفادار، پکے دوست، نیک دل، نیک مزاج، نیک صفات، نیک خیال، نیک چلن نیک جو اور نیک خو انسان ہر گز عنقا نہیں۔ معزول فرمانبرداروں کا ساتھ دینے والے چند سابق دربارئے آج بھی اپنے حوالی نصیب آقاؤں کا ساتھ دے رہے ہیں۔ ہر مذہب و ملت کی، ہر قوم و نسل کی، ہر فرقے اور ذات کی لاکھوں عورتیں سچی پتی برتا اور پکی دھرم پتیاں ہیں۔ اگر دہلی یونی ورسٹی کے ہوتے ہوئے جامعہ ملیہ، ٹاٹا نگر کے توڑ پر سیوا گرام، کلکتہ یونیورسٹی کے مقابلہ میں شانتی نکیتن، مسلم یونیورسٹی کے جواب میں دارالمصنفین باقی ہیں تو مدراس میں مسز بیسنٹ کے ہر مذہبی لگاؤ کو قایم رکھنے والی تھیا سوفیکل سوسائٹی Theosophical Society) پٹنہ میں خدا بخش کے کارنامہ کو زندہ رکھنے والی اورینٹل لائبریری (Oriental Library) دیس بھگت کا سبق دینے والی یونائی سروینٹس آف انڈیا سوسائٹی (Servants of India Society) بنارس میں ناگری پرچارنی سبھا، علیگڈھ میں انجمن ترقی اردو، الہ آباد میں ہندی ساہتیہ سمیلن، دہلی میں ندوۃ المصنفین، پانڈیچری میں آرو بندو آشرم جیسے رفاہی اور تہذیبی ادارے قایم ہیں اور اپنے وجود ہی سے ہمت، بے غرضی، خلوص، مستقل مزاجی، سچائی، ادب پروری اور علم دوستی کی تعلیم دے رہے ہیں۔

ہر قسم کی تخریبوں اور تخریبیوں کے ہوتے ہوئے علم و تحقیق، ادب اور آرٹ سے انسوٹ وابستگیاں باقی ہیں۔ عیش و راحت دولت و فراوانی، شان و شوکت، طاقت اور رعونت، اقتدار اور ٹھاٹھ کے نمودی جھنڈوں اور رنگ برنگی پرچموں کے جھنڈ میں امان اور سیوا کا پھریرا برابر لہرا رہا ہے اور کلجگ میں بھی ست جگ کے دیئے بہر حال جل رہے ہیں۔

یہ اور اسی قسم کے خیالوں اور بیچاروں سے نیتشے متاثر اور مسرور ہو کر کہتا ہے کہ اس دنیا میں ہم اپنے لئے چاہے دوزخ تیار کریں یا جنت۔ وہی ملک جو قدیم زمانہ میں رشک گلستاں تھا اور جو جسمانی اور ذہنی، علمی اور ادبی، فنی اور تنظیمی ہر اعتبار سے ترقی کرتے کرتے بلند ترین مرتبے پر پہونچ گیا تھا، آج برباد و ویران ہے، نسل وہی ہے، لوگ وہی ہیں، موسم وہی ہے، آب و ہوا وہی ہے۔ پھر بھی ہر طرف ویرانی اور بربادی نظر آتی ہے۔ نیتشے کہتا ہے کہ وہی یونان جس نے یورپ کو علم و ادب کے انگنت سبق دیئے اور جس نے آرٹ کے اصول اور

لافانی شہ پارے اور شہ کار پیدا کئے آج اتنا بیچ ہے کہ اپنے ہی رائج کردہ علوم وفنون میں جالکاری یا مہارت نہیں رکھتا اور خدا ہی کے لکھے ہوئے شہپارہ دل اور بنائے ہوئے شہکاروں کی قدر بندی نہیں کرسکتا۔ اس کی وجہ نیتشے کی رائے میں اس کے سوا اور کیا ہوسکتی ہے کہ موجودہ انسانوں میں یہ صلاحیت نہیں کہ بلندی کو زیادہ عرصے تک برقرار رکھ سکیں۔ بہترین سے بہترین انسان اقتدار حاصل کرنے کے بعد خدغرضیوں میں مبتلا ہوتا ہے۔ عزیز نوازی، دوست پروری، خوشامد پسندی، غرور اور ایٹھ کا مادہ ظاہر ہوتا ہے، موجودہ انسانوں کی نجی کمزوریاں، فطری برائیاں اور قدرتی کوتاہیاں اتنی ہیں کہ اسے اونچائی پر پہونچنے کے بعد اونچا مقام برقرار رکھنے اور نیکیاں اور بھلائیاں پھیلانے میں بار بار ناکامی ہوئی ہے۔ ہم میں اب بھی بہت سی برائیاں موجود ہیں جو صرف تہذیب وتمدن کے پردے میں چھپی ہوئی ہیں۔ نظریۂ ارتقا کا قایل اور معتقد ہونے کے ناتے نیتشے مایوس نہیں ہوتا بلکہ وہ سمجھتا ہے کہ دواعی برتری اس وقت باقی رہ سکے گی جب کہ موجودہ انسانوں میں بہتری کی امنگیں پیدا ہوں گی اور وہ ترقی کی خواہشوں اور بہترہستی سدھار کے ارمان میں ارتقا کی ایک اور منزل طے کرکے فوق انسان بنیں گے چنانچہ نیتشے کہتا ہے:

"ہم نے نیم جانداروں سے ترقی کرتے کرتے موجودہ رتبہ حاصل کیا ہے، مگر اب بھی ہم میں ان ہی کی سی بہت سی خصوصیتیں باقی ہیں، کیا یہ ممکن نہیں کہ ہم اس سے زیادہ ترقی کریں اور انسانوں سے بہتر انسان پیدا کرسکیں؟"

ایک جگہ اور نیتشے کہتا ہے:

"عالم حیات میں ہر پستی نے اپنے سے بہتر ہستی پیدا کی، اس کی بجائے کہ انسان کو مغلوب کرکے تم فوق انسان پیدا کرتے کیا تم یہ چاہتے ہو کہ حیوان کی طرف پھر عود کرو؟ کیا اس بحر ارتقا کے مدوجزر میں تبدیل کرتے ہو؟"

عورتوں کو مخاطب کرکے نیتشے کہتا ہے:

"کاش ہر عورت کھلونا بن سکے مثل قیمتی جواہر کے جس میں آنے والی دنیا کا نور ہو! اے عورتو! کاش ستاروں کی شعاعیں تمہاری محبت میں منور ہوں اور تمہاری یہ خواہش ہو کہ تم فوق انسان پیدا کرسکو!"

اس متوقع نسل کا نام نیتشے نے فوق انسان رکھا اور مستقبل کی تمام خوش آیند توقعات اور اپنے فلسفۂ سکھ پسندی سے پیدا ہونے والی امیدیں فوق انسان سے وابستہ کیں۔ سکھ پسندانہ فلسفہ کی طرح فوق انسانیت کا نظریہ نیتشے کے اہم ترین اور اساسی تخیلات میں سے ہے۔ سچ پوچھئے تو فوق انسانیت کا نظریہ سکھ پسندانہ فلسفے کا نتیجہ اور اسی کا جز گویا جز نظریہ ہے۔

نیتشے کا نظریہ فوق انسانیت

نیتشے نے یہ کہیں نہیں کہا کہ فوق انسان موجودہ انسانی نسل سے بالکل مختلف شکل و صورت کا آدمی ہوگا یا جسمانیات کے نگاہی نقطے سے موجودہ انسانوں اور فوق انسانوں میں خلیاں فرق ہوگا۔ یا یہ کہ وہ ہمیشہ زندہ رہے گا اور ہر فوق انسان کی عمر تین تین یا چار چار صدیاں ہوا کرے گی۔ اس قسم کی لغو باتیں نیتشے نے کبھی نہیں کہیں اور یہ زیادہ تر ان لوگوں کے خود ساختہ تخیلات ہیں جنھوں نے نہ کبھی نیتشے کی تصنیفوں کا مطالعہ کیا اور نہ نیتشے کے بارے میں مستند کتابیں اور مضمون پڑھنے کی زحمت گوارا کی۔

نیتشے کی مراد فوق انسان سے ایسے آدمی سے تھی جو وجدانیت کا نہیں بلکہ عقلیت کا ہیرو ہوگا جو نفسانی لذتوں کا خاہشمند نہیں بلکہ سمجھدارانہ یا معقول خوشیوں کا طالب ہوگا۔ وہ نفس کا غلام نہیں بلکہ دماغ کا تابع ہوگا وہ انسانی نسل جس میں کمترین برائیاں اور زیادہ سے زیادہ خوبیاں ہوں گی، فوق انسانوں کی نسل ہوگی۔ وہ فرشتے نہ ہوں گے بلکہ فوق انسان ہی رہیں گے ان میں برائیاں بھی ہوں گی مگر اس مجسمۂ اوصاف میں یہ برائیاں بالکل ناقابل لحاظ ہوں گی۔ جس طرح سمندر کا پانی غلاظت اور گندگی کے پڑنے سے غلیظ اور گندہ نہیں ہو جاتا اور سمندر کی حیثیت سے پاک وصاف ہی رہتا ہے، اسی طرح فوق انسان کی برائیاں اور کوتاہیاں اس کی اچھائیوں اور بھلائیوں میں گھل مل کر ایسی ہوجائیں گی جیسے گلی گلی سے بہہ کر آتا ہوا پانی محض گنگا میں آنے کی وجہ سے گنگا جل کہلاتا ہے اور پاک و پوتر مانا جاتا ہے۔

جس طرح بدبودار پانی کے گرنے سے بڑی بڑی ندیاں متاثر نہیں ہوتیں اسی طرح فوق انسان کا کردار اس کی چند بدخصلتوں کی وجہ سے متاثر نہیں ہوسکے گا۔

نیتشے کی تصنیفوں کا مطالعہ کرنے سے اچھی طرح واضح نہیں ہوتا کہ اس کے ذہن میں فوق بشر کی کیا تصویر تھی۔ بظاہر نیتشے توقع کرتا ہے کہ انسان کے افعال اور کردار میں جس قدر بے سمجھ پن پایا جاتا ہے، اس کی سیرت و ذہنیت میں جس قدر عدم عقلیت ہے وہ کم ہوتے ہوتے تقریباً مفقود ہوجائے گا، وہم پرستی اور نادانی، جھوٹی شیخی اور جھوٹا اطمینان، غیر دانشمندی اور نفس پرستی نا انصافی اور جاہلیت کم ہوتی جائیں گی اور ان کی جگہ سمجھ اور عقل، انصاف اور ایمان، سچائی اور بے غرضی کا عمل دخل بڑھے گا اور مجموعی طور پر انسانوں کی صحت بدرجہا بہتر ہوگی اور وہ جسمانیاتی، جسمانیاتی اور سماجیاتی اعتبار سے امکانی حد تک بہترین اور تقریباً مکمل انسان یعنی فوق انسان ہوگا۔

نیتشے جو دل و دماغ سے نظریۂ ارتقا کا معتقد تھا باور کرتا تھا کہ ارتقا کی آخری منزل انسان نہیں ہے، کیونکہ انسان کے دماغ نے کافی ترقی کرلی، اپنی قابلیت کی بدولت زمین اور سمندر پر کامیابی حاصل کرلی، ہوا سے مقابلہ شروع کرنے کے بعد نصف صدی میں اسے بھی مغلوب کرلیا اور اب دوسرے سیاروں سے ربط قائم کرکے ساری کائنات میں اپنا اقتداری جال پھیلانے کے خواب دیکھ رہا ہے۔ اسے یہ دھن بھی ہے کہ سمندر کی تہ سے غذا اور چاند و مریخ کی سطح سے دھاتیں حاصل کرے۔ اس نے خاص کر میکانیت اور صنعتیت میں اچھے میں ڈالنے والی ایجادیں اور اختراعیں کیں۔ تحقیق اور تفتیش کے سہارے یا فنکاریوں کے بل بوتے، قدرت کے مقابلہ میں ایک ذاتی قدرت پیدا کی۔ قدرت کی غلطیوں کو دور کیا، کوتاہیاں کم کیں، پہاڑ کاٹے، غار بنائے، پلوں کی تعمیر کی، ندیوں کو روکا، خلیجوں کو پاٹا، سمندروں کو ملایا، عظیم الشان بشار بنائے، بجلی کو مقید کیا، بلندی اور پستی کی تفریق کو کم کرکے ہموار سڑکیں بنائیں، زمان و مکان، وقت اور فاصلے کی اہمیت گھٹا دی، پہاڑوں سے مقابلہ کرنے والی عمارتیں، پاتال میں چلنے والی ریلیں، شاہین اور عقاب سے بلند تر اور ان سے بھی تیز تر چلنے والے ہوائی جہاز طیار کئے، غرض ایجادوں اور فنکاریوں کے ذریعے انسانی دماغ نے اپنی قابلیت کا بہترین سے بہترین اور اعلا ترین ثبوت پیش کیا۔

یہ سب صحیح ہے مگر انسان کے دماغ ہی نے ترقی کی۔ انسان کی خصلت و طینت میں بہتری تو کجا کسی قسم کی تبدیلی بھی نہیں ہوئی۔ ہمارا کردار ہماری ذہنیت اور ہمارے اخلاق وہی ہیں جو آج سے سو ہزار یا دس ہزار سال پہلے تھے۔

انسانوں کی سیرت اور کردار کا غائر نظر سے مطالعہ کرنے والے فلسفیوں، نفسیاتی ماہروں اور مردم شناسوں کے مطابق انسانوں کی جبلتی خصوصیتیں ایسی تو نہیں ہیں جن کی بنا پر اشرف المخلوقات ہونے کا دعویٰ ہوسکے۔ کسی سیاہ بین، انسان ہیزر، تارک الدنیا سنیاسی نہیں بلکہ امانیول کانٹ جیسے عالم و یکتائے زمانہ نے کہا ہے:

"اگر ہر شخص کو یہ معلوم ہوجائے کہ اس کے ملاقاتی، دوست، احباب، عزیز، اقارب، پڑوسی اور اغیار اس کے بارے میں کیا خیال رکھتے ہیں اور کس حد تک اس کے سچے خیر خواہ ہیں تو انسان ایک دوسرے سے بھاگنے اور دوسروں کی پرچھائیوں سے ڈرنے لگیں گے۔"

دشمن دوست کی شکل میں، رہزن رہنما کے بھیس میں، کپٹی بہی خواہوں کے روپ میں نظر آتے ہیں۔ دنیا بھر میں ریاکاری، جھوٹی دوستی بے وفائی، بے مہری پھیلی ہوئی ہے۔ ہر جگہ سرد مہری چھائی ہے۔ چار دانگ عالم میں تن پروری اور آرام طلبی کی خاطر پیسے کا زور ہے، روپے کا راج ہے، سونے چاندی کی حکومت ہے، زر کی پوجا ہو رہی ہے اور ہر طرف نوٹوں کا ڈنکا بج رہا ہے۔ انسان مختلف برائیوں کا مجسمہ ہوگیا ہے، خاص کر خود غرضی اور خدا نمائی اس کی کئی خوبیوں کو غارت کر رہی ہے۔ کرورہا انسان صرف مصلحت سے نیک چلن ہیں اور یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ موجودہ انسانوں میں برائیاں بہت زیادہ اور بھلائیاں برائے نام ہیں۔ صرف تعداد کی اعتبار سے نہیں بلکہ زور اور گہرائی کے لحاظ سے بھی اچھائی اور برائی میں ایک راکشس اور ایک معصوم کا سا فرق پایا جاتا ہے۔ اس میں رتی برابر شک نہیں ہے کہ شرافت کے لحاظ

سے یعنے اخلاقیاتی نقطۂ نظر سے انسان نے مطلق ترقی نہیں کی۔ دغابازی، رشوت خاری، احسان فراموشی اور کینہ پروری گزشتہ زمانوں کی طرح اب بھی ہیں، مگر موجودہ زمانہ میں پاک دل، نیک ذات، نیک صفات، ملنسار، امن پسند، شانتی دوست، غیرت مند اور بہادر انسان پائے جاتے ہیں تو یہ پچھلے زمانہ کے کسی دور میں مفقود نہ تھے۔ اگر موجودہ زمانہ میں وطن فروش، ملک فروش، اصول فروش اور مسلک فروش پائے جاتے ہیں تو پرانے زمانہ میں بھی دُنیا پرستوں اور خُشامد پسندوں کی کہیں کمی نہیں تھی۔

بہرطور انسان کے دماغ میں نور ہے تو دل میں حسب معمول تاریکی پائی جاتی ہے۔ عقل ترقی کر رہی ہے، سیرت جمود میں مبتلا ہے۔ مادی تمدن بڑھ رہا ہے، روحانی تہذیب تعطل میں گرفتار ہے، بدھی بڑھ رہی ہے، جسم مایا کے جنگل میں پھنسا ہے، غرض دماغ ترقی کر رہا ہے، مگر اخلاق و کردار، افعال و اعمال میں کوئی بہتری نہیں پائی جاتی۔

رجائیت کا فلسفی، سکھ پسندی کا پجاری، ترقی کا خواہاں، وکاس کا آرزومند، ارتقائیت کا معتقد نیتشے مایوس نہیں ہوتا وہ سوچتا ہے کہ جس طرح بے جان چیزوں سے نیم جان درختی جانور، کیڑے، مکوڑے، کیچوے اور مچھلیاں، رینگنے اور جل تھلئے، چوپائے اور دوپائے اور آخرکار آدمی پیدا ہوئے ہوں گے، اسی طرح انسان سے فوق انسان پیدا ہوں گے، یہ نہ صرف لاجواب دماغی قابلیت کے آدمی ہوں گے بلکہ ان کے اخلاق بھی اونچے ہوں گے۔ وہ نفس کے پجاری، حسیات کے تابع دل کے محکوم نہ ہوں گے بلکہ دماغ کے فرمانبردار ہوں گے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان دنیا میں آئیڈیل زندگی گزاریں گے۔

فلسفۂ فوق انسانیت کی تائید میں اصولی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ ارتقاء کا نظریہ اگر صحیح ہے (اور اس کے صحیح ہونے کا جسمانیات اور زندگیات کی طرح نہ صرف زمینیات اور آسمانیات بلکہ حیوانیات اور انسانیات کو یقین ہے) تو کوئی وجہ نہیں کہ ارتقاء انسان پر ختم ہوجائے اور انسانوں سے بہتر انسان بقول نیتشے فوق انسان پیدا نہ ہوں، خاصکر جبکہ تاریخی دور ہی میں اکثر افراد اس قسم کے گزر چکے ہیں اور موجودہ زمانہ میں بھی یقیناً بعض انسان ایسے موجود ہیں جو دماغی، عقلی، اخلاقی تینوں اعتبار سے پائے تکمیل کو پہونچ چکے ہیں۔

اپنے ہم قوموں میں نیتشے، امانیول کانت، گوئٹے اور بیٹھوون کو، قدیم یورپیوں میں سقراط، افلاطون اور ارسطو کو، بیچ عہد کے یورپیوں میں لیونارڈو دوونچی، رافیل اور لوتھر کو، امریکیوں میں واشنگٹن اور ابراہام لنکن کو فوق انسانوں کی قبل نشانیاں یعنے Vorerscheinungen یا قبل ظہور اور آثار ظہور سمجھتا تھا تو کیا ہم کنگ زوسو گوتم بدھ، اشوک، ابن خلدون، اکبر اعظم شاہجہاں اور کلسی داس کو فوق انسان کی قبل نشانیاں یا آثار ظہور نہیں تصور کرسکتے؟ قریبی ماضی اور موجودہ زمانہ کے بھی چند افراد مثلاً سرسید، غالب، انیس، حالی، رابندر ناتھ ٹیگور، برناڈ شا اور سب سے بڑھکر مہاتما گاندھی کیا اسی زمرے میں داخل نہیں کئے جاسکتے جو شرافت، عقلیت، اخلاق، ذہانت، فعلیت اور کارکردگی کے نگاہی نقطوں سے پایۂ تکمیل کو پہنچے ہوئے نظر آتے ہیں؟

مثالوں میں چاہے اختلاف رائے ہو، مگر اس میں شک نہیں کہ ایسی ہستیاں گزر چکی ہیں اور اب بھی ہیں جو فوق انسانی درجہ کی فرشتہ خبری بنی آدم کو پہونچاتی ہیں۔ اگر جانوروں سے انسان بننا ممکن تھا اور صحیح ہے تو انسانوں سے فوق انسان بننا کیونکر اصولاً ناممکن اور غلط ہوسکتا ہے۔ اگر ارتقائیت کا نظریہ صحیح ہے تو دوسرا لازماً غلط نہیں ہوسکتا، کیونکہ اس کا کوئی ثبوت نہیں کہ ارتقا کا عمل درآمد ختم ہوچکا اور اب مد کے بعد جزر ہے۔ اگر بدترین سے بد، بد سے خوب، خوب سے خوب تر بننا ممکن تھا تو کیا معنے کہ خوب تر سے خوب ترین بن سکے۔

نظرئے فوق انسان سے واقف ہونے کے بعد جب میری نظر سے یہ شعر گزرا تھا:

شبیہ مدنظر ہے کس کی کہ کوئی پوری نہیں اُترتی؟
ہزاروں نقشے فلک نے کیسے مٹا دئے ہیں بنا بنا کے!

یا جب میں نے حیدرآباد کے ایک نوجوان شاعر امان ارشد صاحب کا یہ شعر سنا تھا:

بنا رہے ہیں ہم انساں کی اک نئی تصویر،
ہمارے فن کا ابھی شاہکار باقی ہے!

تو مجھے لامحالہ نیتشے کا خیال آیا اور احساس ہوا کہ فلسفے اور سماجی علوم میں نہ سہی ادب و شاعری میں تو بہرحال ہمارے ہم قوموں اور ہم زمانوں کو فوق انسانیت کا احساس وادراک ہے۔

نیتشے یا تعلیمات کا ایک اور اصول جو ہم ہندوستانیوں کے لئے بہت اہم، لہٰذا قابلِ غور اور حتی المقدور قابلِ پیروی ہے۔

عدم مداخلتی اصول کے نام سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ جیسے جیسے میری عمر بڑھتی جاتی ہے اور جس قدر زیادہ مجھے ہندوستانیوں کی گھریلو زندگی اور اجتماعی تنظیم کی خامیوں کا علم ہوتا ہے، جس قدر مجھے گھریلو جھگڑوں اور آپسی اختلافوں کی وجہیں معلوم ہوتی ہیں اسی قدر میرا یہ خیال پختہ ہوتا جاتا ہے کہ ہماری سماجی اور تمدنی زندگی کی بڑی سی بڑی نخوستوں میں ہم لوگوں کی مداخلت پسندی بھی ہے۔ قانون ساز جماعتوں، میونسپالٹیوں اور پارلیمانوں کے ارکان کو چھوڑئیے، معمولی معمولی کمیٹیوں کے رکن، ٹیموں کے افراد، دفتر کا عملہ، خاندان کے لوگ، عزیز اقارب، دوست، دوست نما اغیار اور سب سے بڑھ کر سسرال والے اور پڑوسی سبھوں میں یہ لت ہے کہ وہ خواہ مخواہ غیر متعلق معاملوں میں مداخلت کر کے بے لطفی پیدا کرتے ہیں۔

یہی لوگ خدا کے تفویض شدہ امور پر پوری توجہ، توانائی اور وقت صرف نہیں کرتے وہ نجی کاموں کو ممکنہ حد تک بہترین نہیں بناتے وہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کا خیال نہیں کرتے۔ وہ خود سدھار کی طرف متوجہ نہیں ہوتے انھیں دوسروں کا درد کھائے جا رہا ہے۔ انھیں آنکھوں پر دوسروں کی چنتا اور دوسروں کی بہتری کی فکر رہتی ہے، اسی نام نہاد جذبۂ ہمدردی سے سرشار اور مجبور ہو کر وہ دوسروں کے کاموں میں مداخلت کر کے نہ صرف خد کو فت زدہ ہوتے بلکہ دوسروں کو اذیت پہونچاتے ہیں۔

مزے کی بات تو یہ ہے کہ مداخلت پسند اصحاب نیک نیتی کے بہانے نیک بخت کا سوانگ اختیار کر کے اپنی مداخلت پسندی کا جواز پیش کرتے اور اپنی غلط کاری سے لامحالہ پیدا ہونے والے پچھتاوے کو بھلانا چاہتے ہیں گویا محض نیک نیتی اور شبہ خیالی، بے وقوفی اور جہالت یا بداعمالی اور غلط کاری کا جواز ہو سکتی ہے، تب ہی ترکوں میں یہ دعائیہ کہاوت بہت مقبول ہے:

"خدایا! تو مجھے میرے دوستوں سے بچا، اپنے مخالفوں اور دشمنوں سے میں آپ اپنی حفاظت کر لے سکوں گا!"

نیتشے جس حد تک عدم مداخلت کا قایل تھا اس کا اندازہ آپ اس نہایت مختصر اور موثر چٹکلے سے کر سکیں گے، جس کے لئے اردو میں تو کوئی نام نہیں اور جسے یورپی بھاشاؤں میں Aphorism کہتے ہیں۔

نیتشے نے کہا ہے:

"Ein Wort des Rates gib nicht!" — A word of advice don't give it!

"بقول زردشت" میں کہا گیا ہے:

"سب سے مقدم بات یہ کہی جاتی ہے: 'اپنے پڑوسیوں سے محبت کرو' 'اپنے پڑوسیوں کو انھیں کے حال پر چھوڑ دو!' اور نیک چلنی کا یہی پہلو اہم تر اور مشکل تر ہے!"

آپ جانتے ہوں گے کہ حافظ نے عدم مداخلتی اصول کا پرچار کرتے ہوئے کہا تھا:

نہ قاضیم، نہ مدرس، نہ محتسب، نہ فقیہم
مرا چہ کار؟ کہ منع شراب خواری کنم!

اور خد ہماری زبان کے شاعر نے کہا ہے:

رند خراب حال کو زاہد نہ چھیڑ تو
تجھ کو پڑی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو!

مفہوم اور غرض، منشا و مطلب کے لحاظ سے مختلف زمانوں اور ملکوں کے لوگ بات تو ایک ہی کہہ رہے ہیں مگر تینوں کا رنگ، پیرایۂ بیان طرزِ اظہار بالکل الگ ہے۔

ہماری زبان میں ایک کہاوت بھی ہے جس میں نیتشیانہ طرز کی جھلک پائی جاتی ہے اور عدم مداخلتی پالیسی کی تلقین کی گئی ہے:

"پرائی شادی میں عبداللہ دیوانہ!"

ہم لوگوں میں مداخلت کی بری عادت اتنی عام ہوگئی ہے کہ غمی کے موقع پر بھی دخل در معقولات کرکے غم زدہ لوگوں کو اور زیادہ پریشان کرتے ہیں اور جیسا کہ وحیدالدین سلیم صاحب نے خوب کہا تھا کہ ہم پر اس مثل کے دونوں روپ صادق آتے ہیں یعنے:

"پرائی شادی میں عبداللہ دیوانہ!"

اور: "پڑوس کی موت میں حمیداللہ باولہ!"

نیتشے کس حد تک عدم مداخلتی اصول کا حامی تھا؟ اس کا اندازہ ہمیں اس حقیقت سے ہو سکتا ہے کہ نیتشے رحمدلانہ موت یا آزادانہ موت کو بھی جایز قرار دیتا تھا اور بعض صورتوں میں اس کی ضرورت بلکہ جواز اور افادیت کے موافق ہو کر کبھی تو یہ کہتا ہے:-

"فاقتوں سے دنیا بھری پڑی ہے۔ بہت ہی زیادہ لوگوں کی وجہ سے زندگی تنگ ہو چکی ہے۔ کاش کوئی انھیں ابدی زندگی کی لالچ میں اس زندگی سے لے اڑے!"

اور کبھی یہ:-

"کئی لوگ بہت دیر سے مرتے ہیں اور چند ہی قبل از وقت۔ ابھی یہ تعلیم اجنبی سی معلوم ہوتی ہے کہ 'ٹھیک وقت پر مرو' 'ٹھیک وقت پر مرو' یہی زرد بخت کی تعلیم ہے!"

آپ نے سنا ہوگا کہ موجودہ زمانہ کی کئی ترقی یافتہ، ترقی پسند اور ترقی پذیر ملکوں میں یہ تحریک چالو ہے کہ لاعلاج بیماریوں میں مبتلا، جراح کے چنگل میں پھنسے ہوئے، آٹھوں پہر دکھ سہہ سہہ کر نڈھال ہو جانے والوں کو خود انھیں کی خواہش اور تحریری اجازت پر موت کی میٹھی نیند لانے والی دوا دیجائے۔ چونکہ اس کی اصل وجہ اہم ہے، اس لئے اسے یعنے رحمدلانہ موت یا دیا ہتیا کہتے ہیں۔ یورپ اور امریکہ میں دیا ہتیائی تحریک قابلِ لحاظ نہیں ہے اور رحمدلانہ موت کو جائز قرار دینے کی کوشش بڑھتی جا رہی ہے۔

اس حقیقت سے ظاہر ہے کہ نیتشے کس قدر زیادہ اپنے زمانہ سے آگے تھا۔ اس قول کے بالکل برعکس

لائی حیات آئے، قضا لے چلی چلے
اپنی خوشی نہ آئے، نہ اپنی خوشی چلے

وہ خاندانی منصوبہ بندی، شادی بیاہ میں نسل سدھارانہ مسلک، تعلیم، محنت، کھیل اور تفریح پر مناسب توجہ سے دماغی اور جسمانی ترقی اور حسب دلخواہ یا آزادانہ موت کا قایل تھا۔ گویا جدید اصطلاحاتی زبان میں نیتشے

خاندانی منصوبہ بندی	Family Planning
طاقت اور حسن کی تحصیل	Ways to Strength & Beauty
تعلیم اور خوشحالی	Education & Welfare
اور: آزادانہ موت	Euthanasia

کا موافق اور مبلغ تھا۔

مضمون ختم کرنے سے پہلے ہم نیتشے کی مفکرانہ حیثیت کے بارے میں یہی کہہ سکتے ہیں کہ وہ سب سے زیادہ سکہ پسندانہ فلسفے کا معتقد تھا

اور اس نے سکھ پسندی کی تلقین بہت اچھی طرح کی، نیز اس کو سمجھانے کے لئے بڑی نرالی تشبیہیں اور دلآویز مثالیں دیں۔ "نیتشے کی ادیبانہ حیثیت" نامی مضمون میں میں نے اس کی متعدد مثالیں دی ہیں۔ یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ نیتشے کہتا ہے:

"فرطِ مسرت کی بدحواسی شدتِ غم کی بدحواسی سے بہتر ہے۔ بدلما رقص لنگ سے بہتر ہے"

سکھ پسندانہ فلسفے کی تشریح کرتے ہوئے نیتشے نے نظریۂ فوق انسان کی اہمیت و صداقت بخوبی واضح کی۔ اگرچہ یہی اس کا کارنامۂ حیات تھا مگر اس کے علاوہ بھی نیتشے نے بڑے بڑے کام انجام دئے۔ بہت سے فلسفیانہ جز مسئلے حل کئے، اخلاقیات اور جمالیات، مذہبیات اور نفسیات، آوازات اور زبانیات، فنونِ لطیفہ اور صرف و نحو کے بارے میں بڑے معنی خیز اور سنجیدہ نکات بیان کئے، جن کی تشریح و توضیح سے نیتشے کے ذہنی دبستان کو خوب پھیلایا یا متعلقہ علوم کو بہتر بنایا جا سکتا ہے۔

ان سب کے برابر شاید ان سے بڑھ کر نیتشے کا یہ کارنامہ مدتوں زندہ رہے گا کہ نیتشے نے سنجیدہ اور فلسفیانہ تنقیدی اور تشریحی خیالات کو نہایت دلآویز، موثر اور پر لطف زبان میں پیش کر کے اپنی متعدد تصنیفوں اور گراں قدر مضمونوں کے ذریعہ جرمن ادبیات کی ایسی خدمت کی جس سے جرمن زبان و ادب کا معیار اور زیادہ بلند ہو گیا کہ نیتشے کی مفکرانہ حیثیت اہم تر اور بلند تر ہے یا اس کی ادیبانہ حیثیت۔

"ڈاکٹر جعفر حسن" کا مقالہ بجنسہ شائع کیا جاتا ہے اور جو سقم یا مجہول عبارت میں پایا جاتا ہے اسے بھی دور نہیں کیا گیا کیونکہ ان کی خواہش یہی تھی۔ املا، ترجمہ اور ترکیب الفاظ کا جو اصول انھوں نے اختیار کیا ہے اس سے مجھے اتفاق نہیں ہے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس بات سے مجھے اتفاق نہ ہو، وہ غلط ہی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات اسی کو پسند کریں۔

بہرحال معنویت کے لحاظ سے یہ مقالہ مطالعہ کے قابل ہے اور اسی نقطۂ نظر سے اسے دیکھنا چاہئے۔ (نیاز)

یہ بھی ضرور پڑھئے

تصانیف نیاز فتحپوری

اطلاعی قیمت

من و یزداں مفت	مذہبی استفسارات و جوابات ۲	جمالستان ۲	نگارستان للہ	شہوانیات للہ
مکتوباتِ نیاز تین حصے عہ ۱۳	انتقادیات للہ	حسن کی عیاریاں ۲	مالہ وماعلیہ ۲	شہاب کی سرگزشت ۲
فلاسفۂ قدیم ۸	مذاکراتِ نیاز ۸	فراست الید ۸	مذہب ۸	نقاب اٹھ جانے کے بعد ۸

میزان ۵۲ عہ ۸

یہ تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف چالیس روپئے میں مل سکتی ہیں

منیجر نگار لکھنؤ

ترکوں کے عہد میں

سرزمینِ دمشق کا ایک رومان

ایک طرف شام اپنی تمام مکمن ملاحتوں اور شفقی رنگینیوں کے ساتھ، دوسری طرف آسمان اپنی تمام پاکیزہ نمود آگینیوں کے ساتھ۔ سرزمینِ دمشق میں ایک سحر کارانہ کیفیت پیدا کر رہا تھا اور وہ موجِ نشاط جو غروبِ آفتاب کے بعد ہی ہوا کے پہلے ٹھنڈے جھونکے سے وہاں پیدا ہو جاتی ہے، چاروں طرف فضا میں گھل رہی تھی۔

احمد کا محل جو نہایت سفید سنگِ مرمر سے تعمیر کیا گیا تھا، ایک وسیع باغ کے اندر آسمان کے نیلگوں فضا میں جاذبِ قلب و نگاہ تھا۔ اور چاروں طرف کی فصیل پر گلاب اور چنبیلی کے پھول سڑک پر چلنے والوں کو اس طرح نظر آتے تھے، جیسے شام و دمشق کی بلند بالا حسین لڑکیاں جھانک رہی ہوں، فوارہ کے قطرات حوض کے پانی میں گر گر کر اک سمیں آواز پیدا کر رہے تھے، اور نارنج و ترنج کے کنجوں کی خوشبو سے مست ہو ہو کر چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔

اس شام کو آفتاب کی شعاعوں نے آسمان پر صرف کے سے مختلف رنگ پیدا کر رکھے تھے، باغ پر اک سکون طاری تھا اور اگر کبھی کوئی آواز آتی بھی تھی تو فاختہ کی یا کسی کے ہلکے قدموں کی جو تاک کی جھاڑیوں میں ایک روش پر مصروف خرام تھا۔

سلمہ، جو احمد کی حرم سرا میں سب سے زیادہ حسین لڑکی تھی، اس وقت باغ میں محوِ گلگشت تھی، سپید ریشمی نقاب الٹ کر سر کے اوپر ڈال دیا گیا تھا اور اس کے سرخ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم، ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے نسیم نے گلاب کی پنکھڑیوں کو جنبش دیدی ہو، وہ اس وقت بہت مسرور تھی۔

دمشق کا موسمِ بہار، سترہ سال کی نوجوانی اور پھر فرشتۂ محبت کی مستی۔ اسے مسرور ہونا چاہئے تھا۔ وہ شام کے اس حصہ کی رہنے والی تھی، جہاں فطرت تقسیمِ حسن کے لحاظ سے بڑی فیاض ہے۔

اس کے جسم کا کھلا ہوا حصہ، آفتاب کی شعاعوں سے ایک تابشِ زریں بن گیا تھا اور لباس میں چھپا رہنے والا حصہ جب کھل جاتا تھا تو محسوس ہوتا تھا کہ جلد کے نیچے چاندنی مسکرا رہی ہے، اس کے بالوں کے ہلکے گھونگھر والے بال گویا سیاہ ریشم کے لچھے تھے جو ابھی ابھی سلجھا کر چھوڑ دئے گئے تھے، اس کی حسین آنکھوں کے سرخ سرخ ڈورے، معلوم ہوتا تھا کہ جوانی کی شراب پلکوں سے ٹپک رہی ہے۔ اس کی پیدائش، بیروت کے گرم و خشک پہاڑوں میں ہوئی تھی اور بہت کم سنی میں مالِ غنیمت کی صورت سے احمد کے پاس پہونچی تھی جو دمشق کا نہایت دولت مند تاجر و زمیندار تھا۔

احمد ایک ترک سردار تھا اور وہ تمام صفات جو ایک ترک میں فطرتاً پائی جاتی ہیں، اس میں بھی موجود تھیں وہ ان لوگوں کے ساتھ جو اس سے متعلق تھے حد درجہ لطف و نرمی سے پیش آتا تھا اور حبشی غلاموں سے لے کر خواتینِ حرم تک سب کے لئے سراپا رحمت و شفقت تھا۔ کسی ترک کا حکومت کرنا گویا امن و سکون کا حکومت کرنا ہے، اس لئے احمد کا قصر بھی اک جولانگاہ مسرت و نشاط تھا اور یوں بھی احمد خصوصیت کے ساتھ بہت زیادہ حسین تھا۔

سلمہ، ایک وحشی قبیلہ کی لڑکی تھی اور ابتدا سے اس کو وہ تربیت میسر نہیں آئی تھی جو ترک خواتین میں عام طور سے رائج ہے، اسلئے

وہ احمد کی حرم سرا میں آکر "مربیات حرم" کے سپرد کر دی گئی اور اُن کی تربیت میں نشو و نما پانے لگی۔ حتیٰ کہ اب جبکہ اس کی عمر سترہ سال کی ہو چکی وہ ایک ایسی مہذب و شائستہ لڑکی بن گئی کہ مشکل سے احمد اپنے تئیں اس کے سحر سے بچا سکتا تھا، آخر کار اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس کے ساتھ شادی کر کے نہ صرف اپنی دولت بلکہ اپنی روح بھی اس کی سپردگی میں دیدے گا۔ ہر چند حرم کا ہر شخص اس حقیقت سے آشنا ہو چکا تھا اور سب کو یقین تھا کہ کسی نہ کسی دن احمد کے یہ مخفی جذبات بروئے کار آنے والے ہیں، لیکن سلمیٰ ابھی تک اس سے بے خبر تھی اور وہ احمد کی بیوی، حرم سرا کی ملکہ بن جانے کو اپنی بڑی خوش بختی سمجھتی تھی کہ اگر کبھی اس کا خیال بھی آتا تو فوراً مایوس سائس کے ساتھ اس خیال کو دور کر دیتی۔ وہ ایک سنہری تتلی کی طرح فضائے گلشن میں نشو و نما پاکر ادھر اُدھر آزادی سے پھرتی رہتی تھی، لیکن اس سے آگاہ نہ تھی کہ کنجوں کے اندر ایک ہاتھ اس کو گرفتار کرنے کے لئے بیتاب ہے۔

چاندنی رات تھی، اور سلمیٰ جس کے جذبات میں ہر طلوع ماہ کے ساتھ ناقابل ضبط ہیجان پیدا ہو جاتا تھا، اپنے شباب کی خوابیدہ اپنی جوانی کی تمناؤں سے مجبور ہو کر فصیل کے پاس ایک روش پر مضطربانہ ٹہل رہی تھی، کہ ایک نارنگی اس کے سینہ پر آکر لگی، اس نے گھبرا کر گردن اُٹھائی تو دیکھا کہ ایک نوجوان جو اپنی صورت کے لحاظ سے ایک فرشتہ معلوم ہوتا تھا، فصیل پر بیٹھا ہوا مسکرا رہا تھا۔ سلمیٰ ڈری اور چیخ مار کر بھاگنا چاہتی تھی کہ وہ نوجوان اُترا اور دوزانو ہو کر اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا اور بولا "اے سلمہ، میں انسان ہوں اور اس زمانہ سے تیرا فریفتہ، جب تو اول اول اس باغ میں تفریح کے لئے آئی تھی، میں روز تجھے اس باغ میں مصروف خرام دیکھتا ہوں اور روز اس بات کی کوشش کرتا ہوں کہ تیرا خیال اپنے دل سے نکال دوں، لیکن میں کامیاب نہیں ہوا اور آخر کار مجبور ہو کر تجھے تیرے قدموں تک پہونچنا پڑا۔ اس میں شک نہیں کہ تو حسن کی دیوی ہے اور دمشق کے سب سے بڑے دولتمند شخص کی حرم سرا میں زندگی بسر کر رہی ہے۔ لیکن میں باوجود مفلس و غریب ہونے کے بھی تجھ پر ایک حق رکھتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ میں اُسی بستی کا رہنے والا ہوں جہاں تو پیدا ہوئی اور مجھے بھی اسی قوم کا ایک فرد ہونے کی عزت حاصل ہے، جس کا خون تیری رگوں میں دوڑ رہا ہے۔"

سلمہ جو اس سے قبل آگاہ نہ تھی کہ کسی مرد کا محبت بھرا ہاتھ جسم سے مس ہو جانے کے بعد دل میں کیا کیفیت پیدا ہو سکتی ہے جو اس حقیقت سے بالکل ناآشنا تھی کہ ایک مرد کا اظہار محبت کیونکر رگوں میں بجلی دوڑا سکتا ہے، مسحور سی ہو گئی اور دیر تک معمورانہ کیفیت میں مبتلا رہی، اس کی حالت اس وقت ایسی تھی جیسے کوئی بھنور میں پھنس جائے اور گھبرا کر ہاتھ پاؤں بے قابو ہو جائیں۔

اجنبی نوجوان دیر تک اظہار محبت کرتا رہا اور سلمہ خامشی بابے ہوشی کے عالم میں اسے سنتی رہی شاید وہ ابھی کچھ دیر اور اس حالت میں مبتلا رہتی، لیکن صحن باغ کی مسجد سے اذان کی آواز بلند ہوئی اور وہ دفعتاً چونک پڑی۔ اس نے اپنا ہاتھ اس کے ہاتھ سے جدا کیا اور بولی کہ "تم یہاں سے فوراً چلے جاؤ، کیونکہ تمہارا یہاں ٹھہرنا، تمہارے لئے موت ہے، اس نے جواب دیا کہ "اے سلمہ صرف ایک لمحہ تجھ کو دیکھ لینا ایک انسان کے لئے اتنی طویل زندگی ہے کہ اس کے حصول کے بعد موت کا خطرہ ضعیف ہو جاتا ہے اور اس لئے میں اب دُنیا میں کسی چیز سے نہیں ڈر سکتا، مگر اُس وقت سے کہ تو مجھے ٹھکرا دے، میری محبتوں کو رد کر دے۔" سلمہ اس کا جواب دینا ہی چاہتی تھی کہ محل سرا سے نوحہ و شیون کی آواز بلند ہوئی اور سلمہ سمجھ گئی کہ اس کے آقا کی بیوی جو عرصہ سے علیل تھی مر گئی ہے، وہ پھر گھبرا گئی، محلسرا کی طرف بھاگ جانے کے لئے آمادہ ہوئی، لیکن اس نوجوان نے اُس کا دامن پکڑ لیا اور چونکہ سلمہ کا جسم بالکل بے قابو تھا اس لئے وہ اس کے آغوش میں گر پڑی اور اس طرح عشق کی پہلی منزل طے ہو گئی۔

(۲)

اس واقعہ کے پانچ دن بعد سلمہ حوض پر بیٹھی ہوئی فانوسی خاتونوں سے کھیل رہی تھی اور اُس نوجوان کی یاد جس کا نام مراد تھا اس کے دماغ کو معمور کئے ہوئے تھی اور سوچ رہی تھی کہ جب وعدہ کے مطابق دو ہفتہ گزر جانے کے بعد وہ مجھے لینے آئے گا تو میں کیونکر نکل سکوں گی۔ جس کارواں کے ساتھ وہ مجھے لیجانا چاہتا ہے، کیوں نہیں اسی ہفتہ کو پتہ کرتا، میرے بھاگ جانے پر

احمد کیا کہے گا۔ یقیناً میری ناشکری ہے کہ میں اس طرح چھوڑ کر چلی جاؤں گی، لیکن میں اس طرح کی زندگی جو باوجود تمام اسباب عیش و مسرت کے ویران و غیر آباد ہے کب تک بسر کئے جاؤں گی۔ الغرض وہ اسی قسم کے مختلف خیالات میں مستغرق تھی کہ ایک کنیز آئی اور نہایت ادب سے دست بستہ عرض کی کہ "آقا نے یاد فرمایا ہے"۔

سلمہ کے لئے یہ پہلا موقعہ تھا کہ احمد نے اُسے بلایا ہو، اس لئے وہ اس غیر متوقع خبر سے چونک پڑی، اور ایک عجیب قسم کا خوف و ہراس لئے ہوئے وہ کنیز کے پیچھے پیچھے چلی، جب محل سرا کے اندر پہونچی تو احمد کے کمرہ کی طرف اس کے رہنمائی کر دی گئی۔ احمد فرش پر تکیہ لگائے نیلگوں قبا پہنے ہوئے مضمحل بیٹھا ہوا تھا، اور اس کے چہرے سے ایک شاہانہ انداز پیدا تھا، سلمہ جس کو اس وقت تک احمد کے روبرو آنے یا گفتگو کرنے کا موقعہ نہیں ملا تھا۔ سامنے آتے ہی فرط رعب سے مغلوب ہو کر سجدہ میں گر پڑی۔ احمد نے جلدی سے اُسے اُٹھایا اور نہایت ہی شفقت کے ساتھ اس کو پاس بیٹھنے کی اجازت دی، سلمہ بیٹھی ہوئی تھی اور یہ محسوس کر رہی تھی کہ احمد کی ہر نگاہ کے ساتھ تخیل ہوئی جاتی ہے اور اس کا ضمیر ملامت کر رہا تھا کہ کیوں اس نے مراد کے ساتھ جانے پر رضامندی ظاہر کر کے اپنے مالک کو دھوکہ دینے پر آمادگی ظاہر کی، اس کا فیروزی رنگ کا ریشمی ملبوس شانہ و گردن کے بلور و گلاب سے مل کر عجیب کیفیت پیدا کر رہا تھا، چہرہ کا رنگ غیر معمولی طور پر رخساروں میں جمع ہو کر آگ بنا ہوا دہک رہا تھا اور احمد نہایت غور سے کام لے کر اُس کے جذبات سمجھنے کی کوشش میں مصروف تھا۔ تھوڑی دیر گزر جانے کے بعد احمد نے کہا: "مجھے امید ہے کہ تمھیں میرے گھر میں کوئی تکلیف نہ پہونچی ہوگی"۔

سلمہ "تکلیف! نہیں تو مجھے کوئی نہیں ہوئی" وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی اور اضطراری طور پر اس کے منہ سے یہ الفاظ نکل رہے تھے۔ احمد نے اس سے کچھ گانے کی فرمائش کی اور اُس نے عود لے کر اپنی کانپتی ہوئی آواز سے تقریباً دو گھنٹہ تک ناکام سعی کی، احمد اس وقت سلمہ کی اس حیا آمیز ادا سے اس درجہ متاثر ہوا کہ مہتاب ہو کر اس نے اپنا ہاتھ اس کے شانہ پر رکھ دیا اور زیادہ قریب ہو کر اس کا مطالعہ کرنا چاہا، لیکن سلمہ جس کے دل میں اس وقت تک مراد کی محبت کی آگ روشن تھی جھجک کر علیحدہ ہو گئی اور احمد کو چند لمحات کے لئے متحیر کر دیا، چونکہ وہ ایک لمحہ کے لئے بھی یہ خیال نہ کر سکتا تھا کہ حرم سرا کی کوئی عورت اس سے احتراز و اجتناب کر سکتی ہے، اس لئے اس نے خیال کیا کہ شاید وہ نکاح پر راضی نہیں ہے اور اس نے نہایت فیاضانہ لہجہ سے کہا کہ "سلمہ، ڈرنے کی کوئی بات نہیں۔ میں نے تمھیں یہاں اس لئے نہیں بلایا ہے کہ تم کو محبت کرنے پر مجبور کروں، کیونکہ اس کا تعلق جبر و اکراہ سے نہیں ہے، چونکہ اب میں بالکل تنہا ہوں اور میرا جی چاہتا ہے کہ کوئی میری تنہائی کو دور کرے، اس لئے میں نے تمھیں بلایا ہے کہ اگر تم مجھ پر اس قدر مہربانی روا نہیں رکھ سکتیں تو میں تمھیں مجبور نہ کروں گا۔ تم آزاد ہو"۔

یہ سننے کے بعد سلمہ اس قدر متاثر ہوئی کہ اس نے اپنا سارا راز ظاہر کر دینا چاہا، لیکن پھر اس خیال سے کہ احمد اتنی بڑی غلطی کو معاف نہ کریگا اس نے ضبط کیا اور اس کا یہ ضبط گریۂ بے اختیار میں تبدیل ہو گیا۔

(۳)

ایک ہفتہ گزر چکا ہے اور سلمہ بالکل آزاد اپنے حال پر چھوڑ دی گئی ہے، نہ احمد نے اسے بلایا اور نہ مراد نے منہ دکھایا، اس کے لئے اب دنیا بالکل ویران تھی اور کسی تفریح میں اس کا جی نہ لگتا تھا، رات کو آسمان کا ایک ایک تارا جو اس سے قبل اس سے گفتگو کرتا ہوا معلوم ہوتا تھا، اب اسے برہم نظر آتا تھا، باغ میں بلبل کا لحن جو اس سے پہلے اس کے اندر ایک لذت پیدا کرتا تھا، اب اس کو ایک کراہ معلوم ہوتا تھا، محلسرا کی فضا، جو پہلے اس کے لئے نشاط گاہ کا حکم رکھتی تھی، اب اس کو ماتم کدہ دکھائی دیتی تھی غرضیکہ وہ ہر چیز کو اپنے سے متنفر دیکھتی تھی اور دمشق کا ایک ایک ذرہ اُسے دیوانہ بنائے دیتا تھا، کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ اس نے احمد کی محبت کو رد کر کے ایسا معمولی گناہ نہیں کیا ہے جس کو فطرت معاف کر دے گی۔

ایک شام جبکہ افق کا قرمزی رنگ ہلکا ہو چلا تھا اس کے مقابل پورا چاند اپنا سنہرا چہرہ لیکر نمودار ہوا، سلمہ بیتاب ہو گئی اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ اس زندگی سے مرجانا بہتر ہے، کیونکہ اگر وہ احمد کو چھوڑ کر مراد کے ساتھ چلی گئی تو بھی اس کا ضمیر چین سے نہ بیٹھنے دے گا،

اس لئے وہ فرش پر گر کر رونے لگی اور بے اختیار اس کے منہ سے نکل گیا کہ "اے خدا مجھے اُٹھا لے کیونکہ میں اپنے مالک و آقا کی ہتک کو برداشت نہیں کر سکتی"۔
ایک کنیز جو باہر پردہ کے پاس بیٹھی ہوئی سُن رہی تھی، فوراً اُٹھ کر احمد کے پاس گئی اور اس سے سارا حال بیان کر دیا۔

(۴)

تمام حرم سرا میں ہر جگہ چہل پہل نظر آ رہی ہے، ذرہ ذرہ سے مسرت و نشاط پیدا ہے، کیونکہ سلمہ آج دولہن بنائی جا رہی ہے وہ گلاب سے نہلائی گئی، صحرائے شام کے جنگلی خوشبودار پھولوں سے اس کے بال سنوارے گئے، زر کار لباس سے اُسے آراستہ کیا گیا اور ایک کنیز عطریات لینے کے لئے بازار دوڑائی گئی ۔ لیکن عین اس وقت جبکہ وہ کنیز، عطار سے، احمد اور سلمہ کے باہم نکاح کا قصہ بیان کر رہی تھی، مراد بھی کسی غرض سے اُس کی دوکان پر آیا تھا اور یہ حال سنتے ہی غائب ہو گیا۔
سلمہ ایک منور کمرہ میں سونے کی زنجیر گلے میں ڈالے ہوئے آئینہ دیکھ رہی، اس کے سیاہ بالوں میں ذرات افشاں، تاریک رات کے ستاروں کی طرح چمک رہے تھے، ابرو کا وسمہ اس کے گورے گورے رنگ میں ان تلواروں کے خم کو پوری طرح نمایاں کر رہا تھا وہ پوری طرح آراستہ ہو چکی تھی اور صرف کنیز کا انتظار کر رہی تھی کہ عطر گلاب لا کر اس کے جسم میں ملا دے۔ کہ وہ کنیز بھی آ گئی اور سلمہ خوابگاہ عروسی کی طرف لیجائی گئی ۔

(۵)

احمد کا کمرہ روشنی سے جگمگا رہا تھا اور چاند کی روشنی نے اسے سیلاب نور سے لبریز کر دیا تھا، کھڑکیاں جن پر سرخ وقت پردہ پڑا رہتا تھا اس وقت ہوا آنے کے لئے کھولدی گئی تھیں۔ گلاب و یاسمین کے خوشبو بیچے باغ سے آ آ کر سارے مکان کو معطر بنائے ہوئے تھی اور احمد فرش پر تکیہ کے سہارے خاموش بیٹھا ہوا نظر آ رہا تھا۔
سلمہ آہستہ آہستہ شرمائے ہوئے قدموں کے ساتھ اس کی طرف بڑھ رہی تھی کہ وہ اس کی پذیرائی کے لئے اُٹھ کھڑا ہوگا، لیکن احمد نے بالکل پروا نہ کی اور وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ چونکہ روشنی بہت تیز تھی اور اُسے احمد کی صورت اچھی طرح نظر نہ آتی تھی اس لئے سلمہ نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ کا سایہ کر لیا اور پھر آہستہ آہستہ بڑھی۔ وہ قریب پہونچگئی اور اس نے جھک کر اس کے قدموں کو بوسہ دیا، لیکن پھر بھی اس میں حرکت نہ پیدا ہوئی۔
احمد کا چہرہ اس وقت ایسا نظر آتا تھا جیسے کسی پتھر میں تراشا گیا ہے اور اس کا رنگ بالکل نچوڑ دیا گیا ہے اس کی کھلی ہوئی آنکھیں سلمہ کی طرف جمی ہوئی تھیں، اور اسی حال پر قائم تھیں، وہ اس کے قدموں میں تھی، لیکن اس کا شوہر اس کی طرف سے بے نیاز تھا، اور کسی تمنا کا اظہار نہ کرتا تھا۔ سلمہ متحیرانہ طریقہ سے اسے دیکھ رہی تھی کہ اس کی نگاہ سینہ پر پڑی جہاں ایک سُرخ دھبہ نظر آ رہا تھا اور نیچے فرش پر خون پھیل کر جم گیا تھا، زیادہ غور کرنے سے اس نے اس خنجر کو بھی دیکھ لیا جو اس کے سینہ میں پیوست تھا اور پھر بیہوش ہو کر وہیں گر پڑی۔

(۶)

سلمہ ۔ "مراد، تم یہاں کیسے آئے اور کیوں ؟"
مراد ۔ "میں ان کھڑکیوں سے چڑھ کر یہاں آیا تاکہ تمہیں لیجاؤں اور اس شخص کو ہلاک کر دوں، جو تم کو چھین لینا چاہتا تھا"۔
سلمہ ۔ "شاباش، مرد ایسا ہی کہا کرتے ہیں اور میں تمہارے ساتھ چلنے کے لئے آمادہ ہوں، لیکن چونکہ احمد نے میرے ساتھ بہت سا احسان کئے ہیں، اس لئے مجھے اتنی اجازت دو کہ ایک بار قریب سے اس کی لاش کو اور دیکھ لوں"۔
مراد ۔ "اجازت ہے، لیکن جلدی کرو، مبادا کوئی آجائے اور پھر ہم تم دونوں مارڈالے جائیں"۔
مراد نے یہ کہکر دروازہ کی طرف منھ پھیرا ہی تھا کہ وہی خنجر جو احمد کے سینہ میں پیوست تھا، اب مراد کی پشت سے گزر کر اس کے دل کا خون پی رہا تھا اور سلمہ ایک بپھری ہوئی شیرنی کی طرح اس کے تڑپنے کا تماشہ دیکھ رہی تھی۔

ق

لڑائیوں کی پیشین گوئیاں

دُنیا میں دو قسم کے اضطرابات رونما ہوتے رہتے ہیں، ایک طبعی دوسرے اجتماعی، اضطرابات طبعی زلزلہ یا زمین کے پھٹ جانے یا اسی قسم کے دوسرے غیر معمولی طبعی حوادث سے عبارت ہیں اور اجتماعی اضطرابات سے مقصود لڑائیاں، بغاوتیں اور دنیا کی قوموں کی باہمی کشمکش ہے۔

دنیا میں جب کبھی کوئی طبعی یا اجتماعی تغیر پیدا ہوتا ہے تو اس سے قبل اس کے متعلق پیشین گوئیاں ہونے لگتی ہیں، یہ پیشین گوئیاں کسی واقعہ کی ابتدا اور انتہا دونوں کے متعلق کی جاتی ہیں اور جب کوئی واقعہ طول اختیار کرتا ہے تو لوگ اُس سے تنگ آکر اس قسم کی باتوں کی طرف زیادہ توجہ کرنے لگتے ہیں، چنانچہ اسی قاعدہ کے مطابق جنگ عظیم کے دوران میں بھی متعدد پیشین گوئیاں کی گئی تھیں، اور جس قدر لوگ جنگ سے گھبراتے جاتے تھے اسی قدر پیشین گوئیاں کثرت سے بیان کی جاتی تھیں، لیکن یہ ضروری نہیں ہے کہ ہمیشہ پیشین گوئی صحیح ہوا کرے، یا کسی واقعہ کے ختم ہونے کی صحیح مدت اُس سے دریافت ہو سکے، اگر جنگ عظیم کے شروع ہونے سے پہلے انسان کو یقینی طور پر معلوم ہو جاتا کہ یہ جنگ سات آٹھ سال تک طول پکڑے گی تو اس وقت لوگوں کی جو حالت ہوتی اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔

پیشین گوئیوں کی چند قسمیں ہیں جن میں سب سے زیادہ اعلیٰ الہامی پیشین گوئی ہے اور سب سے کم درجہ کی وہ پیشین گوئی ہے جو کسی واقعہ کے مقدمات دیکھ کر اُس کے متعلق کی جاتی ہے۔

اس مضمون کا موضوع الہامی پیشین گوئیوں اور ان کی تحقیق نہیں ہے بلکہ صرف ان پیشین گوئیوں پر نظر ڈالنا ہے جو اس جنگ کے متعلق کی گئی تھی اور یہ بھی اس غرض سے نہیں کہ ہم اُن کی صحت کے معترف ہیں بلکہ محض بر سبیل تفریح ان کا ذکر کرتے ہیں۔

اس سے پہلے کہ جنگ عظیم کی پیشین گوئیوں کا ذکر کیا جائے ہم تین اہم پیشین گوئیوں کا ذکر کرتے ہیں جن کے متعلق ذرا بھی شک نہیں ہے کہ وہ واقعات سے پہلے کی گئی تھی۔ یہ تینوں پیشین گوئیاں بغاوتِ فرانس کے متعلق تھیں اور بغاوت فرانس سب سے قریب ترین عظیم الشان تاریخی واقعہ ہے جو بڑی حد تک گزشتہ جنگ عظیم کے اسباب میں اثر رکھتا ہے۔ یہ پیشین گوئیاں فرانس کے رسالہ لاروس میں شائع ہوئی تھیں۔

پہلی پیشین گوئی ۱۷۱۴ء میں کی گئی تھی، یہ پیشین گوئی (Prediction) کی کتاب میں لکھی تھی پیشین گوئی کے الفاظ یہ تھے "بڑے عظیم الشان اور دہشت خیز انقلابات رونما ہوں گے جن کو زیادہ تر قوانین مدنیت و مذاہب سے تعلق ہوگا"

جنگ سے پہلے کتاب مذکور کا قلمی نسخہ شہر ڈوائے (Douai) میں محفوظ تھا اور یہی پیشین گوئی بعینہ پیرڈلی کی دوسری کتاب میں لکھی ہے جو مرسیلیا کے کتب خانے میں محفوظ ہے اور ۱۷۱۵ء میں کی گئی ہے۔

دوسری پیشین گوئی رچرڈ روساک (Richard Rousseau) کی ہے یہ بھی ایک کتاب میں لکھی ہوئی تھی۔ اس پیشین گوئی کی عبارت حسب ذیل ہے:

"۱۸۸۹ء میں اور اُس کے ۲۵ سال بعد (۱۹۱۴ء) میں دنیا کے قوانین اور مذاہب میں عظیم انقلابات اور تغیرات رونما ہونگے"

تیسری پیشین گوئی نسٹراڈامس (Nostradamus) نے کی تھی یہ شخص مہنری ثانی کا خاص ڈاکٹر تھا۔ اس پیشین گوئی کی تاریخ کتابت ۱۵۵۶ء ہے اس میں بمقابلہ دونوں سابق پیشین گوئیوں کے یہ اضافہ ہے۔

"بغاوت کے انقلابات ۱۷۹۲ء میں نہایت شدید ہوں گے اور اسی سال سے ایک نئے دور کا آغاز ہوگا"

فی الواقع یہ اضافہ بھی حرف بحرف صادق آیا کیونکہ بغاوت فرانس اس سال اپنے شباب پر تھی اور سنہ مذکور عہد بغاوت کا پہلا سال شمار کیا جاتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ وہ کونسی قوت ہے جس کی بنا پر پیشین گوئی کرنے والے مستقبل کے واقعات بتا دیتے ہیں، کیا حقیقت میں یہ غیب داں ہیں، یا اس کے کچھ اور اسباب ہیں۔ اس سوال کے متعدد جوابات دئے گئے ہیں جن کی بنا مختلف نظریات پر ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ تمام نظریات ایسے مقدمات پر مبنی ہیں جو علمی حیثیت سے صحیح نہیں ہیں۔ ہم یہاں ایک نظریہ کا خلاصہ درج کرتے ہیں۔

حوادث عظیم کے اسباب کئی صدیوں کے بعد فراہم ہوتے ہیں ان اسباب میں پوشیدہ طریقہ پر پختگی حاصل ہوتی جاتی ہے اور ایک طویل مدت کے بعد وہ اس قابل ہوتے ہیں کہ وہ ایک عظیم الشان انقلاب کا سبب بن سکیں۔

حوادث طبعی مثلاً زلزلے یا زمین کا پھٹنا، آگ اور گیسوں کے عمل سے پیدا ہوتا ہے جو زمین کے اندر پائے جاتے ہیں۔ اس لئے یہ بالکل آسان ہے کہ انسان ایسے آلات اختراع کرے، جس سے اندرونی گیسوں کی رفتار معلوم ہوتی رہے اور زلزلہ یا زمین پھٹنے سے پہلے اس کے متعلق خبر دی جا سکے۔

جس طرح یہ طبعی حوادث خاص اسباب کے تحت پیدا ہوتے ہیں اور انسان دقیق آلات اختراع کر کے پہلے سے بتا سکتا ہے کہ فلاں وقت زلزلہ آئے گا یا زمین پھٹے گی اسی طرح اجتماعی حوادث اُن پوشیدہ اسباب کے تحت میں رونما ہوئے ہیں جو آہستہ آہستہ نفوس بشری پر اپنا اثر کرتے جاتے ہیں اور جب یہ اسباب جن کا اثر براہ راست انسانی نفوس پر پڑتا ہے پختہ ہو جاتے ہیں ان سے عظیم الشان انقلابات اور تغیرات پیدا ہوتے ہیں اور جس طرح انسان آلات کے ذریعہ سے زلزلے کے اسباب پہلے سے معلوم کر کے اُس کے متعلق پیشین گوئی کر سکتا ہے اسی طرح بعض آدمیوں میں اس کی قابلیت ہوتی ہے کہ وہ اُن پوشیدہ اسباب کی رفتار معلوم کر لیتے ہیں جو نفوس انسانی میں آہستہ آہستہ اپنا اثر کر رہے ہیں۔ یہ لوگ اپنی فطری اور قابلیت سے اسباب مذکورہ دیکھتے ہوئے بتا سکتے ہیں کہ فلاں وقت ایسا واقعہ رونما ہونے والا ہے۔

بعض لوگ اعداد و حروف کے خواص کے قابل ہیں وہ اپنے اصول کے مطابق بعض وقت ایسے نتائج نکالتے ہیں جن کو دیکھ کر سخت حیرت ہوتی ہے، چنانچہ ایک شخص نے فرانس اور پروشیا کی جنگ کے آغاز اور انتہائی سنہ جمع کرنے سے نکالی تھی۔ یہ لڑائی جولائی ۱۸۷۰ء سے شروع ہو کر جنوری ۱۸۷۱ء میں ختم ہوئی، جنگ کے آغاز اور اختتام کی تاریخ اس طرح نکلتی ہے ۱۸۷۰ + ۱۸۷۱ = ۳۷۴۱، اب اس مجموعہ کو بائیں طرف سے پڑھئے، پہلے تین کا ہندسہ ہے پھر سات کا، چنانچہ جنگ بھی تیسری تاریخ اور ساتویں مہینہ میں شروع ہوئی، اس کے بعد چار اور ایک کا عدد ہے اور جنگ بھی پہلے مہینہ کی چوتھی تاریخ کو ختم ہوئی تھی۔

ایک اور پیشین گوئی ۱۸۴۹ء میں ولیم اول (قیصر کا دادا) پروشیا کا ولی عہد تھا، اتفاقاً ایک روز وہ نہا نسبرگ کے قصبہ میں گیا جہاں ایک مشہور کاہنہ رہتی تھی، ولی عہد لباس بدل کر اس کے پاس پہونچا کاہنہ نے اُسے بشارت دی کہ وہ ایک روز بادشاہ ہو جائے گا ولیم نے پوچھا کہ میں کب بادشاہ ہوں گا اُس نے کہا کہ آجکل ۱۸۴۹ء ہے اس لئے اس سنہ میں اس کے اعداد انفرادی طریقہ پر اس طرح جمع کرنے چاہئیں ۱۸۴۹ + ۹ + ۴ + ۱ = ۱۸۷۱، اعداد کا مجموعہ یعنی ۱۸۷۱ تمہاری تخت نشینی کا سنہ ہے اور حقیقت میں بھی ولیم اول ۱۸۷۱ء جرمنی کا بادشاہ ہوا پھر ولیم نے اُس سے پوچھا کہ میں کتنے عرصہ تک حکومت کروں گا، اُس نے کہا کہ ۱۸۸۸ء کا انفرادی مجموعہ اُس کے ساتھ جمع کرو، جمع کرنے سے جو کچھ حاصل ہوگا وہی تمہاری موت کا سنہ ہے یعنی (۱ + ۷ + ۸ + ۱ = ۱۷ + ۱۸۷۱ = ۱۸۸۸) اور فی الواقع ۱۸۸۸ء میں ولیم کا انتقال ہوا پھر اس نے سوال کیا کہ میری سلطنت کب تک قایم رہے گی اُس نے کہا ۱۸۸۸ء کے انفرادی مجموعہ کو اُس کے ساتھ جمع کرو یعنی ۸ + ۸ + ۸ + ۱ = ۲۵ + ۱۸۸۸ = ۱۹۱۳، اور حقیقت میں ۱۹۱۳ء میں جرمنی شاہنشاہیت کے آثار سقوط پیدا ہونے لگے۔

منجملہ ان عجیب پیشین گوئیوں کے جو اس جنگ کے متعلق کی گئی ہیں۔ کاہنہ روڈیل کی پیشین گوئی ہے۔ پیشین گوئی ساتویں صدی میں کی گئی تھی۔ اوڈریل ٹھیوک الٹرس کی بیٹی تھی۔ اس کی پیشین گوئی لاطینی زبان میں ہے اس میں صراحتاً ظاہر کیا گیا ہے کہ وہ سلطنت بالکل تباہ

ہو جائے گی جو اس کی جائداد پر تصرف کرنا چاہے گی، جس لڑائی کا ذکر اس پیشین گوئی میں کیا گیا ہے، اس کے حالات بالکل گزشتہ جنگ پر منطبق ہوتے ہیں۔ اس پیشین گوئی میں ہوائی جہازوں اور آبدوزوں کی طرف بھی اشارہ پایا جاتا ہے۔

جنگ کی پیشین گوئیوں میں ایک عجیب و غریب پیشین گوئی (۱۹۰۳ء میں) امریکہ کے ایک اخبار میں شایع ہوئی تھی۔ اس پیشینگوئی کا تعلق بادشاہوں کے سنین ولادت، سنہ جلوس اور مدت حکومت کے اعداد پر مبنی ہے اور جن کے دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دول متحدہ کے تمام فرمانرواؤں کے سنین ولادت وغیرہ جمع کرنے سے سب کا حاصل جمع ایک ہی ہو جاتا ہے۔ ذیل میں اس کی تفصیل درج کرتے ہیں:

ولسن (پریسیڈنٹ امریکہ)	
پیدائش	۱۸۵۶ء
تاریخ انتخاب صدارت	۱۹۱۳ء
مدت حکومت	۴
عمر	۶۱
مجموعہ	۳۸۳۴
شاہ انگلستان	
ولادت	۱۸۶۵ء
تخت نشینی	۱۹۱۰ء
مدت حکومت	۷
عمر	۵۲
مجموعہ	۳۸۳۴
صدر جمہوریہ فرانس	
پیدائش	۱۸۵۸ء
تاریخ انتخاب	۱۹۱۳ء
مدت حکومت	۴
عمر	۵۹
	۳۸۳۴
شاہ بلجیم	
پیدائش	۱۸۷۵ء
تخت نشینی	۱۹۰۹ء
مدت حکومت	۸
عمر	۴۲
	۳۸۳۴
شاہ سرویا	
پیدائش	۱۸۴۴ء
تخت نشینی	۱۹۰۳ء
مدت حکومت	۱۴
عمر	۷۳
	۳۸۳۴
شاہ سرویا	
پیدائش	۱۸۶۵ء
تخت نشینی	۱۹۱۴ء
مدت حکومت	۳
عمر	۵۲
	۳۸۳۴
شاہ اطالیہ	
پیدائش	۱۸۶۹ء
تخت نشینی	۱۹۰۰ء
مدت حکومت	۱۷
عمر	۴۸
	۳۸۳۴
جاپان	
پیدائش	۱۸۷۹ء
تخت نشینی	۱۹۱۲ء
مدت حکومت	۵
عمر	۳۸
	۳۸۳۴
شاہ مانٹی نگرو	
پیدائش	۱۸۴۱ء
تخت نشینی	۱۹۱۰ء
حکومت	۶
عمر	۶۲
	۳۸۳۴

اس میں سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ جب اس مجموعہ کو نصف کرتے ہیں تو ۱۹۱۰ حاصل ہوتا ہے جس سنہ میں یہ پیشین گوئی کی گئی تھی۔

بظاہر یہ عجیب بات معلوم ہوتی ہے۔ لیکن حقیقتاً یہ صرف ریاضی کی ترکیب ہے، کیونکہ جب آپ کسی بادشاہ کا سنہ ولادت اور اس کی موجودہ عمر کو جمع کریں گے تو سنہ حاضر نکل آئے گا۔ اسی طرح تاریخ تخت نشینی اور مدت حکومت کا مجموعہ وہی ہوگا، پھر چونکہ ۱۹۱۰ء میں ان دونوں کو یکجا کر دیا گیا اس لئے مجموعہ ۳۸۴۴ ہوا جو ۱۹۱۰ء کا دوچند ہے۔

ایک پیشین گوئی ۱۷۹۳ء میں جاپان کے کسی شخص نے کی تھی کہ "جب انسان پرندوں کی طرح اڑنے لگے گا تو دس بادشاہ آپس میں برسر جنگ نظر آئیں گے اور تمام دنیا اس سے متاثر ہوگی۔

ٹالسٹائی کی پیشین گوئی بھی بہت مشہور ہے۔ لیکن وہ اس قدر صاف و صریح نہیں ہے کہ بغیر تاویل کئے ہوئے گزشتہ جنگ پر منطبق ہو سکے

"نگار" کے پچھلے فائل

۳۲ء	=	جولائی تا دسمبر	=	۱۰ء
۳۶ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ ہندی شاعری نمبر) =	۲۰ء
۳۷ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ اصحاب کہف و خلافت نمبر) =	۲۰ء
۳۹ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ مصحفی نمبر) =	۲۰ء
۴۰ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ نظیر نمبر) =	۲۰ء
۴۴ء	=	جولائی تا دسمبر	=	۱۰ء
۴۶ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ انتقاد نمبر) =	۲۰ء
۴۷ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ ماجد و لین نمبر) =	۲۰ء
۴۹ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ افسانہ نمبر) =	۲۰ء
۵۰ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ تنقید نمبر) =	۳۰ء
۵۲ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ حسرت نمبر) =	۲۰ء
۵۳ء	=	جنوری تا دسمبر	= (سالنامہ داغ نمبر) =	۲۰ء

نوٹ:۔ صرف ایک ایک فائل موجود ہے اور سب سے پہلے جس کا آرڈر پہونچے گا اسی کو دیا جائے گا۔ قیمت محصول ڈاک کے علاوہ ہے۔

منیجر نگار لکھنؤ

نومِ طویل

جنگِ عظیم کے دوران میں ایک مرتبہ شمالی گول فرانسیسی فوج کے قریب آکر گرا جس کے ٹکڑوں سے بہت سی جانیں تلف ہوگئیں اور مجروحین کو شفاخانوں میں علاج کی غرض سے بھیجا گیا، اُن میں ایک ایسا شخص بھی تھا جس کے جسم پر کوئی زخم نہیں لگا تھا، مگر گولہ پھٹتے ہی وہ ایک گہری نیند سو گیا تھا۔

طویل عرصہ تک سو جانا کوئی نئی بات نہیں ہے اس سے پہلے صدہا واقعات نومِ طویل کے گزر چکے ہیں، مگر اس سپاہی کی نیند نے بہت زیادہ طول کھینچا، کچھ دنوں بعد وہ سپاہی ایک ہسپتال میں لایا گیا، وہ برابر سو رہا تھا واقعہ مذکورہ کے اکیس ہفتہ کے بعد وہ بورڈو کے شفاخانہ میں لایا گیا، جہاں عصبی امراض کا خاص طریقہ پر علاج ہوتا ہے، اس کے بعد جنوری کے مہینہ میں یعنی ۲۹ مہینے کے بعد وہ پیرس بھیجا گیا، جہاں اُس سونے والے کا مکان تھا، اس طویل خواب کے زمانہ میں اُس کی عورت اس کی خدمت کرتی رہی، اس کے بعد اُسکا حال معلوم نہیں ہوا کہ وہ اپنے خواب راحت سے بیدار ہوا یا ابھی اس کی نیند پوری نہیں ہوئی ہے۔ لیکن اتنا ضرور سنا گیا تھا کہ اب اسکی نیند پہلے کی طرح گہری نہیں رہتی ہے۔

یہ سب سے آخری واقعہ ہے جو نومِ طویل کے متعلق اس عہد میں سامنے آیا ہے اس سے پہلے اطبا نے متعدد واقعات گہری نیند کے بیان کئے ہیں، جس کے متعلق بیان میں اس سپاہی کی نیند خفیف سے قیاس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، کیونکہ زمانۂ ماضی میں بہت سے ایسے سونے والے گزرے ہیں جو کئی سال تک محوِ خواب رہے، مگر یہ ایک فرانسیسی عورت ۲۷ سال تک سوتی رہی۔

اس خوفناک حوادث کا شکار اکثر عورتیں ہوتی ہیں جن کے عصبی نظام میں کوئی زبردست خلل پیدا ہوجاتا ہے طویل نیند سونے والوں کی تاریخ حیات کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کسی سخت مرض میں مبتلا ہوگئے تھے ان کے اعصاب میں اضطراب اور تیج پایا جاتا تھا اور انھیں دماغی دورے ہوتے تھے۔

بعض لوگ متعدد مرتبہ طویل نیند میں مبتلا ہوجاتے ہیں اور ہر مرتبہ بعد کی نیند پہلے سے زیادہ طویل ہوتی ہے، اکثر اوقات یہ کیفیت کسی خارجی اثر سے پیدا ہوتی ہے جس سے دماغ متاثر ہوجاتا ہے اور بعض صورتوں میں محض داخلی سبب کی بنا پر نومِ طویل واقع ہوجاتی ہے۔

سب سے زیادہ عجیب تر یہ بات ہے کہ بعض لوگوں کو سالانہ ایک خاص زمانہ میں نومِ طویل کا دورہ ہوتا ہے ماریا البون جو اٹھارویں صدی کی ایک خاتون ہے اسی مرض میں مبتلا تھی، پہلی مارچ سے ۱۹ مارچ کی آدھی رات تک ۲ دورہ رہتا تھا، چونکہ وہ اسکی عادی ہوگئی تھی اس لئے ایک دن پہلے اس کا اہتمام کرتی تھی معمولی لباس اُتار کر سفید کپڑے پہن لیتی تھی اور صلیب سینہ پر رکھ کر نومِ طویل کی پذیرائی کے لئے تیار ہوجاتی تھی اور وقت معین پر اُسے نیند آجاتی تھی۔

اس قسم کی طویل نیند سونے والوں کی حالت تقریباً یکساں ہوتی ہے، سب پر ایک مکمل سکون و جمود طاری ہوجاتا ہے اور ہر خارجی شے سے متاثر نہیں ہوتے، یہاں تک کہ اگر ان کی زبان پر تیز ترین دوا رکھی جائے تو بھی انھیں خبر نہیں ہوتی البتہ عضلات بعض وقت سخت اور کبھی نرم ہوجاتے ہیں۔ کبھی جسم اس قدر زار اور لاغر ہوجاتا ہے کہ دیگر امراض اس پر حملہ کر دیتے ہیں۔

طویل نیند سونے والوں کی غذا

انسانی حیات کی حفاظت کے لئے کچھ نہ کچھ غذا کا ہونا لازم ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ طویل نیند والوں کو غذا کی ضرورت پیش نہیں آتی اور وہ بغیر کھائے پئے مدتوں تک زندہ رہتے ہیں بعض سونے والے اس قسم کے ہیں جنھیں کچھ نہ کچھ غذا دی جاتی ہے جو اکثر چند چمچے دودھ یا انڈے کی زردی یا اسی قسم کی اور کوئی لطیف غذا ہوتی ہے، ان سیال غذاؤں کو سونے والا اکثر اوقات نگل لیتا ہے، اور یہی اُس کے تغذیہ کے لئے کافی ہوتی ہیں، بعض صورتوں میں ایسے سونے والے کے معدہ میں خاص قسم کی نلکیوں کے ذریعہ سے غذا پہونچائی جاتی ہے، بعض مریض ایسے ہوتے ہیں کہ تیسرے چوتھے دن کھانا اُن کے لئے کافی ہوتا ہے لیکن بعض سونے والوں کے عضلات میں تشنج ہونے کی وجہ سے اُن کا منہ نہیں کھل سکتا ایسے لوگوں کو غذا دینے میں سخت دشواری پیش آتی ہے، ایسی حالت میں ضرورت اس امر کی ہوتی ہے کہ قوت سے اُن کا منہ کھولا جائے، چنانچہ ایک مریضہ کا منہ آلات کے ذریعہ سے کھولا گیا، مگر پھر وہ بند نہ ہو سکا۔

بعض سونے والے ایسے ہوتے ہیں جو مطلقاً غذا نہیں کھاتے، چنانچہ ماریان اولیون جس کا ذکر اوپر کیا گیا۔ اپنے اُنیس دن کے دورۂ خواب میں کوئی چیز نہ کھاتی تھی، لیکن سب سے زیادہ تعجب خیز حالت ایک اسپینی عورت کی تھی اس کا نام لیتھیان تھا، ابتدا میں اُسے ضعفِ عقلی کا مرض لاحق ہوا، اور تدریجاً اُس کا مرض بڑھتا گیا پھر اُس پر ایک طویل سکون و جمود طاری ہو گیا لیکن یہ پُرسکون گہری نیند نہ تھی بلکہ وہ دیکھتی اور سنتی تھی اور جو کوئی اُس کے قریب جاتا تھا تو اپنا منہ چھپا لیتی تھی، تیس سال تک اُس کا یہی حال رہا، ابتدائی دس سال میں ہر روز اُس کے گھر والے چند چمچ دودھ اُسے پلا دیا کرتے تھے۔ لیکن اس کے تیس سال کے عرصہ میں خالص پانی کے سوا اُس کے منہ میں کچھ نہ گیا جس کی روزانہ مقدار ایک سو پچیس گرام سے زیادہ نہ تھی۔

ان واقعات کی سوا اس کے کچھ توجیہ نہیں ہو سکتی کہ جسمانی اور عقلی جمود عارض ہو جاتا ہے اور اعضا کی حرکت بالکل سکون کے قریب ہو جاتی ہے اس لئے انسان کی احتیاج غذا کی طرف بہت کم ہوتی ہے اور تغذیہ کے لئے وہ چیزیں کافی ہوتی ہے جو انسان کے بدن میں موجود ہے، یہی سبب ہے کہ اس قسم کی نومِ طویل کے بعد سونے والا کمزور ہو جاتا ہے۔

جاگنے کے بعد ان کی کیا حالت ہوتی ہے

جو لوگ تھوڑے عرصہ تک سو کر اُٹھتے ہیں وہ بالکل اسی طرح بیدار ہوتے ہیں جس طرح معمولی نیند کے بعد انسان جاگ اُٹھتا ہے، ماریان اولیون جو ۱۹ دن کے بعد بیدار ہوتی تھی اسے جاگتے وقت ایک چھینک آیا کرتی تھی، لیکن اس طویل خواب کے بعد حد درجہ ضعف اُس پر طاری ہو جاتا تھا، یہاں تک کہ اُس کی آواز مشکل سے سنائی دیتی تھی، سوتے وقت اس کا منہ باندھ دیا جاتا تھا تاکہ خشک نہ ہو جائے، جاگنے کے بعد اُسے میوے اور بادام وغیرہ کھلائے جاتے تھے اور چند روز کے بعد وہ پھر اچھی خاصی ہو جاتی تھی، بعض وقت اس قسم کے سونے والے کسی خارجی آواز سے بیدار ہو جاتے ہیں، ایک مرتبہ ایک عورت گھنٹوں کی آواز سے جاگ اُٹھی جو اُس کے محلہ میں آتشزدگی کی اطلاع کے لئے بجائے جا رہے تھے۔

طویل نیند سونے والے بیدار ہونے کے بعد اکثر مرض میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور نہایت شاذ صورتوں میں ان کی اصلی قوت واپس آ سکتی ہے۔

وہ تمام وسایل جو ایک معمولی سونے والے کے بیدار کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں، نومِ طویل کے حق میں غیر مفید ثابت ہوتے ہیں۔

سب سے زیادہ عجیب تجربہ اس مقصد کے لئے ایک ڈاکٹر نے کیا تھا جو ایک حد تک کامیاب ثابت ہوا، اُس نے اس بات کی کوشش کی کہ اس غیر طبعی نوم کو نومِ طبعی بنایا جائے۔ چنانچہ اُس نے مریضہ کو نیند لانے والی دوائیاں سُنگھانا شروع کیں وہ چاہتا تھا کہ اس طریقہ سے اُس کے نفس پر اثر ڈالا جائے، چنانچہ اُس کا عمل مفید ثابت ہوا اور سونے والی نیند سے اُٹھ بیٹھی مگر وہ کھانا پینا، بالکل بھول گئی تھی،

بچوں کی طرح اسے اکل و شرب کی تعلیم دی گئی۔

نومِ طویل کیا چیز ہے

اگر ہم نومِ طویل کی یہ وجہ بیان کریں کہ اس قسم کی نیند کسی اعصابی خلل سے پیدا ہوتی ہے، تو یہ تعلیل مجہول کی مجہول کے ساتھ ہوگی، کیونکہ جب تک اس خلل کی تشریح نہ کی جائے وہ بھی مجہول ہے۔

ڈاکٹر پیر فرانسیسی نے اس کی ایک نئی وجہ بیان کی ہے، وہ کہتا ہے کہ دماغ میں ایک مرکز ایسا ہے جو نیند کا مقابلہ کرتا ہے اور انسان کو سونے سے باز رکھتا ہے، بعض مخصوص حالات میں وہ مرکز کسی سبب سے فاسد ہو کر اپنا فعل چھوڑ دیتا ہے اور انسان سو جاتا ہے، پھر کوئی چیز اس کے بیدار کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔

لیکن ہمارے خیال میں نومِ طویل کی تعلیل بیان کرنے سے پہلے نومِ طویل اور معمولی سونے میں فرق کرنا ضروری ہے لیکن ابھی تک نومِ طویل کا کیا ذکر معمولی نیند کی حقیقت بھی اچھی طرح سمجھ میں نہیں آئی ہے۔

حضرت نیاز کا ایک خط

آپ بھی کیا داستان لے بیٹھے ـــــ اے حضرت، آج کل کافر و مسلمان دونوں کا ایک حال ہے، نہ اُس کو شیوۂ کافری کا پاس نہ اس کو آئینِ مسلمانی کا لحاظ - یہ وہ زمانہ ہے کہ:-

چراغِ کعبہ و بتخانہ بے پروا نہ می سوزد

دُنیا بدل گئی، اس کا تمدن بدل گیا، عورت مرد ہو گئی، مرد عورت بن گیا اور آپ کو ہنوز اس پر اصرار ہے کہ: رہیں دراز بھی ہو اور منت کش شانہ بھی!

دین و مذہب کے باب میں غالب اپنا فلسفہ ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:-

سنگ و خشت از مسجد ویرانہ می آرم بہ شہر
خانۂ در کوئے ترسایاں عمارت می کنم

یعنی اگر کسی مذہب میں یہ قوت باقی نہیں رہی کہ وہ قعیری نظام کو قایم رکھ سکے، تو مناسب یہی ہے کہ اس کی ویرانی پر کسی اور زندہ مذہب کی تعمیر شروع کی جائے

اب مذہب نام ہے صرف سیاست کا اور سیاست کی غایت ہے صرف صنعت و تجارت کی ترقی، اس لئے اگر آپ کو واقعی مذہبی شراب سے دلچسپی ہے تو سرمایہ داری کی حمایت کیوں نہ کیجئے کہ تاریخ مذہب کے واقعات میں سے اب یہی ایک چیز دُنیا کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے - اب زمانہ "حی علی الصلوٰۃ" کی پکار کا نہیں بلکہ "حی علی العمل" کا ہے

ما ہے کہ خضر داشت ز سرچشمہ در رہد
لب تشنگی ز راہ دگر بردہ ایم ما

کیسی آپ کیوں سمجھنے لگے؟

فنونِ لطیفہ اور علم الاخلاق

مختلف نقطہ ہائے نظر سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ "کیوں نہ صنعت (آرٹ) کو اصول اخلاق کے تابع رکھا جائے"، لیکن سب سے پہلے یہ امر غور طلب ہے کہ ایسا ہو بھی سکتا ہے یا نہیں، جس حد تک تفکر و تدبر سے کام لیا جاتا ہے ہم اس نتیجہ پر پہونچے ہیں کہ ایسا ممکن ہی نہیں ہے، یہ درست ہے کہ کبھی کبھی صنعت اصولِ اخلاق پر بھی حاوی ہو جاتی ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ صنعت کا دائرہ اخلاق کے دائرہ سے بہت وسیع ہے، کیونکہ اس کا تعلق بالکل فطرت سے ہے اور وہ کچھ نہیں ہے مگر اک نتیجہ مظاہر فطرت کے مختلف نتائج و اثرات کا۔

اس لئے یہ سوال خواہ کسی شکل میں کیا جائے۔ تاہم فنونِ لطیفہ اور علم الاخلاق کا باہمی تعلق نہایت دلچسپ گورکھ دھندا ہوا بحث ہے، صنعت اک تخلیق ہے، اور اس لئے کسی ایسی شے کا پیدا کرنا ہے جو جدید ہو، بے عیب ہو، جو اپنے اندر صنعت کار کا کوئی نشان رکھتی ہو یعنی کچھ ایسی چیز ہو جس سے یہ معلوم ہو کہ صناع نے اپنی روح کا کوئی جزو اس میں چھوڑ دیا ہے لفظ "صناع" میں شاعر، مصور، سنگ تراش افسانہ نگار وغیرہ سب شامل ہیں، وہ شخص جس نے کبھی کوئی چیز "تخلیق" نہیں کی، لیکن اپنے ذوق کے لحاظ سے اس کا اہل ہے، صناع کہلائے جانے کا مستحق ہے، علم الاخلاق کو جو تعلق "صنعت" سے ہے، یا جس حد تک اخلاقی احکام ایک صناع سے وابستہ ہو سکتے ہیں، اس کے متعلق غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ علم الاخلاق کا صحیح دائرہ صرف "حیاتِ دُنیا" ہے لیکن وہ تصویر زندگی جسے فنونِ لطیفہ پیش کرتے ہیں کچھ اور چیز ہے، کیٹلس نے اس حقیقت کو ذرا وسعت کے ساتھ یوں ظاہر کیا ہے:-

"اگر شاعر خود اک صالح زندگی بسر کرتا ہو تو اس کی نظموں میں کچھ آزادی ضرور جائز رکھی جا سکتی ہے"

تخیل اور عمل میں باہم ایک قسم کا عناد پایا جاتا ہے، ایک صاحب فن کے اصول نفسیات صرف اسی کے لئے مخصوص ہوتے ہیں اور اگر ہم صرف فن کا علم حاصل کرنا چاہیں تو ہمیں اک صناع کے صرف زائیدہ دماغ کو دیکھنا چاہئے اور اس پر کبھی غور کرنا چاہئے کہ اسکے لئے لازم کیا تھا۔

کسی شخص نے کارلایل کے سامنے اس بات پر افسوس ظاہر کیا کہ جرمنی کا سب سے بڑا شاعر گیوٹے اخلاقی معاملات میں ایک حد تک ملامت کے قابل تھا۔ کارلایل نے جواب دیا کہ یہ اعتراض ایسا ہی ہے جیسے اس بات کی شکایت کہ آفتاب تمہارے لئے پائپ کے تمباکو کو نہیں سلگاتا۔ گیوٹے میں اس قسم کے معائب کی مثال ایسی ہے جیسے آفتاب میں داغ۔

اگرچہ بعض ماہر صناع ایسے بھی تھے جو اخلاقی نقطۂ نظر سے بے عیب تھے، لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ صرف صاحب فن ہونے کی وجہ سے ایک شخص اکثر نیک خصلت بن جاتا ہے۔ ایک صناع کا مقصد زندگی کی تصویر کھینچنا ہے اور اس حیثیت سے کہ وہ اپنے کو صالح تر بنانے کی کوشش سے زیادہ قدرتاً اس بات کے معلوم کرنے کی جستجو کرتا ہے کہ زندگی کیا ہے اور اپنے سوا اُسے کوئی شخص ایسا نہیں ملتا جس کی حقیقت کا وہ مکمل طور سے مطالعہ کر سکے۔ اُسے اُن جذبات سے جو اس کی فطرت میں پوشیدہ ہوتے ہیں اک دلچسپی ہوتی ہے اور اس دلچسپی کی وجہ سے وہ انھیں روکنے کی بجائے کامل آزادی دیدیتا ہے۔

اک صناع بحیثیت صناع ہونے کے واقعات زندگی سے بالکل علٰحدہ ہو کر کام کرتا ہے، وہ انھیں کو بغور دیکھتا ہے، وہ خود اپنا بھی مطالعہ کرتا ہے اور آخر کار اپنے آپ کو بھی اک دوسرا آدمی تصور کرنے لگتا ہے، جیسا والٹ وٹمین کہتا ہے:

"میں اپنی شبیہ کے سایہ کو دیکھتا ہوں جو حصول معاش کے لئے اِدھر اُدھر ہر دہ سوالی کرتے ہوئے خرید و فروخت کرتی پھرتی ہے"

ایک صناع اس کام کو جسے ہم سب کسی قدر کمی بیشی کے ساتھ کر سکتے ہیں، اعلیٰ پیمانہ پر کرتا ہے، تمام جلیل القدر شاعر اپنے گیتوں کی بنیاد جذبات اور کیفیات قلب پر رکھتے ہیں لیکن وہ اُسی وقت گیت طیار کر سکتے ہیں جب لمحۂ جذبات یعنے وفورِ جذبات کا نازک وقت گزر جائے جب ہم کسی غم کے متعلق اشعار پڑھتے ہیں تو اُس وقت وہ غم ختم ہو چکا ہوتا ہے یا اسوقت تک ہم اُس غم کو خاموشی سے برداشت کرنا سیکھ لیتے ہیں غرض ایک صناع اخلاق کے متعلق کسی قدر خاموش اور بے غرض ہوتا ہے اور اُس کے لئے یہ مشکل ہے کہ وہ مردوں اور عورتوں کے معائب سے بالکل ناراض ہو جائے، کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ یہی وہ چیزیں ہیں جو اُسے اپنے فن کے استعمال کا موقع دیتی ہیں، مثلاً ناول نگار اور ڈراما نویس بغیر بدکار لوگوں کے کیا کر سکیں گے؟ جس قصہ کے تمام اشخاص نیک خصلت ہوں گے، اُسے کون شوق سے پڑھے گا۔

میرڈ لنک نے اپنے ایک پُر تخیل اور معنی خیز الفاظ میں لکھا ہے کہ غمناک ڈراموں میں کبھی ایسی شخصیت نہیں پیش کی گئی جو مکمل طور سے عاقل ہو، کیونکہ غمناک واقعات پیدا ہوتے ہیں صرف انسانی جذبات و نقائص سے اور ڈراما میں اک عاقل شخص کی موجودگی اُن حالات کو جن سے غمناک نتائج پیدا ہونے والے ہوں روک دینے کے لئے کافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈراما لکھنے والوں کے لئے جس قدر مواد اخلاقی کمزوریوں سے ملتا ہے اتنا فطرت انسانی کی دانائیوں سے نہیں۔

ہر چند بعض قدیم ناول نویسوں نے جو حقیقتاً صناع نہ تھے اپنی تصانیف کو بالکل علم الاخلاق کے تحت مرتب کیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اُن میں حقیقی روح حسن صنعت کی موجود نہیں ہے، اسی کے ساتھ صنعت کو ملاحظہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ بعض مذاہب صنعت کے مطابق ہیں اور بعض مخالف، لیکن مطابق وہی ہیں جو ہر نوع کے فن کو پیدا کرنے اور ترقی دینے کی کافی آزادی دیتے ہیں اور جن میں اصول اخلاق کا کوئی شدید ضابطہ موجود نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ بہ نسبت پروٹسٹنٹ مذہب کے زمانۂ وسطیٰ کا کیتھولک مذہب اسکی بہت پرستی فنون لطیفہ سے زیادہ دلچسپی لیتی تھی۔ جس مذہب میں افعال نیک و بد کی تقسیم نہایت سختی سے کی جاتی ہے اُن سے صنعت بیزار ہو جاتی ہے۔

مسٹر واٹ اک ہوشیار نوجوان سے ملاقات تھی جو اپنی ہوشیاری کی وجہ سے اکثر مشکلات میں مبتلا ہو جاتا تھا، اُسے پیٹر وفی لیس کی کتاب "سیٹری کون" کا مطالعہ نہایت مرغوب تھا، اُس نے روما کے اس قدیم و بدنام مصنف کو پسند کرنے کی وجہ یہ بیان کی کہ باوصف اس نکوہش و ملامت کے جو اس رند کے حالاتِ زندگی پر عموماً کی جاتی ہے، اس کی تصانیف میں اک عظیم الشان بے خوف آزادی کا عالم نظر آتا ہے، اُس کے ناول میں شروع سے آخر تک کوئی تنقیف سا اشارہ بھی یہ ظاہر نہیں کرتا کہ انسان پر اُس کے فعل کی وجہ سے ملامت کی جا سکتی ہے۔

اگر دنیائے ادب میں بعض اوقات ہم اُن زنجیروں کو دور کر دیں، جن سے "اندیشۂ ملامت" واقعی زندگی کو اک شدید قید میں مبتلا رکھتا ہے، تو کیا صحیح ہے؟۔

زندگی میں ہم ہر شخص کو اس بات کا خطرناک اختیار دیا جاتا ہے کہ فرض یا آزادی میں سے ایک کو اپنے لئے منتخب کرے، مجبوراً ہم فرض ہی کو منتخب کرتے ہیں اور فرض ہی انتخاب کرنے والوں کی تعریف، اگر یہ واقعی زندگی ہیں اُن شکستہ حال، پیرہن دریدہ آوارہ لوگوں کی صحبت جنھوں نے آزادی کی تلاش میں اپنی زندگی برباد کر دی ہو، کسی معزز شخص کو مشکل گوارا ہوتی ہے، تاہم فنون لطیفہ کی دنیا میں بعض وقت ایسی صحبت میں وقت گزار دینا بہت پر لطف مشغلہ ہو جاتا ہے

ایک ماہر صناع کے قلب کی نہایت اہم خصوصیت "حسن" کی محبت ہے اور وہ اگر اخلاق تک پہونچ سکتا ہے تو صرف ذوقِ محبت کے ذریعہ سے۔ قدیم یونانیوں کے عقیدے کے مطابق ان کی زندگی کا نصب العین صرف "حسن" تھا، ہر چند اس نصب العین میں "نیکی" بھی شامل تھی، تاہم وہ اُسے بھی حسن ہی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس سے ظاہر ہوتا ہے، کہ اہل یونان اخلاقی مسایل کو بھی حقیقتاً کس نظر سے دیکھتے تھے، جو شے مفید ہو اُس میں اک نوع کا "حسن" ضرور ہونا چاہئے اور اس میں شک نہیں کہ اخلاق کے اصول نہایت مفید ہیں، اس لئے اخلاق میں ایک مخصوص حسن ہونا چاہئے۔ اک انسان کی باقاعدہ زندگی، جس میں وہ اپنی ہی عقل و احتیاط سے کام لے، حقیقتاً اک حسن ہے، لیکن وہ پابندی جو کوئی غیر قوت اُس پر عاید کرتی ہے، اک صناع کو ضرور قابلِ نفرت نظر آئے گی۔

لیکن باوجود ماہر جلیل القدر موجدہ شاعر اور صناع کو پیشکل دماغ سلیم رکھنے والا کہا جا سکتا ہے کیونکہ شاید کسی صناع کا دماغ کسی ایسے راہب و مقدس شخص کے برابر نہیں پہونچا، جو اپنی زندگی کو عقل و تمیز کے ماتحت رکھ کر اپنے قول و فعل کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہے۔

ایک صناع کو اپنی زندگی کی لذتوں کا نہایت شدید احساس ہوتا ہے اور اُس کی طبیعت عموماً تغیر پذیر ہوتی ہے، وہ آزاد بے تعصب جذبات کی پرورش کرتا ہے، جن کی وجہ سے وہ نیک و بد میں تمیز کر سکتا ہے، لیکن بہرحال وہ اُن نقائص سے آزاد نہیں ہوتا جو فطرتِ انسانی کے لئے ضروری ہیں اور جو ایک غیر صناع مقدس آدمی بھی پائے جاتے ہیں۔

اک مثل ہے کہ اگر دو شخص گھوڑوں پر سواری کر رہے ہوں تو ایک کو ضرور آگے ہو جانا چاہئے، چنانچہ صناع ہمیشہ فنونِ لطیفہ کو علم الاخلاق سے آگے رکھنا چاہئے اور ایک مصلحِ اخلاق، اخلاق کو پہلی جگہ دینے کا متمنی ہے، غرض اس طرح پر ان دونوں میں ایک ناگزیر مخالفت چلی آتی ہے اور جب تک صنعت، اپنی حقیقی روح کو زایل نہ کرے اُس وقت تک غالباً وہ اخلاق کے تحت کام نہیں کر سکتی۔

(ماخوذ) غربت

تاریخ انقلاب حیدرآباد

یا

مشاہدات

تقسیم ہند کے بعد، تاریخ ہندوستان کا اہم ترین واقعہ "انقلاب حیدرآباد" تھا، جس کے صحیح تفصیلی حالات حکومت شایع نہ کر سکتی تھی اور اہل حیدرآباد میں کسی کو اس کی جرأت نہ تھی۔ پھر ٹھیک اسی وقت جبکہ ہندوستان کی تاریخ کا نیا ورق اُلٹا جا رہا تھا اور سلطنت مغلیہ کی آخری یادگار (حکومت آصفیہ دکن) کے نقوش مٹنے جا رہے تھے۔ جناب ہوش بلگرامی (نواب ہوشیار جنگ) جو حضور نظام کے خاص درباری اور حیدرآباد کے تمام سیاسی تار و پود کے ایک ایک ریشہ سے واقف تھے۔ اپنی آپ بیتی مرتب کرنا شروع کی جس کا اصل مقصود یہ تھا کہ حیدرآباد کی سیاست، دربار آصفی کی سازشوں اور وہاں کی جماعت اتحاد المسلمین کی سرگرمیوں اور ریشہ دوانیوں کی صحیح و جامع تاریخ مرتب کر کے ایک ایسا ریکارڈ پیش کیا جائے جسے ان کے سوا کوئی دوسرا پیش ہی نہ کر سکتا تھا۔

حیدرآباد میں حکومتِ ہند کا پولیس ایکشن بڑی تاریخی اہمیت رکھتا ہے لیکن یہ اقدام کیوں اور کس طرح کیا گیا اور اس کے نتائج کیا پیدا ہوئے۔ یہ ایک بڑی دردناک داستان ہے جسے تمام جزئیات کے ساتھ وہی شخص لکھ سکتا تھا جو نظام اور حکومت ہند دونوں کے ارادوں اور اقدامات سے آگاہ ہو اور اُس وقت جبکہ حیدرآباد کے ایک ایک انسان کا دل دھڑک رہا تھا، جناب ہوش بلگرامی ہی تنہا ایسے شخص تھے جن کے ذریعہ سے نظام اور نمایندگانِ حکومتِ ہند کے درمیان انتہائی مادرانہ پیغام و مراسلت ہوا کرتی تھی اور جنھوں نے اپنی جان پر کھیل کر حیدرآباد کو تباہی و بربادی سے بچانے کی انتہائی کوشش کی۔

پھر اگر آپ اس عجیب و غریب داستان کے تمام تفصیلی حالات جاننا چاہتے ہیں تو "مشاہدات" ملاحظہ کیجئے جو علاوہ تاریخی اہمیت کے ادب و انشا کی حیثیت سے بھی خاص امتیاز کی مالک ہے۔

یہ کتاب نہایت نفیس کاغذ پر متعدد تصاویر کے ساتھ مجلد شایع ہوئی ہے اور مع محصول ڈاک بارہ روپئے (عہ۱۲) میں دفتر نگار لکھنؤ سے مل سکتی ہے

نوجوان شاعروں کی ہدایت کیلئے

مولانا حسرت موہانی کا ایک غیر مطبوعہ مقالہ

شاعری کی کوئی جامع و مانع تعریف تو ممکن نہیں لیکن اچھے شعر کی خصوصیات ضرور قلم بند کی جا سکتی ہیں اور انھیں خصوصیات کی بنا پر اچھے اور برے شعر میں تمیز کی جا سکتی ہے ۔ شعرا مختلف طبائع رکھتے ہیں، کوئی نازک خیالی اور مضمون آفرینی کو معراج سخن سمجھتا ہے، کوئی سادگی پر جان دیتا ہے، کوئی تصوف کے مضامین باندھتا ہے ..... شاعر کا موضوع خواہ کچھ ہو لیکن چند فنی بندشوں کا اسے خیال رکھنا پڑتا ہے مثلاً شعر میں عیب تنافر نہ ہو، قبیح طور پر تکرار الفاظ نہ ہو۔ تعقید لفظی نہ ہو کیونکہ یہ بڑا عیب ہے جس کی ناگواری مسلم ہے، اُردو الفاظ کے ساتھ فارسی اضافت بھی سراسر معیوب اور ناجائز ہے لیکن اکثر شعرا اس سے بھی پرہیز نہیں کرتے، ضلع جگت بھی اب عیب میں داخل ہے اگرچہ لکھنوی شاعری کے دور میں ضلع جگت کی بڑی قدر تھی اور لفظی بھایات کے بغیر تو کوئی شعر قابل تعریف سمجھا ہی نہ جاتا تھا..... شتر گربہ، توالئی اضافت، "ابہام و اشکال" غیر شاعرانہ الفاظ کا استعمال، شکست ناروا اور "ایطائے جلی" ..... یہ سب باتیں معائب سخن میں داخل ہیں۔

اس مضمون میں ہمارا مقصد محاسن سخن کو اختصار کے ساتھ پیش کرنا ہے تاکہ ارباب مذاق کو انتخاب سخن و اصلاح سخن کے معاملہ میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔

شعر میں خیال کی اہمیت مسلم ہے لیکن اگر خیال شاعرانہ سلیقہ سے ادا نہ کیا جائے تو شعر میں نہ حسن ہوگا اور نہ تاثیر ـــ صرف موزونیت کو شعر نہیں کہتے ـــ ہم آگے چل کر جن محاسن کا ذکر کریں گے وہ شاعری کا زیور ہیں، ہاں یہ بات کہہ دینا ضروری ہے کہ ایک اچھے شعر میں تمام محاسن بیک وقت مجتمع نہیں ہو سکتے، کسی ایک حسن یا خوبی کا ہونا اس شعر کے اچھے ہونے کے لئے کافی ہے۔

ارباب نظر نے شاعری اور مصوری کو ایک ہی قبیل سے قرار دیا ہے، اس کی بنیاد اور وجہ یہ ہے کہ جس طرح کامیاب مصوری کے لئے لازم ہے کہ جس چیز کی نقل اُتاری جائے وہی ہو بہو تصویر میں نظر آئے۔ اس طرح سے حقیقی شاعری کے لئے بھی اس بات کی ضرورت ہے کہ واقعات محسوسات، زندگی کے تجربات، ذاتی محسوسات اور خارجی مشاہدات کے بیان میں تصنع سے کام نہ لیا گیا ہو اور جذبات نگاری کی گئی ہو عام اس سے کہ وہ جذبات علوی ہوں یا سفلی، اگر جذبات عالی ہوں گے تو شاعری جذبہ نگاری کی شکل اختیار کرے گی ورنہ معاملہ بندی ہو جائے گی اور ہمارے نزدیک یہی تینوں چیزیں شاعری کا بہترین نمونہ ہیں، معاملہ بندی طبائع کی مصنوعی نفاہت کے لئے ناگوار ثابت ہوتی ہے، لیکن یہ ناگواری انتہائی بدمذاقی اور بے شعوری پر دلالت کرتی ہے، جرأت کی معاملہ بندی میں بڑا کیف ہے۔ مومن کے یہاں بھی معاملہ بندی اعتدال کے ساتھ ملتی ہے اور وہ ابتذال سے گریز کرتے ہوئے معاملات کو پیش کرتے ہیں، جذبہ نگاری، واقعہ نگاری اور معاملہ بندی کی عمدہ مثالیں یہ شعر ہیں:

جی میں تھا ان سے ملئے تو کیا کیا نہ کہئے میر	پر جب ملے تو رہ گئے نا چار دیکھ کر	میر
ترے کوچے ہر بہانے مجھے دن سے رات کرنا	کبھی اس سے بات کرنا، کبھی اس سے بات کرنا	مصحفی
جب یہ سنتے ہیں کہ ہمسایہ میں ہیں آپ آئے ہوئے	کیا در و بام پہ ہم پھرتے ہیں گھبرائے ہوئے	جرأت
سودا جو ترا حال ہے اتنا تو نہیں وہ	کیا جانئے تو نے اُسے کس آن میں دیکھا	سودا

آئے بھی لوگ، بیٹھے بھی، اٹھ بھی کھڑے ہوئے — میں جا ہی ڈھونڈھتا تری محفل میں رہ گیا — آتش

سیکھے ہیں مہ رخوں کے لئے ہم مصوری — تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاہئے — غالب

دے وہ جس قدر ذلت، ہم ہنسی میں ٹالیں گے — بارے آشنا نکلا ان کا پاسباں اپنا — غالب

غیر پھرتا ہے لئے یوں ترے خط کو کہ اگر — کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے تو چھپائے نہ بنے — غالب

ہم بھی اب خوش نہیں وفا کر کے — تم نے اچھا کیا، نباہ نہ کی — مومن

ٹھانی تھی جی میں اب نہ ملیں گے کسی سے ہم — پر کیا کریں کہ ہو گئے ناچار جی سے ہم — مومن

وہ جو ہم میں تم میں قرار تھا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو — وہی وعدہ تھا جو نباہ کا، تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو — مومن

انگڑائی بھی وہ لینے نہ پائے اٹھا کے ہاتھ — دیکھا جو مجھ کو چھوڑ دئے مسکرا کے ہاتھ — نظام رامپوری

بیقراری تھی سب امید ملاقات کے ساتھ — اب وہ اگلی سی درازی شب ہجراں میں نہیں — حالی

بے قراروں سے ان کو شرم آئی — شوخیاں رہ گئیں حیا ہو کر — حسن بریلوی

ہر دم اسی کی دھن ہے اسی کا خیال ہے — چھوٹے چھٹائے ربط پر اب تک یہ حال ہے — داغ دہلوی

شاعری صرف معاملہ بندی اور جذبات نگاری تک محدود نہیں، شاعری تو انسان کے بلند ترین جذبات کو کاغذی پیراہن عطا کرتی ہے اسی لئے بعض شاعروں نے متانت مضمون، بلندیِ جذبات اور مذاقِ تصوف کو اختیار کیا۔ متانت مضمون کی مثالیں اردو کے تمام اچھے شاعروں کے کلام میں موجود ہیں، مرزا غالب کی شاعری بلندی جذبات کا دلآویز نمونہ ہے اور میر درد کی شاعری کی بنیاد سراسر مذاقِ تصوف پر قایم ہے۔ دورِ جدید کے اکثر تعلیم یافتہ شاعر تو بلندیِ مضمون اور ندرتِ خیال کے مقابلہ میں زبان و بیان کی خوبیوں کا کافی لحاظ نہیں رکھتے، جس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ اچھے سے اچھا مضمون محض ایک ادنیٰ خرابی کی وجہ سے بے لطف ہو کر رہ جاتا ہے۔ اساتذہ کے یہاں متانتِ مضمون اور بلندیِ جذبات کے ساتھ الفاظ و بیان کی خوبیاں ملتی ہیں۔ میر، خواجہ میر درد، آتش، قایم، ظہیر، حالی، شاد عظیم آبادی، مولوی اسماعیل میرٹھی، بیخود موہانی، آسی سکندرپوری، اقبال، اصغر اور حفیظ جونپوری وغیرہم کے کلام میں متانتِ مضمون بلندیِ جذبات اور صوفیانہ شاعری کے عمدہ نمونے ملتے ہیں ؎

پھرتے دیکھا کچھ بجز یک شعلۂ پرپیچ و تاب — شمع تک ہم نے نہ دیکھا تھا کہ پروانہ گیا — میر

ان لبوں نے نہ کی مسیحائی — ہم نے سو سو طرح سے مر دیکھا — درد

ویراں سرائے سینہ سے آئی ہے بوئے خوں — گویا کبھی یہ خانہ ترا جلوہ گاہ تھا — قایم

ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب تر کہاں — اب دیکھئے ٹھہرتی ہے جا کر نظر کہاں — حالی

دیر تک میں ٹکٹکی باندھے ہوئے دیکھا کیا — چہرۂ ساقی نمایاں صاف پیمانے میں تھا — شاد عظیم آبادی

پہونچا دیا صدود دو عالم سے بھی پرے — مطرب نے راگ چھیڑ دیا کس مقام کا — اسمٰعیل میرٹھی

صد حیرت دیکھتا تھا اپنی آرایش کے ساتھ — آئینہ خانہ میں وہ محو خود آرائی نہ تھا — آسی سکندرپوری

دلوں کو فکرِ دو عالم سے کر دیا آزاد — ترے جنوں کا خدا سلسلہ دراز کرے — حسرت

بارِ الم اٹھایا، رنگ نشاط دیکھا — آئے نہیں ہیں یوں ہی انداز بے حسی کے — اصغر

اچھے شعرا کے کلام میں متانتِ مضمون اور بلندیِ جذبات کے ساتھ ساتھ سوز و گداز بھی ملتا ہے۔ عشق حقیقی ہو یا مجازی آگ کا درجہ رکھتا ہے اور انسان کی روح میں گداز پیدا کرتا ہے، یہی دردمندی عشق اور ہوس کے درمیان حدِ فاصل کی حیثیت رکھتی ہے، ہوس ناکی معاملہ بندی کی صورت میں نمودار ہوتی ہے اور میں معاملہ بندی کو بھی اچھی شاعری سمجھتا ہوں کیونکہ جیسا پہلے کہا گیا

معاملہ بندی کو ناگوار سمجھنا بیذاقی اور بے شعوری کی دلیل ہے بشرطیکہ اس ضمن میں حدِ اعتدال سے نہ گزرا جائے ۔۔۔۔ مگر ظاہر ہے کہ پاک جذبۂ عشق و محبت کا مرتبہ ہوس سے اور سوز و گداز کا درجہ معاملہ بندی سے بلند ہے، یہ پاک محبت ہمیں زیادہ بہتر آدمی بنا دیتی ہے، راقم الحروف نے اسی خیال کو ایک شعر میں یوں ادا کیا ہے :-

ترے عشق میں کیا سے کیا ہو گئے ہم ۔۔۔ سیہ کار تھے با صفا ہو گئے ہم

سوز و گداز کو عاشقانہ شاعری کی جان سمجھنا چاہئے مگر اس کی صحیح مثالیں خاص ہی خاص شعراء کے کلام میں ملتی ہیں، سفید گلاب کو محض رونا دھونا، سینہ کوبی اور آہ و بکا سمجھنا انصاف کا خون کرنا ہے، حق تو یہ ہے کہ اس کا تعلق صفائے قلب اور روح کی نرمی سے ہے اسی سوز و گداز کو شاعرانہ تاثیر کہنا چاہئے اور اس باب میں میر تقی میر کی گرد کو بھی اُردو کا کوئی شاعر نہیں پہونچتا ؎

شعر میرے بھی ہیں پر درد ولیکن حسرت ۔۔۔ میر کا شیوۂ گفتار کہاں سے لاؤں

شعرائے لکھنؤ کے یہاں سوز و گداز کم ہے اور آہ و بکا زیادہ، اس سے طبیعت میں گھٹن پیدا ہوتی ہے اور اسی لئے راقم الحروف لکھنوی انداز سخن کا زیادہ دلدادہ نہیں ؎ حسرت مجھے پسند نہیں طرز لکھنؤ

موجودہ دور کے شعراء میں جناب فانی بدایونی کے کلام میں سوز و گداز موجود ہے اور ان کی شاعری میں سوز و گداز کی صحیح مثالوں کی کمی نہیں، سوز و گداز شعر کو نشتر بنا دیتا ہے اور شعر میں تیر نیم کش کی لذت اور خلش پیدا ہو جاتی ہے ۔۔ چند مثالیں انتہائی احتیاط کے ساتھ پیش کرتا ہوں ؎

جب نام ترا لیجئے تب اشک بھر آئے ۔۔۔ اس طرح کے جینے کو کہاں سے جگر آئے ۔۔۔ میر

فقیرانہ آئے صدا کر چلے ۔۔۔ میاں خوش رہو ہم دعا کر چلے

کوئی نا امید نہ کرتے نگاہ ۔۔۔ سو تم ہم سے منہ بھی چھپا کر چلے

رہنے دو پڑا مصحفیؔ خاک بسر کو ۔۔۔ اس سوختہ بے سر و ساماں کو نہ چھیڑو ۔۔۔ مصحفی

خوشا قسمت قفس میں ہم، قفس پر بیکسوں پر رحم ۔۔۔ نظر بھی اب تو جا سکتی نہیں دیوار گلشن تک ۔۔۔ نسیم دہلوی

کس سے محرومیِ قسمت کی شکایت کیجئے ۔۔۔ ہم نے چاہا تھا کہ مر جائیں سو وہ بھی نہ ہوا ۔۔۔ غالب

ستم کی خو نہ رہی، شیوۂ جفا نہ رہا ۔۔۔ مجھے مٹا کے انھیں کوئی حوصلہ نہ رہا ۔۔۔ مضطر

نہ جانا کہ دنیا سے جاتا ہے کوئی ۔۔۔ بہت دیر کی مہرباں آتے آتے ۔۔۔ داغ

ڈھونڈو گے اگر ملکوں ملکوں ملنے کے نہیں نایاب ہیں ہم ۔۔۔ تعبیر ہے جس کی حسرت و غم اے ہم نفسو وہ خواب ہیں ہم ۔۔۔ شاد عظیم آبادی

جئے جانے کی تہمت کس سے اٹھتی کس طرح اٹھتی ۔۔۔ ترے غم نے بچائی زندگی کی آبرو برسوں

مری اک عمر فانیؔ نزع کے عالم میں گزری ہے ۔۔۔ محبت نے مری رگ رگ سے کھینچا ہے لہو برسوں ۔۔۔ فانی بدایونی

آہ وہ یاد کہ اس یاد کو ہو کر مجبور ۔۔۔ دل مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے ۔۔۔ حسرت

اب یاد رفتگاں کی بھی ہمت نہیں رہی ۔۔۔ یاروں نے کتنی دور بسائی ہیں بستیاں ۔۔۔ فراق گورکھپوری

سوز و گداز عاشقانہ شاعری کی جان ہے لیکن انسان پر ہمیشہ ایک ہی کیفیت طاری نہیں رہتی ۔۔۔ غم اور سوز و گداز کے علاوہ جذباتِ مسرت بھی حیاتِ انسانی کا حصہ ہیں اور انسان کی ذہانتِ کلام میں شوخی و رندی پیدا کر دیتی ہے۔ بعض اوقات غم و اندوہ کا مذاق اڑاتے ہیں، روایات کا احترام نہیں کرتے، زاہد و ناصح کی تضحیک کرتے ہیں، واعظ کی پگڑی اچھالتے ہیں، نغمہ و مے کی تحسین کرتے ہیں اور اس طرح ان شاعروں کے کلام میں شوخیِ کلام و رندی مضمون سے بھی اکثر اوقات حسنِ سخن میں بہت کچھ اضافہ ہو جاتا ہے، غالب کے یہاں یہ رنگ بہت نمایاں ہے، مولانا حالی نے کیا خوب نکتہ پیدا کیا ہے کہ مرتا حیوان ظریف تھے اور حقیقت تو یہ ہے کہ مرزا اسد اللہ خاں غالب کی طبیعت اور شوخی و رندی میں وہی تعلق تھا جو گوشت اور ناخن میں ہے۔

شوخی و رندی کے سلسلہ میں یہ بات بھی واضح ہو کہ ہجو زاہد و واعظ کا ہر مضمون پسندیدہ ہی نہیں ہوتا بلکہ بعض موقعوں پر تو بے باکی و بے پروائی کی شدت مذاقِ سلیم کو ناگوار گزرنے لگتی ہے مثلاً :-

پند واعظ سنتے سنتے کان اپنے بھر گئے کیا عبادت کو ہمیں ہیں سب فرشتے مر گئے داغ

لاریب حسنِ کلام کی ترقی کے لئے اس قسم کے مضامین میں بھی پیرایۂ بیان کی لطافت اور مفہوم "کنایہ" کو ندرت کا ہونا لازمی ہوا کرتا ہے ـــ شوخیِ کلام کے سلسلہ میں خمریات کی بڑی اہمیت ہے، حضرت ریاض خیرآبادی اور مرزا محمد تقی بیگ صاحب مایل دہلوی کو خمریات کا "اسپیشلسٹ" سمجھنا چاہئے، ان کا کلام پڑھنے ہی سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں حضرات اس میدان میں کیسے کیسے شوخ مگر لطیف شعر نکالتے ہیں۔

بڑے پاک طینت بڑے صاف باطن ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں
فرشتے عرصہ گاہِ حشر میں ہم کو سنبھالے ہیں ہمیں تو آج لطفِ لغزشِ مستانہ آتا ہے ریاض خیرآبادی
بے سبب بارانِ رحمت قبرِ واعظ پر نہیں کوئی پتھر لگ گیا مے خانہ کی بنیاد کا
واعظ نہ بڑھا شوکتِ دروازۂ مسجد مے خوار چلے آئیں گے مے خانہ سمجھ کر مایل دہلوی

شوخیِ کلام کے جو نمونے رندانہ اشعار کے علاوہ عاشقانہ اشعار میں پائے جاتے ہیں وہ اپنی خوبی میں خمریات کو بھی پیچھے چھوڑ جاتے ہیں ـ مثلاً آتش ؎

روٹھ کر بیٹھے جو جاتا ہوں تو کہتا ہے وہ شوخ کل خفا تم تھے مزاج آج ہے ناساز اپنا

ناسازیِ مزاج کے مصنوعی بیان میں طعن کا بھی پہلو نکلتا ہے اس کی شوخی ملاحظہ طلب ہے :

سر اڑانے کے جو وعدے کو مکرر چاہا ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو غالب

سر اڑانے کا حتمی وعدہ کرنے کے لئے اسی سر کی قسم کھانا مضمون کی ایک عجیب و غریب شوخی ہے جس کی کافی داد نہیں دی جا سکتی!

نہ میں سمجھا نہ آپ آئے کہیں سے پسینہ پوچھئے اپنی جبیں سے انور دہلوی

انور کا یہ مطلع شوخیِ محاورہ کی بہترین مثالوں میں سے ہے اور دوسرے مصرعہ کے شوخ کنائے نے مصرعہ اول کی نفی کو اثبات سے بھی پرلطف بنا دیا ہے۔

کہئے تو کہوں انجمنِ غیر کی روداد ، کیا اب بھی اسے آپ کرامت نہ کہیں گے ظہیر دہلوی

شوخیِ کلام ملاحظہ ہو کہ کرامت کا دعویٰ بھی کیا تو کن معاملات کے علم کی بابت، جن کا متعلق پہ رندی و ہوس ناکی ہونا بہرحال مسلم ہے!

نہ آنا اے اجل تجھ کو قسم ہے وقتِ آخر تک ابھی کچھ عمر باقی ہے اسے بھی رائگاں کر لیں نظم طباطبائی

شاعر نے عمر ضائع ہونے کو عجب طور سے اپنا ایک محبوب مشغلہ بے باکی و ہوسناکی ہونا ظاہر کیا ہے، اس شوخیِ بیان کی داد نہیں دی جا سکتی۔

شوخیِ کلام کی وجہ سے پرانے مضامین بھی نئے معلوم ہوتے ہیں، شعراء کے مضامین عاشقانہ طور پر ایک سے ہوتے ہیں یعنی ہجر و وصال بے قراری و بے چینی، اپنی وفا محبوب کی جفا، رقیبِ روسیاہ کی بوالہوسی، کوچۂ یار کی رونق، خوبیِ جسم نازنین ـــ فلسفہ و تصوف کے مضامین بھی مشترک ہوتے ہیں، لاریب یہ طرزِ بیان ہی ہوتا ہے جو ایک شاعر کے کلام کو دوسرے سے الگ کرتا ہے، پستی اور بلندی بھی طرزِ سخن سے پیدا ہوتی ہے اسی لئے شاعری میں شوخیِ کلام اور تازگیِ بیان کی ضرورت ہے، ندرتِ مضمون تازگیِ بیان کا ثمرہ ہے حسنِ کلام کے ارکان میں تازگیِ بیان اور ندرتِ مضمون کا بھی درجہ بہت بلند واقع ہوا ہے، بسا اوقات ایسا دیکھنے میں آیا ہے کہ مضمون نہایت معمولی اور بالکل پامال و فرسودہ تھا مگر بیان کی ذرا سی تازگی نے اس میں ندرت پیدا کر دی اور اسے نہایت پسندیدہ اور نہایت برگزیدہ بنا دیا ـــ مندرجۂ ذیل اشعار میں تازگیِ بیان و ندرتِ مضمون ملاحظہ ہو ؎

یاد اس کی اتنی خوب نہیں میر باز آ — نادان پھر وہ دل سے بھلایا نہ جائے گا
نامرادانہ زیست کرتا تھا، — میر کی وضع یاد ہے ہم کو — میر
دیکھئے واماندگی اب کیا دکھائے — قافلہ یاروں کا سفر کر گیا — سودا
شیشے کی طرح شام سے رو رو کے تا سحر — خالی کریں دل کو تری انجمن میں ہم — میر سوز
کہتے ہیں تم کو ہوش نہیں اضطراب میں — سارے لگے تمام ہوئے اک جواب میں
اس نقشِ پا کے سجدہ نے کیا کیا کیا ذلیل — میں کوچۂ رقیب میں بھی سر کے بل گیا — مومن
نظارے نے بھی کام کیا واں نقاب کا — مستی سے ہر نگہ ترے رُخ پر بکھر گئی
کہتے ہوئے ساقی سے حیا آتی ہے ورنہ — ہے یوں کہ مجھے درد تہہ جام بہت ہے — غالب
آنکھوں کے تقاطر سے خبردار ہو دامن — کچھ اور ارادہ ہے مرے ابرِ کرم کا — نسیم دہلوی
ہم جس پر مر رہے ہیں وہ ہے بات ہی کچھ اور — عالم میں تجھ سے لاکھ سہی، تو مگر کہاں — حالی
اس نو بہارِ حسن کو بدنام مت کرو — تھی شیفتہ کے پہلے سے شورش دماغ میں — شیفتہ
تشبیہ مرے حالِ پریشاں سے نہ دینا — ایسا نہ ہو وہ گیسوئے شب رنگ بکھر جائے — مجروح
تھا جفاکش ایک سالک آج وہ بھی مر گیا — اب لئے بیٹھے رہو تم شکوۂ بیداد کو — سالک دہلوی
نو بہار آئے اور کیا ہوگا — کچھ نکھر جائے گا خزاں کا رنگ — ناظم رامپوری
جب اہلِ ہوش کہتے ہیں افسانہ آپ کا — ہنستا ہے دیکھ دیکھ کے دیوانہ آپ کا — شاد عظیم آبادی
عالم ہو میں اک آواز سی آجاتی ہے — چپکے چپکے کوئی کہتا ہے فسانہ دل کا — ریاض خیرآبادی
ہم نے جب وادیِ غربت میں قدم رکھا تھا — دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو — وحید کرادی
بیٹھ جاتا ہوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے — ہائے کیا چیز غریب الوطنی ہوتی ہے — حفیظ جونپوری
کہہ کے کچھ لالہ و گل رکھ لیا پردہ میں نے — مجھ سے دیکھا نہ گیا حسن کا رسوا ہونا — اصغر
اے زہے خشک تیری ہدایت کے واسطے — سوغاتِ عشق لائے ہیں کوئے بتاں سے ہم — حسرت
نہ جانے کس لئے امیدوار بیٹھا ہوں — اک ایسی راہ پر جو تیری رہ گزر بھی نہیں — فیض

اب تک ہم نے شاعری کے معنوی محاسن سے بحث کی ہے، آنے والے صفحات میں ہم اختصار کے ساتھ مثالوں کی مدد سے شعر کی فنی اور لفظی خوبیوں کو، اپنے پڑھنے والوں کے لئے قلم بند کریں گے، لیکن یہاں ایک بات کی وضاحت لازم ہے، ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ اساتذہ کے یہاں مضمون اور بیان کے محاسن ساتھ ساتھ ملتے ہیں، ایک اچھے مضمون کو اگر پسلیقگی کے ساتھ نظم کیا جائے تو اسکی خوبیاں ختم ہو جائیں گی، راقم الحروف کا خیال ہے کہ الفاظ و معانی میں وہی ربط ہے جو جسم و روح میں — ذاتی تجربہ بھی یہی ہے کہ جو خیال میرے ذہن میں شدت کے ساتھ آتا ہے وہ خود بخود اپنے لئے الفاظ مناسب انتخاب کرتا ہے اور اس ضمن میں میرے التزام کی نوبت نہیں آتی۔ الفاظ اپنے مفہوم و معنی کی طرف دلالت کرتے ہیں، مرزا غالب نے کیا خوب فرمایا ہے کہ:

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے — جو لفظ کہ غالب مرے اشعار میں آئے

دورِ حاضر کے بعض شعراء کا رجحان زیادہ تر اس جانب معلوم ہوتا ہے کہ اپنے کلام کی خوبی کا دارومدار استعمال ترکیب فارسی اور دشوار گوئی پر رکھیں، جس کو پیروی غالب کے مرعوب کن نام سے موسوم کرتے ہیں حالانکہ حقیقتِ حال یہ ہے کہ غالب کے بھی بہترین اشعار وہی ہیں جن کی برتری صدقِ محاورہ یا صفائی بیان کی مرہونِ منت ہے، میرا خیال ہے کہ لطفِ سخن کے طالبانِ صادق کو اسی سادگی

سے تسکین ہو سکتی ہے۔ سادگی بیان شعر کو نیچرل بناتی ہے اور گفتگو سے قریب تر لاتی ہے، مرزا غالب کے یہاں طبع زاد یا فارسی کے زیر اثر تخلیق کی ہوئی ترکیبوں کی کمی نہیں، لیکن اپنی آخری عمر میں انھوں نے سادگی کو اپنا شعار بنا لیا اور صفائی زبان کو اختیار کیا اور یہ امر ظاہر ہے کہ اس زمانہ میں اُن کے خیالات میں زیادہ پختگی آگئی تھی ـــــ خیال کو سادگی، صدقِ محاورہ اور صفائی زبان کے ساتھ پیش کر دینا انتہائی کمال ہے جیسا کہ ذیل کی مثالوں سے ثابت ہو جائے گا ؎

تم کہ بیٹھے ہوئے اک آفت ہو	اُٹھ کھڑے ہو تو کیا قیامت ہو	شاہ حاتم
دردِ دل کچھ کہا نہیں جاتا	آہ چپ بھی رہا نہیں جاتا	قائم چاندپوری
نہ خفا ہو کہ آن نکلے ہیں،	ہم بھی یاں اتفاق کے مارے	میر حسن
غنچے تری غنچہ دہنی کو نہیں پاتے	ہنستے ہیں مگر تیری ہنسی کو نہیں پاتے	ذوق
اُن سے ہم لو لگائے بیٹھے ہیں	آگ دل میں دبائے بیٹھے ہیں	انور دہلوی
خالی شراروں سے یہ طرزِ حیا نہیں	کیا جانے کوئی دل میں ترے کیا ہو کیا نہیں	داغ
یاد کرتے ہیں مگر یاد نہیں آتا ہے	بھول آئے ہیں کہاں ہم دلِ مضطر اپنا	ہجر شاہجہانپوری
مرگِ عاشق تو کوئی بات نہیں	پر کہے گا تمھیں زمانہ کیا،	مست بنارسی
مرگِ عاشق تو کچھ نہیں لیکن	اک مسیحا نفس کی بات گئی	جگر مرادآبادی

سادگی زبان اور صفائی بیان کے سلسلہ میں دانستہ میر، غالب اور مومن کے شعر نہیں پیش کئے گئے کیونکہ ان کے اشعار میں سادگی معجزہ بن گئی ہے اور اس معجزہ کو سہل ممتنع کہتے ہیں، سہلِ ممتنع سادگی و حسنِ بیان کی اس صنف کا نام ہے جس کو دیکھ کر ہر شخص بظاہر یہ سمجھے کہ یہ بات میرے دل میں تھی اور ایسا کہنا ہر شاعر کے لئے آسان ہے مگر جب کوشش کر کے ویسا لکھنا چاہے تو نہ لکھ سکے ـــ معمولی خیال کو سادگی سے نظم کر دینا کوئی کمال نہیں اور نہ اسے ہم سہل ممتنع کہیں گے بلکہ کسی گہرے، اوچھے اور بڑے خیال کو یوں نظم کر دینا کمال ہے، ایسے ہی اشعار کو ضرب المثل کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے اور اشعار زبان کا حصہ بن جاتے ہیں اور یہ بات کسی بھی شاعر کی حیاتِ جاوداں کی ضمانت ہے۔

میر ان نیم باز آنکھوں میں	ساری مستی شراب کی سی ہے	میر
جب کہ پہلو سے یار اُٹھتا ہے	درد بے اختیار اُٹھتا ہے	
آگ تھے ابتدائے عشق میں ہم	ہو گئے خاک انتہا ہے یہ	
شاہد رہیو تو اے شبِ ہجر	جھپکی نہیں آنکھ مصحفی کی	مصحفی
جمع کرتے ہو کیوں رقیبوں کو	اک تماشا ہوا گلا نہ ہوا	
قطع کیجئے نہ تعلق ہم سے	کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی	
دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے	آخر اس درد کی دوا کیا ہے	
ہو چکیں غالب بلائیں سب تمام	ایک مرگِ ناگہانی اور ہے	غالب
تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے	ورنہ دُنیا میں کیا نہیں ہوتا	
تم مرے پاس ہوتے ہو گویا	جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا	مومن
رنج اور رنج بھی تنہائی کا	وقت پہونچا مری رسوائی کا	حالی
تندرستی اگر نہ ہو سالک	تندرستی ہزار نعمت ہے	سالک دہلوی

ہے آج سے گزشتہ اپنی — کل اُس کی کہانیاں بنیں گی — امیر مینائی
زندگی کیا ہے آج سے اے دوست — سوچ لیں اور اُداس ہوجائیں — فراق گورکھپوری
گزاری تھیں خوشی کی چند گھڑیاں — انھیں کی یاد میری زندگی ہے — عندلیب شادانی
زمانہ بڑے شوق سے سن رہا تھا — ہمیں سو گئے داستاں کہتے کہتے — ثاقب لکھنوی

اسی سادگیِ بیان و زبان سے اشعار میں تاثیر پیدا ہوتی ہے، راقم الحروف کے کلام میں ترکیبِ مومن کی نیرنگیاں بھی ہیں اور وہ اپنی اس خوش بیانی پر نازاں بھی ہے لیکن سادگی کو زیادہ پسند کرتا ہے ؎

سہل کہتا ہوں ممتنع حسرت — نغز گوئی مرا شعار نہیں

کیونکہ تاثیر علمیت کے اظہار سے زیادہ اہم ہے اور شعر کی صحیح تعریف یہ ہے ؎

شعر در اصل ہیں وہی حسرت — سنتے ہی دل میں جو اُتر جائیں

سادگی اور صفائی میں بہت سی خوبیاں مضمر ہیں، لیکن طبیعت انسانی تنوع اور نیرنگی و رنگا رنگی کو بھی پسند کرتی ہے اسی لئے خوبیِ ترکیب، خوبیِ استعارہ و لطفِ تشبیہ کو بھی پیشگاہِ سخن میں بہت بڑا درجہ حاصل ہے، میں ان تینوں کا ذکر ایک ہی جگہ اس لئے کر رہا ہوں کہ اکثر یہ خوبیاں بے حد متصل اور ایک دوسرے سے دست و گریباں پائی جاتی ہیں — حسنِ ترکیب میں غالب و مومن کا کوئی شاعر ہمسر نہیں ہوسکتا، ان دونوں شاعروں نے بہت سی ترکیبیں اختراع کیں یا فارسی ترکیبوں کو اُردو میں اس طرح استعمال کیا کہ مقبول ہوئیں اور دوسرے شاعروں نے انھیں امتیاز کیا، غالب کی ترکیبوں میں جہاں کہیں غرابت نہیں بڑی معنویت ہے، حق تو یہ ہے کہ مرزا ان ترکیبوں کے بغیر معنی آفرینی کا حق ادا نہ کرسکتے تھے، وہ مضامین جو غیب سے ان کے خیال میں آتے تھے مروجہ زبان میں بیان نہ ہوسکتے تھے فارسی زبان مرزا غالب کے دل و دماغ کا حصہ تھی۔ بایں وجہ وہ فارسی طرز کی ترکیبیں اختراع کرتے تھے، مومن کی ترکیبوں میں بھی فارسیت ہے مگر وہ عاشقانہ اندازِ سخن رکھتے تھے اسی لئے ان کے یہاں نرمی زیادہ ہے اور غالب کے یہاں شان و شکوہ اور طمطراق — یہ بات چیز حسرت موہانی مومن کے سلسلۂ تلمذ کا ایک شاعر ہے اسی لئے سادگی پسند ہونے کے باوجود ترکیبوں کے باب میں تقلیدِ مومن کرتا ہے۔

کہاں سے آئیں گی نیرنگیاں ترکیبِ مومن کی
یہ لطفِ خوش بیانی حسرتِ رنگیں نوا تک ہے

میرے کلام میں جو لطیف، شگفتہ اور حسین تراکیب جا بجا موجود ہیں اور یہ فیضانِ مومن و نسیم ہے لیکن اس میں میرے مطالعۂ فارسی کو بھی دخل ہے، "جفاہائے التزامی"۔ "سرمایہ دارِ انتظار"۔ "تغافل ہائے پیہم"۔ "روشِ حسن مراعات"۔ اور زندانِ تمنا کی ترکیبیں مجھے بے حد مرغوب ہیں:

کمالِ خاک ساری پر بے پروائیاں حسرت،
میں اپنی داد خود دے لوں کہ میں بھی کیا قیامت ہوں

یہی حسین ترکیبیں اکثر اوقات خوبیِ استعارہ اور لطفِ تشبیہ اپنے اندر چھپائے رکھتی ہیں یا نتیجتاً خوبیاں پیدا ہوجاتی ہیں —
اساتذہ اور ممتاز شعراء کے کلام سے حسنِ ترکیب، خوبیِ استعارہ و لطفِ تشبیہ کی مثالیں درج کی جاتی ہیں ؎

آویزہ گہر ہے بنا گوشِ یار میں — یا سرنگوں ہے اس کے مقابل غرورِ صبح — سودا
وے ہنس میں جو اشکبار ہوا — گریہ کیا آبروے کار ہوا — راسخ عظیم آبادی
ٹکڑے کپڑوں میں یوں ہے جلوہ گر اسکا بدن — دھوپ جیسے شام کی ہو یا سحر کی چاندنی — میر حسن
ہوتی ہی نہیں کم کسی عنواں تپشِ دل — ہے دامنِ مژگاں سے فزوں تر تپشِ دل — مذہب شاگرد سودا

رنج و راحت کا مرے واسطے ساماں ہوگا — مشتعل راہِ عدم داغِ عزیزاں ہوگا — آتش

ناکامیوں کی کاہش بے جا کا کیا علاج — بوسہ دیا تو ذوقِ لبِ یار کم ہوا

بے کاریِ امید سے فرصت ہے رات دن — وہ کارِ دیرینہ حسرت و ارماں نہیں رہا — مومن

جا ہے قطرۂ خونِ جگر شمشیرِ دشمن پر — تماشا ہے یہ گل پھولا نیا دیوارِ آہن پر — نسیم دہلوی

کیا کہوں جھپٹ کے میں اس گل تر سے تسلیم — صورتِ نکہتِ ہر باد کہیں کا نہ رہا، — تسلیم لکھنوی

کب داغ یہ دل پر شبِ ہجراں میں لگے ہیں — نایاب کنول انجمنِ جاں میں لگے ہیں — رضوان مرادآبادی

اب وصال اس سمن اندام کو کہاں — بس بس نہ چھیڑ اے خلشِ آرزو مجھے — شیفتہ

ناچند نظر بازی و پابندیِ تقویٰ — ہمسائیگیِ شعلہ و سیماب کہاں تک — ظہیر دہلوی

خرامِ جلوہ کے نقشِ قدم تھے لالہ و گل — کچھ اور اس کے سوا موسمِ بہار نہ تھا — آسی سکندرپوری

گلستاں کر دیا ہے دامنِ دل کو تصور نے — ہوائے شوق میں حاصل ہے عیشِ جاوداں مجھ کو — رضا علی وحشت

جنازہ ہند کا در سے ترے نکلتا ہے — سہاگ قوم کا تیری چتا میں جلتا ہے — چکبست

کلام میں حسن پیدا کرنے کے اور بھی طریقے ہیں، ہمارے شاعر زبان و بیان پر بڑی قدرت رکھتے ہیں اور انھیں زبان کا مزاج داں کہنا چاہئے ۔۔۔ اگر زبان پر قدرت ہو اور شاعر کو اندازِ بیان پر کمال حاصل ہو تو اشعار میں محض مصرعوں کے تقابل یا الفاظ کے الٹ پھیر سے بھی ایک قسم کا حسن پیدا ہو جاتا ہے، کبھی یوں بھی ہوتا ہے کہ ایک مصرع میں کسی قدر تغیر و تبدل کر کے اور غزل کی ردیف کا خیال کر کے دوسرا مصرع کہہ لیا جائے ۔ مرزا داغ اور ان کے متبعین کے کلام میں ایسی امثال کی کمی نہیں، اس باب میں مضطر خیرآبادی کی غزلیں بھی ملاحظہ طلب ہیں، عہدِ جدید کے شعراء بھی اس اسلوب کو مرغوب رکھتے ہیں اور یہ حسن انھیں پسند ہے، جوش ملیح آبادی کی نظموں میں حسنِ تکرار کے عمدہ نمونے ملتے ہیں، مجاز ردولوی اور جذبی بھی اس صنعت سے کام لیتے ہیں، اس لحاظ سے مجھے جذبی کا یہ شعر بہت پسند ہے ؎

میری ہی نظر کی مستی سے سب شیشہ و ساغر قصباں تھے
میری ہی نظر کی گرمی سے سب شیشہ و ساغر ٹوٹ گئے

چند اور مثالیں پیش کی جاتی ہیں ؎

میں پھر کہوں کہ پاس مرے کوئی آئے کیوں — تم پھر کہو کہ کوئی کسی کا کرے گا کیا، — مضطر خیرآبادی

بدہوشیِ ارباب نظر کو کوئی سمجھے — خاموشیِ ارباب نظر کو کوئی دیکھے — بیخود بدایونی

دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے تمھیں کیسا چاہا — یہ سمجھنا یہ ہے کہ تم نے ہمیں کیسا دیکھا — حسن بریلوی

اس مضمون کے آخر میں مطابقتِ الفاظ و مضمون کے متعلق میں کچھ کہنا مناسب ہوگا۔ مضمونِ شعر اور الفاظِ شعر میں مطابقت کا قایم کرنا منجملہ کمالاتِ شاعری بہت کچھ اہم سمجھا جاتا ہے اور عموماً بہت بڑی قوت اور مشقِ سخن کا نتیجہ ہوا کرتا ہے ——— میر صاحب کی شاعری میں رنج و غم کا بیان ہے اور وہ ویسے ہی الفاظ لاتے ہیں لیکن جب وہ اپنے معشوق کے حسن کا تذکرہ کرتے ہیں تو وہ خوبصورت الفاظ منتخب کرتے ہیں جن میں بے حد شگفتگی ہوتی ہے ؎

کھلنا کم کم کلی نے سیکھا ہے — تیری آنکھوں کی نیم خوابی سے

انگریزی داں اصحاب تکرارِ الفاظ یا تکرارِ حروف کو بے حد پسند کرتے ہیں کیونکہ انگریزی شاعری کی یہ ایک مقبول صنعت ہے، ہماری شاعری میں الفاظ و حروف کی تکرار عام اس سے کہ وہ شعر کے ایک ہی

مصرع میں ہو یا دونوں میں عموماً قبیح سمجھی جاتی ہے، راقم الحروف کا بھی عرصہ تک یہی خیال تھا اور یہی معیارِ سخن میں لکھا بھی ہے لیکن اب میری رائے یہ ہے کہ اس ضمن میں کوئی حتمی فیصلہ نہیں دیا جا سکتا بلکہ اس کا فیصلہ ذوقِ سلیم ہی کر سکتا ہے، تکرارِ الفاظ و حروف کی اکثر صورتیں ایسی بھی ہوتی ہیں، جن کی موجودگی حسنِ شعر کی ترقی کا موجب ہوا کرتی ہے، مثال کے طور پر میر تقی میرؔ کا مندرجۂ بالا شعر جس میں کم کم کی تکرار اور حرفِ "ک" کی تکرار سے عجیب لطف پیدا ہو گیا ہے۔ اساتذہ کے یہاں ایسی مثالوں کی کمی نہیں ؎

رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے — تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی — غالبؔ

کس تجاہل سے یہ کہتا ہے کہاں رہتے ہو — تیرے کوچے میں ستمگار! ترے کوچے میں — شیفتہؔ

زندگی میں ترکِ شغلِ عشق کیونکر کیجئے — زندگی بھی، زندگی کا مدعا بھی عشق ہے — آزادؔ سہارنپوری

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی — جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی

آہ وہ یاد کہ اس یاد کو ہو کر مجبور — دلِ مایوس نے مدت سے بھلا رکھا ہے — حسرتؔ موہانی

اس طرح یہ بات طالبانِ ذوقِ سخن کو معلوم ہو جائے گی کہ تکرارِ الفاظ و حروف سے بھی مضمون و الفاظ میں مطابقت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس کی اور بھی بہت سی صورتیں ہیں ——— اچھا شاعر ہمیشہ مناسب الفاظ لاتا ہے تاکہ وہ خیال اور بہتر ہو جائے ؎

کبھی خوش بھی کیا ہے دل کسی رندِ شرابی کا — بھڑا دے منہ سے منہ ساقی ہمارا اور گلابی کا — دردؔ

پہلے مصرعہ میں مضمونِ رندی و بے باکی کی مناسبت سے مصرعِ ثانی میں "لگا دے" کی جگہ "بھڑا دے" لکھا ہے اور خوب لکھا ہے

سوادِ گیسوئے مشکیں میں ظلمت شام کی پائی — بیاضِ گردنِ محبوب میں نورِ سحر دیکھا — آتشؔ

سیاہی شام کے اعتبار سے سوادِ گیسو اور سپیدۂ سحر کے لحاظ سے بیاضِ گردن ہی لکھنا مناسب تھا، چنانچہ آتشؔ نے وہی لکھا اور خوب لکھا۔

ہم نے یہ مضمون ان نوجوانوں اور شاعروں کے لئے لکھا ہے جو شاعری کا قابلِ قدر رجحان رکھتے ہیں تاکہ ان کے سامنے شاعری کا ایک معنوی اور فنی معیار رہے اور وہ مبتذل یا خراب اشعار سے دامن کشی کریں، یہ ضرور ہے کہ شاعری کی تمام خوبیوں کا احاطہ کوئی بھی نہیں کر سکتا اور اسی لئے اپنے ذوق کی تربیت کرنا لازم و ضروری ہے، کیونکہ ذوقِ سلیم حقیقی کسوٹی ہے جو کسی کم عیار چیز کو پسند نہیں کرتی ——— اس مضمون میں مثالیہ اشعار اسی لئے کثرت سے درج کئے گئے ہیں تاکہ رہنمائی و رہبری ہو سکے اور یقین ہے کہ پڑھنے والے ان اشعار کو دلچسپی اور دل پذیری سے خالی نہ پائیں گے۔

(سیارہ)

"نگار" کے پچھلے تین سالنامے

سالنامہ ۱۹۳۱ء جس میں علم "فراست التحریر" کے اصول پیش کئے گئے تھے اور جن کو دیکھ کر آپ ایک شخص کا سوادِ خط دیکھ کر اسکے کیرکٹر کا صحیح اندازہ کر سکتے ہیں۔ صرف ایک کاپی باقی ہے ——— قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۳۷ء اس میں ڈرامہ "اصحاب کہف" اڈیٹر کے قلم سے پورا شایع ہوا ہے اور "خلافت و امامت" کے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز ہوا ہے ——— قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۳۸ء اس میں تاریخ اسلامی ہند کے عہد خلافت و امامت پر مختتم بحث کی گئی ہے جس کی ابتدا ۱۹۳۷ء میں ہوئی تھی ——— قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

فنِ تحریر کی تاریخ

(بہ سلسلۂ ماسبق)

مختصر نویسی — ناروے اور سویڈن میں رونی خط نے مختصر نویسی کی صورت اختیار کرلی تھی۔ اس خط کے لکھے گیا دسویں صدی عیسوی کے ہیں اور (Haelsingeland) کے علاقہ میں پتھروں پر کندہ کئے ہوئے ملے ہیں اسی لئے اس خط کو (Haelsinge Runes) کہا جاتا ہے۔ نیچے اس کی دو قسموں کے حروف نقل کئے جاتے ہیں:۔

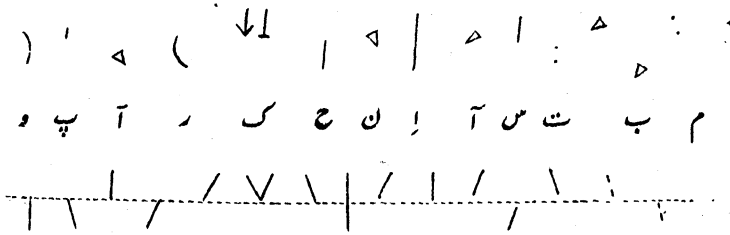

ر ل م ب ت س آ ا ن ح ک ر آ پ و ف

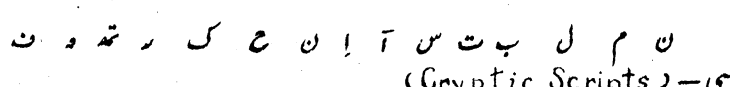

ن م ل ب ت س آ ا ن ح ک ر ت ہ و ف

مرموز نویسی — (Cryptic Scripts)

رونی خط ہی کو سامنے رکھ کر بعض رمزی خط ایجاد کئے گئے۔ سینٹ گیلن (St. Gallen) کے مسودے میں ایسے متعدد خطوں کا ذکر ہے۔ نیچے اس کے چند نمونے پیش کئے جاتے ہیں، ان میں لفظ (Corui) کو چار رمزی خطوں میں لکھا ہے:۔

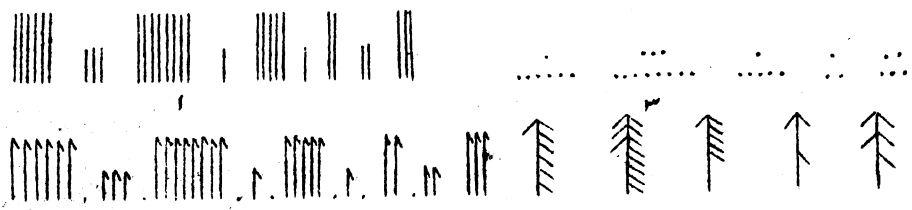

ان کے نام (۱) آئس رونا۔ (۲) لوگو رونا۔ (۳) سٹوف رونا۔ (۴) ہابل رونا ہیں۔

اسی سلسلہ میں دو اور خطوں کا بھی ذکر کیا جا سکتا ہے جو بالترتیب "شجر رونی"[1] (Twig Runes) اور

---

[1] اس کا مقابلہ عربی کے خط "مشجر" سے کیجئے۔ ملاحظہ ہو نگار بابت ستمبر ۱۹۵۸ء

"صلیبی رونی" (Cross. Runes) کہلاتے تھے۔ ان کے نمونے یہ ہیں:-

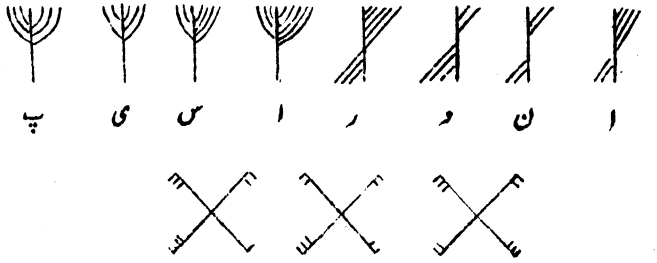

کتبے ۔ قدیم جرمن قومیں لکڑی کے کام میں بہت ماہر تھیں اور شروع میں رونی خط لکڑی ہی پر کندہ کیا جاتا تھا۔ لیکن لکڑی پر منقوش کتبے تھوڑے ہی سے دستیاب ہوئے ہیں، اکثر تلف ہوگئے، جو کتبے باقی رہ گئے ہیں اُن سے ظاہر ہوتا ہے کہ جرمن قبایل میں چوبی جنتریاں رائج تھیں جو چند انچوں سے لیکر پانچ فیٹ تک لمبی ہوتیں، جن میں تصاویر کے ذریعہ سے تہوار اور رونی حروف میں تاریخیں ظاہر کی جاتی تھیں۔

دھات کی تختیوں پر بھی رونی کتبے پائے گئے ہیں۔ ذاتی استعمال کی چیزوں مثلاً آلات حرب و ضرب اور زیورات پر اُن کے بنانے والوں یا مالکوں کے نام کندہ ہیں۔ بعض کتبے سونے کے گول تمغوں پر پائے گئے ہیں جو اہل رومہ کی تقلید میں بنائے گئے تھے۔ پانچویں صدی سے ان نقوش کے درمیان آرایش یا علامات کے طور پر بعض جانوروں کی تصاویر بھی بنائی جانے لگیں۔

ان چوبی و فلزاتی کتبوں کے علاوہ جو پورے یورپ میں روما نیہ اور مغربی روس سے لیکر فرانس تک ملے ہیں، ہزاروں کتبے پتھروں پر کندہ ڈنمارک، ناروے اور سویڈن میں موجود ہیں۔

مذکورۂ بالا کتبوں کا زمانہ پہلی سے پندرھویں صدی عیسوی تک ہے۔ ان کے علاوہ نویں سے گیارھویں صدی عیسوی تک کے بعض مسودے بھی لیڈین ـــــ ویانا اور آکسفورڈ کے کتب خانوں اور عجائب گھروں میں محفوظ ہیں۔ مسودوں کی کمی اس بات کا ثبوت ہے کہ یہ خط علمی و ادبی کاموں میں شاذ ہی استعمال کیا جاتا تھا۔ نیچے مختلف ممالک کے کتبوں کا علٰحدہ علٰحدہ ذکر کیا جاتا ہے۔

ڈنمارک ـــ رونی خط کے قدیم ترین کتبے (۵۰ سے اوپر جن میں ۴۰ تمغے شامل ہیں) ڈنمارک کے جنوبی مغربی حصے میں ملے ہیں۔ یہ تیسری سے چھٹی صدی عیسوی تک کے ہیں اور ۲۰۰ کتبے جو پتھروں پر کندہ ہیں نویں اور گیارھویں صدی عیسوی کے بیچ کے ہیں۔

نیچے چوتھی یا پانچویں صدی عیسوی کے ایک رونی کتبے کی اشکل پیش کی جاتی ہے جو ایک طلائی قرنا پر کندہ ڈنمارک میں ۱۸۳۹ء میں ملا۔ ۱۸۴۱ء میں یہ قرنا چوری ہوگیا اور سونے کے لالچ میں اُسے گلا ڈالا گیا۔

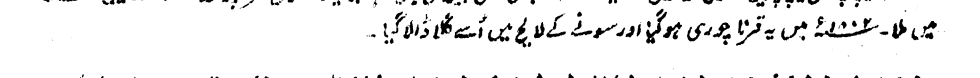

(۱) رونی کتبہ۔ (۲) نقل بخط رومن۔ ترجمہ "میں ہلیواسٹ ہولٹ (کے باشندے) نے اس قرنا کو بنایا"

برطانیہ ۔ تقریباً ۵۰ رونی کتبے ملے ہیں۔ ان میں سے بیشتر انگلستان میں نہیں بلکہ جزیرۂ آرکنی (Orkney

کمبرلینڈ (Cumberland) اور آئل آف مین (Isle of Man) میں پتھروں پر کندہ پائے گئے ہیں۔ ان مقامات پر نارویے کے لوگ آباد تھے۔ علاوہ ازیں کینٹ (Kent) میں جیسے جوٹ (Jute) لوگوں نے فتح کر لیا تھا۔ ڈمفریس شائر (Dumfriesshire) میں رتھ ویل (Ruthwell) کی صلیب پر ایک مشہور رونی کتبہ ہے۔ کمبرلینڈ میں بیوکیسل (Bew Castle) پر ساتویں صدی عیسوی کا ایک قابلِ ذکر کتبہ پایا جاتا ہے۔ نیچے کا اینگلو سیکسن کتبہ ایک سونے کی چڑی پر منقوش ہے جو کرنگ مورز (کمبرلینڈ) میں ملی تھی:

ᚦᚠᚱᚻᚱᛁᚢᚠᛏᛚᚻᚱᛁᚢᚱᛁᚦᚠᚾᚷᛚᚠᚠ ᛏᚠᚲᚴᚠᚾ

ᛏᚠᚠ

انگلستان کے مشہور کتبوں میں ایک تلوار نما چاقو ہے جس پر رونی حروف منقوش ہیں۔ یہ ۱۸۵۶ء میں دریائے ٹیمس میں ملا تھا اور اب برٹش میوزیم (لندن) میں محفوظ ہے۔ اگرچہ بعض عالم اسے پانچویں اور چھٹی صدی عیسوی کا بتاتے ہیں لیکن غالباً یہ ۸۰۰ء کا ہے۔ دوسرا مشہور کتبہ وہیل کی ہڈی کے بنے ہوئے ایک صندوقچہ پر پایا جاتا ہے جو "فرینکس کیسکیٹ" کہلاتا ہے اسے سر ولاسٹن فرینکس (Sir Wollaston Franks) نے ۱۸۵۶ء میں خرید کر برٹش میوزیم کو تحفے میں دیا تھا جہاں اب بھی یہ محفوظ ہے (اسکاٹ لینڈ کے حصے کے جو فلورنس کے بارگیلو میوزیم میں ہے) اسے بعض عالم ۶۵۰ء اور بعض ۷۰۰ء کا بتاتے ہیں۔ اس کے ایک رخ پر مشہور جڑواں بھائیوں رومولس اور ریمیس کی تصویر ہے جن کے بارے میں روایت ہے کہ انھیں ایک مادہ بھیڑیے نے دودھ پلا کر پالا تھا اور رومولس نے شہر روم کی بنیاد ڈالی تھی۔ اس تصویر کے چاروں طرف جو کتبہ ہے اس میں سے صرف اوپر کا حصہ نقل کیا جاتا ہے:-

(۱) ᚱ ᚠᛗᚨᚹᚠᚱᚨᛚᚻᚠᚷᚷᛞᚱᛗᚨᚨᚹᚠᚱᚨᛚᚻᛏᚹᛟᚷᛗᚷ

(۲) R O M W A L U S . A N D . R E U M W A L U S . T W Œ G E N

(۳) جڑواں ریموالس اور روموالس ⟵

اسکینڈی نیویا — رونی کتبے ایستادہ پتھروں پر (جن میں سے بیشتر سنگ مزار ہیں) سب ملکوں سے زیادہ سویڈن میں پائے گئے ہیں۔ ان ۲۰۰۰ کتبوں میں سے تقریباً ۱۰۰۰ گیارھویں اور ابتدائی بارھویں صدی عیسوی کے ہیں۔ نارویے سے تقریباً ۷۰ کتبے ملے ہیں جن میں سے ۱۰ اٹھنے ہیں۔ نارویے ہی میں اس خط کا سب سے طویل کتبہ ہے جس کا زمانہ ۱۰۳۰ء ہے۔

ؔ یہاں کا رونی خط (Manx Runes) کہلاتا ہے۔ اس کا تعلق اسکینڈی نیویائی خط سے ہے۔ اس کا مشہور ترین کتبہ (Kirk Michael Stone) ہے جس کا زمانہ ۱۰۰۰ء ہے۔

اس پر ۱۷۰ حروف کو اب تک پڑھا جا سکتا ہے۔

یہ ایک عجیب بات ہے کہ آئس لینڈ میں جہاں قدیم جرمن ادب سب ملکوں سے زیادہ محفوظ رہا روٹی خط کے کتبے بہت کم ملے ہیں ان میں سب سے قدیم سنہ ۱۲۰۰ء کا ہے۔ اسی طرح جنوبی مغربی جرمنی، آسٹریا، بحیرۂ اسود کے روسی ساحل اور رومانیہ میں بھی تھوڑے سے کتبے ملے ہیں۔

ایجاد — روٹی خط کی ایجاد کے بارے میں بڑے متضاد نظریے پیش کئے گئے ہیں۔ مثلاً:- (۱) اُس کا ماخذ سامی خط تھا جو فنیقی تاجروں کے ذریعہ اسکینڈی نیویا پہونچا (۲) وہ اسکینڈی نیویا کے لوگوں کی ذاتی ایجاد تھا۔ (۳) وہ مثل دیگر یورپی رسوم خط اور فنیقی خط کے ایک قبل تاریخی جرمن نارڈک خط سے ماخوذ تھا۔ یہ آخری نظریہ قومی اور سیاسی اغراض کی بنا پر وضع کیا گیا تھا۔ ان نظریوں کی تردید ہو چکی ہے۔

علم الحروف کے نہایت مشہور ماہر ڈاکٹر آئزک ٹیلر (Isaac Taylor) کے نزدیک روٹی خط کو اُن گوتھ لوگوں نے ایجاد کیا تھا جو جنوبی روس میں آباد تھے۔ اُنھوں نے اپنی ایجاد کی بنیاد چھٹی صدی ق۔م کے اُس یونانی خط پر رکھی تھی جو بحیرۂ اسود کی یونانی نوآبادیوں میں مستعمل تھا۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ مثل یونانی خط کے قدیم ترین روٹی کتبے دائیں سے بائیں کو لکھے گئے ہیں اور یا پھر باری باری اُن کی ایک سطر دائیں سے بائیں کو اور دوسری بائیں سے دائیں کو لکھی گئی ہے، یونانی خط میں پانچ قسم کی تبدیلیوں کے بعد روٹی خط وجود میں آیا۔ (۱) غیر ضروری حروف کا ترک کیا جانا (۲) نئے حروف کی ایجاد۔ (۳) حروف کی شکلوں میں تبدیلی۔ (۴) حروف کی آوازوں میں تبدیلی۔ (۵) حروف کی ترتیب میں تبدیلی۔ حروف کی شکلوں میں تبدیلی کی وجہ یہ تھی کہ روٹی خط ایک لکڑی پر کندہ کئے جانے والا خط (Xylographic Script) تھا۔ لکڑی کے ریشوں کے رُخ کی طرف حروف کندہ کئے جاتے تھے۔ اس وجہ سے یونانی حروف کی گولائیوں کی جگہ زاویوں نے لے لی۔ حروف کی ترتیب میں دو وجوہ سے تبدیلیاں ہوئیں۔ یعنی جن حروف کی صورتیں مشابہ تھیں اُنھیں پاس پاس رکھا گیا۔ اس طرح جن کی آوازوں میں تشابہ تھا وہ بھی پاس پاس رکھے گئے۔ اگرچہ ٹیلر کا نظریہ عالموں میں بہت مقبول ہوا لیکن اب اسے تسلیم نہیں کیا جاتا اس لئے کہ روٹی خط کا سنہ عیسوی کے آغاز سے قبل موجود ہونا ثابت نہیں ہوتا۔

بعض عالموں نے سنہ عیسوی کے آغاز سے پہلے کی چند صدیوں کے گھسیٹ یونانی خط کو روٹی کا ماخذ بتایا اور اس کارنامہ کو انجام دینے کے لئے گیلٹ لوگوں کو واسطہ ٹھہرایا لیکن ان دعووں کے لئے بھی کوئی ثبوت موجود نہیں ہے۔

ڈنمارک کے عالم (L. Wimmer) کے نزدیک روٹی خط کا ماخذ دوسری صدی عیسوی کے اخیر کا لاطینی خط تھا (Argell) کے نزدیک بھی روٹی خط لاطینی سے ماخوذ تھا لیکن پہلی صدی عیسوی کے گھسیٹ حروف سے جو پومپیائی کے کھنڈروں پر منقوش ہیں۔ (Von Friesen) کے مطابق روٹی خط یونانی اور لاطینی دونوں ہی خطوں پر مبنی ہے "بعض گوتھ افراد — مثلاً گرایہ کے سپاہی — بحیرۂ اسود کے شمالی مغربی ساحل سے رومی صوبوں میں گئے اور وہاں انھوں نے یونانی اور لاطینی زبانیں اور رسوم خط سیکھے جو سرکاری فرمانوں اور خانگی زندگی میں مستعمل تھے۔ ایسے ہی کسی ایک شخص یا متعدد گوتھ لوگوں نے مل کر گوتھک زبان کو لاطینی اور یونانی خطوں میں لکھنے کی سعی کی ان ہی کوششوں کا نتیجہ روٹی خط ہے" چنانچہ روٹی کے بعض حروف گھسیٹ لاطینی سے مشابہ ہیں لیکن دوسری باتوں میں وہ یونانی خط سے متاثر معلوم ہوتے ہیں یعنی:-

(۱) دونوں میں حروف کی تعداد ۲۴ ہے جبکہ لاطینی میں کل ۲۱ حروف تھے اور بعد میں جب یونانی کے حروف (Y) اور (Z) لئے گئے تو ۲۳ ہو گئے۔ (۲) روٹی خط میں حروف تہجی کا استعمال یونانی سے لیا گیا جس میں یہ آواز (Y) سے ظاہر کی جاتی تھی۔ (۳) ہر روٹی حرف کا ایک علحدہ نام ہے جو یونانی حروف ایلفا، بی تا، گاما وغیرہ کی نقل ہے۔ برخلاف

اس کے لاطینی حروف کلاسیکی زمانہ میں اب کی طرح اے، بی، سی، ڈی وغیرہ ہی پڑھے جاتے تھے۔[1]

ڈاکٹر ڈیوڈ ڈرینگر کے نزدیک یہ کل نظریئے ناقابلِ تسلیم ہیں۔ قدیم روٹی خط کی تحریر کا رخ اور حروف کی شکلیں اس بات کو ثابت کرتی ہیں کہ روٹی خط کا ماخذ نہ تو گھسیٹ یونانی خط ہے اور نہ گھسیٹ لاطینی۔ ڈرینگر کے نزدیک یہ رائے زیادہ قابلِ قبول ہے کہ روٹی خط کا ماخذ شمالی ایٹرسکی خط تھا۔[2] اس نظریئے کو متعدد عالموں نے پیش کیا ہے اور تائید کی ہے جن میں ناروے کے عالم C.J.S. Marstrander کا نام خصوصیت کے ساتھ قابلِ ذکر ہے جس نے فروری ۱۹۲۸ء میں اپنے دعوے کو ثابت کرنے کیلئے ایک تحقیقی رسالہ لکھا تھا۔ علاوہ ازیں Rhys Carpenter نے بھی اس نظریئے کی تائید میں اہم دلایل فراہم کئے ہیں

شمالی ایٹرسکی خط کو روٹی خط کا ماخذ مان لینے سے لاطینی خط کی اثر اندازی کا امکان بڑھ جاتا ہے اور یہ چیز بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ بعض روٹی حروف کی آوازیں ایٹرسکی حروف کی آوازوں سے مشابہ کیوں ہیں۔ مزید براں روٹی خط اگرچہ زمانہ کے لحاظ سے بعد کی چیز ہے لیکن حروف کی شکلیں پرانی کیوں نظر آتی ہیں۔ ایٹرسکی خط اور روٹی خط میں زمانہ کے لحاظ سے بھی زیادہ فصل نہ تھا۔ زیادہ سے زیادہ دو سو ہی صدی ق۔م یا اس کے کچھ بعد کوتھ لوگوں نے ایٹرسکی خط کا علم حاصل کیا تھا۔ (باقی)

نوٹ:۔ بعض اہم مصروفیتوں کی بنا پر اس سلسلہ کو اسی جگہ روک دینا پڑا۔ اب ایٹرسکی خط، رومن خط اور موجودہ انگریزی حروف کی تفصیلی تاریخ نیز ہندوستانی رسومِ خط کا مفصل تذکرہ سالِ آیندہ پیش کیا جائے گا۔

محمد اسحاق صدیقی

---

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے چودھویں اڈیشن میں "روٹی خط" پر جو مقالہ ہے اُس میں اس نظریہ کو قابلِ قبول قرار دیا گیا ہے۔

[2] اسے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں غیر مقبول بتایا گیا ہے۔

اصلاح و ترمیم:۔ ستمبر کے مضمون میں صفحہ ۳۸ پر "حروف کی تعداد گھٹانے کے لئے غیر ضروری نشانات ترک کئے گئے مثلاً کے بعد یہ حروف نقل کر لیجئے:۔

او د نگ اِ اِہ د گ

اس کے بعد جو حروف نقل کئے گئے ہیں اُن میں سے اوپر والوں کے سامنے "مقبول" اور نیچے والوں کے سامنے "متروک" لکھ لیجئے۔

"نگار" کی ایجنسی حاصل کرنے کے قواعد

(۱) نگار کے معمولی پرچوں کی قیمت ۱ر فی پرچہ ہے۔ ایجنٹوں سے ۱ر لئے جاتے ہیں، لیکن "صارف رجسٹری" بھی انھیں کے ذمے ہوتے ہیں۔

(۲) پانچ پرچوں سے کم کے لئے ایجنسی قایم نہیں کی جاتی اور ایجنٹوں کو ۵ پرچے ذریعہ وی پی ہی میں روانہ کئے جاتے ہیں۔ غیر فروخت شدہ پرچے واپس نہیں لئے جاتے ــــ (۳) سالناموں کی قیمت ہر سال مختلف ہوتی ہے۔ جس میں ایجنٹوں کو ۲۵ فی صدی کمیشن دیا جاتا ہے۔ منیجر نگار لکھنؤ

"گاہے گاہے باز خواں ——"

روح و بقاءِ روح کی دلچسپ داستان

انسان کی زندگی اس میں شک نہیں بہت سے معتقدات و مزعومات سے گھری ہوئی ہے اور ہر عقیدہ کے لئے وہ کوئی نہ کوئی دلیل بھی ضرور رکھتا ہے لیکن اگر اُن دلایل کی قوت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سب سے زیادہ کمزور دلیل وہ ہے جو بقاءِ روح کے باب میں اس کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔

قبل اس کے کہ آپ اس دلیل کو سُنیں یہ معلوم کرنا مناسب ہے کہ بقاءِ روح کے معتقدین کہتے کیا ہیں ؟

ان میں ایک جماعت تو کہتی ہے کہ صرف روح کو بقا ہے یعنی انسان میں جس چیز کو احساس، تشخص، حافظہ اور تاثر سے تعبیر کیا جاتا ہے وہ مرنے کے بعد بھی قائم رہے گا۔ دوسری جماعت جس میں زیادہ تر مذہبی لوگ شامل ہیں وہ بقاءِ روح کے ساتھ حشرِ اجساد کے بھی قایل ہیں، یعنی ایک دن ایسا آئے گا جب جسموں سے جدا ہونے والی روحیں پھر اپنے جسموں سے مل جائیں گی اور وہ تقریباً اسی قسم کی زندگی بسر کریں گی جیسی اس دُنیا میں بسر کی ہے،

حیات بعد الموت کا عقیدہ کوئی نیا عقیدہ نہیں ہے بلکہ یہ اتنا ہی قدیم ہے جتنی نوعِ انسانی ـــ اول اول جب انسان کی عقل بہت محدود تھی، تو وہ اپنے مُردہ عزیزوں اور دوستوں کو خواب میں دیکھ کر سمجھتا تھا کہ یہ ضرور کسی نہ کسی حیثیت سے اب بھی موجود ہیں اور انکو پہلے کے ساتھ وہی تعلق باقی ہے جو ان کی زندگی میں پایا جاتا تھا اور یہیں سے یہ اعتقاد پیدا ہوا کہ روح اور جسم دو بالکل علٰحدہ علٰحدہ چیزیں ہیں، اور روح جسم سے جدا ہونے کے بعد بھی کسی نہ کسی طرح قایم رہتی ہے، چنانچہ اسی بنا پر ایک شخص کے مرنے کے بعد اس کی قبر پر کھانے پینے کی چیزیں رکھدی جاتی تھیں تاکہ اس کو حیات بعد الموت کے طویل سفر میں تشنگی و گرسنگی کی تکلیف نہ پہونچے (مسلمانوں میں مرنے کے بعد فاتحہ وغیرہ کی رسمیں سب اسی اعتقاد کی یادگار ہیں)

خیر اگر عہدِ قدیم کا جاہل انسان ایسا سمجھا جاتا تو جائے حیرت نہیں، کیونکہ وہ غریب حیات کی حقیقت سے واقف ہی نہ تھا، لیکن اب کہ آغازِ حیات کے اسباب سے ہر شخص واقف ہوگیا ہے، روح کے بقا کا قایل ہونا سخت حیرتناک امر ہے۔

حیات حیوانی کی تمام ترقی یافتہ شکلوں کی بنیاد صرف ایک خلیہ یا کویا (CELL) ہے لیکن حقیقتاً حیات کا آغاز اس وقت ہوتا ہے جب اس کا پیوند دوسرے خلیہ سے ہو[1]۔ اس پیوند کے بعد بے شمار خلایا بنتے رہتے ہیں یہاں تک کہ حیوانی صورت ظہور پذیر ہوتی ہے اور ایک وقت معینہ کے بعد وہ اس دُنیا میں قدم رکھتا ہے۔ پھر حیات دنیاوی میں بھی بے شمار خلایا اس کے جسم میں پیدا اور فنا ہوتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ کسی بیماری یا حادثہ یا بڑھاپے کی وجہ سے خلایا کا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے اور زندگی ختم ہوجاتی ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر مناسب حالات کے تحت خلایا کا پیوند نہ ہو تو وجودِ حیات نہیں پایا جاسکتا۔ یہ درست ہے کہ سب سے پہلا خلیہ جو حیات حیوانی کا باعث ہے خود جان رکھتا ہے، لیکن وہ حیات ایسی نہیں ہوتی جو کسی دوسرے خلیہ سے ملے بغیر ظاہر ہوسکے۔

عورت میں تقریباً دس ہزار پہلی قسم کے خلایا موجود رہتے ہیں اور مرد میں ارب در ارب (بلکہ بیشمار) خلایا دوسری قسم کے پائے جاتے ہیں، لیکن ان میں سے صرف چند خلایا کے پیوند ہونے سے حیات رونما ہوتی ہے۔ پھر اگر ان غیر پیوند شدہ بیکار خلایا میں بھی روح کا وجود مانا جائے

---

[1] نباتات میں عام طور پر کسی دوسرے خلیہ سے پیوند ہونے کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ ایک ہی خلیہ ترقی پاکر اور اپنے اندر سے کثیر خلایا پیدا کرکے نشو و نما کا باعث ہوتا ہے۔

اور مرنے کے بعد حیات مابعد کی وہی صورت تسلیم کی جائے جو ان غیر نتیجہ خیز خلایا میں پائی جاتی ہے، تو میں نہیں سمجھ سکتا کہ ایسی حیات سے کیا فایدہ ہے اور کیوں اس کی تمنا کی جائے۔

اگر وہ چیز جس کا نام "روح" ہے جسم سے بالکل علٰحدہ کوئی شے ہے تو پھر لامحالہ یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ کب کہاں اور کیونکر جسم کے اندر آگئی، جب انسانی وجود عبارت ہے دو بے روح خلایا کے اتصال سے، تو پھر روح ان میں کہاں سے آگئی۔ اس کا جواب دینا ہمارا فرض نہیں۔

آپ نے سُنا ہوگا کہ ایک جنین جس نے رحم مادر میں پوری پرورش پائی تھی اور جس میں جان پڑ گئی تھی کسی صدمہ سے بالکل بے جان پیدا ہوا، لیکن بجلی اور دیگر آلات کی مدد سے اس میں جان پھر عود کر آئی اور وہ اپنی طبعی زندگی پوری کر کے مرا، اسی طرح آپ نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ایک شخص پانی میں ڈوب کر بالکل بے جان ہوگیا۔ لیکن اس میں تنفس دوبارہ پیدا کر دیا گیا۔ پھر اگر روح واقعی جسم سے بالکل علٰحدہ کوئی دوسری چیز ہے تو بتایا جائے کہ اس مردہ جنین اور اس غرق شدہ انسان میں اتنے عرصہ کے لئے روح کہاں چلی گئی تھی اور وہ کیوں ان تدابیر کا انتظار کر رہی تھی جو کہ اگر اختیار نہ کی جاتیں تو پھر روح کے واپس آنے کا امکان نہ تھا۔

کہا جاتا ہے کہ "محض حیات کا وجود، جو روح کے لئے ضروری نہیں، اور نہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ جس چیز کو ہم جسم انسانی میں حیات سے تعبیر کرتے ہیں اسی کا دوسرا نام روح ہے۔ کیونکہ دیگر ذیحیات مخلوق اور انسان کے درمیان مابہ الامتیاز یہی امر ہے کہ انسان میں روح پائی جاتی ہے اور انھیں نہیں ایک درخت میں "حیات" ہے لیکن روح نہیں، ایک جانور میں "زندگی" ہے لیکن روح نہیں۔ پھر یہ تو صحیح ہے کہ زندگی کا آغاز ایک خاص وقت سے شروع ہوتا ہے اور اس لئے اس کی انتہا بھی ہونی چاہئے لیکن انسان کا حافظہ اور ادراک نفس مرنے کے بعد بھی قایم رہ سکتا ہے اور یہی وہ چیز ہے جسے روح کہتے ہیں"۔

میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ دعویٰ کس حد تک درست ہے۔ انسان میں وجود روح کو تسلیم کرنا اور دیگر مخلوقات کو اس سے محروم سمجھنا ایک ایسی بات ہے جس پر کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی۔ اور کوئی وجہ نہیں کہ انسان کی طرح اور ذیحیات اشیاء میں بھی ادراک و حافظہ نہ پایا جائے گھوڑے، کتے اور بلی کا برسوں کے بعد اپنے مالک کو پہچان لینا اس بات کا قوی ثبوت ہے کہ ان میں قوت حافظہ بھی پائی جاتی ہے اور ادراک بھی اور اگر تھوڑی دیر کے لئے مان لیا جائے کہ ادراک و حافظہ صرف انسان ہی کو میسر ہوا ہے تو پھر انسان کو اس وقت کی باتیں کیوں یاد نہیں رہتیں، جب وہ رحم مادر میں تھا، یا جب دُنیا میں آنے کے بعد اُس نے گھٹنیوں چلنا سیکھا تھا، اسی طرح ضعیف ہونے کے بعد انسان کیوں اپنے شباب کی بہت سی باتیں بھول جاتا ہے، اس لئے قرین قیاس یہی ہے کہ مرنے کے بعد یہ حافظہ و ادراک بھی ختم ہو جائے گا اور جس طرح پیدا ہونے سے پہلے عدم کی تاریکی تھی اسی طرح مرنے کے بعد طاری ہو جائے گی، نہ پہلے کچھ تھا، نہ بعد میں کچھ ہوگا۔

عہد قدیم میں جب انسان نہ اپنے جسم کی تعمیری حقیقت سے واقف تھا اور نہ کائنات کے دوسرے مخلوقات کا اسے علم تھا، اس کا روحوں کے وجود کو جسم سے علٰحدہ سمجھنا ٹھیک تھا کیونکہ آسمانی جغرافیہ کی حقیقت اس کے نزدیک صرف یہ تھی کہ زمین کو آسمان گھیرے ہوئے ہے اور اس میں ستارے جڑے ہوئے ہیں، آسمان کے اوپر بہشت ہے جہاں فرشتے اوپر نیچے آتے جاتے رہتے ہیں۔ لیکن اب کہ مکان و زمان کا مفہوم بہت وسیع ہو گیا ہے اور ہماری دوربینوں نے کرۂ ارض سے بہت زیادہ عظیم المرتبت اجرام سماوی ہمارے سامنے پیش کر دئے ہیں، ہمارے لئے یہ باور کرنے کی کوئی وجہ نہیں کہ لامتناہی فضا کے ان بیشمار دنیاؤں میں، صرف کرۂ ارض ہی کے باشندوں کو کوئی خاص اہمیت حاصل ہے اور انھیں کی روحوں کو بقاء دوام کے خلعت سے سرفراز کیا گیا ہے پھر اور رکروں کو جانے دیجئے، خود اسی زمین کے تمام مخلوقات کو لیجئے تو بھی سوچنا پڑے گا کہ انسان کی روح کو بقا کیوں حاصل ہو اور جانوروں کی روحیں فنا کر دی جائیں اور اگر اس کا جواب صرف مصلحت خداوندی ہو سکتا ہے تو کیا وہی رضاء الٰہی و مصلحت ربانی روح انسانی کو فنا نہیں کر سکتی، ایسا کرنے سے آخر کون باز رکھ سکتا ہے، اور اس میں کونسا استحالۂ عقلی ہے۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے کے بعد روح عالم برزخ میں رہتی ہے بعض کہتے ہیں کہ اسی وقت بہشت و دوزخ کی طرف لیجاتے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ عالم برزخ یا بہشت و دوزخ ہیں کہاں؟۔ روح کا یہ سفر کیونکر ہوتا ہے اور اپنی منزل تک پہونچنے کے بعد وہ کہاں اور کیونکر رہتی ہے

کہنے والے یہ بھی کہتے ہیں کہ وہاں عزیزوں اور دوستوں سے بھی ملاقات ہوگی گویا کوئی جگہ ایسی ہے جہاں ان سب کا اجتماع ہوگا اور وہ اسی دنیا کی طرح آپس میں تبادلۂ خیال کرسکیں گے، اب اسی اعتقاد کے ساتھ ان علمی حقایق کو بھی سامنے رکھئے کہ زمین اپنے محور پر نہایت تیزی سے گردش کررہی ہے اور ۲۴ گھنٹے میں پوری ایک گردش کرلیتی ہے یعنی فی گھنٹہ ایک ہزار میل کی رفتار سے وہ گھوم رہی ہے۔ اسی کے ساتھ اس کی دوسری گردش آفتاب کے گرد ہے جو تقریباً ۹ کروڑ ۳۰ لاکھ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ یہ گردش پورے ایک سال میں پوری ہوتی ہے یعنی فی منٹ ایک ہزار میل کی رفتار سے زیادہ زمین کو آفتاب کے گرد چکر لگانا پڑتا ہے۔ پھر یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہوجاتا بلکہ ایک اور تیسری گردش ہمارے نظام شمسی کی ہے جو قطب کے گرد ہوتی رہتی ہے اور چوتھی گردش نظام قطبی کی ہے جو خدا معلوم کتنے فضاہائے شمسی کے ساتھ فضاء کہکشاں میں کسی اور مرکز کے گرد چکر لگا رہی ہے ــــ پھر کیا ان تمام چکروں اور گردشوں میں باشندگان کرۂ ارض کی روحوں کا جسم سے جدا ہوکر باہم گم ہوجانا یا کسی ایک جگہ قرار پانا باور کیا جاسکتا ہے۔

بعض نہایت سخت مذہبی قسم کے لوگ باور کرتے ہیں کہ انسان قیامت کے دن معہ اپنے جسم کے اٹھایا جائے گا۔ اب سے دو ہزار سال قبل اہل فلسطین جب وہ نہ زمین کی حقیقت سے آگاہ تھے نہ کائنات کی وسعت سے، یقین کرتے تھے کہ زمین کی عمر چار ہزار سال کی ہے اور طوفان کے بعد دنیا کو بسے ہوئے صرف دو ہزار سال کا زمانہ گزرا ہے اور جلد ہی اس کو پھر تباہ ہوجانا ہے۔ لیکن آج یہ امر بایۂ تحقیق کو پہونچ گیا ہے کہ انسان کا وجود کرۂ زمین پر لاکھوں سال سے پایا جاتا ہے اور اس دوران میں دنیا خدا معلوم کتنی مرتبہ بدل چکی ہے، کم از کم تین چار تو صرف برفیلے دور ایسے آچکے ہیں جنھوں نے زمین کی تمام انسانی آبادی کو یا تو سمندر میں ڈبو کر رکھ دیا یا زمین کے اندر دفن کرکے ختم کردیا۔ خدا جانے کتنی بار نوع انسانی جانوروں کی غذا بن کر ختم ہوئی اور پھر انھیں سے پیدا ہوئی۔ الغرض موجودہ انسان میں معلوم نہیں کتنے گزشتہ انسانوں اور جانوروں کے اجزاء شامل ہیں اس لئے اگر حشر اجساد کو تسلیم کیا جائے تو وہ کونسا الفقہ ہوگا جو لاکھوں سال قبل کے انسانوں کے تقسیم شدہ اجزاء کو پھر فراہم کرسکے گا اور اگر میرا حشر ہوا تو کن کن جانوروں، کن کن درختوں اور کن کن انسانوں سے میرے اجزاء فراہم کرکے میرا اصلی جسم طیار کیا جائے گا۔

فطرت کے وہ تمام تغیرات جو انسانی جسم میں نشوونما، بیماری، ضعیفی اور موت وغیرہ کی صورتیں اختیار کرتے رہتے ہیں بالکل ایسے ہی ہیں، جیسے ہم ایک جلنے والے کوئلہ میں دیکھتے ہیں۔ آپ انگیٹھی میں کوئلہ ڈال دیتے ہیں اس کا کیا حشر ہوتا ہے ایک حصہ اس کا دھواں بن کر غائب ہوجاتا ہے، ایک حصہ حرارت میں تبدیل ہوکر آپ کے کمرہ کو گرم رکھتا ہے اور کچھ حصہ راکھ بن جاتا ہے۔ بالکل یہی حالت انسان کی سمجھئے۔ فطرت ہر وقت جوڑنے، توڑنے، ملانے اور منتشر کرنے میں مصروف ہے اور توت و مادہ کو وہ اسی طرح نئی نئی صورتوں میں تبدیل کرتی رہتی ہے پھر کوئی وجہ نہیں کہ انسان جو اسی دنیا، اسی نظام اور اسی مادہ سے متعلق ہے اس عمل سے بچا رہے گا، اگر انسان کا یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر فانی سمجھے تو ایک چیونٹی بھی یہی دعویٰ کرسکتی ہے، ایک گھاس کا تنکا بھی یہی کہہ سکتا ہے۔ روح ہم میں بھی ہے اور ان میں بھی اور اگر ہماری روح کو بقا ہے تو ان کی روحوں کو بھی ہونا چاہئے۔

زندگی حقیقتاً نام ہے صرف اس توازن کا جو فطرت کی تعمیری و تخریبی دو متضاد قوتوں میں پایا جاتا ہے ــــ فطرت کی تعمیری قوت ہمیں قایم رکھنا چاہتی ہے اور تخریبی قوت مٹانے پر تلی ہوئی ہے، جب تک ان دونوں میں توازن قایم ہے، صحیح و توانا کہلاتے ہیں، لیکن جب رفتہ رفتہ تخریبی قوت غالب آنے لگتی ہے تو ہم ضعیف ہوجاتے ہیں اور جب اس کا بالکل تصرف ہوجاتا ہے تو ہم مرجاتے ہیں، لیکن ہماری قوت کے بعد فطرت کا یہ عمل بند نہیں ہوتا بلکہ برابر جاری رہتا ہے، اور ہماری تخریب سے پھر تعمیر شروع ہونے لگتی ہے خواہ وہ تعمیر کیڑوں کی ہو یا نباتات و حیوانات کی، اس لئے اب پھر ہمارے انھیں اجزاء کا فراہم ہوکر جیا ہونا اور اصلی صورت و شکل سے رونما ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اور نہ اس کی کوئی ضرورت ہے۔

حشر و نشر یا بقاء روح کا عقیدہ صرف جذبۂ محبت کی بناء پر پیدا ہوا ہے، جس سے مقصود اپنے آپ کو تسکین پہونچانا ہے، اول اول

جب انسان نے دیکھا کہ اس کے ماں، باپ، اس کے بچے، اس کے بھائی بہن، اس کے سردار اور بزرگ دفعتہً مر گئے، تو اسے سخت صدمہ ہوا اور اسے کسی طرح یقین نہ آیا کہ واقعی ہمیشہ کے لئے فنا ہو گئے ہیں اس کے بعد جب اس نے انھیں خواب میں دیکھا، خواب میں ان سے باتیں بھی کیں تو اس کو اور زیادہ یقین ہو گیا کہ ان کی روحیں موجود ہیں اور ہم سے وہی تعلق محبت کا رکھتی ہیں، پھر یہ عقیدہ برابر اسوقت تک قایم رہا۔ جب تک انسان نے حیات کی حقیقت کو نہیں جانا اور اب بھی انھیں قوموں میں باقی ہے جو اس حقیقت سے ناواقف ہیں یا ناواقف رہنا چاہتی ہیں مگر سوال یہ ہے کہ وہ لوگ جو یہ عقیدہ رکھتے ہیں کیا فی الحقیقت انھیں اس کا یقین بھی ہے ممکن ہے وہ اس کا اقرار کریں، لیکن مجھے اس میں کلام ہے ـــــ اس سے قبل میں عقیدہ و یقین کا فرق بتا چکا ہوں اور ثابت کر چکا ہوں کہ تمام وہ عقاید جن کا تعلق مابعد الموت سے ہے وہ سب مزعومات و قیاسات ہیں حقیقت سے انھیں کوئی واسطہ نہیں کیونکہ علم حقیقی کا تعلق صرف ہمارے حواس اور ہمارے ادراک سے ہے یا ان تجربات سے جو بربنائے تواتر محسوسات کا حکم رکھتے ہیں ـــــ اور یہاں ان دونوں میں سے کوئی بات نہیں۔

اچھا اس فلسفیانہ موشگافی کو جانے دیجئے وہ لوگ جو حیات بعد الموت کے قایل ہیں اور حقیقی سکون و آرام کی زندگی اسی کو سمجھتے ہیں ان سے پوچھئے کہ باوجود اس علم کے کہ دُنیاوی زندگی ناپائدار و مکلف ہے اور اُخروی زندگی ابدی راحت، وہ کیوں یہاں کی زندگی پر جان دیتے ہیں، جب بیمار پڑتے ہیں تو کیوں علاج کرتے ہیں، تپ دق اور سرطان میں مبتلا ہونے کے بعد انھیں موت کا یقین ہوتا ہے لیکن پھر بھی چارہ و علاج ضرور کرتے ہیں۔ اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ انھیں اُخروی زندگی کا صرف اعتقاد ہے، یقین نہیں اگر انھیں یقین ہوتا تو وہ ایک لمحہ کے لئے اس دُنیا میں رہنا پسند نہ کرتے اور جلد سے جلد اس عالم میں پہونچنے کی کوشش کرتے جہاں بہشت کی رحمتیں ہیں، حوروں کی آغوشیں ہیں، بچھڑے ہوئے احباب ہیں، چھوٹے ہوئے اعزہ ہیں، جدا ہو جانے والی اولادیں ہیں اور وہ سب کچھ ہے جو یہاں میسر نہیں آسکتا۔

کہا جاتا ہے کہ مرنے سے ڈر اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کے گناہوں کی سزا وہاں ملے گی، میں کہتا ہوں کہ اس خیال میں بھی وہی اعتقاد کام کر رہا ہے جسے یقین سے کوئی واسطہ نہیں۔ کیونکہ اگر واقعی سزا کا یقین ہو تو قیامت تک کوئی گناہ سرزد نہیں ہو سکتا اصل یہ ہے کہ مرنے کے بعد نہ معاصی کی سزا کا یقین ہے اور نہ نیکیوں کی جزا کا اور نہ ممکن نہیں کہ یہاں کسی سے کوئی گناہ سرزد ہو یا اس دُنیا میں جیتے رہنے کی تمنا دل میں پائی جائے۔

وہ لوگ جو بقاء روح کے قایل ہیں وہ اپنے عقیدہ کے ثبوت میں امریکہ و مغرب کے اُن روحانیین کے بیان کو بھی پیش کرتے ہیں جنھوں نے روحوں سے ہم کلام ہونے کا دعویٰ کیا ہے اس کی نسبت ہم اجمالاً پہلے لکھ چکے ہیں کہ یہ دعوے بالکل جھوٹے ہیں اور ان مدعیان روح و روحانیت نے کس کس طرح لوگوں کو دھوکہ میں مبتلا کیا ہے اور جس چیز کو روحوں کا نامہ و پیام کہا جاتا ہے وہ محض مکر و فریب ہے۔

الغرض مسئلۂ روح یا حیات بعد الموت منجملہ اُن چند مسائل کے ہے جو صرف انسانی تمنّا کی پیداوار ہیں اور اُن عقاید سے متعلق ہیں جن کے لئے نہ صرف یہ کہ کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کی جا سکتی بلکہ سراسر اصول فطرت و انتظام عالم کے منافی ہیں۔ پس اگر مذہب عالم کا انحصار صرف معاد یا حیات بعد الموت پر ہے جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے۔ تو اب کوئی امید نہیں کہ وہ عرصہ تک قایم رہ سکیں، کیونکہ جوں جوں مادی و علمی ترقی بڑھتی جا رہی ہے انسان میں خود اعتمادی کی کیفیت زیادہ پیدا ہوتی جاتی ہے اور وہ کسی بات کو محض اس دلیل پر ماننے کے لئے طیار نہیں ہو سکتا کہ اب سے پہلے کے لوگ ایسا کہہ گئے ہیں، لیکن اگر مذہب کی زندگی کا تعلق کسی ایسے درس اخلاق سے بھی ہو جو اسی دنیا میں کام آنے والا ہے اور اسی عالم میں داعیات تمدن کو پورا کرنے والا ہے تو اُنکے لئے لازم ہے کہ وہ صرف اسی پر اپنی بنیاد قایم کریں اور اُن عقاید پر زور نہ دیں جو اُن کی کمزوری کو ظاہر کرنے والے ہیں۔

یہ دور ڈائرکٹ اور مشین کا ہے، ذہنی آزادی اور حکمت عملی کا ہے، محض روایتی معتقدات کا نہیں اور ایک مذہب کی سب سے بڑی کمزوری یہی ہے کہ اس کی بنیاد صرف روایات پر قایم ہے فکر و تدبر پر نہیں، سُنی سُنائی باتوں پر ہے ذاتی تجربہ و یقین پر نہیں۔

چراغ

(ساقی جاوید - بی - اے)

ہم دیر و حرم کی زینت ہیں تقدیس کدوں میں جلتے ہیں
ہم شام سے لیکر تا بہ سحر عرفاں کی حدوں میں جلتے ہیں

محلوں کے در و دیوار پہ ہم ہر شب کو سحر کر دیتے ہیں
جس بام پہ روشن ہوتے ہیں فردوس نظر کر دیتے ہیں

ہر طاق زر افشاں ہم سے ہے ہر بزم گلستاں ہم سے ہے
تثلیث کدہ ہو یا معبد راتوں میں چراغاں ہم سے ہے

ہم قوس قزح کا ترکش ہیں ہم پھولوں کی محراب بھی ہیں
فانوس میں روشن ہوتے ہی ہم زہرہ بھی مہتاب بھی ہیں

جب رقص ہمارا ہوتا ہے، بازار دہکنے لگتے ہیں
قلعوں پہ شباب آجاتا ہے مینار دہکنے لگتے ہیں

تاریک زمیں ملبوس بدل کر نخلستاں بن جاتی ہے
جس راہ میں ہم جل جاتے ہیں وہ کاہکشاں بن جاتی ہے

ہم راہروانِ شعلہ نفس کے گرم سفر ہو جانے سے
اک لو سی نکلنے لگتی ہے اس خاک کے ظلمت خانے سے

کس کس کی جبین و عارض کی تشبیہ کے ہم کام آتے ہیں
مہتاب و نجوم و لالہ کی توجیہہ کے ہم کام آتے ہیں

قسمت کو ہمارا رونی کیا کہئے مغموم بھی ہیں مسرور بھی ہیں
راتوں میں کسی کے مرقد پر جلنے کے لئے مجبور بھی ہیں

اشکوں کے دہکتے افسانے آہوں کے سلگتے قصے ہیں
افلاس کدوں کی پارینہ تاریخ کے ہم بھی حصے ہیں

ہم پر بھی رکھے ہے قدرت نے بنیاد کئی افسانوں کی
ہم کو بھی ملی ہے تحفے میں کچھ خاک یہاں پروانوں کی

روتے ہیں نظامِ عالم پر جلتے ہیں دیارِ ہستی میں
ہم آگ لگانے آئے ہیں اے انسانو اس بستی میں

عصمت کے جنازے دیکھے ہیں مذہب کے ہلاکت خانوں میں
اے وقت جلیں گے ہم کب تک تہذیب کے گورستانوں میں

ہم کس سے کہیں یہ افسانے بیدار ابھی انسان نہیں
اس شام و سحر کے قلزم میں صدیوں سے کوئی طوفان نہیں

ہم اہلِ سفر نے دیکھی ہے خوں رنگ تباہی راہوں میں
رو رو کے گزاری ہیں راتیں چنگیز کی خیمہ گاہوں میں

سقراط و مسیح و گوتم کے عہدوں کی دلیلیں باقی ہیں
اس وقت بھی قصرِ ماضی کی خوں رنگ فصیلیں باقی ہیں

محلوں کے سنہرے طاقوں میں جلنے کے لئے رکھ دیتے ہیں
ارباب جہاں افسوس کہاں لے جا کے دئے رکھ دیتے ہیں

ہم تو ہیں دلیلِ راہگزر انسان کو مگر احساس نہیں
دامن پہ ہمارے آنسو ہیں، اس کا بھی کسی کو پاس نہیں

دُنیا کے تباہی خانے میں گھبرا کے کہیں جی چھوڑ نہ دیں
اے وقت ترے مہمان کہیں پہلو میں ترے دم توڑ نہ دیں

کچھ اور دکھا دیں راہ تجھے پھر ساتھ کہاں ہم آئیں گے
اک بار بجھے تو اے انساں پھر ہاتھ کہاں ہم آئیں گے

دولتِ برباد

(فضا ابن فیضی)

خانہ آباد ہے ویرانی دیکھ
یہ تباہی کی غزل خوانی دیکھ

اب گریباں بھی نہیں ہاتھوں میں
عالمِ بے سروسامانی دیکھ

زندگی عافیت اسلوب کہاں
خون انساں کا ہوا پانی دیکھ

ابھی طوفان کی نبضیں نہ ٹٹول
ساحلوں پر ہے جو طغیانی دیکھ

زخم پہلو سے غریب الوطنی
یہ بہارِ غمِ پنہانی دیکھ

ڈھل گئی قالبِ صرصر میں نسیم
وحشتوں کی یہ فراوانی دیکھ

جو پشیمانِ رفو ہو نہ سکا
چاکِ پیراہنِ انسانی دیکھ

دیکھ! اربابِ تمدن کی روش
یہ تصوف کی تن آسانی دیکھ

آج پھر مصر کے بازاروں میں
بک گئے یوسفِ کنعانی دیکھ

لٹ گئی عظمتِ احساسِ یقیں
سو گئی قوتِ ایمانی دیکھ

ہر نظر عیش، ہر احساس، گناہ
کفر و تہذیب کی ارزانی دیکھ

جسم کپڑوں میں ہیں ننگے ہیں ضمیر
یہ قبا پوشی و عریانی دیکھ

واعظِ قوم کے پیراہن میں
نہ رہی بوئے مسلمانی دیکھ

نگہ و قلب کا افلاس، نہ پوچھ
عقل کا شیوۂ نادانی دیکھ

شانہ کش جذبۂ بیدار نہیں
زلفِ ملت کی پریشانی دیکھ

جلوے محکوم، اندھیرے آزاد
یہ سیہ پوش درخشانی دیکھ

درد کے ساز پہ تنہائی میں
آنسوؤں کی یہ خوش الحانی دیکھ

زندگی چند نفس ہے، پھر بھی
کتنی مشکل ہے یہ آسانی دیکھ

خلوتِ ماہ و ثریا کے مکیں،
اشک خونیں کی بھی تابانی دیکھ

تجھ کو پندارِ خدائی کی قسم
اپنی دنیا کی یہ ویرانی دیکھ

بگولوں کی دُلہن

جگیشور ناتھ ورما (بیتاب)

زندگانی کروٹیں لیتی رہی خلجان میں
کھیلنے کھانے کے دن کٹتے رہے کچھ کان میں

عہدِ طفلی لے کے انگڑائی جواں ہونے لگا
چلچلاتی دھوپ کا خنجر رواں ہونے لگا

جب نئی اُٹھتی جوانی پاؤں پھیلانے لگی
اک حسین و مست دنیا کیف برسانے لگی

بدلیاں زلفوں کی اُڈیں نور کی پھوٹی کرن
تھا کنارِ نکہتِ گل میں اُمنگوں کا چمن،

چاندنی پیر تھی شرابِ ارغواں موجِ آفریں
لے اُڑی رنگِ شفق کی آنچ صندل کی زمیں

گدگدانی گنگنانی جھومتی آئی ہوا،
مسکراہٹ کے چمن کا غنچہ غنچہ کھل اُٹھا

گدگدا کر پاؤں چومے عقد کی زنجیر نے
مسکرا کر سر جھکایا حُسن کی تصویر نے

ڈھانپ کر مُنھ گھر سے نکلی نازنیں بیمار سی
کوششیں دل تھامنے کی تھیں مگر بیکار سی

یوں گلے مل مل کے دُنیا بھر نے رخصت کر دیا
آنسوؤں کے موتیوں سے اس کا دامن بھر دیا

چل پڑی مُڑ مُڑ کے تکتی دم بخود سیں برجیں
فرشِ مخمل بن گئی جلتی ہوئی چٹیل زمیں

مختصر سا قافلہ گو مہ جبیں کے ساتھ تھا
اک ہجومِ شوق نازِ دلنشیں کے ساتھ تھا

دیکھتے ہی دیکھتے دو لھا دُلھن رخصت ہوئے
دل بدل آویختہ سرو و سمن رخصت ہوئے

جیٹھ کی تپتی فضائیں پھول برساتی رہیں
آگ سی جیکل ہوائیں دل کو گرماتی رہیں،

آندھیوں کے گرم جھونکے تھپکیاں دیتے رہے
دھول کے بادل بلائیں لے کے لیتے رہے

آگ کے شعلوں پہ مستانہ ادا چلتی رہی
نور کے سانچے میں ڈھلنا تھا اُسے ڈھلتی رہی

لڑکھڑاتے سے نظر آتے تھے لو دیتے شجر،
بدلیوں سے دھول کی خورشید کے جلتے تھے پر

کھینچتی تھا دستِ نادیدہ سے دامانِ عروس
آندھیوں کا چیختا سر پھوڑتا سرکش جلوس

جھلملاتا تھا پسینے میں جو کندن سا بدن
چاند سے کھڑکے کو گھونگھٹ سے نہ لگتا تھا گہن

آگ کی گرمی سے لپٹی تھی ہوائے تُند خو،
لوٹتے پھرتے تھے ذرّے پی کے شعلوں کا لہو،

اپنے حلقوں میں لئے پرچم شعاعِ نور کا
مُنھ چڑاتے تھے بگولے تک شبِ دیجور کا،

دفعتاً ٹھٹکی اُٹھانا پاؤں دو بھر ہو گیا،
چھا گئیں مایوسیاں یا معرکہ سر ہو گیا

جھک گئیں سمٹی نگاہیں منھ پہ سرخی چھا گئی
رہ پسینے کی چلی برسات سر پر آ گئی

اک نئی دنیا اُمنگوں سے لپٹ کر رہ گئی
کائناتِ رنگ و بو گویا سمٹ کر رہ گئی

ہمعناں رخشِ ہوا کا تھا غبارِ آرزو
یا اُڑی جاتی تھی شیشہ سے شرابِ مشکبو

ہو گئیں طے منزلیں ساری میانِ رہگذر
تلملا کر بجھ گئے جلوے بساطِ خاک پر،

تشنگی کی آنچ سے مرجھا گیا نخلِ حیات،
چھا گئی افلاس کی ٹھٹھرتی ہوئی تاریک رات

میّتِ دوشیزگی رکھی تھی بے گور و کفن
یعنی آغوشِ اجل میں تھی بگولوں کی دُلہن

بیانِ آرزو

پروفیسر شورؔ (علیگ)

گستاخیٔ بحضرتِ یزدانم آرزوست — یک سجدۂ خلوص بجانانم آرزوست
در بزمِ دوست ذوقِ غزلخوانم آرزوست — مضراب یک نظر بہ رگِ جانم آرزوست
تنہا بخاکِ دیر نیم دا مہا بدوش — ہم در حرم شکارِ عزا لانم آرزوست
رخنے بروں زحدِ گلستانم آرزوست — بر ہر قدم ہزار بیابانم آرزوست
یک گلستاں بہ ہمتِ پروازِ شوق نیست — پروازِ صد ہزار گلستانم آرزوست
بگزر زِ کہکشاں و مکن بر ستارہ ناز — دامے بآفتابِ درخشانم آرزوست
خوردم فریبِ ساحلِ و دیگر نمی خورم — آویزشِ سفینہ و طوفانم آرزوست
اے عشق طرحِ عالمِ نوعِ دگر بریز — نے گہرم آرزو نہ مسلمانم آرزوست
دیں است اگر ہمیں و گر ایں است بندگی — پروردگار توبہ ز ایمانم آرزوست
در محفلے کہ لاف زشعر و غزل زنند — گفتے سکوت و دیدۂ حیرانم آرزوست
اے عشق نالہ سر کن و اے دیدہ خوں ببار — یاراں شنیدہ و صحبتِ یارانم آرزوست

اے شورؔ دم زفتنۂ دیر و حرم مزن
انساں پرستم و غمِ انسانم آرزوست

شباب

(شفیقؔ شاہجہانپوری)

تقوے کی یہ فرسودہ کہانی اچھی — یا جام میں روحِ زندگانی اچھی
صد سالہ و خشک دورِ پیری سے شفیقؔ — اک ساعتِ پرکیف جوانی اچھی

لبریزِ سرور و کامرانی تو ہے — معمورِ شراب ارغوانی تو ہے
یہ رات جسے کہتے ہیں سب عہدِ شباب — تاریک سہی مگر سہانی تو ہے

تو سرِّ مشیت سے نہیں ہے آگاہ — ہم رازِ حقیقت ہے کہاں تیری نگاہ
تقوے کے پرستار خبر بھی ہے تجھے — ناکردہ گناہی ہے جوانی میں گناہ

پایانِ نشاط و کامرانی ہے شباب — تکمیلِ متاعِ زندگانی ہے شباب
اے شیخ کہن سال تجھے کیا معلوم — جنت کی حیاتِ جاودانی ہے شباب

گہوارۂ سرمستی و عشرت ہے شباب — اس عالمِ رنگ و بو کی جنت ہے شباب
مرجھائے ہوئے پھول نے غنچوں سے کہا — دو دن ہی سہی پھر بھی غنیمت ہے شباب

ہستی میں اک انقلاب ہو جائے گا — پامال ترا شباب ہو جائے گا
یہ موسمِ پرکیف یہ دورِ رنگیں — اک روز خیال و خواب ہو جائے گا

روش صدیقی:

بغل میں ایک شکستہ سا جام رکھتے ہیں
ہم اہتمام نشاطِ دوام رکھتے ہیں

جگہ ملی نہ زمانے میں سر چھپانے کی
مگر بتائیں کہاں ہم قیام رکھتے ہیں

پڑے غنی ہیں گدایانِ وعدۂ فردا
ہزار سلسلۂ صبح و شام رکھتے ہیں

قدم، قدم، پہ محبت کے خانماں برباد
بنائے قصرِ حیاتِ دوام رکھتے ہیں

بہ قیدِ بادہ و ساغر کسے نصیب ہوئی
وہ سرخوشی جو ترے تشنہ کام رکھتے ہیں

جلے تو بجھ نہ سکیں گے کہ تیرے پروانے
وہ سوزشِ غمِ ناتمام رکھتے ہیں

گزر کے اہلِ طلب سے ادھر بھی ایک نظر
ہم اہلِ ترک بھی کچھ تجھ سے کام رکھتے ہیں

روش! گلہ ہے فقیہانِ شہر کو ہم سے
ہم اہلِ درد یہاں کیوں قیام رکھتے ہیں

سیف حسن پوری:-

رنگِ امید نقشِ تمنا میں بھر گئی
اللہ! کیا غضب نگہِ ناز کر گئی

بے کیفیٔ حیات، اور اس پر غمِ حبیب
اُف! جانِ ناتواں پہ قیامت گزر گئی

یونہی سہی، ہوا تو مداوائے اضطراب
ہاں اے ہجومِ یاس! طبیعت ٹھہر گئی

یادش بخیر! کیا نگہِ التفات تھی
اک نامرادِ زیست کی دنیا بدل گئی

نوکِ مژہ پہ آ ہی گیا سیف رازِ دل
آج اُس کی یاد پردۂ غم خاک کر گئی!

نورجہاں نصرت:-

نہ رہا وہ زورِ طوفاں، نہ وہ تند و تیز دھارے
بڑھا جب مرا سفینہ، اُبھر آئے خود کنارے

میں جلا کے آشیاں کو سوئے دشت کیوں ہو لوں
کہ فلک سے ہو رہے ہیں یہی برق کے اشارے!

میں کشاکشِ غمِ دل سے نجات پاؤں کیونکر
کبھی تیری یاد رو کے کبھی زندگی پکارے!

ہے جنوں ہمارا رہبر ہمیں کیا ملالِ نصرت
جو چراغِ راہِ گل ہوا، جو مجھیں فلک کے تارے!!

اکرم دھولیوی:-

اب تری حسرتِ دیدار سے جی ڈرتا ہے
حیرتِ نقشِ در و دیوار سے جی ڈرتا ہے

شرکتِ انجمنِ ناز کی حسرت تھی کبھی
اب ترے سایۂ دیوار سے جی ڈرتا ہے

اُن کے آگے نہ کہیں چھیڑ دے رودادِ الم
بزمِ عشرت میں دلِ زار سے جی ڈرتا ہے

آتشِ گل نے جلائے ہیں نشیمن لاکھوں
کس قدر شعلۂ رخسار سے جی ڈرتا ہے

لگتی ہے خار کو دامن سے اُلجھتے کیا دیر
آرزوئے گل و گلزار سے جی ڈرتا ہے

دَور ایسا بھی گزرتا ہے کبھی وحشت میں
دشت تو دشت چمن زار سے جی ڈرتا ہے

شفقت کاظمی (بہ طرزِ حسرت):

ترے حضور میں کیوں بار پا نہیں سکتا
وہ بدنصیب جو تجھ کو بھلا نہیں سکتا

تری نگاہِ کرم کی امید کیوں رکھے
وہ دل کہ بارِ تغافل اُٹھا نہیں سکتا

ہوئے ہیں مر کے محبت میں زندۂ جاوید
زمانہ دل سے ہمیں اب بھلا نہیں سکتا

مطبوعات موصولہ

کتاب نورس

دکن کے عادل شاہی خاندان میں ابراہیم عادل شاہ ثانی بڑا جلیل القدر فرمانروا تھا اور علم و فضل کا بڑا قدر شناس۔ اس کا دربار ادیبوں اور شاعروں کا مرکز تھا، چنانچہ ظہوری اسی دربار کا ملک الشعراء تھا۔ خود ابراہیم عادل شاہ بڑا پڑھا لکھا شخص تھا اور علاوہ علوم متداولہ کے موسیقی سے بھی خاص لگاؤ رکھتا تھا اور اسی ذوق کا نتیجہ کتاب نورس تھی۔ اس کتاب میں اس نے موسیقی پر فنی بحث نہیں کی ہے بلکہ مختلف راگوں کو سامنے رکھ کر ۲۰ گیت اور دوہے اس وقت کی دکنی زبان تصنیف کئے ہیں۔

اسی کتاب کو ڈاکٹر نذیر احمد (لکھنؤ یونیورسٹی) نے ایڈٹ کرکے کتاب نورس کے نام سے شایع کیا ہے۔ اصلی تصنیف بہت مختصر ہے لیکن ڈاکٹر صاحب نے اپنی تحقیق و ریسرچ سے اسے ایک اچھی خاصی کتاب بنا دیا ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے مختلف کتب خانوں سے اس کے نسخے جمع کرکے اس کی صحت کی، اعراب لگائے اور ترجمہ کیا، اسی کے ساتھ انھوں نے ایک بسیط مقدمہ لکھکر اس عہد کی گویا مختصر سی ادبی تاریخ بھی مرتب کردی جو ابراہیم عادل شاہ کے ماحول اور خود اس کے علمی ذوق سے پیدا ہوئی تھی۔ مقدمہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اس کی ترتیب و تدوین میں کتنی محنت، کتنی کاوش اور کتنی ژرف نگاہی سے کام لیا ہے۔

یہ کتاب دو روپیہ آٹھ آنے میں مکتبۂ دانش محل لکھنؤ سے مل سکتی ہے۔

صحیفۂ ہمام بن منبہ

حیدرآباد میں عرصہ سے ایک ادارہ قایم ہے جو مسلمانوں کی قدیم مذہبی تصانیف کی اشاعت کرتا رہتا ہے۔ اس ادارہ کے روح رواں ڈاکٹر حمید اللہ ہیں جو اس وقت تک مختلف زبانوں میں متعدد کتابیں قدیم اسلامی تمدن پر تصنیف کرچکے ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی انھیں کی تدوین و ترتیب کا نتیجہ ہے۔

"ہمام بن منبہ"، مشہور جامع احادیث حضرت ابوہریرہ کے شاگرد تھے اور انھیں کے لئے ایک مجموعہ ۱۳۸ احادیث نبوی کا حضرت ابوہریرہ نے ۵۸ھ سے پہلے املا کرایا تھا، جو کمیاب تھا۔ ظاہر ہے کہ جو مجموعۂ احادیث ۵۸ھ سے پہلے مرتب ہوا ہوگا اور جسکے ترتیب دینے والے حضرت ابوہریرہ ہوں گے وہ بڑی مقدس چیز ہوگا، لیکن قبل اس کے کہ ان احادیث کو صحیح تسلیم کیا جائے، جامع احادیث کی حیثیت سے خود جناب ابوہریرہ کی اہمیت کا سوال سامنے آتا ہے۔

ابوہریرہ ۷ھ میں مدینہ آئے اور رسول اللہ کے صحابی ہونے کی حیثیت سے ان کے ساتھ رہنے لگے، اس لئے ظاہر ہے کہ ان کو رسول اللہ کے اقوال و افعال کا بہت زیادہ علم ہوگا، لیکن سوال یہ ہے کہ ۵۳۷۴ احادیث جو ان سے منسوب کی جاتی ہیں، ان میں واقعی کتنی ان کی روایت کی ہوئی ہیں اور کتنی الحاقی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ان کا حافظہ بہت قوی ہو، لیکن محض حافظہ کی قوت اس بات کی دلیل نہیں ہوسکتی کہ تمام احادیث جو ان سے منسوب کی جاتی ہیں واقعی انھیں کی بیان کی ہوئی ہیں۔ علاوہ اس کے یوں بھی ان کے مزاج میں ظرافت زیادہ تھی اور اسی بناء پر بعض نقاد ان احادیث نے ان کی روایات پر نقد و جرح کی ضرورت سمجھی اور ابوہریرہ کو اس کی تردید کرنا پڑی۔

بہرحال ابوہریرہ، جامع احادیث کی حیثیت سے اتنا بلند مرتبہ نہ رکھتے تھے کہ ان کی تمام احادیث کو بغیر نقد و جرح کے صحیح باور کیا جائے یا یہ کہ تمام ان احادیث کو جو ان سے منسوب کی جاتی ہیں واقعی انھیں کی روایت تسلیم کرلیا جائے۔ چنانچہ اس بات کا

ثبوت ہمیں "صحیفۂ ہمام بن منبہ" سے بھی ملتا ہے جس میں بعض احادیث ہم کو نہایت عجیب و غریب نظر آتی ہیں مثلاً :-

(۱) رسول اللہ نے فرمایا کہ جنت میں ایک درخت ہے اگر سوار اس کے سایہ میں سو برس تک چلتا رہے تو بھی اس کو ختم نہ کرے گا۔

(۲) قیامت اس وقت تک نہ آئے گی جب تک آفتاب اپنے مغرب سے نہ نکلے۔

(۳) خدا کا عرش پانی پر ہے اور اس کے دوسرے ہاتھ میں روک لینے کی قابلیت ہے وہی بلند کرتا ہے اور وہی پست کرتا ہے۔

(۴) اللہ نے آدم کو اپنی شکل پر بنایا، ان کی لمبائی ۶۰ ہاتھ تھی۔ اور ہر وہ شخص جو جنت میں داخل ہوگا اس کی لمبائی ۶۰ ہاتھ ہوگی۔

(۵) پہلی جماعت جو جنت میں داخل ہوگی ان کی صورتیں چودھویں رات کے چاند کے مانند ہوں گی، جنت میں وہ نہ تھوکیں گے، نہ ناک صاف کریں گے اور نہ بیت الخلا جائیں گے، ان کے برتن اور کنگھے سونے چاندی کے ہوں گے، ان کی انگیٹھیاں ایلوے کی ہوں گی اور ان کا چھڑکاؤ مشک کا ہوگا، ان میں سے ہر ایک کے دو بیویاں ہوں گی، جن کی پنڈلیوں کا گودا حسن کی وجہ سے گوشت کے اندر سے نظر آئے گا۔

(۶) خضر کا نام خضر (سبز) اس لئے رکھا گیا کہ ایک مرتبہ وہ ریت پر بیٹھے تو وہ سرسبز ہوگئی۔

اس قسم کی تمام احادیث جو تاریخ، مابعد الطبیعی عقاید یا پیش گوئیوں سے تعلق رکھتی ہیں اکثر و بیشتر موضوع ہیں اور اس وقت ضرورت ہے کہ درایتی نقطۂ نظر سے چھان بین کرکے اس طرح کی تمام احادیث کو ساقط الاعتبار قرار دیا جائے نہ کہ ان کی تصدیق

اس میں شک نہیں کہ صحیفۂ ہمام تاریخی حیثیت سے بڑی اہم چیز ہے، لیکن مذہبی حیثیت سے اس کی اہمیت بعض احادیث کی وجہ سے بہت کم ہو جاتی ہے۔ ضرورت تھی کہ کتاب کے مقدمہ میں اس خاص پہلو پر ناقدانہ بحث کی جاتی۔

اس کتاب کا اہم ترین حصہ ڈاکٹر صاحب موصوف کا مقدمہ ہے جس میں انھوں نے نہ صرف ایک محقق کی حیثیت سے صحیفۂ ہمام پر روشنی ڈالی ہے بلکہ یہ بھی نہایت وضاحت کے ساتھ ظاہر کیا ہے کہ ابتداء عہد اسلام ہی میں تحصیل علم و اصلاح تمدن کی طرف توجہ شروع ہوگئی تھی اور تدوین حدیث کی ابتدا عہد نبوی ہی میں ہوگئی تھی۔

یہ کتاب ہے میں الہندی بک ایجنسی نظام شاہی روڈ حیدر آباد سے مل سکتی ہے۔

دافع البہتان تصنیف ہے مولوی حسن علی سارنگ پوری استاد جامعۂ سیفیہ سورت کی جس میں انھوں نے ڈاکٹر زاہد علی کی کتاب "تاریخ فاطمیین مصر" پر تبصرہ کرکے ثابت کرنا چاہا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کتاب اغلاط و وسائس سے پُر ہے اور صریح تعصب کا نتیجہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب کی کتاب ہماری نظر سے نہیں گزری، لیکن اگر مصنف دافع البہتان کے اقتباسات صحیح ہیں اور صحیح نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ واقعی ڈاکٹر صاحب نے مورخانہ دیانت سے کام نہیں لیا اور واقعات کی تحقیق میں بھی پوری کاوش صرف نہیں کی ہے۔

تاریخ کی کتاب لکھنے میں، مذہب کا کوئی سوال سامنے نہ آنا چاہئے بلکہ صحت تاریخی کا لحاظ رکھنا چاہئے اور اگر ڈاکٹر صاحب نے اس کا لحاظ نہیں رکھا جیسا کہ کتاب زیر نظر کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے تو انھوں نے واقعی کوئی اچھی تاریخی خدمت انجام نہیں دی۔

یہ کتاب تقریباً ۸۰۰ صفحات کو محیط ہے، لیکن اس طوالت کا سبب غالباً یہ ہے کہ وہ قدیم مناظرانہ انداز میں لکھی گئی ہے، ورنہ تمام باتیں دو تین سو صفحات میں آسکتی تھیں — اس میں شک نہیں کہ مصنف نے اس کتاب کی تالیف میں بڑی محنت کی ہے اور اس کے مطالعہ سے بہت سے وہ پردے بھی اُٹھ جاتے ہیں جو فاطمیین مصر کی تاریخ پر پڑے ہوئے تھے۔

اس کی قیمت بہت کم صرف چار روپیہ رکھی گئی ہے اور داؤدی بوہرہ بک ڈپو ۱۷۶ مسجد بندر روڈ بمبئی سے مل سکتی ہے کاغذ بہت دبیز استعمال کیا گیا ہے اور کتابت و طباعت بہت واضح و روشن ہے۔

انگاروں کے گیت مجموعہ ہے جناب حسن شہیر کی نظموں کا جسے کتابستان الہ آباد نے شایع کیا ہے۔ شہیر صاحب ترقی پسند عوامی ادب کے خادموں میں سے ہیں اور وہ اپنے اصول پر خواہ شاعری سے متعلق ہوں یا موضوع شاعری سے، سختی سے قایم ہیں، یہاں تک کہ ہم اگر انھیں ULTRA-MODERN شاعر سمجھ کر اپنی قوت نقد و نظر کی نارسائی ظاہر کرنے پر مجبور ہوں، تو کوئی غلط بات نہ ہوگی۔ ایسے ترقی یافتہ شاعروں کے جذبات اور ان کی شاعری ٹکنک دونوں کی صحیح داد دینے کے لئے ضرورت ہے کہ ہم تمام پچھلے اقدار کو پس پشت ڈال دیں اور یہ کوئی آسان بات نہیں۔

حسن شہیر اس میں شک نہیں بہت ذہین انسان ہیں، اتنے ذہین کہ اگر وہ اپنے آپ پر قابو پانا سیکھ جائیں تو وہ شاعر سے بڑھکر لیڈر بھی ہو سکتے ہیں۔

اس مجموعہ میں ان کی اکثر نظمیں آزاد و معرا ہیں اور انداز بیان کی سبھا دینے والی ندرتوں سے معمور، اس لئے ضرورت ہے کہ ان کا مطالعہ کیا جائے اور یہ جان کر کہ اگر اسی شاعری کا چلن دنیا میں ہوتا ہے، تو کیوں نہ ابھی سے شہیر صاحب کے ہاتھ پر بیعت کر کے مستقبل کے خدشات سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیا جائے۔ قیمت ڈھائی روپیہ۔

حضرت عیسیٰ اور عیسائیت سری نگر میں ایک انجمن اشاعت اسلام قایم ہے جو مناظرانہ قسم کا لٹریچر اکثر شایع کرتی رہتی ہے۔ یہ کتاب اس ادارہ سے شایع ہوئی ہے جو ڈاکٹر عزیز احمد قریشی اور جناب عزیز کاشمیری کی متحدہ کاوش کا نتیجہ ہے۔

اس کتاب میں مسیح کی ولادت و وفات وغیرہ کے متعلق تمام مشہور روایات پر بڑی دلچسپ روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور پھر یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ کسی وقت کشمیر بنی اسرائیل کا مسکن تھا۔ حضرت عیسیٰ، فلسطین سے ہجرت کر کے یہیں آ گئے تھے۔ وہ ٹیکسلا بھی جاتے تھے جو اس وقت علوم و فنون کا مرکز تھا اور ہندوستان کے برہمنوں اور بودھ پجاریوں سے کسب فیض کرتے تھے۔ آپ کی والدہ حضرت مریم کی قبر مری میں اب تک موجود ہے اور انھیں کے نام پر اس پہاڑ کا نام کوہ مری مشہور ہوا۔ خود حضرت عیسیٰ کی وفات بھی سرینگر میں ہوئی اور ان کا روضہ اب تک موجود ہے۔

یہ اور اسی قسم کی دوسری دلچسپ معلومات اس کتاب میں جمع کر دی گئی ہیں۔ پھر یہی نہیں کہ جو کچھ لکھا گیا ہے وہ محض خواب و خیال کی باتیں نہیں بلکہ اس کا ثبوت بھی تاریخ لٹریچر سے پیش کیا گیا ہے۔ الغرض کتاب بہت دلچسپ ہے اور پڑھنے کے قابل۔ انجمن اشاعت اسلام، قلعہ ان پورہ سرینگر (کشمیر) سے دو روپیہ میں مل سکتی ہے۔

انتخاب کلام امیر مینائی عاشقانہ جناب خالد مینائی ام۔اے نے ۲۶ صفحات کے مختصر سے رسالہ میں امیر مینائی کے عاشقانہ کلام کا انتخاب شایع کیا ہے جو آٹھ آنے میں مکتبۂ اُلجیب اچھرہ لاہور سے مل سکتا ہے۔ نظر انتخاب ہر شخص کی جداجدا ہوتی ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ ہم کو بعض اشعار کے انتخاب پر اعتراض ہو، لیکن حیرت تو یہ ہے کہ اس مجموعہ میں ان اشعار کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا جو ضمناً عشق کے ذخیرہ میں درج ہیں، حالانکہ ان میں سے اکثر صحیح عاشقانہ رنگ کے ہیں۔ امید ہے آیندہ اشاعت میں اس فروگزاشت کی تلافی کر دی جائے گی۔

انتخاب کلام امیر مینائی نعتیہ یہ انتخاب بھی جناب خالد مینائی نے کیا ہے اور اپنے مفہوم کے لحاظ سے یقیناً نعت ہی سمجھا جائے گا۔ امیر مرحوم گو شاعر نعت تھے لیکن بربنائے جذبات انھوں نے دیار حبیب کا بھی ذکر کبھی کبھی کیا ہے گو اس میں وہ والہانہ کیفیت نہیں ہے جو شہیدی وغیرہ کے نعت میں پائی جاتی ہے۔ اگر اس سے قطع نظر صرف شاعری کو سامنے رکھا جائے تو بھی یہ انتخاب بہت ناقص و تشنہ ہے۔ اس کی قیمت بھی آٹھ آنے ہے۔

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، رنگینی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، ان اڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر طبع ہوئی ہے، قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ (علاوہ محصول)

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے اویان طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ، انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول)

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ جسن و عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس صدر نہ چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی، تازہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط، قیمت بارہ آنہ (علاوہ محصول)

مالہ وما علیہ

حضرت نیاز نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ فن شاعری کس قدر مشکل فن ہے اور اس میدان میں بڑے بڑے شاعروں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں، اور اس کا ثبوت اُنھوں نے دور حاضر کے بعض اکابر شعرا مثلاً جوش، جگر، سیماب وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھکر پیش کیا ہے۔ ملک کے نوجوان شاعروں کے لیے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے، قیمت دو روپیہ

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ صدیم المثال افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اس کی زبان، تخیل، اس کی نزاکت بیان، اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے، یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔ قیمت دو روپے، عار (علاوہ محصول)

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس رسالہ کو فروغ دیجئے اور اخیر تک پڑھ لیجئے، یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کاغذ و طباعت کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں اُنھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دُنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا، اسکے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے، قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ، فہرست مضامین یہ ہے، ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اُردو غزل گوئی پر عمدہ بحث ترقی، نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول لفظ، خون بادیہ و حقیقت نگاری، قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

قراست الید

اسکے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و نیکنامی پر پیشینگوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

REGD.N.A-966 رجسٹرڈ نمبر اے ۴۶۶

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۴۲ء

اموس نمبر، جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے، برسوں کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپے ۸/

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں، یاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کرکے بتایا ہے کہ وہ کیا تھے، کیا شاعری کی تھی، قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)

فروری۔ مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم و ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ ۸/ (علاوہ محصول)

جنوری۔ فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دو ذریں کو نہ بھول جائیے جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد دائم ہوئی تھی۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کیے گئے ہیں اس سال نامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اصول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیئے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

جنوری۔ فروری ۱۹۵۱ء

اس سالنامے کے دو حصے ہیں، پہلے حصے میں "ارض ہندی کی مشہور عالم کتاب ایک مستقل کی تلاش کا تجزیہ" اقتباس ہے۔ جس میں اس نے ایران، مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ان کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے صحیح راستہ کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ ایڈیٹر نگار کے قلم کا ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپے ۸/ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۲ء (حسرت نمبر)

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت پیش کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، قیمت دو روپے ۸/ (علاوہ محصول)

جنوری، فروری ۱۹۵۳ء

ادبی نمبر جس میں تاریخ کے سربفلک حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کیے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رامپور، حیدرآباد کے زمانہ کے علاوہ انکی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت دو روپے ۸/ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۴ء

(خواں دواں اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لیکر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شعبہ وار کرائن کے عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ دراصل تاریخی کتاب ہے جو ہر پڑھے لکھے کے پاس ہونا چاہیئے۔ قیمت چھ روپے ۸/ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۵ء

(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر) تتمہ۔ جس میں اسلامی علوم و فنون پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات و سکران کی علمی خدمات اور تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قیمت چھ روپیہ آٹھ آنہ ہے (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

سالانہ چندہ ہندوستان و پاکستان
آٹھ روپیہ چھ آنہ (مع سالنامہ)

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی دس آنہ ۱۰/

تصانیف نیاز فتح پوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد ضمائم غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات ایسے اضافہ کیے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہو۔
قیمت چار روپیہ للہ/ (علاوہ محصول)

جمالستان

ایڈیشن بنگالہ کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا' ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے' اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔
قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے صہر (علاوہ محصول)

من و یزداں

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

مولانا نیاز فتحپوری کی ۴۰ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے جس میں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی علمی اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند انشائیاں اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے
قیمت سات روپیہ آٹھ آنے مہر (علاوہ محصول)

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم بتائج کی روشنی میں (۸) یونس و یاجوج (۹) حسن یوسف کی وضاحت (۱۰) آثار قرون (۱۱) اسامی (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) تعدد ازواج (۱۶) عالم برزخ (۱۷) یاجوج ماجوج (۱۸) ہاروت ماروت (۱۹) حوض کوثر (۲۰) امام مہدی (۲۱) نور محمدی اور پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ ضخامت ۲۲۰ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت صہر

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا یہ نیا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشائیہ لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی افسانے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے' قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)

ترغیبات جنسی یا شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام قسموں اور غیر فطری قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی' نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو حیرت انگیز انکشافات نظر آئیں گے۔ نیا ایڈیشن۔ قیمت چار روپیہ للہ/

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گمشدہ فلاسفہ قدیم کی سوانح کے ساتھ (۲) مانی کا مذہب' نہایت مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۵۶ء کا سالنامہ

"خدا نمبر" ہوگا

جسے "مذاہب عالم نمبر" کہنا زیادہ موزوں ہوگا ۔ خالص تاریخی چیز ہوگا جس میں بتایا جائے گا کہ تمام اہم سابقہ میں اول اول مذہب کا خیال کس طرح پیدا ہوا، اگن کن صورتوں اور پیکروں میں خالق عالم یا مدبر عالم کی پرستش کی، نیز یہ کہ اس تصور ربوبیت و خلاقی میں جغرافیہ، ماحول اور سماج کے کیا اثرات تھے اور رفتہ رفتہ ذہنی ترقیوں کے ساتھ ساتھ خدا کا تصور کیونکر منزہ ہوتا گیا۔

یہ سالنامہ دراصل تمام مذاہب عالم کی مستند تاریخ ہوگا جس میں خالص تاریخی نقطۂ نظر سے تمام قوموں کی مذہبی زندگی، جملہ بانیان مذہب کی تعلیم و اصلاح، اور مقدس کتابوں کی ہدایات پر مورخانہ تبصرہ کیا جائے گا، اس میں کوئی مناظرہ کا پہلو نہ ہوگا اور نہ کسی مذہب کے خصوصی تصورات و شعائر، تعلیمات و ہدایت پر کوئی تنقید ہوگی ۔ متعدد نقوش و تصاویر بھی اس میں شامل ہوں گی تاکہ بعض عقائد کے سمجھنے میں سہولت ہو۔

اردو میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل پہلا مجموعہ ہوگا، جس میں پوری جامعیت و تحقیق کے ساتھ دنیا کے مذاہب کو پیش کیا جائے گا۔

منیجر نگار لکھنؤ

پاکستان کے خریدارانِ "نگار"

سالانہ چندہ (پونے ۷ روپے) ذریعہ منی آرڈر ذیل کے پتہ پر روانہ فرمائیں اور رسید ڈاک ہمارے پاس لکھنؤ بھیج دیں ۔ ہماری مطبوعات بھی اسی پتہ پر خط و کتابت کرنے سے مل سکتی ہیں :

ڈاکٹر ضیا عباس ہاشمی - ۱۰۵، سوبھ راج چیتول روڈ - ویسٹ گارڈن - کراچی

اگر ۱۵ تک کسی ماہ کا پرچہ آپ کو نہ ملے

تو اطلاع ملنے پر آئندہ ماہ کے پرچہ کے ساتھ ہم اپنے صرف سے فراہم کر دیں گے لیکن اگر آپ اس سے قبل جانچیں گے تو بیرنگ روانہ ہوگا (کیونکہ چھپنے کے اندازہ پیڈ بھیجنے میں ہم کو دگنا محصول ادا کرنا ہوگا) اس لئے جب آپ پرچہ نہ پہنچنے کی اطلاع دیں، تو یہ ضرور لکھ دیجئے کہ آپ فوراً چاہتے ہیں یا اگلے پرچہ کے ساتھ۔

منیجر نگار لکھنؤ

بعض کمیاب کتابیں

تذکرۂ شعراء اُردو مطبوعہ

تذکرۂ گلشنِ ہند - مرزا علی لطف ..... عہ
تذکرہ آبِ بقا - عبدالرؤف عشرت ..... للہ
تذکرہ بہارِ سخن - سندر لال - ہندو شعراء کا تذکرہ ..... ۱۵ عہ
تذکرہ آبِ حیات - محمد حسین آزاد ..... عہ
مخزنِ نکات - شیخ قیام الدین قایم ..... ۵ ر
چمنستان شعراء - رائے لچھمی نرائن تفکیک ..... عہ
جایزہ زبان اُردو - مرتبہ انجمن ترقی اُردو ..... ۵ ر
خطبات گارساں دتاسی - لکچر ہندوستانی زبان پر شائع کردہ انجمن ترقی اُردو ۵ عہ
تذکرہ ہندی - مصحفی ..... عہ
عقدِ ثریا ..... ۶ ر
نگارستانِ فارسی - محمد حسین آزاد ..... مہ
تذکرہ دستور الفصاحت - احمد علی خاں یکتا ..... ۵ ر
پنجاب میں اُردو مع مقدمہ - محمود شیرانی ..... عہ

ادب اُردو مطبوعہ

دیوان میر حسن - میر حسن حسن ..... ۴ ر
مخمنۂ عشق - امیر احمد امیر ..... ۷ ر
مراۃ الغیب ..... ۵ ر
دیوان ذوق - شیخ ابراہیم ..... ۴ ر
کلیات ناسخ - امام بخش ..... ۷ ر
گلکدہ - مرزا محمد ہادی عزیز ..... ۷ ر
دیوانِ تاج سخن - جلیل ..... ۷ ر
کلیات سودا - مرزا رفیع سودا ..... ۷ ر
مظہر معانی دیوان مجروح - میر مہدی حسین ..... ۴ ر
نظم دل افروز کلیات تسلیم - منشی امیر اللہ ..... للہ
آیات وجدانی - مرزا واجد حسین یگانہ ..... ۷ ر
مجموعہ قصاید عزیز - مرزا محمد ہادی عزیز ..... ۷ ر
گلزار تعشق - سید مرزا تعشق لکھنوی ..... ۶ ر

دیوان ثاقب - ذاکر حسین ثاقب ..... ۵ ر
کلیات مومن - مومن خاں دہلوی ..... مہ
کلیات میر - میر تقی میر ..... عہ
دیوان ولی مع دیباچہ حیدر ابراہیم ساسانی محمود ولی دکھنی ۵ ر
دیوان غالب - حسرت موہانی ..... ۷ ر
کلیات نظیر - نظیر اکبر آبادی ..... ۷ ر
کلیات نظیر اکبر آبادی - مرتبہ عبدالباری آسی ..... عہ

مرثیے اُردو مطبوعہ

مراثی میر انیس - جلد اول و دوم و سیوم و چہارم - میر انیس ..... مہ

متفرق اُردو مطبوعہ

دریائے لطافت - انشاء اللہ خاں ..... ۷ ر
موازنہ انیس و دبیر - شبلی نعمانی ..... ۵ ر
تذکرۂ آبِ بقا - عبدالرؤف عشرت ..... ۸ ر
فرہنگ آصفیہ ۲ حصے حروف الف تا س ..... مہ
چراغ سخن - مرزا واجد حسین یاس ..... ۴ ر
کلیات جان صاحب - میر یار علی جان ..... ۴ ر
کلیات سودا - مرزا رفیع سودا ..... ۷ ر
کلیات ظفر چہار دیوان - بہادر شاہ ظفر ..... ۱۵ عہ
نشتر - یاس عظیم آبادی ..... ۴ ر
دیوان قلق ..... ۵ ر
نقش چغتائی ..... ۵ عہ
کلیات تراب ..... ۵ عہ
تذکرہ کاملانِ رامپور ..... عہ
مشاہیر عالم طبقۂ حکماء ..... ۵ ر
الہارون - مصباح الدین ..... ۷ ر
قاموس المشاہیر حصۂ اول ..... عہ
نور جہاں بیگم - اشہری ..... مہ
ہندو ادیب - ناظر کاکوری ..... ۷ ر

ان کتابوں پر کمیشن نہیں دیا جائے گا - محصول ڈاک ذمہ خریدار ہوگا -

منیجر نگار - لکھنؤ

(اشتہار مہتمم نگار لکھنؤ کے ایما پر شائع کیا گیا)

"مشاعرۂ نگار" دسمبر میں شایع ہوگا

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں دی، پی ہوگا، جس میں

آپ کا چندہ نومبر میں ختم ہوگیا اور دسمبر کا "نگار" سالنامہ ۵۶ء کی قیمت (مع مصارف جبطری) بھی شامل ہو

نگار

اڈیٹر: نیاز فتحپوری

جلد ۶۸ | شمارہ ۵

فہرست مضامین نومبر ۵۵ء

ملاحظات ---------- ۳

مستشرقین اور فارسی کی تحصیل و تدریس --- ڈاکٹر محمد باقر -- ۵

واقعۂ کربلا ---------- ایک سنّی مسلمان ------ ۹

ایک نئی آواز ---------- پروفیسر ارشد کاکوی ------ ۲۵

غالب کی مثنوی نگاری ---------- ۲۸

گاہے گاہے باز خواں! ---------- ۳۴

ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک عقلی نقطۂ نظر سے ---------- ۳۷

معلومات واقتباسات ---------- ۴۳

منظومات: فضا ابن فیضی - عزیز - ساقی جاوید - کاوش - اکرم - سعادت نظیر - جوہر تونکی - انور معظم - ارشد کاکوی - شارق میرٹھی ۴۶

باب الاستفسار ---------- ۵۰

مطبوعات موصولہ ---------- ۵۱

ملاحظات

پاکستان کا مستقبل کیا ہے

یہ ایک سوال تھا جو مجھ سے میرے ایک ملنے والے نے کیا۔ یقیناً ہر سوال کا کوئی نہ کوئی جواب ہوتا ہے اور اس کا بھی ہونا چاہئے، لیکن دشواری یہ تھی کہ وہ اپنے سوال کا کوئی قطعی و یقینی اور اذعانی جواب چاہتے تھے اور پاکستان کے موجودہ حالات کے پیش نظر ایسا جواب دینا، میں کیا شاید خود اکابر پاکستان کے لئے بھی فی الحال ممکن نہیں ——— بعض حضرات اس بحث کے سلسلہ میں سب سے پہلے قیام پاکستان کے جواز و عدم جواز پر گفتگو شروع کر دیتے ہیں، لیکن مجھے یہ بات پسند نہیں آتی، کیونکہ ماضی کے ان قضایا پر بحث کرنا جن میں رد و بدل کا امکان نہیں ہے یکسر تضیع اوقات ہے۔ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا، پاکستان بن تھا بن گیا، اس کی تاریخ بننا شروع ہوگئی، اس کی وحدت مسلمہ کو دنیا نے تسلیم کر لیا اس لئے اس باب میں مناسب یا نامناسب کی بحث چھیڑنا بے کار ہے ——— اس وقت نہ صرف اس خیال سے کہ وہ ہمارا پڑوسی ہے، نہ محض اس حیثیت سے کہ وہ ایک بڑی اسلامی سلطنت ہے، بلکہ اس لحاظ سے بھی کہ وہ ایشیا کی حکومتوں میں ایک اہم حکومت ہے اور مشرق و مغرب کے بین الاقوامی تعلقات کو سدھارنے اور ایشیا کو یوروپ و امریکہ کی گرفت سے آزاد اور کھنچنے کے لئے بھی وہ بہت کچھ کر سکتا ہے، ہمارے لئے اگر دیرپا ہے تو کیا ہے کہ ہم اس کے مستقبل پر غور کریں ——— دنیائے سیاست میں ماضی کوئی چیز نہیں اصل چیز مستقبل ہی ہے۔ ہر دور اسی کے سنوارنے کے لئے تمام تر اہتمام اختیار کی جاتی ہیں، لیکن اس سے قبل ایک منزل اور آتی ہے، صحیح نصب العین کی تعیین کی اور اسی پر مستقبل کے بننے یا بگڑنے کا انحصار ہوتا ہے چنانچہ تاریخ بتاتی ہے کہ دنیا کی اکثر قومیں اسی لئے تباہ ہوئیں کہ انھوں نے یا تو محض ماضی کی روایات پر فخر کرنا کافی سمجھا یا کوئی بلند مطمح نظر قایم نہ کر کے صرف حال کی سبکباریوں پر قناعت کر لی۔ اس لئے ہم کو افسوس ہے کہ پاکستان نے انھیں دو فروگذاشتوں میں مبتلا ہو کر اپنے مستقبل کو تباہ کر دیا ——— یقیناً یہ ماضی کی روایات ہی پر فخر و اعتماد کا نتیجہ تھا کہ اس نے قرآن و سنت پر اپنے دستور کی بنیاد رکھی، اور یہ اس کی انتہائی سہل پسندی تھی کہ خود فراز جدوجہد سے گزرنے کی ہمت نہ کر کے غیروں کے دامن سے گل چینی کو کافی سمجھا ——— ہو سکتا ہے کہ بعض حضرات میرے اس قول کو کہ "دستور کی بنیاد قرآن و سنت پر رکھنا غلطی ہے"۔ میرے کفر و الحاد پر محمول کریں، لیکن اگر وہ انصاف سے کام لیں تو انھیں میرے اس قول سے اختلاف نہ ہونا چاہئے ——— "قرآن و سنت کی دو حیثیتیں ہیں ایک وہ جو اصلاح اخلاق و احساس مذہبیت سے تعلق رکھتی ہے اور دوسری

خالص تشریعی یا قانونی ہے، پھر غور کیجئے کہ ان میں مقدم حیثیت کس کو حاصل ہے۔ "دنیا میں کبھی ایسا نہیں ہوا کہ پہلے قانون بنا لیا جائے اور اصول اخلاق بعد میں متعین کئے جائیں اور ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ تمدنی و اجتماعی حالات کے لحاظ سے قانون میں تبدیلیاں کی گئیں ـــــ ہاں اگر پاکستان یہ کہنا کہ ہم اپنے اخلاق کی بنیاد قرآن و سنّت پر قائم کریں گے اور انھیں اصول پر کاربند ہو کر اپنا مستقبل متعین کریں گے تو بیشک یہ ٹھکانے کی بات ہوتی۔ تشریعی حیثیت سے قرآن و سنّت دونوں مختص المقام و مختص الزمان چیز ہیں اور ظاہر ہے کہ جو قانون کسی خاص وقت و مقام کو سامنے رکھ کر وضع کیا جائے وہ ہمیشہ ہر زمانہ میں کام نہیں دے سکتا، وہ کبھی دنیا کی رفتار کا ساتھ نہیں دے سکتا اور نہ اس عقیدہ کو سنّت و قرآن کا انکار قرار دیا جا سکتا ہے۔ ہاں اس کی اصولی تعلیم ضرور اپنی جگہ اٹل ہے، اور افسوس ہے کہ پاکستان نے اسی کو نظر انداز کر دیا ـــــ اسلام رہبانیّت و قیصریّت کا مذہب نہیں ہے، بلکہ کام کرنے والوں، آگے بڑھنے والوں اور مقاومت میں دوسروں سے بازی لے جانے والوں کا مذہب ہے اور اس جدوجہد میں کامیاب ہونے کا اصول بھی اس نے بتا دیا ہے: "اللہ یؤتی الحکمۃ من یشاء ومن یؤتی الحکمۃ فقد اوتی خیرا کثیرا"۔ پھر یہی وہ حکمت تھی جس سے کام لیکر مسلمان کسی وقت ساری دنیا پر چھا گئے تھے اور اسی حکمت کا فقدان ہے کہ آج پاکستان خود اوروں کو اپنے اوپر چھا جانے کی دعوت دے رہا ہے ـــــ "وشتان ما بین خلّ وخمر"۔

ایسا کیوں ہے، یہ سمجھنے کے لئے پاکستان کی سیاست خارجہ کے پس منظر پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ تقسیم ہند یقیناً باہمی نفرت و بے اعتمادی کی پیداوار ہے، یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ تقسیم کے بعد اس نفرت میں زیادہ شدت پیدا کرنے کی ذمہ دار ہندوستان کی وہ جماعتیں ہیں جو ہمیشہ سے مسلمانوں کو نفرت کی نگاہ سے دیکھ رہی تھیں، جن کا یہ جذبہ تقسیم ہند کے بعد کھلم کھلا ان کی زبان سے ظاہر ہونے لگا، اور نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان مشتعل ہو گیا اور اس کا جذبۂ انتقام ابھر آیا ـــــ حالانکہ اگر وہ دانشمندی سے کام لیتا تو اپنے اس جذبہ کو ظاہر ہونے ہی نہ دیتا اور گالیوں کا جواب مسکراہٹوں سے دیکر برا کہنے والوں کو خود ان کی نگاہ میں ذلیل کر دیتا، لیکن اس نے ایسا نہیں کیا، یہ حکمت اس کی سمجھ میں نہیں آئی اور اپنی کمزوری محسوس کر کے اس نے ہر اس ہاتھ کو پکڑ لیا جو سامنے آیا اور یہ نہ دیکھا کہ اس کی آستین میں کہیں دشنہ تو چھپا ہوا نہیں ہے ـــــ پاکستان نے عراق و ترکی کے ساتھ اپنی قسمت اس لئے وابستہ نہیں کی کہ جذبۂ ایمانی اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہا تھا، اپنے امریکہ کی مدد اس لئے قبول نہیں کی کہ واقعی وہ اپنی اصلاح و ترقی چاہتا ہے، بلکہ یہ سب کچھ اس نے اس لئے کیا کہ شاید وہ ہندوستان سے انتقام لیکر اپنے دل کو ٹھنڈا کر سکے

میں یہ نہیں کہتا کہ ہندوستان کی طرف سے جو شکایتیں پاکستان کو پیدا ہوئی ہیں وہ سراسر غلط ہیں، میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ اگر ہندوستان چاہتا تو پاکستان کی سیاست یہ غلط رُخ اختیار نہ کرتی، لیکن یہ بھی اپنی جگہ بالکل صحیح ہے کہ اگر پاکستان "فراست" سے کام لیتا تو وہ ہندوستان کے لئے اپنے آپ کو ناگزیر بنا سکتا تھا مگر یہ اتنی بلند سیاست ہے جس کا جاننے والا پاکستان و ہندوستان دونوں جگہ کوئی نہیں۔

اب پاکستان کے داخلی حالات کو دیکھئے تو وہ اس سے کہیں زیادہ خراب ہیں۔ وہاں کے ارباب حل و عقد کی خود غرضی، باہمی مخالفت اور سازشی ریشہ دوانیاں دیکھ کر بے اختیار داغ کا یہ شعر یاد آ جاتا ہے:۔

دیکھنا رشک اس کی محفل میں
ایک کو ایک کھائے جاتا ہے

اور اسی آپا دھاپی اور جماعتی اختلاف نے وہاں عام طور پر بے اعتمادی پیدا کر دی ہے جو ایک جہتی اور ملک کی ترقی کی دشمن ہے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ایک ملک کے مستقبل کے متعلق صرف ایک ہی حکم لگایا جا سکتا ہے اور وہ ایسا نہیں جس کے اظہار کی ضرورت ہو

ایں سخن را چہ جواب ست تو ہم میدانی

کابل اور پاکستان

پختونستان کے مسئلہ میں کابل کا اتنی دلچسپی لینا کہ وہ پاکستان سے سفارتی تعلقات منقطع کر لے، عجیب معمہ ہے، اس کا مطالبہ ہے کہ صوبۂ سرحد کا علاقہ جو پٹھانوں کا علاقہ ہے اسے مغربی پاکستان کی وحدت سے علیٰحدہ کر کے اس کی جداگانہ وحدت قایم کی جائے کیونکہ اس طرح وہ پنجاب کے زیر اثر آ جائے گا اور پٹھانوں کو ترقی کا موقع نہ مل سکے گا۔ قریب قریب یہی مطالبہ خان عبدالغفار خاں کا ہے اور زیادہ جمہوری طریقہ سے، یعنی وہ چاہتے ہیں کہ اس باب میں پختونستان کی رائے حاصل کر لی جائے۔ یہ بات اپنی جگہ کتنی ہی معقول ہو، لیکن سوال یہ ہے کہ حکومت افغانستان کو اس مطالبہ کا کیا حق پہونچتا ہے اور اس دخل در معقولات سے وہ کیا فایدہ اٹھانا چاہتا ہے۔

بہر حال اس میں شک نہیں کہ افغانستان کا یہ طرز عمل سخت قابل اعتراض ہے اور اگر یہ اپنے خالصتاً اسی کی ہے، تو احمقانہ بھی ہے۔

مُستشرقین اور فارسی کی تحصیل و تدریس

اُنیسویں صدی میں انگریز کا ہندوستان میں نیا نیا تعلق قایم ہوا تو یہ رابطہ قایم کرنے والی "تاجرانہ جماعت ایسٹ انڈیا کمپنی" نے معاشی اور معاشرتی دائروں میں اپنا اثر اور نفوذ بڑھانے کے لئے وسایل تلاش کرنا شروع کئے ۔ چنانچہ اس کمپنی نے ہندوستان لائے جانے والے ڈاکٹروں کو ہندوستانی پڑھانے کے لئے مشہور مستشرق ڈاکٹر جان گلکرسٹ کی نگرانی میں ۱۸۱۸ء میں لندن میں "سکول او اورینٹل لینگویجز" کے نام سے ایک درسگاہ قایم کی ۔ لیکن ہندوستانی کی تدریس کا یہ سلسلہ ۱۸۲۶ء میں ختم ہوگیا اس کے ساتھ ہی ۱۸۲۵ء میں چینی زبان کے مشہور عالم ڈاکٹر رابرٹ مارسین نے لندن کے C I T کے حصہ میں چینی، سنسکرت، اور بنگالی پڑھانے کے لئے ایک درسگاہ جاری کی ۔ لیکن نامساعد حالات کی وجہ سے یہ درسگاہ بھی ۱۸۲۸ء میں بند کردی گئی ۔ اسکے بعد مشرقی علوم کی تدریس کے لئے متعدد کوششیں اور تحریکات جاری کی گئیں ۔ جو مستشرق ان میں حصہ لیتے رہے ان میں سے چند ایک مشہور نام یہ ہیں :- ڈاکٹر جی ۔ ڈبلیو ۔ لائٹنر، کرنل ہنری یول ، پروفیسر میکس میولر، سر سی ۔ ایم ۔ والٹن ، ڈاکٹر سر جارج گریرسن اور ڈاکٹر اے ۔ سی ہیڈلیم ۔ تقریباً ایک سو سال کی تگ و دو کے بعد ان لوگوں کی تحریکات ۵ جون ۱۹۱۶ء کو برطانوی پارلیمنٹ اور لندن یونیورسٹی کے مراحل سے گزر کر اس طرح کامیاب ہوئیں کہ ۲۰ اکتوبر ۱۹۱۶ء کو ڈاکٹر سر ڈینیسن راس سابق پرنسپل مدرسۂ عالیہ کلکتہ کو لندن یونیورسٹی میں فارسی کا پروفیسر اور اس درسگاہ کا پہلا ڈائرکٹر مقرر کیا گیا جو آج "سکول او اورینٹل اینڈ افریکن سٹیڈیز" کے نام سے مشہور ہے اور مشرقی علوم کی تدریس کے لئے یورپ اور انگلستان کی سب سے بڑی اور شہرۂ آفاق درسگاہ سمجھی جاتی ہے ۔ ۲۳ فروری ۱۹۱۷ء میلادی کو رسمی طور پر شہنشاہ جارج پنجم نے اس درسگاہ کا افتتاح کیا اور اس کی سرپرستی قبول فرمائی، چنانچہ آج تک انگلستان کے شاہی حکمراں اس درسگاہ کے سرپرست چلے آتے ہیں ۔

یورپ اور انگلستان میں فارسی کی تدریس کے سلسلہ میں یہ انگلستان کی صرف ایک درسگاہ کا مختصر سا تذکرہ تھا ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ انگلستان کی بہ نسبت دوسرے یورپی ممالک نے فارسی سے پہلے رابطہ پیدا کیا ۔ ہندوستان پہونچنے کے لئے یورپ والوں نے جب راس امید کا راستہ دریافت کیا تو مشہور شہنشاہیت پسند پرتگالی البوکرک نے گوا کی طرف بڑھنے سے پہلے خلیج فارس کی بندرگاہوں پر قبضہ کیا ۔ اس قبضہ کی ابتدا ۱۵۰۸ء میلادی میں ہوئی اور خلیج فارس کی مشہور بندرگاہ ہرمز پر اس نے ۱۵۱۵ء میں زبردستی کرلی ۔ تاریخ بتاتی ہے کہ صفویوں کے خاندان کے بانی شاہ اسمٰعیل نے اس امر پر اظہار مسرت کا اظہار کیا کہ یورپی اقوام ایران کی طرف متوجہ ہیں ۔ ایران کی تجارتی منڈیوں میں پرتگالیوں کے روز افزوں اثر و نفوذ کو دیکھ کر انگریزوں نے بھی ایران کی طرف توجہ کی ۔ شاہ طہماسپ کے زمانہ میں جو پہلا انگریز ایرانی دربار میں باریاب ہوا اس کا نام رچرڈ چانسلر تھا ۔ ۱۵۶۱ء میں انطونی جینکنسن قزوین پہونچا جو اس وقت ایران کا دارالسلطنت تھا ۔ جینکنسن ملکہ الزبتھ کی طرف سے معرفی کے خطاے کر گیا تھا لیکن شاہ طہماسپ نے تجارتی امور کی بہ نسبت اس کے مذہبی عقاید میں زیادہ دلچسپی لی اور جینکنسن کو قزوین سے نامراد لوٹنا پڑا ۔ شاہ طہماسپ اور اس کے جانشین محمد خدابندہ کے دربار میں ملکہ الزبتھ نے جینکنسن کے بعد تین تجارتی مشن بھیجے اور اس کے بعد ایران میں انگریزوں کی ریشہ دوانیاں یوں کامیاب ہوئیں کہ ۱۶۲۲ء میلادی میں ایرانیوں اور انگریزوں کی متحدہ فوج نے ہرمز کی بندرگاہ سے پرتگالیوں کو نکال باہر کیا ۔ اس طرح سے ایران میں پرتگالیوں کی ایک سو سال سے زاید تجارتی حکومت کا عہد ختم ہوگیا اور انگریز رفتہ رفتہ ایران میں مقبول ہوتے چلے گئے

تاجروں اور سیاست داروں کی کامیابی کے بعد ایران پر عیسائی مبلغوں نے یورش کی - اور یہی وہ زمانہ ہے جب یورپی ضرورت مندوں نے فارسی زبان کا مطالعہ کیا - کیونکہ عیسائیت کی تبلیغ کے لئے ایرانی زبان کے علوم کی اشد ضرورت محسوس کی گئی - اس سلسلہ میں سب سے پہلے لائیڈن میں داستان مسیح اور داستان ساں پیدرو ۱۶۳۹ء میلادی میں فارسی زبان میں شایع کی گئیں - کتابوں کے ناشر نے کتابیں چھاپنے کے بعد سوچا کہ شاید نہ جاننے والے وہ یورپی مبلغین کتابیں نہ پڑھ سکیں جو ایران میں کام کر رہے ہیں - چنانچہ اس نے Rudimenta Linguae کے عنوان سے فارسی زبان کی ایک گرامر بھی مرتب کرائی۔ یورپ میں چھپی ہوئی فارسی آموزوں میں یہ سب سے پہلی کتاب ہے جو ۱۶۳۹ء میلادی میں شایع ہوئی - اس کے بعد لائیڈن میں ۱۶۴۲ء میں اس نوعیت کی ایک اور کتاب شایع ہوئی اور پھر ۱۶۵۱ء میں ایمسٹرڈم میں سعدی کی گلستان لاطینی ترجمہ کے ساتھ چھپی - اسی زمانہ میں آکسفورڈ کا ایک عربی کا عالم جان گریوز فارسی کی گرامر لکھنے میں مشغول تھا - چنانچہ اس نے یہ گرامر نو سال کی محنت کے بعد ۱۶۴۹ء میں لندن سے شایع کی اور اس سے اگلے سال الغ بیگ کی زیج شایع کی -

ہالینڈ اور انگلستان کے بعد اس کہانی کا رخ فرانس کی طرف مڑتا ہے اور ۱۶۷۲ء میں تیمور کی مشہور سوانح عمری یعنی ظفر نامہ شرف الدین یزدی کا فرانسوی ترجمہ پیرس سے شایع ہوتا ہے - اس سے اگلے سال ڈارپی نے لندن سے فرانسوی ترجمہ کا انگریزی ترجمہ شایع کیا -

ہندوستان پر نادر شاہ کے حملہ کے بعد معاصر یورپی علماء نے فارسی میں لکھی ہوئی تاریخ کی طرف توجہ منعطف کی - اس وقت فرانس، ہالینڈ، اسپین، پرتگال، اٹلی اور انگلستان سے بیشمار کتابیں شایع ہوئیں جن کا مواد فارسی میں لکھی ہوئی تاریخوں سے جمع کیا گیا - یا فارسی تواریخ سے ترجمہ کیا گیا - لیکن ان ادبی کاوشوں کا مقصد ایران کی تاریخ یا ادب کو زیر بحث لانا نہیں تھا - بلکہ مقصود ہندوستان کی تاریخ تھی - کیونکہ ہندوستان اور پاکستان کی تاریخ اس وقت فارسی زبان میں لکھی جا رہی تھی اور یہ تاریخ یورپی اقوام کی توجہ کا مرکز تھی چنانچہ ۱۷۶۳ء میں جب جیمز فریزر نے نادر شاہ کی تاریخ لکھی تو اس میں میرزا زماں دہلوی کے لکھے ہوئے فارسی نسخہ کا ترجمہ بھی شایع کیا مرزا زماں دہلوی نے نادر شاہ کے قیام ہندوستان کی تاریخ فارسی میں تدوین کی تھی - اصل فارسی نسخہ آج ناپید ہے اور فریزر کا انگریزی ترجمہ موجود ہے

اسی زمانہ سے مستشرقین کی فارسی سے گہری دلچسپی شروع ہوتی ہے اور یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ دراصل اس وقت کے ہندوستان اور اس وقت کے پاکستان کی ہی فارسی میں لکھی ہوئی وہ تاریخ تھی جس نے مستشرقین کو فارسی زبان، فارسی ادب اور فارسی گرامر سے عمیق شغف پیدا کرنے پر آمادہ کیا - کیونکہ یہی وہ وقت ہے جب انگریزوں اور فرانسیسیوں کا تسلط ہندوستان میں رفتہ رفتہ بڑھ رہا تھا اور یہاں کی سرکاری و درباری زبان فارسی کو دیکھ کر یہ لوگ اسے سیکھنے اور سمجھنے پر مجبور ہو رہے تھے - اٹھارویں صدی کے نیمۂ آخر میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے تجارتی کمپنی کی بجائے حکمران کا روپ دھار لیا اور وہ ہندوستان کے ان علاقوں پر قابض ہو گئی جہاں سیاستداروں کی بولی بھی فارسی تھی اور تاجروں کا حساب کتاب بھی فارسی میں محفوظ تھا - اس لئے یہ کچھ عجیب بات نہ تھی کہ حالات نے ایسے انگریز پیدا کئے جو فارسی سمجھنے اور سیکھنے پر مجبور ہوئے اور پھر انگریزوں نے ایسے خاور شناس پیدا کئے جو مستشرق کہلائے -

اس عہد سے آگے مستشرقین کا وہی گروہ زیادہ کامیاب رہا جس نے ہندوستان سے تعلق کی وجہ سے فارسی سے تعلق پیدا کیا ان میں سے سب سے پہلا نام سر ولیم جونز کا ہے جس نے ۱۷۷۰ء میں فارسی کی ایک گرامر شایع کی - جونز نے اپنی زندگی کے کوائف میں یہ بیان کیا ہے کہ فارسی سے اُن کی دلچسپی بڑھانے کا سہرا ہیرن ریوسکی کے سر ہے، اُس نے ہی آنا سے ۱۷۷۰ء میں حافظ کی سو غزلوں کا ترجمہ لاطینی میں شایع کیا - جونز کی گرامر کے متعدد اڈیشن شایع ہوئے اور اس حوصلہ افزائی کا یہ نتیجہ نکلا کہ اُس نے کلکتہ سے ۱۷۸۸ء میں مولانا باقفی کی لیلیٰ مجنوں شایع کی - ہندوستانی میں جونز کے داعیوں میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا گماشتہ دار سر چارلس ولکنس بھی شامل تھا

جو خود سنسکرت کا بہت بڑا عالم تھا اور جس نے رچرڈسن کو فارسی کی کتاب لغت لکھنے پر آمادہ کیا تھا۔ اس ڈکشنری کی پہلی جلد یعنی فارسی سے انگریزی ۱۸۰۸ء میں شایع ہوئی۔ اسی دور میں متعدد انگریزوں نے ہندوستان میں فارسی کی علمی ترویج و اشاعت کے لئے کام شروع کر دیا۔ فرانسس گیڈون ۱۸۰۱ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں فارسی کا پروفیسر مقرر ہوا۔ یہ وہی عالم مستشرق تھا جس نے ۱۷۸۳ء میں آئین اکبری کا انگریزی ترجمہ شایع کرنا شروع کیا تھا۔ اس نے سعدی کے پندنامہ اور عبدالکریم کشمیری کے بیان واقع کے ترجمے بھی شایع کئے۔ اس سے ذرا پہلے ڈاؤ نے تاریخ فرشتہ کا ایک ناقص انگریزی ترجمہ چھاپا۔ اگر تفصیل عرض کروں تو آپ شاید اُکتا جائیں گے اس لئے صرف یہی عرض کروں گا کہ اس حاصل خیز دور میں سکاٹ، وینسٹارٹ، کرے، وایٹ، سر ولیم اوسلی، سرجان ملکم، پرائس، شی، کرک پیٹرک، اسٹوارٹ، اور ہیلیفور نے نہایت اہم فارسی کتابوں کے انگریزی ترجمے شایع کئے۔

مستشرقین کی فارسی سے دلچسپی کا یہ عہد تقریباً تین چوتھائی صدی یعنی ۱۸۷۰ء میلادی تک پھیلا ہوا ہے اور اس کا ذکر کرنا اس لئے ضروری سمجھا گیا کیونکہ فارسی سے انگریزی مستشرقین کی دلچسپی کا راستہ اس وقت کے ہندوستان اور اس وقت کے پاکستان کی اُس تاریخ نے ہموار کیا جو صرف فارسی میں لکھی ہوئی تھی۔ اور یہ تاریخ صرف سیاسی تاریخ نہیں بلکہ وہ تاریخ ہے جس میں سیاسی، سماجی، مذہبی، معاشرتی اور ادبی تحریکات کی تاریخ محفوظ ہے۔ آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ شہنشاہیت پسند اور سلطنت بڑھانے والے انگریز کے لئے یہ لازمی تھا کہ وہ فارسی پڑھے اور اسے سیکھے تاکہ اس ملک کے باسیوں کے ماضی اور حال کو شناخت کر کے ملک گیری کی راہیں استوار کر سکے۔ لیکن اس سے لازمی نتیجہ یہ بھی نکلتا ہے کہ اس ملک کا ثقافتی اور فرہنگی ماضی اُن اوراق میں مدفون ہے جو فارسی میں لکھے گئے ہیں اور ماضی کے متعلق صداقت اور حقیقت تک رسائی حاصل کرنے کے لئے ان اوراق تک رسائی حاصل کرنا ضروری ہے۔

خیر یہ تو جملۂ معترضہ تھا۔ کہنا یہ ہے کہ سیاسی تاریخ کے مطالعہ کی ضرورت نے جب مستشرقین کو فارسی سیکھنے پر مجبور کیا تو زبان کی تحصیل کے بعد لازمی طور پر اس کے ادبی محاسن و معائب کی طرف بھی توجہ ہوئی اور خیام کے فلسفۂ خوش باشی سے مستشرقین کچھ اس طرح لذت اندوز ہوئے کہ ایڈورڈ فٹز جیرلڈ سے لے کر آج تک کئی انگریزوں نے اُس کی رُباعیات کا شاعرانہ اور لفظی ترجمہ پیش کیا۔ خیام کے بعد فارسی شاعروں میں سب سے حافظ نے مستشرقین کو اثر پذیر کیا۔ چنانچہ ہیں جرٹروڈ ٹیبل، والٹر لیف اور رچرڈ گارنیاں نے حافظ کے ترجمے پیش کئے اور حال ہی میں پروفیسر ڈاکٹر آربری نے حافظ کی پچاس غزلوں کا انگریزی ترجمہ پیش کیا ہے۔

ہندوستان میں اب فارسی کی سرکاری، درباری حیثیت ختم ہو چکی تھی اور اس کی مقبولیت اور عوام پسندی کی بھڑکتی ہوئی آگ پر لارڈ میکالے اس وقت تک وایٹ ہال کافی متعصبانہ سرد پانی گرا چکا تھا۔ لیکن بنگال میں کام کرنے والے انگریزوں نے تالیف و تصنیف کا جو سلسلہ شروع کیا تھا اور جس کے نتیجہ کے طور پر رایل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال اور مدرسۂ عالیہ کلکتہ قایم ہوئے تھے وہ بدستور جاری رہا اور رایل ایشیاٹک سوسائٹی کتاب پر کتاب شایع کرتی رہی۔ اس وقت تک ایسٹ انڈیا کمپنی کا وہ پریس بھی بند ہو گیا جو ٹائپ میں فارسی کی کتابیں چھاپتا تھا۔ لیکن اس کی جگہ کلکتہ کے مشن پریس نے لے لی اور اس نے فارسی کی متعدد کتابیں شایع کیں۔ اسی زمانہ (۱۸۶۵ء) میں فٹز گرالڈ نے فخرالدین گرگانی کی ویس و رامین اور جامی کی نفحات الانس (۱۸۵۹ء) چھاپی۔ سعدی کی بوستان ۱۸۵۹ء میں لندن سے شایع ہوئی۔ اور فالکنر نے جامی کی تحفۃ الاحرار کا ترجمہ شایع کیا۔ ڈنکن فوربز اور پلیٹ نے سر ولیم جونز کی پیروی کرتے ہوئے فارسی کے قواعد انگریزی میں مرتب کئے اور رچرڈسن، پامر اور ووسٹن نے اس کام کو اور آگے بڑھایا۔

اس دور کے مستشرقین اور اُن کے کارناموں کی تفصیل اس مختصر سے مقالہ کے احاطہ سے باہر ہے۔ اس لئے میں صرف یہ کہنے پر اکتفا کروں گا کہ فارسی پسندی کی روایت چلتے چلتے پھر عصر حاضر کے مشہور مستشرقین ڈاکٹر براؤن، نکلسن، اور میرے استاد گرامی سر ڈینیسن راس تک پہونچی۔ یہ لوگ فوت ہو چکے ہیں، لیکن ان کی تصنیفات اور روایات اب بھی پروفیسر لیوی، پروفیسر آربری، پروفیسر منارسکی اور ڈاکٹر لاکہارٹ کو فارسی کے متعلق تصنیف و تالیف کا کام جاری رکھنے کی ترغیب دلاتی رہتی ہیں۔

آپ کہیں گے کہ ان مستشرقین کو اس سرد دی اور جگر کاوی کا کیا صلہ ملا ؟ سو حضور عرض یہ ہے کہ سب سے پہلا صلہ تو یہ تھا کہ ان لوگوں نے مذہبی، تاجرانہ اور سیاسی مصالح کی توسیع کے لئے اسے استعمال کیا اور مادی اور روحانی طور پر اپنے ملک اور ملت کو فایدہ پہونچایا - پھر جب فارسی کی ادبی جانشنی اور فارسی تصانیف کی ادبی جانشنی اور فارسی تصانیف کی علمی اہمیت کا شعور اور احساس بڑھا تو اس سے مستشرقین نے اپنے ادب کو مالا مال کیا اور آج یہ حالت ہے کہ دُنیا میں کسی ملک کا باشندہ جو فارسی سے نابلد ہو فارسی کی علمی اور ادبی کتابوں تک اُن تراجم سے رسائی حاصل کرتا ہے جو ان مستشرقین کی علمی کاوش سے معرضِ ظہور میں آئیں، یہاں تک کہ اس ملک کے بہت سے باشندے جو فارسی سے نابلد ہیں اور انگریزی اور دوسری مغربی زبانیں جانتے ہیں وہ بھی ان علمی ذخائر سے انہی زبانوں کی وساطت سے استفادہ کرتے ہیں - اور انھیں حقایق پر غور کرتے ہوئے جب ہم اپنی ملت کی علمی زندگی کا جایزہ لیتے ہیں تو اس مقام پر پہونچ کر ہم اپنے آپ سے بھی ایک سوال کرتے ہیں کہ ہم فارسی کی تدریس و تحصیل کیوں کرتے رہے ہیں اور کیوں کریں؟ کیوں کرتے رہے ہیں ؟ کا جواب ہیں اشارۃً میں ابھی عرض کرچکا - ابھی سو سال بھی نہیں گزرا کہ فارسی اس علاقہ کی سرکاری اور درباری زبان تھی - اور اس کی مقبولیت اور رواج کا یہ عالم تھا کہ یہاں کے خارجی حکمراں یعنی انگریز بھی اسے سیکھنے پر مجبور ہوئے اور اس طرف انھیں اس قدر توجہ دینا پڑی کہ اُن کے عہد میں متحدہ ہندوستان میں رائج زبانوں میں سے فارسی کی جس قدر تصانیف اور تالیفات اور اُن کے تراجم شایع ہوئے وہ کسی دیسی زبان کے حصہ میں نہ آئے اور اسی ایک حقیقت سے یہ بھی واضح ہوجاتا ہے کہ اب ہمیں پاکستان میں فارسی کی تدریس و تحصیل کیوں جاری رکھنی چاہئے - وطن دوستی اور ملت پرستی کے جذبہ کو اُبھارنے اور اس عقیدہ کو راسخ کرنے میں سب سے قوی دلیل ملت کا ماضی ہوتا ہے - یہ ایک ایسا آیئنہ ہوتا ہے جسے دیکھ دیکھ کر ملت اپنی ماضی کی کوتاہیوں اور روایات کا جایزہ لیتی رہتی ہے اور اس سے حال اور استقبال کی تعمیر کرتی رہتی ہے - ملت میں یک جہتی کا احساس اور پیشرفت کا شعور پیدا کرنے کے لئے اُسے یہ بتانا ضروری ہے کہ ملت کی بنیادیں کس طرح قایم کی گئیں اور کن ادوار نکبت و فلاح سے گزر کر اُسے اس کا حال نصیب ہوا - یہ سب حقایق ملت کی تاریخ میں محفوظ ہوتے ہیں اور پاکستانی ملت کی بیشتر تاریخ گزشتہ پچاس سال کے سوا فارسی میں محفوظ ہے - بنگال سے لے کر پشاور تک اور لاہور سے لے کر کراچی تک ساری تاریخ فارسی میں اور صرف فارسی میں محفوظ ہے - اور آج اگر ہم اپنی ملت کے بھی خواہ ہیں اور اس میں یکجہتی کا احساس اور پیشرفت کا شعور پیدا کرنے کے متمنی ہیں تو ہمیں اس تاریخ کے اوراق کو کھنگالنا پڑے گا جیسا کہ میں شروع میں عرض کرچکا ہوں - یہ تاریخ صرف سیاسی نہیں یہ تاریخ سیاسی، مذہبی اور ثقافتی حقایق پر مشتمل ہے اس میں اُن واقعات کا ذکر ہے جن سے ہم ماضی کی لغزشوں کا جایزہ لے کر مستقبل میں اُن سے محفوظ رہ سکتے ہیں - اس میں وہ مذہبی علوم اور روایات جمع کی گئیں ہیں جو ہماری ملت کی بنیادوں کی ضامن ہیں - اور اس میں اُن تمام ثقافتی تجربوں کا مفصل ذکر ہے جو ہماری ملت وقتاً فوقتاً کر رہی ہے - میرا عقیدہ ہے کہ اگر ہم اپنی تاریخ کا تنقیحی مطالعہ نہ کرسکے تو ہمارے ہاں ملت دوستی اور وطن پرستی کا جذبہ اتنی شدت کبھی اختیار نہ کرسکے گا کہ ہم اپنے آپ کو مسلمان اور پاکستانی مسلمان سمجھ سکیں - اور احساس کے بغیر ہمارا مستقبل معلوم!

(ڈاکٹر) محمد باقر

توقیت

تاریخ اسلامی ہند کی ترتیب کے سلسلہ میں اڈیٹر نگار نے یہ توقیت مرتب کی تھی - جس میں ۷۱۵ھ سے ۹۳۲ھ تک کے تمام اہم تاریخی واقعات بقیہ سنہ عیسوی یکجا کردئے گئے ہیں - تاریخ کے طلبہ کے لئے بڑی کارآمد چیز ہے - قیمت ایک روپیہ -

منیجر نگار

واقعۂ کربلا

(منظر و پس منظر)

حال میں بعض مخلص احباب نے ماہنامہ "الفرقان" لکھنؤ (اگست و ستمبر ۱۹۹۴ء) کے دو نمبروں میں شایع ہونے والے ایک مضمون کی طرف توجہ دلائی۔ جس میں مضمون نگار نے واقعۂ کربلا پر بحث کی ہے۔ پہلے نمبر میں انھوں نے شروع سے آخر تک مختصراً واقعۂ شہادت کی تفصیلات دے کر اپنے زعم میں افراط و تفریط کی مذمت کی ہے اور دوسرے میں چند غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے اور بعض اعتراضوں کا جواب دینے کی کوشش کی ہے۔

مضمون بالا کو بالاستیعاب پڑھنے کے بعد میں اور میرے کئی ذی علم دوست اِس نتیجے پر پہونچے کہ مضمون نگار اول سے آخر تک حکومت بنی امیہ اور خصوصاً یزید کی پوزیشن صاف کرنے اور امام ہمام سیدنا حسین علیہ السلام کی مظلومانہ حیثیت اور اوالعزمانہ شہادت کا مرتبہ گھٹانے میں ساعی رہے ہیں اس لئے اگر اُن کے مضمون کو (APOLOGY FOR YAZID) (حمایت یزید) کے نام سے موسوم کیا جائے تو بیجا نہیں۔ مضمون کے پہلے نمبر کو پڑھ کر بعض صاحبوں نے اُن پر اعتراضات کئے تھے کہ حضرت حسینؓ کے اقدام کے لئے بغاوت کا لفظ کیوں استعمال کیا۔ نیز حضرت کا بیعتِ یزید کے لئے آمادہ ہو جانا۔ صحابۂ کرام کا یزید سے بیعت کر لینا اور یزید کا حادثۂ کربلا پر رنج کرنا کس بنا پر لکھ دیا۔ ان اعتراضات کے جو جوابات انھوں نے دئے ہیں اُن سے ہر شخص یہ فیصلہ کرنے پر مجبور ہوگا کہ وہ اموی سلطنت یا ملوکیت کے طرف داروں میں ہیں۔ جب سلطنت مذکور کے فنا ہونے کے صدیوں بعد لوگوں کی وفادارانہ روش کی یہ کیفیت ہے تو بہ آسانی قیاس کیا جا سکتا ہے کہ اموی دورِ استبداد میں جب بنی امیہ کی تلواروں کی جھنکار اور رشوتوں کی بھرمار کام کر رہی تھی مخلوق کا کیا حال ہوگا اصل واقعہ پر روشنی ڈالنے یا مضمون نگار کے مغالطوں کو صاف کرنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ چند امور بطور تمہید واضح کر دئے جائیں جس سے حادثۂ کربلا کا پس منظر سامنے آجائے۔ بنی ہاشم اور بنی امیہ کی پوزیشن۔ اہلبیت رسولؐ کا مقام۔ خلافت کی مذہبی حیثیت۔ یہ چند عنوانات ہیں جن کی وضاحت ہمارے موضوع کے لئے ضروری ہے۔

بنی ہاشم اور بنی امیہ کی پوزیشن قریش حجاز کا ایک سربرآوردہ خاندان تھا جو مدت سے کعبۂ مطہرہ کا متولی مانا جاتا تھا یہ خاندان کئی شاخوں میں بٹا ہوا تھا جن میں بنی ہاشم اور بنی امیہ خاص طور پر ممتاز تھے۔ ان دونوں میں قرابت کے باوجود قدیم رقابت اور منافست چلی آتی تھی یہاں تک کہ رسول مقبولؐ مبعوث ہوئے۔ آپ ہاشم کے پروتے تھے۔ اس لئے امیہ کی اولاد نے اپنی کج رائی سے آپ کی برتری کی مخالف شاخ کی برتری کا مترادف سمجھا۔ یہی وجہ تھی کہ ابوجہل کی موت کے بعد ابوسفیان[1] (جو اموی تھے) قریش کی سرداری کا عہدہ سنبھالا اور اسلام اور رسول اسلام کی شدید مخالفت کی اور اس وقت تک کرتے رہے جب تک کہ اسلام عرب میں پورے طور پر قوی نہ ہو گیا۔ آخر ۸ھ ہجری میں فتح مکہ کے موقع پر وفات نبوی سے صرف دو سال پہلے ابوسفیان اور ان کے بیٹے معاویہ داخلِ اسلام ہوئے اور مؤلفۃ قلوب میں شمار کئے گئے اِس لئے اگر کہا جائے کہ اُن کو اسلام کی اعلیٰ تعلیمات اور پیغمبر اسلام کی مقدس زندگی سے فایدہ اُٹھانے کا موقع کم ملا تو

---

[1] سیوطی — اکمال فی اسماء الرجال

غلط نہ ہوگا - کیرکٹر کے لحاظ سے عموماً بنی ہاشم راست گفتار ہی - پاک کردار ہی - شجاعت اور سخاوت میں، اور بنی امیہ مصلحت پسندی اور زمانہ سازی میں مشہور تھے - خود امیر معاویہ کا قول ہے کہ "جو شخص اموی ہوکر اپنے مال کا انتظام نہ کرسکے اور حلم سے کام نہ لے وہ اپنے خاندان سے الگ ہے۔ اسی طرح جو شخص ہاشمی ہوکر سخی و جواد نہ ہو وہ بھی اپنے خاندان سے الگ ہے۔ ہاشمی کی طلاقت، شجاعت اور سخاوت چھپ نہیں سکتی" (طبری)

سرور عالم کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیق خلیفہ منتخب ہوئے تو ابوسفیان، حضرت علی کے پاس گئے اور کہا: "خدا کی قسم اگر تم کہو تو میں تمہاری مدد کے لئے مدینہ کو سواروں اور پیادوں سے بھر دوں"۔ مگر حضرت علیؑ امت میں تفرقہ ڈالنے کے روادار نہ تھے - آپ نے نہایت سختی سے جواب دیا کہ: "تم جاہلیت میں ہمیشہ اسلام کے دشمن رہے - اب اسلام لانے پر بھی دشمنی سے باز نہیں آتے"۔ اُن کے بیٹے یزید بن ابی سفیان پہلی اور دوسری خلافت میں شام کے والی رہے - اور جب ان یزید کی وفات ہوئی تو ان کے بھائی معاویہ بن ابی سفیان کو یہ عہدہ ملا اور وہ پوری قوت کے ساتھ حضرت عثمان کے آخر عہد تک شام میں حکومت کرتے رہے -

اہلِ بیت رسولؐ کا مقام

آپ سب واقف ہیں کہ آنحضرتؐ کے اہل بیتؑ کو مسلمانوں کی نظر میں امتیازی درجہ حاصل ہے - خود قرآن مجید اُن کی طہارت کا شاہد عادل ہے - اس کے علاوہ بکثرت احادیث صحیحہ اہل بیت اور آل محمدؐ کی فضیلت اور منقبت سے لبریز ہیں - مثالاً چند احادیث ملاحظہ ہوں:-

رسول مقبولؐ کا ارشاد ہے: "میں نے تجھ سے جو کچھ کہا وہ تجھیں رزق دیتا ہے اور تجھے خدا کی وجہ سے اور میرے اہل بیت کو میری وجہ سے دوست رکھو - میں اپنے اہلبیت کے بارے میں تمہیں خدا کا واسطہ دیتا ہوں - (مسلم) - میں تم میں اپنے اہلبیت چھوڑے جا رہا ہوں - یہ قرآن سے جدا نہ ہوں گے، یہاں تک کہ حوض پر مجھ سے ملیں گے - اب تم خود غور کرو کہ تم میرے بعد ان کی کس طرح پاسداری کرتے ہو - (ترمذی) — میرے اہل بیت کی مثال کشتی نوح کی سی ہے - کہ جو اس کشتی میں سوار ہوا اُس نے نجات پائی اور جس نے اُسے چھوڑا وہ ڈوبا - (بزار) — قیامت میں میرے سبب و نسب کے سوا ہر سبب و نسب قطع ہوجائے گا - (معجم کبیر و اوسط) — یہ ایک مختصر نمونہ تھا اُن احادیث کا جن میں حضورؐ نے اِن نفوس قدسیہ کی محبت اور نصرت کی تاکید فرمائی ہے - اہل بیت و آل نبی میں جو شخصیتیں حضرات بھی شامل ہوں (مثلاً بنات طیبات - ازواج مطہرات - اولاد و اقربائے رسولؐ) تاہم اس سے کوئی انکار نہیں کرسکتا کہ اُن میں چار افراد ذرۃ التاج اور گلِ سرسید کی حیثیت رکھتے ہیں - یعنی جناب فاطمہؑ - حضرت علیؑ اور حضرات حسنینؑ - رسولؐ کے نزدیک ان حضرات کی مجموعہ بیت اور تقرب اور امت کی نظر میں ان کی عظمت اور وقعت آفتاب سے زیادہ روشن ہے -

پہلا نام حضور پرنور کی سب سے پیاری بیٹی خاتونِ جنت سیدۃ نساء العالمین فاطمہ زہرا (علیٰ ابیہا و علیہا السلام) کا ہے - جن کو حضور نے بضعۃ منی (میری پارۂ جگر) کے لقب سے یاد کیا ہے - آپ کے شرف کے لئے یہ کہنا کافی ہے کہ گو اسلام میں سیکڑوں فرقے ہوگئے جن میں ہر ایک دوسرے کے پیشواؤں کو بُرے الفاظ سے یاد کرتا ہے لیکن جناب سیدہؑ کی بارگاہِ جلال کے سامنے ہر فرقہ سر ارادت خم کرنا اپنا فخر سمجھتا ہے - دوسرے بزرگ حضرت علیؑ ابن عم و داماد رسول میں جن کا حضور سے تقرب - اور جن کی سبقت اسلام علم - شجاعت - سخاوت اور تقویٰ تاریخ کی لوح پر زریں حروف میں ثبت ہیں - وقت نہیں کہ آپ کے فضایل کا بیان کیا جائے اور نہ یہ اس مقالہ کا موضوع ہے حضرت امام احمد بن حنبل کا قول یاد رکھئے کہ اصحاب رسول میں سے کسی کے حق میں اتنے فضایل وارد نہیں جتنے علیؑ کے حق میں وارد ہیں - (حاکم)

لہ الاستیعاب

ان کے بعد حضرت فاطمہ کے صاحبزادوں یعنی حسنینؑ کا مرتبہ ہے جن کو حضور نے اپنے ریحان اور جوانانِ جنت کا سردار کہا ہے۔ حضرت عمر بن ابی سلمہ سے روایت ہے کہ جب آیۂ تطہیر نازل ہوئی تو حضور نے فاطمہؑ - علیؑ - حسنؑ اور حسینؑ کو اپنی چادر میں لپیٹا اور کہا کہ اے اللہ یہ میرے اہل بیت ہیں - غرض جن حضرات کی فضیلت احادیث پر نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ کس کس طرح رسول پاک نے بار بار صحابہ کے مجمع میں ان حضرات کے فضایل دینی جتائے - ان کو اپنا مقرب و محبوب بتایا - اور مسلمانوں کو ان کی محبت و نصرت کی تاکید فرمائی - کہیں ارشاد ہوتا ہے کہ یہ میرے ہیں میں ان کا ہوں - کہیں فرمایا جاتا ہے کہ میں اس سے لڑوں گا جس سے یہ لڑیں گے اور اس سے صلح کروں گا جس سے یہ صلح کریں گے - (ترمذی) ۔۔۔ آپ نے خیال فرمایا کہ رسول پاک کو اس امر میں اتنا اہتمام کیوں تھا - یہ صحیح ہے کہ آپ بشر تھے - اور بشریت کی بنا پر اپنی اولاد سے محبت رکھنا امر مستحسن ہے - لیکن اس پر بس نہیں - آپ کی حدیث ناطق ہے کہ خدا یا میں حسنؑ و حسینؑ کو محبوب رکھتا ہوں - اس لئے تو بھی انہیں محبوب رکھ اور ان کے محبوب رکھنے والے کو بھی محبوب رکھ (مسلم) - یہ صاف ظاہر کر رہا ہے کہ اس محبت کو دینی حیثیت حاصل ہے - ہر قوم و ملک کا دستور ہے کہ لوگ اپنے سردار - استاد یا پیر کے واسطے سے اس کی اولاد کا احترام بھی ملحوظ رکھتے ہیں اور پھر جب وہ اولاد علم و عمل - دین و تقویٰ - اخلاق حمیدہ اور اوصاف پسندیدہ کے لحاظ سے بھی ممتاز ہو تو یہ احترام اور بھی زیادہ ضروری ہو جاتا ہے - ان حضرات کے حق میں رسول کی محبوبیت اور اضافی نسبت ہی کیا کم وجہ شرف تھی کہ ان کے ذاتی فضایل اور بلند مناقب نے ان کو اور بھی واجب الاحترام قرار دے دیا - اس کے علاوہ ان ارشادات کی ایک اور وجہ بھی سمجھ میں آتی ہے - وہ یہ کہ حضور کو بہ تعلیم الٰہی معلوم تھا کہ ان نفوس قدسی کو کن کن مصائب کا سامنا ہوگا - اس لئے ان کے مراتب کی تاکید کرنا اور امت کو ان کی نصرت کی ہدایت فرمانا اور ان کی مخالفت کے گناہ سے باز رکھنا ہادیٔ اسلام کی شفقت کا عین تقاضا تھا -

خلافت کی مذہبی حیثیت

حضرات اہل سنت کے یہاں خلافت اصول دین میں تو نہیں لیکن فروع دین میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے - شرح عقاید نسفی میں جو صدیوں سے درسیات میں داخل رہی اور علم کلام میں مستند مانی گئی ہے موجود ہے کہ امت پر نصب امام واجب ہے - یعنی ایسا شخص مقرر کرنا جو ولایت مطلقہ کا حامل رکھتا ہو (اسلام حریت - عقل - بلوغ اور عدالت) - اور تنفیذ احکام اور اقامت حدود وغیرہ کر سکے ضروری ہے - چنانچہ اسی بنا پر وفات نبوی کے فوراً بعد ہی صحابۂ کرام نے امام یا خلیفہ کا تقرر ضروری سمجھا اور تمام اہل حل و عقد نے بالاجماع حضرت ابوبکر صدیق کو خلیفہ منتخب کیا - حضرت صدیق نے انتقال کے قریب حضرت عمر فاروق کو نامزد کیا - اور چونکہ مسلمانوں نے اس نامزدگی کو تسلیم کر لیا اس لئے اس کو بھی اجماعی ماننا چاہئے - حضرت عمر نے اپنے بعد چھ صحابہ میں شوریٰ کے ذریعہ سے امر خلافت کو دائر کیا اور بالآخر ان میں سے حضرت عثمان غنی چنے گئے جن کو اجماع امت نے تسلیم کر لیا - جب حضرت عثمان شہید ہو گئے تو اہل حل و عقد کے اتفاق سے جناب علی مرتضیٰ مسند نشین خلافت ہوئے - حضرت علی کی وفات کے وقت آپ سے پوچھا گیا کہ کیا آپ کے بعد سید احسنؑ کو خلیفہ بنایا جائے - آپ نے ارشاد کیا "نہ میں حکم دیتا ہوں نہ منع کرتا ہوں" جس سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ایک طرف قانون وراثت کو اسلامی خلافت میں رائج کرنا نہیں چاہتے تھے - اور دوسری طرف کسی مستحق کی حق تلفی بھی پسند نہ تھی - غرض جن لوگوں نے حضرت علی کو خلیفہ مانا تھا انھوں نے ہی آپ کے بعد حضرت امام حسن کو اس منصب کا اہل سمجھا -

---

لہ شرح عقاید کے حاشیے پر منہاج کی عبارت یوں ہے کہ ایسا شخص جماعۂ مسلمین کی ہیبت سے امام ہوا ہو اور مسلمانوں پر عدالت و شفقت سے حکومت کرے، اور جو ایسا نہ کرے وہ خلیفۂ برحق نہیں ہے - اس کی اطاعت واجب نہیں - بلکہ اس کے خلاف خروج لازم ہے - ۱۲ واضح رہے کہ اہل حل و عقد سے خواص مہاجرین و انصار مراد ہیں - امت یا صحابہ کا ہر فرد ان میں داخل نہیں -

یہ دَور اہلِ سنت کے نزدیک خلافتِ راشدہ کہلاتا ہے جس میں خلافت علیٰ منہاج النبوۃ پائی جاتی ہے۔ یہ زمانہ تیس سال[1] میں ختم ہوجاتا ہے جیسا کہ حدیث میں فرمایا گیا ہے کہ خلافت میرے بعد تیس سال تک رہے گی۔ اس کے بعد ملک عضوض یعنی کاٹ کھانے والی بادشاہی ہوجائے گی۔ ابوداؤد و ترمذی میں یہ روایت تھوڑے فرق سے موجود ہے۔ بعض جگہ اتنا اضافہ ہے کہ ایک شخص نے راوی حدیث حضرت سفینہ سے پوچھا کہ بنی امیہ بھی تو اپنے آپ کو خلیفہ کہتے ہیں۔ انھوں نے جواب دیا کہ یہ بنو زرقا جھوٹے ہیں۔ یہ تو شرِ ملوک ہیں۔ اسی قسم کی روایت حضرت حسن بصری سے بھی منقول ہے۔

غرض خلیفہ کے نصب اور تقرر کے بعد اُس کی اطاعت امت پر واجب ہے۔ لیکن یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں۔ اگر کوئی خلیفہ کی بیعت ہی نہ کرے یا کرکے توڑ دے تو کہاں تک جائز ہے۔

جہاں تک پہلے سوال کا تعلق ہے بیعت نہ کرنے والا صرور گنہ گار ہوگا۔ لیکن اگر ارباب حل و عقد میں سے کچھ لوگ کسی جایز وجہ سے بیعت سے انکار کریں تو مضایقہ نہیں ہے۔ بلکہ ارباب حل و عقد پر شرعاً لازم ہے کہ اگر قدرت ہو تو ایسے شخص کی بیعت سے اجتناب کریں جس سے مصالح امت کے ضایع ہونے کا ظن غالب ہو۔

رہا دوسرا سوال سو اس کے متعلق امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ خلیفہ فسق و فجور سے معزول ہوجاتا ہے۔ اس کی اصل یہ ہے کہ فاسق اُن کے نزدیک ولایت کا اہل نہیں۔ کیونکہ وہ جب اپنے ساتھ اضافہ نہیں کرسکتا تو دوسروں کے ساتھ کیا کرے گا۔ اس کے برخلاف امام ابوحنیفہ فاسق کو اہل قرار دیتے ہیں۔ (شرح عقایدِ نسفی) لیکن ہمیں معلوم ہے کہ جب بعض اکابر سادات نے مروانی و عباسی بادشاہوں کے خلاف خروج کیا تو امام ابوحنیفہ نے ان سادات کی اخلاقی و مالی مدد میں ہر طرح حصّہ لیا۔ شریعت مطہرہ کی اسپرٹ پر غور کرنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اگر کوئی متغلب خلافت اسلامیہ پر قابض ہوجائے تو امر معروف میں اُس کی اطاعت کی جائے۔ لیکن اگر وہ مصالح امت کو ضائع کرتا ہو تو اس کے خلاف خروج کرنا جایز بلکہ واجب ہوجاتا ہے بشرطیکہ قدرت ہو اور عام خونریزی کا اندیشہ نہ ہو۔[2] اس تمہید کے بعد جو ضرورۃً قدرے طویل ہوگئی ہم واقعۂ کربلا کو لیتے ہیں۔ لیکن مسئلہ پر صحیح رائے قایم کرنے کے واسطے سابقہ خلافتوں کے اُن واقعات کا مختصر جایزہ ناگزیر ہے جو بالواسطہ یا بلاواسطہ واقعۂ مذکورہ پر اثر انداز ہوئے۔

تاریخ شاہد ہے کہ جب حضرت عثمان بلوائیوں کی بغاوت اور مروان کی شرارت سے شہید ہوگئے تو حضرت علی کا انتخاب عمل میں آیا۔

ابھی آپ نے زمام خلافت پورے طور پر سنبھالی نہ تھی کہ ام المومنین حضرت عائشہ مع حضرت طلحہ و حضرت زبیر کے ایک بڑی جماعت لے کر آپ کے مقابل صف آرا ہوئیں۔ اور حضرت عثمان کے قاتلوں سے قصاص لینے کا مطالبہ کیا۔ کیونکہ حضرت عثمان کے مخالفین کا ایک گروہ لشکر مرتضوی میں موجود تھا۔ چنانچہ جنگ جمل وقوع میں آئی۔ جس میں طرفین کے کافی آدمی شہید ہوئے۔ اور بالآخر ام المومنین کے لشکر کو شکست ہوئی۔ یہ ہنگامہ ابھی ختم ہی ہوا تھا کہ والیٔ شام امیر معاویہ نے علم بغاوت بلند کیا۔ ہوا یہ کہ حضرت علیؓ نے خلافت کی ذمہ داری قبول کرتے ہی معاویہ کو جن کا طریق کار پسندیدہ نہ تھا معزولی کا حکم بھیجا۔ وہ بھلا کیونکر گوارا کرتے کہ شام سے جہاں وہ کامل اقتدار حاصل کرچکے تھے بہ آسانی دست بردار ہوجائیں۔ چنانچہ انھوں نے جواب دیا کہ مجھے آپ کی خلافت ہی تسلیم نہیں۔ میں معزولی کا حکم کیوں مانوں۔ غرض حضرت علیؓ کی تمام کوششِ اصلاح کے باوجود معاملہ

---

[1] زمانہ خلافت کی توقیت اس طرح ہے:- حضرت ابوبکرؓ ۲ سال۔ حضرت عمرؓ ۱۰ سال۔ حضرت عثمانؓ ۱۲ سال۔ حضرت علیؓ ۴½ سال۔ حضرت حسنؓ ۷ ماہ۔

[2] شرح مواقف میں ہے "للہ در خلع الامام وعزلہ بسبب یوجب مفسدۃ یوجب اختلال احوال المسلمین واختلاس امور الدین" ساتھ ہی یہ شرط بھی ہے کہ "ان ادنی لمفسدۃ احتمل ادنی المضرتین"۔

روبراہ نہ ہوا۔ امیر معاویہ کی واحد QUALIFICATION حضرت علی کے مقابلہ میں یہ تھی کہ وہ خلیفۂ مقتول کے قرابت دار تھے چنانچہ انھوں نے اسی کو آڑ بنایا قدیم عصبیت کو زندہ کیا اور مسلمانوں میں یہ پروپاگنڈا کیا کہ قتل حضرت عثمان میں حضرت علی کا ہاتھ تھا نتیجہ یہ ہوا کہ صفین کی خونریز جنگ واقع ہوئی۔ جس میں مسلمانوں کی قوت باہمی نزاع میں ضایع ہوئی اور شیر خدا کی شمشیر صاعقہ بار جس نے ہمیشہ رسول کے سامنے سے کفر کے بادل چھائے تھے مجبوراً کلمہ گویوں کے خلاف اٹھی۔ نہروآزمائی کے میدان میں حیدر کرار کے سامنے مخالفوں کا ٹھہرنا کچھ آسان نہ تھا۔ آخر یہ مشکل عمر ابن العاص کی تدبیر نے جو امیر معاویہ کے دست راست تھے حل کردی انھوں نے کئی ہزار قرآن نیزوں پر بلند کرائے اور پناہ مانگی۔ حضرت علی اس چال کو سمجھتے تھے۔ اس لئے آپ نے جنگ کو جاری رکھا۔ لیکن آپ کے لشکر میں پھوٹ پڑ گئی اور دشمن کا مقصد حاصل ہوگیا۔ مجبوراً حضرت علی کو ہاتھ روکنا اور معاملہ کو فیصلہ ثالثی پر محول کرنا پڑا۔ مگر افسوس کہ فیصلہ ثالثی (تحکیم) کے موقع پر بھی عمر ابن العاص کی تدبیر کارگر ہوگئی اور فیصلہ حضرت علی کے خلاف ہوا۔ آپ نے اس ناجایز فیصلے کو تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ آدھے بلاد اسلام میں آپ کی حکومت رہی اور آدھے پر معاویہ کا قبضہ ہوگیا۔ لیکن معاویہ کی حوصلہ مند طبیعت اس پر بھی قانع نہ تھی اور اُن کے جنرل حضرت علی کے علاقہ پر تاخت کرتے رہتے اور عورتوں اور بچوں کے قتل میں بھی باک نہ کرتے۔ اس کو مسلمانوں کی بدبختی کہئے کہ تحکیم نے ایک نئے فتنے کو جنم دیا جو مدت تک امت اسلامیہ میں خونریزی کا باعث ہوا۔ یعنی فرقۂ خوارج کا ظہور ہوا۔ یہ ایک جوشیلا مذہبی فرقہ تھا جو اس بنا پر حضرت علی اور امیر معاویہ دونوں کی تکفیر کرتا تھا کہ وہ انسانی فیصلہ پر کیوں آمادہ ہوئے۔ خوارج میں بڑے بڑے عبادت گزار اور پرہیزگار لوگ تھے جو اپنی کج اندیشی سے خلیفۂ برحق (علیؑ) کے مخالف ہوگئے۔ حضرت علی نے دو چھلوں میں اہل شام اور خوارج کی ذہنیت کو نہایت خوبی سے بیان فرمادیا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: شامیوں نے باطل کو ڈھونڈا اور اس کو پالیا اور خوارج نے حق کو ڈھونڈا مگر نہ پاسکے۔ بالآخر آپ کو خوارج کے خلاف تلوار اٹھانی پڑی۔ اور ان لوگوں کو ہزیمت کا سامنا ہوا۔ کچھ عرصہ کے بعد آپ نماز کی حالت میں ایک اشقی الامۃ خارجی ابن ملجم کے ہاتھ سے شہید ہوگئے اور امیر معاویہ کے لئے میدان صاف ہوگیا۔ اوپر عرض کیا گیا کہ حضرت علیؑ کی شہادت کے بعد امام حسنؑ کو انتخاب بہ حیثیت خلیفہ عمل میں آیا تھا۔ لیکن امیر معاویہ ایک کثیر جمعیت کو لے کر آپ کے مقابل صف آرا ہوگئے۔ حضرت امام حسنؑ نے جو اپنے نانا سیدؐ کی پیشگوئی کے مصداق ہونے والے تھے، خلافت سے دست برداری منظور کی اور امیر معاویہ سے صلح کرلی۔ جس کی وجہ آپ کی خونریزی سے کراہت۔ اور آپ کے ساتھیوں کی پھوٹ تھی۔ اگرچہ شروع میں آپ کے بھائی امام حسینؑ نے اس سے اختلاف کیا۔ اور بعض رفقا نے سخت مخالفت کی۔ لیکن آپ نے سب کو خاموش کردیا۔ شرائط صلح حسب ذیل تھیں:۔

(۱) امام حسنؑ کے قرضے ادا کردئے جائیں اور حضرات حسنینؑ اور بنی ہاشم کو وظایف دئے جائیں۔

(۲) اہل مدینہ و عراق وغیرہ سے جو اصحاب بنی ہاشم میں کوئی موافذہ نہ کیا جائے۔

(۳) حضرت علیؑ پر سب وشتم موقوف کی جائے۔

لہ حضرت علیؑ نے کیا خوب فرمایا ہے "انزلنی الدہر حتی یقال معاویہ وعلی علی ومعاویہ"۔ ۲ حالانکہ حضرت علی وہ تھے جن کے حق میں فرمایا گیا تھا "اللھم ادر الحق معہ حیث دار" (حدیث)۔ ۳ حضرت علیؑ کا قول یاد رکھنے کے قابل ہے "لولا الدین لکنت اوہی الناس" یعنی اگر دین کا احترام نہ ہوتا تو میں سب سے زیادہ ہوشیار شخص ہوتا۔ نیز آپ نے فرمایا کہ مجھے بھی وہ طریقے آتے ہیں جن سے لوگوں کی سرکشی توڑی جاسکتی ہے۔ مگر میں اپنے نفس کو فاسد کرکے ان کی اصلاح نہیں چاہتا۔ ۴ اسد الغابہ میں ہے کہ بسر بن ارطاۃ نے جو امیر معاویہ کا جنرل تھا یمن پر حملہ کیا اور حضرت علی کے والی عبید اللہ بن عباس پر چڑھائی کی۔ وہ بھاگ گئے۔ بسر نے ان کے کم عمر لڑکوں کو ان کے سامنے ذبح کردیا۔ مسلمان خواتین کو لونڈی بنایا۔ آخر حضرت علی کی جدوجہد سے یہ گل جھاگیا۔ وہ بسر والی مثلاً سہو میں جذب اور زیادہ کچھ بے باکی و سفاکی میں کم نہ تھے۔ ۵ طبری

(۴) امیر معاویہ اپنے بعد کسی کو ولی عہد نہ کریں بلکہ معاویہ کے بعد خلافت امام حسنؓ کو واپس آئے۔

امیر معاویہ نے بلا تامل تمام شرائط کو منظور کر لیا اور امام حسنؓ کوفہ سے مدینہ تشریف لے گئے۔ لیکن افسوس کہ عہد نامے کی سیاہی ابھی خشک بھی نہ ہوئی تھی کہ امیر معاویہ کی طرف سے شرائط کی صاف اور علانیہ خلاف ورزی شروع ہو گئی۔ تاریخ گواہ ہے کہ پہلی شرط کے علاوہ تمام شرطیں ایک ایک کر کے توڑ دی گئیں بلکہ پہلی شرط کے ایفاء میں بھی اکثر ڈھیل ہونے لگی۔ باقی شرطوں کا بھی حال سن لیجئے کہ معاویہ اور ان کے عمال نے ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر ہواخواہان و طرفداران علی کو جنھوں نے حکومت کے خلاف کوئی عملی اقدام نہیں کیا تھا، ستانا، ذلیل کرنا، قید میں ڈالنا اور قتل کرنا شروع کیا۔ صحابی رسول حجر بن عدی اور ان کے رفقاء کو جن میں اکثر بڑے عابد و زاہد تھے دمشق میں پابہ زنجیر طلب کر کے معاویہ کا قتل کر دینا ایسا دردانگیز اور ناروا فعل تھا جس پر حضرت عائشہ اور حضرت عبداللہ بن عمر نے سخت بیزاری فرمائی۔ (ابن اثیر) ۔ تیسری شرط یہ تھی کہ حضرت علی پر سب و شتم نہ کی جائے۔ اس پر جیسا عمل ہوا وہ اس سے ظاہر ہے کہ اُس وقت سے تا انقراض سلطنت اموی (امام صالح حضرت عمر بن عبدالعزیز نجیب بنی امیہ کی خلافت کے دو سال چھوڑ کر) نوے برس تک منبروں پر مساجد میں حضرت علی پر تبرا ہوتا رہا۔ اکثر ایسا ہوا ہے کہ حضرت امام حسن مسجد نبوی میں موجود ہیں اور والی مدینہ مروان (شیطان بنی امیہ) ان کے روبرو حمد خدا اور نعت رسول کے بعد علی اور اولاد علی کو گالیاں دے رہا ہے۔ ایسا نہ تھا کہ عمال اپنے طور پر یہ حرکات کرتے ہوں اور خلیفۂ وقت کو خبر نہ ہوتی ہو۔ صحیح مسلم میں صاف موجود ہے کہ معاویہ نے خود حضرت سعد بن ابی وقاص کو یہ کہکر کہ الا تسب ابا التراب سب علی کا حکم دیا۔ مگر انھوں نے حضرت علیؓ کے فضایل بیان کر کے اس "خدمت" سے انکار کر دیا۔

اب رہی چوتھی شرط۔ اس کے بارے میں مورخین کا بیان ہے کہ حضرت امام حسن کی وفات زہر سے امیر معاویہ کی حیات ہی میں واقع ہوئی جو ان کی بدبخت زوجہ جعدہ نے دیا تھا۔ اکثر مورخین اس میں یزید بن معاویہ کا ہاتھ بتاتے ہیں۔ لیکن چند (مثلاً ابن عبدالبر۔ ابوالفداء اور مسعودی) اس طرف گئے ہیں کہ یہ معاویہ کے اشارہ سے ہوا۔ بہرحال

قاتل اگر رقیب ہے تو تم گواہ ہو

حضرت امام حسن کے بعد معاویہ کے دل کو اطمینان ہوا اور وہ بلا شرکت غیرے تمام امت کے سردار بن گئے۔ اہل سنت کے نزدیک ان کی حیثیت حضرت علی کی حیات میں ایک باغی کی تھی۔ جیسا کہ ایک صحیح حدیث میں حضور نے حضرت عمار بن یاسر (رفیق حضرت علی) کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا تھا (افسوس عمار کو ایک گروہ باغی قتل کرے گا کہ یہ اُس کو جنت کی طرف بلائیں گے اور وہ ان کو دوزخ کی طرف۔ بخاری)۔ یہی حیثیت امام حسنؓ کے زمانۂ خلافت میں رہی۔ چنانچہ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تحفہ میں لکھتے ہیں کہ جب تک امام حسن نے مصالحت نہ کر لی معاویہ باغی کی حیثیت رکھتے تھے۔ بہرحال اب وہ ایک متغلب خلیفہ یا امیر تھے۔ ان کا زمانۂ ولایت ۲۲ اور زمانۂ سلطنت ۲۰ سال کے قریب ہوا۔ وہ ایک مشہور مدبر تھے اور ان کا حلم اور زیرکی زبان زد خاص و عام تھی۔ اور یہ عجیب سوء اتفاق تھا کہ اُس زمانہ کے عرب کے سب نامور دماغ ان کے مشیر کار تھے۔ یعنی عمرو بن العاص۔ مغیرہ بن شعبہ اور زیاد بن ابیہ۔ ان میں پہلے دو صاحبوں کا شمار صحابۂ رسولؐ میں ہے۔ اول الذکر فاتح مصر اور ثانی الذکر والی کوفہ تھے۔ یہ دونوں اپنے عہد کے مشاہیر میں تھے اور ایک زمانہ میں نمایاں اسلامی خدمات انجام دے چکے تھے۔ مگر افسوس کہ اُن کا طریق کار اس موقع پر نہایت نازیبا تھا۔ حسن بصری کا قول ہے کہ امت کے کام کو دو شخصوں نے

طبری ۔ تاریخ الخلفاء سیوطی ۔ دیکھو کتب تواریخ ۔ حدیث میں ہے کہ اُس شخص کی نماز قبول نہیں ہوتی جو کسی قوم کا لیڈر بنے اور وہ لوگ اُس کو پسند نہ کرتے ہوں ۔ تاریخ الخلفاء

بگاڑا۔ عمرو بن العاص نے نیزوں پر قرآن بلند کرا کے اور تحکیم میں چال کر کے۔ اور مغیرہ بن شعبہ نے معاویہ کو یزید کی ولی عہدی کا مشورہ دے کر۔ یہ دونوں صحابی ہیں۔ اور خود امیر معاویہ بھی صحبت و قرابت نبوی سے مشرف ہیں۔ اس لئے ان کے بارے میں احتیاط لازم ہے۔ تاہم اس قدر کہنا پڑتا ہے کہ ان کا R O L E اچھا نہیں رہا۔ اگر اجازت ہو تو ان کے حق میں بھی حضرت حسن بصری کا ریمارک نقل کر دیا جائے۔ وہ فرماتے ہیں[1]:۔ معاویہ کی چار خصلتیں ایسی ہیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی ہوتی تو مہلک تھی۔ اس[2] امت پر جاہلوں کو مسلط کر دینا۔ پھر اپنے شراب خوار بیٹے کو اپنے بعد خلیفہ مقرر کرنا۔ پھر[3] زیاد سے رشتہ جوڑ لینا۔ اور حجر بن عدی کو قتل کرنا (طبری) یہ بھی ان کا قول ہے کہ اگر یہ لوگ نہ ہوتے تو قیامت تک اسلام میں جمہوریت رہتی (ابن ولی) کبھی کبھی خیال ہوتا تھا کہ امیر معاویہ کی شان میں متعدد حدیثیں آئی ہیں۔ ایسے فضایل سے متصف ہوتے ہوئے ان کا یہ طرز عمل کہاں تک مطابق ہے۔ لیکن امام نسائی کا بیان پڑھ کر یہ شبہ دور ہو گیا۔ وہ صاف صاف لکھتے ہیں: "ما اعرف لہٗ فضیلۃ" میں معاویہ کی کسی فضیلت سے واقف نہیں۔ دوسری جگہ ہے: "ما ثبت فی فضل معاویۃ شیء" ان کے حق میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے۔

اب رہا زیاد بن ابیہ۔ یہ عرب کے چار زبردست افراد میں شمار ہوتا ہے۔ یہ شخص نہایت مدبر۔ مقرر۔ سفاک اور متکبر تھا۔ زیاد اصل میں ابوسفیان کا ناجایز بیٹا تھا جو عبید ثقفی کی کنیز سمیہ کے بطن سے تھا۔ اس لئے حدیث نبوی کی تعمیل میں لوگ اسکو ابوسفیان کی طرف منسوب کرنے میں تامل کرتے اور زیاد بن عبید یا زیاد بن ابیہ کہتے تھے۔ یہ پہلے حضرت علیؓ کی طرف سے والی تھا۔ امیر معاویہ نے اس کو ملانا چاہا۔ مگر اس نے سختی سے ان کی پیشکش کو ٹھکرا دیا۔ آخر حضرت علی کی شہادت کے بعد وہ ان سے مل گیا اور انھوں نے اس کے صلہ میں اس کو اپنے خاندان میں شامل کر کے برخلاف حکم شریعت زیاد بن ابی سفیان کہکر خطاب کرنا شروع کیا پھر تو اس نے عام مسلمانوں اور خصوصاً محبان علی پر وہ ظلم ڈھائے کہ خدا کی پناہ۔ اس کا بیٹا بدبخت عبیداللہ بن زیاد گورنر کوفہ ہے جو قتل حسین کا باعث ہوا۔ اوپر بیان ہوا کہ معاویہ کے دل میں جو خلش تھی وہ امام حسن کی وفات سے جاتی رہی۔ مگر وہ اس پر بھی قناعت کرنے والے نہ تھے اور چاہتے تھے کہ رسول کی نیابت کا منصب جس پر میں قابض ہوں میرے گھر سے باہر نہ جانے پائے۔ اتفاق سے اس کے لئے جلد موقع نکل آیا۔ وہ یوں کہ امیر معاویہ نے کسی وجہ سے مغیرہ بن شعبہ والیٔ کوفہ کو معزول کر کے اپنے حضور میں طلب کیا۔ وہ دیر میں حاضر ہوئے۔ اور جب وجہ پوچھی تو بتایا کہ میں آپ کے فرزند یزید کی ولی عہدی کا بندوبست کر رہا تھا۔ انھوں نے جواب دیا کہ اگر ایسا ہے تو اپنے عہدے پر واپس جاؤ اور ضرور بندوبست کرو۔ اس کے بعد امیر معاویہ ہر وقت یزید کے لئے خلافت کی تدبیروں میں مشغول رہنے لگے۔ سب سے پہلے شام کے بااثر لوگوں کو دولت۔ منصب یا تشدد کے ذریعہ سے ہموار کیا۔ اور پھر ارض حجاز کی طرف متوجہ ہوئے۔ اب چند جملے یزید کے متعلق بھی ملاحظہ ہوں۔ یہ ایک لاابالی اور آزاد مشرب جوان تھا اور ماں باپ کے لاڈ پیار اور حکومت کے ناز و نعم میں ایسا شخص جس قدر بگڑ سکتا ہے بگڑ چکا تھا۔ حضرت عبداللہ بن حنظلہ کہتے ہیں کہ یزید کی حرکات سے ہمیں خوف تھا کہ مبادا ہم پر آسمان سے پتھر برسیں تب ہم نے اس کے خلاف خروج کیا۔ غضب خدا کا یہ شخص محرمات ابدیہ پر تصرف کرتا ہے۔ شراب پیتا اور نماز کو ترک کرتا ہے۔ بعض صحابیوں نے کہا کہ یہ لوگ (بنی امیہ) کتوں کو کھلاتے اور انسانوں کو بھوکا رکھتے ہیں۔ غرض یہ لایق بیٹا تھا جس کی خلافت کا ڈول ڈالنے کے لئے باپ حجاز جاتے ہیں۔ تاہم ان کو ڈر تھا کہ یہ بیل آسانی سے منڈھے چڑھنے والی نہیں ہے۔ کیونکہ مدینۂ منورہ میں کئی ممتاز افراد ایسے تھے جو خود صحابی اور صحابی زادے تھے اور علم و تقویٰ

---

[1] طبری و ابن اثیر۔ [2] الولد للفراش وللعاہر الحجر (حدیث) یعنی اولاد صاحب فراش کی ہوتی ہے اور بدکاری کے لئے سنگساری ہے۔ [3] طبری چنانچہ طبری میں ہے کہ ان کے حکم سے ابن اثال نے عبدالرحمن بن خالد بن ولید کو شہد میں زہر دیا تھا۔ [4] تاریخ الخلفاء

کے لحاظ سے امت میں خاص احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ ان میں سے افضل حضرت حسینؓ بن علی مرتضیٰ تھے۔ دوسرے حضرت عبیداللہ بن عمر فاروق۔ تیسرے عبدالرحمٰن بن ابی بکر صدیق۔ چوتھے حضرت عبداللہ بن زبیر حواری رسول۔ پانچویں حضرت عبداللہ بن عباس۔ امیر معاویہ ان حضرات سے فرداً فرداً ملے اور اپنا ما فی الضمیر کہا۔ ہر ایک نے ان کی تجویز سے اختلاف کیا۔ کسی نے کہا کہ یزید کو کیا حق پہونچتا ہے جب کہ اس سے بہتر افراد موجود ہیں۔ کسی نے ٹوکا کہ باپ کے بعد بیٹے کا تقرر قیصر و کسریٰ کی سنت ہے۔ کسی نے بتایا کہ آپ شیخین کے طریق پر عمل کیجئے۔ کسی نے رائے دی کہ آپ پہلے دست بردار ہو جائیے پھر یزید کی جانشینی کا نام لیجئے اگرچہ[1] انھوں نے اس موقع پر رشوت اور نیز تشدد سے کام لیا۔ مگر مطلب حسب دلخواہ حاصل نہ ہوا۔ لیکن عامۃ الناس نے دب کر یزید کی ولی عہدی پر بیعت کر لی اور وہ شام کو واپس گئے۔

اس واقعے کے تین سال بعد امیر معاویہ کو وہ سفر درپیش ہوا جس سے بڑے سے بڑے مدبر کو بھی مفر نہیں۔ انتقال سے[2] پہلے انھوں نے یزید کو وصیت کی (یا کہلا بھیجی) کہ میں نے تیری راہ کے تمام کانٹے صاف کر دئے ہیں۔ اب صرف دو شخصوں سے خطرہ ہے۔ حسینؓ بن علی اور عبداللہ بن زبیر۔ میرا خیال ہے کہ حسینؓ اہل عراق کے اکسانے سے ضرور تیرے خلاف اقدام کریں گے۔ اگر تجھے ان پر قابو حاصل ہو تو حسن سلوک کرنا کیونکہ ہماری ان سے قرابت ہے۔ رہے ابن زبیر۔ سو وہ ایسا شخص ہے کہ شیر کی طرح حملہ کرے اور لومڑی کی طرح دھوکا دے۔ اس پر اگر تیری دسترس ہو تو ٹکڑے اڑا دینا۔ یزید نے تخت سلطنت پر بیٹھتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ اپنے والی مدینہ ولید بن عتبہ کے نام تاکیدی حکم بھیجا کہ ان صاحبوں سے میری بیعت لو اور اگر تامل کریں تو اُن پر سختی کرو۔ سچ پوچھئے تو یہ معاملہ حسینؓ کے لئے حق و باطل کا سوال تھا۔

حسینؓ جگر گوشۂ رسولؐ و فرزند علیؓ و بتولؓ تھے۔ انھوں نے مقدس نانا اور محترم باپ کے آغوش عاطفت میں تعلیم و تربیت پائی تھی۔ قرب رسول کے علاوہ بھی ان کے فضل و کمال کی دُنیا معترف تھی۔ وہ شروع سے امیر معاویہ اور بنی امیہ کی روش کا مطالعہ کرتے رہے تھے۔ معاویہ کا جو ناروا سلوک ان کے پدر بزرگوار اور برادر گرامی کے ساتھ رہا ان کو بخوبی معلوم تھا۔ اموی پارٹی کی نظر میں شعائر دین اور احکام شریعت کی جس قدر وقعت تھی وہ اُس سے بھی واقف تھے۔ یہ وہ دور تھا کہ سنتیں مردہ اور بدعتیں زندہ ہو رہی تھیں۔ بیت المال خلیفہ کی ملک تھا اور خفیف سے شبہ پر لوگوں کے جان و مال تلف ہو رہے تھے۔ حریر۔ سونا۔ درندوں کی کھال اور جن چیزوں کو شریعت نے منع کیا ہے در بار میں زینت کے طور پر استعمال ہوتی تھیں۔ یزید نے تو سرے سے پردہ ہی اُٹھا دیا تھا اور وہ علانیہ شراب پیتا اور طنبور بجاتا تھا۔ غرض ایسے "خمیر اور سکیر" خلیفہ کی خلافت امت مسلمہ اور فرزند رسول کے سر منڈھی جا رہی تھی۔

اگر امام حسینؓ اس موقع پر یا اس سے پہلے اپنی خلافت کا دعویٰ کرتے تو وہ یقیناً اس کے اہل تھے اور جس طرح چالیس ہزار کی جمعیت اُن کے برادر بزرگوار کو میسر ہو گئی تھی ان کو بھی ہو سکتی تھی۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ انھوں نے اپنی طرف سے اب تک کوئی ایسا اقدام پسند نہیں کیا جس سے مسلمانوں میں تفرقہ پڑے۔ لیکن اب سوال ان کی بیعت کا تھا۔ دوسرے الفاظ میں یزید چاہتا تھا کہ رسول خدا کا گھرانا بھی میرے افعال پر مہر توثیق ثبت کر کے میری سیادت تسلیم کرے۔ حسینؓ اگر ایسا کر لیتے تو یہ ایک طرح کی مذہبی خودکشی ہوتی۔ وہ جانتے تھے کہ میری بیعت کے کیا معنی ہیں۔ ان کو معلوم تھا کہ حدیث کی رو سے سب سے بڑا جہاد وہ کلمۂ حق ہے

---

[1] ایک دوست نے خوب لطیفہ کہا کہ اگر معاویہ یزید کے کرتوتوں سے واقف تھے تو اُس کی ولی عہدی پر زور دینا رسولؐ پاک کے مشن کو کمزور کرنا تھا۔ اور اگر ناواقف تھے تو اور تعجب ہے کہ خلیفہ کو اپنے گھر کی خبر نہیں۔ امت کی خبر کیسے لیتے ہوں گے۔ علامہ ابن تیمیہ نے ایک حدیث نقل کی ہے، "من ولیٰ امر المسلمین شیئاً فولیٰ رجلا وھو یجد من ھو اصلح للمسلمین منہ فقد خان اللہ ورسولہ والمسلمین"۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے:۔ "من ولیٰ امر المسلمین شیئاً فولیٰ رجلا لمودۃ او قرابۃ بینھما فقد خان اللہ ورسولہ والمسلمین"۔ [2] طبری وغیرہ۔ [3] سیر الصحابہ۔ جلد ششم۔

جو سلطان ظالم کے سامنے کہا جائے۔ وہ واقف تھے کہ رسول کا حکم ہے کہ گناہ کو دیکھو تو ہاتھ سے مٹا دو۔ یہ ممکن نہ ہو تو زبان سے روکو۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو کم از کم دل سے بُرا سمجھو۔

ہمیں یقین ہے کہ صحابہ۔ خصوصاً جلیل القدر صحابہ میں سے کوئی یزید کو اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ البتہ اپنے ذاتی حالات کے تحت کسی نے دل سے بُرا سمجھا۔ کسی نے زبان سے تردید کی۔ کسی نے ہاتھ سے مٹانے کی سعی کی۔ جو لوگ امام حسینؑ پر درپردہ اعتراض کرتے ہیں کہ انھوں نے ایک زبردست طاقت سے ٹکر لی۔ یا قایم شدہ مذہبی حکومت سے (معاذ اللہ) بغاوت کی وہ تعصب یا جہالت میں گرفتار ہیں۔ کیا وہ یہ چاہتے ہیں کہ یزید کا دربارِ ملوکیت زر و حریر سے آراستہ ہوتا۔ محفل میں دورِ شراب چلتا ہوتا۔ معشوقِ طنبورہ چھیڑتا خلیفۂ وقت سرخوشی کے عالم میں جھومتا ہوتا اور (خاکش بدہن) نبی کا جگر بند۔ علی کا فرزند بھی ایک طرف بیٹھا ہوا خلیفہ کی خوشامد کرتا اور ہاں میں ہاں ملاتا جاتا۔ لِذا العمری فی القیاس بدیع۔ سچ ہے العمر لیقیس علیٰ نفسہٖ۔ مسلک امام کے متعلق یہ باتیں فرضی یا قیاسی نہیں ہیں۔ حضرت نے یزید کی دعوتِ بیعت پر جو آیۂ کریمہ پڑھی وہ یہ تھی: " ولا ترکنوا الی الذین ظلموا فتمسکم النار وما لکم من دون اللہ اولیاء ثم لا تنصرون " ظالموں کی طرف نہ جھکنا۔ ورنہ دوزخ کی آگ تم کو آلے گی اور خدا کے سوا تمھارا کوئی مددگار تو ہے نہیں تو اس کی طرف سے بھی تم کو مدد نہیں ملے گی۔

یہ گویا فوری یا ہنگامی فیصلہ نہ تھا بلکہ سوچا سمجھا ہوا راستہ تھا جس پر آپ آخر وقت تک قایم رہے۔ چنانچہ جب حُرّ سے ملاقات ہوئی اُس وقت بھی آپ نے اپنا نصب العین ان الفاظ میں جتا دیا: " لوگو رسول خدا نے فرمایا ہے کہ جو شخص ایسے بادشاہ کو دیکھے جو ظالم ہو۔ حرام کو حلال سمجھتا ہو۔ عہدِ خدا کو توڑتا ہو۔ سنت رسولؐ کے خلاف کرتا ہو۔ اور بندگانِ خدا کے ساتھ ظلم و سرکشی سے پیش آتا ہو اور پھر فعلاً یا قولاً اُس پر اعتراض نہ کرے تو خدا اس کو بھی اُسی کے اعمال میں شریک کرے گا۔ سنو ان حکام نے شیطان کی اطاعت اختیار کر لی ہے۔ خدا کی طاعت کو ترک کر دیا ہے۔ فساد کو ظاہر، حدودِ شرع کو معطل۔ غنیمت کو غصب، حرام خدا کو حلال، حلالِ خدا کو حرام کر رکھا ہے ان پر اعتراض کرنے کا سب سے زیادہ مجھے حق ہے۔"

انصاف سے کہئے۔ اُس عہد کی حکومت کی تصویر اس سے کچھ مختلف تھی۔ یزید یوں سے یہ تو ہوا کہ اپنی فرعونی طاقت (بہ زعمِ خود) حسینؑ کے مرعوب کرنے کے لئے میدان میں لے آئے۔ یہ کسی کی جرأت نہ ہوئی کہ کہتا کہ " ہمارے امیر المومنین خلیفۂ رسول پر یہ الزامات غلط ہیں۔ یا خیر ہم اصلاح کا عہد کرتے ہیں۔ آپ بیعت کا وعدہ کیجئے"۔ بے شک زبردست دنیاوی طاغوتی حکومتیں ہمیشہ وہی کرتی ہیں جو یزید نے کیا۔ لیکن اُس کو تو دنیاوی نہیں۔ مذہبی پیشوا ہونے کا دعویٰ تھا۔ اور اب تک اُسکے حامی یہی باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر آخر میں جب ہر طرف سے حسینؑ پر نرغہ تھا اس وقت بھی انھوں نے کہا تو یہ کہا " فاجمعوا امرکم وشرکاءکم ثم لا یکن امرکم علیکم غمۃ ثم اقضوا الیّ ولا تنظرون۔ ان ولی اللہ الذی نزل الکتاب وھو یتولی الصالحین " پس تم اور تمھارے شریک سب مل کر اپنی ایک بات ٹھیرا لو پھر تمھاری وہ بات تم پر کسی پر مخفی نہ رہے پھر تمھیں جو کچھ کرنا ہے میرے ساتھ کر گزرو اور مجھے مہلت نہ دو۔ میرا کارساز وہی خدا ہے جس نے کتاب اتاری ہے اور وہ صالحین کو دوست رکھتا ہے۔ یہ عزم و عزیمت۔ یہ استقلال و جرأت۔ یہ حق کے لئے فداکاری۔ یہ ایمان و یقین کی استواری محمدؐ کے آغوش اور فاطمہؑ کے دودھ کی تاثیر تھی۔ آخر انھیں کے محترم نانا تو تھے جنھوں نے ظاہری بے سروسامانی اور بے بسی کے باوجود قریش کے جبار اور صاحب مطوت ائمۂ کفر سے ڈنکے چوٹ کہا تھا کہ " میں تمھارے معبودوں کو نہیں پوجتا تم میرے معبود کو نہیں مانتے تو میرا تمھارا میل کیا۔ تمھیں تمھارا دین اور مجھے میرا دین"۔ زندگی کو سود و زیاں کے پیمانے سے ناپنے والے اور ہر ہوا کے ساتھ اُڑ چلنے والے اس قربانی کی حقیقت کیا سمجھیں۔ اگر سبھی حسین (روحی فداہ) کی قربانی محض زمانی ضد

لہ طبری — ۲ طبری

اور شخصی آن کے سوا کچھ نہ تھی تو اسلام سے پہلے اور بعد ہر زمانہ میں اہلِ حق نے قوت باطل کے سامنے جو فداکاریوں کے نمونے پیش کئے ہیں سب کے سب سعی لاحاصل اور تہور بے جا قرار پائیں گے۔ خدا رحمت کرے اقبال پر، کیا خوب کہا ہے:-

رمز قرآں از حسینؑ آموختیم — از شرارش شعلہ ہا اندوختیم
موسیٰؑ و فرعون و شبیر و یزید — ایں دو قوت از حیات آید پدید
زندہ حق از قوت شبیری است — باطل آخر داغ حسرت میری است

اس حادثۂ فاجعہ کی تفصیلات بیان کرنے کا یہ محل نہیں ہے۔ کیونکہ یہ اس مقالہ کا موضوع ہی نہیں۔ سب جانتے ہیں کہ امام نے بیعت سے اجتناب کیا۔ اور مدینۂ رسول کو چھوڑ کر حرم مکہ میں پناہ لی۔ یزید یہ کیونکر گوارا کرتا کہ حسینؑ بیعت کے بغیر زندہ رہیں بلکہ سچ پوچھئے تو بیعت کے بعد بھی اس امر کا کوئی اطمینان نہ تھا۔ آخر حضرت امام حسنؑ کا انجام آپ کی نظر میں تھا ہی۔ خود آپ نے فرمایا کہ اُن لوگوں کی غرض یہ تھی کہ مکہ میں مجھے گرفتار کرلیں یا ہلاک کر ڈالیں۔ بخدا اگر میں سوراخ میں بھی جاکر چھپوں تو یہ لوگ مجھے ڈھونڈھ نکالیں گے۔ قیام مکہ میں اہل کوفہ کے بکثرت خطوط آتے ہیں کہ ہم یزید اور اس کے عمّال سے بیزار ہیں۔ آپ آئیے اور ہماری رہنمائی کیجئے۔ ورنہ خدا کے یہاں آپ ذمہ دار ہوں گے۔ آخر آپ مکہ سے کوفہ کو روانہ ہوتے ہیں۔ راہ میں پتہ چلتا ہے کہ آپ کے سفیر و ابن عم حضرت مسلم جن کو آپ نے حالات کے جائزے کی غرض سے کوفہ روانہ کیا تھا بیدردی سے شہید کردئے گئے اور یزید کے والی ابن زیاد نے کوفہ میں دہشت انگیزی پھیلا رکھی ہے۔ جس کے اثر سے اہلِ کوفہ آپ کی مخالفت پر کمربستہ ہیں۔ تاہم اتمام حجت کے خیال سے آپ بڑھتے ہیں۔ کوفہ کے قریب کربلا میں ابن زیاد کا فرستادہ کمانڈر عمر بن سعد مع لشکر پہونچتا ہے اور آپ محصور ہوجاتے ہیں۔ شروع میں ابن سعد نہیں چاہتا تھا کہ یہ مظلمہ اپنے سر لے مگر شمر کی خباثت ابن زیاد کو اکساتی ہے اور وہ ابن سعد کو سخت احکام بھیجتا ہے۔ بالآخر دُنیا کے لالچ میں آکر ابن سعد جنگ کا آغاز کردیتا ہے اور کہتا ہے: "لوگو امیر کے سامنے گواہی دینا کہ حسینؑ پر پہلا تیر چلانے والا میں ہوں" کاش وہ شقی سمجھتا کہ وہ یہ تیر حسینؑ کے جسم پر نہیں، رسول پاک کے دل پر۔ بلکہ اسلام کے وجود پر چلا رہا ہے۔ حسینؑ، اُن کے اعزہ اور انصار تین دن کی بھوک پیاس کے باوجود نہایت جرأت سے مقابلہ کرتے ہیں اور بہت سے ملاعنہ کو فی النار کرکے آخر شربتِ شہادت نوش کرتے ہیں۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ واقعۂ کربلا کی دلخراش تفصیلات آپ سب کو معلوم ہیں۔ زیادہ صراحت کی حاجت نہیں۔ علامہ سیوطی کے بقول وفی قتلہ قصتہ فیہا طول لا یحتمل القلب ذکرہا۔ ان کی شہادت کی داستان دراز ہے اور قلب اُس کے ذکر کا متحمل نہیں۔ اسی سلسلہ میں فرماتے ہیں "لعنۃ اللہ قاتلہ و ابن زیاد معہ و یزید ایضاً"[1] بعد کے واقعات یعنی شہیدوں کے لاشوں کی پامالی، خیام آل محمدؐ کی تاراجی، حرم کی اسیری اور دربار ابن زیاد اور دربار یزید میں حاضری کچھ کم دلخراش نہیں۔ اس لئے ان کا ترک کرنا ہی مناسب ہے، مدینہ سے مکہ اور مکہ سے کربلا تک ہر ہر قدم پر حسینؑ اور انصار حسین نے شرافت اور رسالت کا جو اعلیٰ نمونہ پیش کیا ہے وہ محیّر العقول ہے۔ خصوصاً امام عالی مقام نے عزیزوں۔ دوستوں۔ بلکہ غیروں اور مخالفوں کے ساتھ جو برتاؤ کیا ہے، اسلامی مورخ اس کو دنیا کے سامنے ہمیشہ فخر کے ساتھ پیش کریں گے۔ عشاً جب راہ میں حضرت مسلم کو شہادت کی ملتی ہے تو آپ چھپالے کی بجائے، اپنے رفقا میں اعلان کرکے فرمادیتے ہیں

---

[1] یزید کو لعنت کرنے میں وہی منفرد نہیں ہیں۔ متعدد علمائے اہل سنت ان کے ہم آواز ہیں۔ مثلاً امام احمد بن حنبل۔ علامہ ابن جوزی۔ علامہ تفتازانی وغیرہم۔ اور جو علما کسی وجہ سے لعن شخصی میں احتیاط کرتے ہیں اس فعل کو ملعون وہ بھی کہتے ہیں۔ جن علمائے نے حضرت کے قتل میں حصّہ لیا ان میں شقاوت و قساوت کے لحاظ سے شاید شمر کا نمبر سب سے بڑھا ہوا ہے۔ پھر ابن زیاد۔ پھر ابن سعد۔ پھر یزید۔ اس لئے علی بن حسینؑ کہتے تھے کہ میں نے یزید سے اچھا کافر نہیں دیکھا۔

کہ حالات بدل گئے ہیں۔ تم میں جو واپس جانا چاہے چلا جائے۔ یا جب حرؑ اور اس کا دستہ جو حضرت کو گھیرنے کے لئے بھیجا گیا تھا پیاس سے بیدم ہوگیا تو آپ نے بے تامل اپنا تمام ذخیرۂ آب اس کو اور اس کے ساتھیوں کو بخش دیا۔ بعد کو انصار نے کہا کہ اس وقت حرؑ اور اس کے رفقا سے ہم نبٹ سکتے ہیں۔ جب فوجیں زیادہ آئیں گی تو مقابلہ دشوار ہوگا۔ مگر آپ نے فرمایا کہ ہم اپنی طرف سے پہل نہیں کریں گے۔ بعض لوگوں نے کسی محفوظ مقام پر منتقل ہونے کا مشورہ دیا۔ لیکن امام نے حرؑ سے جو قرارداد ہوئی تھی اس کی خلاف ورزی پسند نہ فرمائی۔ اسی طرح ہر معاملہ میں صدق مقال و ایفائے عہد کی تاکید فرماتے رہے۔ جب شب شہادت آئی اور ظالموں نے بمشکل عبادت و تلاوت کے لئے آپ کو ایک رات کی مہلت دی اس موقع پر آپ نے اپنے انصار سے مخاطب ہوکر فرمایا:۔ "انی لا اعلم اصحابا اوفی ولا خیرا من اصحابی ولا اہل بیت ابرّ ولا اوصل من اہل بیتی فجزاکم اللہ عنی خیرا۔ الا وانی قد اذنت لکم فانطلقوا جمیعا فی حلّ لیس علیکم حرج منی ولا ذمام من بیعتی۔ ہذا اللیل قد غشیکم فاتخذوہ جملا" میں اپنے رفقا سے زیادہ وفادار اور نیکوکار کسی کو نہیں جانتا اور نہ اپنے اہل بیت سے زیادہ سلوک اور صلہ رحم کرنے والا۔ خدا تمھیں میری طرف سے جزائے خیر دے میں تمھیں بخوشی اجازت دیتا ہوں۔ تم میرے عہد کی پابندی سے آزاد ہو۔ تم پر کوئی تنگی یا میری بیعت کی ذمہ داری نہیں ہے۔ دیکھو رات چھا گئی ہے، اس کی تاریکی میں نکل جاؤ۔ جس پر عزیزوں اور رفیقوں نے جواب دیا اگر ہم ستر مرتبہ قتل کئے جائیں اور جلائے جائیں تو بھی آپ کے قدم چھوڑنے والے نہیں۔ مورخین نے یہ بھی لکھا ہے کہ آپ نے انصار سے ارشاد کیا کہ دشمنوں کو صرف مجھ سے کد ہے۔ میں تمھیں اجازت دیتا ہوں کہ تم میں سے ہر ایک میرے خاندان میں سے ایک فرد کا ہاتھ تھامے اور اپنے وطن کو چلا جائے۔ مگر اُن وفاداروں نے صاف انکار کردیا۔

بعض روایات میں یوں آیا ہے کہ آپ نے فرمایا "لوگو دُنیا نے اپنا رنگ کیسا بدل لیا ہے۔ نیکی سے خالی ہوگئی ہے۔ افسوس دیکھتے نہیں کہ حق کو پس پشت ڈال دیا گیا ہے اور باطل پر علانیہ عمل کیا جا رہا ہے اور کوئی نہیں جو اُس کا ہاتھ پکڑے اُسے سہارا دے۔ بس اب وقت ہے کہ مومن حق کی راہ میں لقاء الٰہی کی خواہش کرے۔ میں شہادت کی مَوت پاتا ہوں۔ ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود ایک جرم ہے۔" (طبری)

اوپر کے بیانات سے چند امور بخوبی واضح ہوگئے ہوں گے۔ یعنی:۔

(الف) بنی ہاشم اور خصوصاً حضرت علی اور آل علی روایات اسلامی اور اپنے بلند کیرکٹر کے لحاظ سے بجا طور پر مسلمانوں میں خاص احترام کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ شعائر دین کا احترام و تحفظ کرنے والا ان سے زیادہ کون ہوسکتا تھا۔ ان کے برخلاف بنی امیہ کے افراد (معدودے چند حضرات کو چھوڑ کر) اپنے مفاد کے لئے جایز و ناجایز کی مطلق پروا نہ کرتے تھے۔

(ب) خلافت کی اطاعت شرعاً مامور بہ ہے۔ لیکن علی الاطلاق نہیں۔ ورنہ حضرت ابن زبیر ان کے رفقا میں اکثر صحابہ عظام سادات کرام جنھوں نے بعد کی حکومتوں کے خلاف خروج کیا اور جن کا ساتھ وقت کے علماء و صلحاء نے دیا۔ سب کے سب باغی اور واجب القتل اور مستحق عذاب اُخروی قرار پاتے۔ لیکن اہل علم نے ایسا نہیں کہا۔ اکثر کی یہ رائے ہے کہ اگر خلیفہ کفر کرے یا مصالح امت کو تباہ کرے تو اُس پر خروج جائز بلکہ حالات مساعد ہوں تو واجب ہے۔ چہ جائیکہ کسی ذمہ دار فرد نے وجوہ بالا کی بنا پر سرے سے بیعت ہی نہ کی ہو۔

(ج) امیر معاویہ اور ان کے رفقا کا طرز عمل حضرت علیؓ اور حسنینؓ کے ساتھ نہ صرف خلاف احترام اہل بیت بلکہ خلاف انصاف تھا۔ لیکن یہ نفوس قدسیہ باوجود کراہت اُس پر خاموش رہ سکتے تھے۔ لیکن جہاں وہ طریق، شریعت سے ٹکراتا تھا وہ ٹوک

لہ نہضۃ الحسین (مطبوعہ بغداد)

دینے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ پھر امیر (یہ علانیہ شریعت کی خلاف ورزی پسند نہ کرتے تھے۔ کم از کم اُس وقت تک یہی حال تھا جب کہ امام حسنؓ نے ان سے صلح کی۔ یہ اور بات ہے کہ کامل اقتدار پانے پر انھوں نے شرائط کی خلاف ورزی، بلکہ سنتِ نبوی سے بے اعتنائی شروع کر دی۔ پھر یزید تو فاسق مجاہر اور مفادِ اسلام و مسلمین کا علانیہ برباد کرنے والا تھا۔ مورخین نے لکھا ہے کہ اُس کے تھوڑے سے عہدِ سلطنت میں (۳ سال۔ ۶ ماہ۔ ۲۰ روز) تین جرم اُس سے ایسے سرزد ہوئے کہ امتِ مسلمہ کبھی معاف نہ کرے گی:۔ قتلِ حسینؓ۔ واقعۂ الحرّہ (جس میں مدینۂ منورہ پر چڑھائی کی گئی تین دن تک یہ شہر لوٹا گیا۔ سات سو صحابہ و رسول قتل کئے گئے۔ اور ایک ہزار دوشیزہ لڑکیوں کی عصمت دری کی گئی) اور حملۂ مکۂ معظمہ (جس میں حرم کعبہ پر منجنیق سے سنگباری کی گئی اور غلاف کعبہ جل گیا)۔ صحابہ کا قول ہے کہ یزید کے اعمال ایسے تھے کہ اگر ہم اُس پر خروج نہ کرتے تو ہم پر آسمان سے پتھر برستے۔ یہ تھے "امیر المومنین" یزید کے کرتوت! ۔ 'امیر المومنین' کو واوین میں بند کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایک[1] مرتبہ کسی خوشامدی نے نجیب بنی امیہ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے سامنے یزید کا ذکر کرتے ہوئے اُس کو امیر المومنین کہدیا تو آپ نے اُس کے بید کوڑے لگوائے۔

(د) یہی وجوہ تھے کہ حضرت امام حسینؓ نے یزید کی بیعت کو شروع سے آخر تک ناپسند کیا۔ اس میں اپنی جان اور خاندان کی تباہی کی پروا نہ کی۔ اس لئے کہ آپ کا بیعت کرنا اپنے مقدس نانا کے دین کو تباہ ہونے پر رضا کا مترادف ہوتا۔ دوسرے صحابہ نے ضرور بیعت کی مگر مجبوراً نہ کہ رضامندی سے۔ ایسی صورت میں آپ کا فعل عزیمت کا تھا۔ دوسروں کا عمل رخصت پر تھا۔ رخصت پر عمل گناہ نہیں۔ لیکن عزیمت کا درجہ کہیں بلند تر ہے۔ نیز یہ واضح ہے کہ آپ کا طریق کار ہنگامی نہ تھا۔ بلکہ تمام نتائج و عواقب کو سوچ کر اختیار کیا گیا تھا۔

(ہ) آپ بخوبی جانتے تھے کہ بالفرض یزید کی بیعت بھی کر لی جائے تو بھی وہ اور اُس کے عمّال آپ کے وجود کو اپنی راہ کا کانٹا سمجھتے رہیں گے۔ جیسا کہ حضرت امام حسنؓ کے ساتھ کیا گیا۔ چنانچہ آپ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ مجھے ڈر تھا کہ مکہ ہی میں مجھے گرفتار یا ہلاک کر دیا جائے گا۔ نیز یہ کہ اگر میں کسی سوراخ میں چھپوں تو بھی یہ لوگ مجھے ڈھونڈھ نکالیں گے۔ یہی وجہ تھی کہ آپ نے اپنے خیر خواہوں کے مشورے پر عمل نہ کیا کیونکہ ان لوگوں کی تمام پہلوؤں پر نظر تھی اور آپ نے کوفہ والوں کی دعوت نصرت کو قبول فرمایا۔

(و) شروع سے آخر تک آپ کا طریق کار خدا اور احکام خدا کی اطاعت و انابت۔ صدق وعدہ اور وفائے عہد۔ ایثار اور خلوص کا آئینہ تھا۔ اور کوفیوں اور شامیوں کا رویہ اس کے۔ ہر [illegible] پر اظہارِ حق اور اتمامِ حجت میں اغلباً یہ مصلحت تھی کہ دنیا یزیدیوں کی اصلی شکل دیکھ لے اور یزید نے اپنے اوپر خلافت و دینی۔ [illegible] دینی اور نیابت رسول و مقتدائی اسلام کا جو نقاب ڈال رکھا ہے وہ نوچ کر پھینک دیا جائے۔ مخالفوں کے معاندانہ بلکہ بہیمانہ طرزِ عمل نے درحقیقت اخلاقی طور پر ان کی شکست اور حسینؓ کی فتح پر مہر کر دی جس کا اعتراف انصاف پسند غیر مسلموں نے بھی کیا ہے۔

واقعاتِ شہادت پر عام تبصرہ کرنے کے بعد ہم خاص طور پر مضمون نگار کے اُن مغالطوں کو جن سے مسلمانوں میں گمراہی اعتقاد پیدا ہو سکتے ہیں اور جن کو پڑھ کر دوسروں کو اہلِ سنت کے مسلک سے بدگمانی ہو سکتی ہے، پیش کر کے ان کا جواب دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ ان کے مضمون کا ماحصل یہ ہے:۔

(ا) اہلِ بیت کے سلسلے میں مسلمان افراط و تفریط میں مبتلا ہو گئے ہیں اور اعتقاد و عمل میں غلو سے کام لیتے ہیں۔ چنانچہ ہزاروں بے بنیاد روایات اہلِ بیت اور واقعۂ کربلا کو اہمیت دینے کی غرض سے گھڑلی گئی ہیں۔ مگر مضمون نگار نے سارا زورِ قلم افراط کی بڑائیاں

---

[1] تاریخ الخلفاء۔ [2] حضرت امام حسنؓ کی شہادت سرّی تھی کہ کسی نے اصل واقعہ اور اصل محرک کو جانا کسی نے نہ جانا۔ اس کے برخلاف سیدنا حسینؓ کی شہادت جہری تھی

دکھانے پر صرف کر دیا ہے۔ اس لئے مجبوراً ہمیں دوسرا رخ نمایاں کرنا پڑا۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ افراط و تفریط سے اجتناب واجب ہے اور بے اصل روایات کی ترویج و اشاعت ناروا۔ لیکن واقعہ بذات خود نہایت اہم (دنیاوی نہ سہی۔ ذہنی اعتبار سے) اور دلخراش ہے۔ اور افسوس و تعجب ہوتا ہے کہ نام نہاد مسلمان اتنی جلد رسول پاک کی وصیت کو بھول گئے۔ جزئیات کی بحث بیکار ہے۔ اصل واقعہ کی۔ اور ان حضرات کی جن کو اس ناگوار واقعہ میں غیر معمولی مصائب سے دوچار ہونا پڑا، اہمیت سے کون مسلمان انکار کر سکتا ہے۔ بدعات اور بے اصل روایات سے عوام کو روکئے۔ مگر للہ حسینؓ کی عظمت گھٹانے اور ان کے مخالفوں کا جرم ہلکا کرنے کی کوشش نہ کیجئے۔

(۲) مضمون نگار خود اعتراف کرتے ہیں کہ واقعات کا تقاضا کچھ اور ہے اور امیر معاویہ کے شرف صحابیت کا تقاضا کچھ اور۔ افسوس یہ اعتراف کرنے کے بعد حامیانِ بنی امیہ (مثلاً علامہ ابن تیمیہ۔ اور ابن خلدون وغیرہ) کے دامن میں پناہ لینے کی سعی کی ہے اور واقعات کی لیپ پوت سے کام لیا ہے۔ کاش وہ اتنا خیال کرتے کہ امام حسین تو اس سے زیادہ رعایت کے مستحق تھے کہ وہ صحابی اور آلِ رسولؐ ہونے کے دُہرے شرف سے متصف تھے۔ یہ صحیح ہے کہ ہمیں صحابہ کی نسبت بدگوئی نہ کرنی چاہئے۔ لیکن اسی کے ساتھ ان کے ہر فعل کی تائید یا توجیہ کرنی بھی مناسب نہیں۔ رہا فروعی واقعات کا اظہار۔ تو اس سے تو مورخین اور محدثین میں کون ہے جو بچ سکا ہے۔

(۳) انھوں نے اپنے نزدیک امام پر بڑا احسان کرتے ہوئے آپ کی شہادت کو تو تسلیم کیا ہے۔ مگر اس کو محض ذاتی عزت کا سوال قرار دیا ہے۔ حالانکہ دوسری جگہ خود 'آن' کے خیال کو باطل ٹھہرایا ہے۔ اب کہئے کس کو صحیح مانا جائے۔

کہ شیوہ ہائے ترا باہم آشنائی نیست

گویا اُن کے نزدیک (معاذ اللہ) امام کی قربانی محض "ایک محرور المزاج غیور سردار" کی ضد تھی۔ ہماری رائے میں مضمون نگار نے جو کچھ لکھا ہے وہ تعصب کے تحت لکھا ہے۔ ورنہ کوئی ہوشمند اور بے تعصب غیر بھی امام کی تصویر اتنی مکروہ انداز میں پیش کرنے کی جرأت نہ کرے گا۔

اوپر آپ نے ملاحظہ کیا کہ امام نے صاف صاف فرمایا تھا کہ ظالموں کے ساتھ زندہ رہنا بجائے خود ایک جرم ہے۔ مگر ہمارے 'محقق' مضمون نگار اس کو محض ذاتی عزت کا سوال سمجھتے ہیں۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ حسینؓ غلط بیانی سے کام لے رہے۔ استغفر اللہ۔ سردار جوانانِ بہشت کی نسبت ایسا گمان بھی دیانت کے منافی ہے۔ خود امام کا ارشاد ہے کہ جب سے مجھے جھوٹ کا گناہ ہونا معلوم ہوا ہے میں نے جھوٹ سے کبھی لب کو آلودہ نہ کیا۔

(۴) صاحب مضمون نے امام کے ترکِ بیعت کو اجتہادِ شخصی اور صحابہ کے بیعت کر لینے کو اجتہادِ اجتماعی کہہ کر امام کے مرتبے کو فروتر دکھانے کی سعی کی ہے۔ حالانکہ اگر صحابیت کا پاس ہے تو امام تو صحابیت کے علاوہ اہلِ بیت میں بھی داخل ہیں۔ اور اگر تعداد وجہِ ترجیح ہے اور وہ (بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے) کے قابل ہیں تو بھی "من رآ منکم منکرا فلیغیرہ" الخ (جو تم میں برائی کو دیکھے تو اس کو ہاتھ سے بدل دے۔ یہ نہ ہو تو زبان سے۔ ورنہ کم از کم دل سے ضرور برا جانے) کی منشا کچھ اور ہے۔ اسی طرح افضل الجہاد کلمۃ الحق عند سلطان جائر کو بھی پیش نظر رکھئے۔ جن صحابہ نے بیعت کی وہ خوف جان سے مجبوراً کی۔ ورنہ یزید کو وہ نااہل جانتے تھے۔ اور پھر جوں ہی موقع ملا اُن حضرات نے یزید کا ربقۂ بیعت اپنی گردن سے نکال دیا۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا۔

(۵) اُن کو شکایت ہے کہ شیعی پروپاگنڈا نے اس واقعہ کو بڑھانے میں زیادہ کام کیا ہے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ غلط پروپاگنڈا کے جس قدر مواقع امویوں کو ملے دوسروں کو نہیں ملے۔ اور واقع میں انھوں نے اپنی حکومت کی برائیوں اور اپنے مخالفوں کی بھلائیوں پر

لہ الفرقان، اگست ۵۳ء صفحہ ۱۹ ــ لہ امام حسین کے احترام کے مقابلہ میں ان ناموں سے مرعوب ہونے کی ضرورت نہیں کیونکہ اُن کا حق ان سے مرجح ہے ــ لہ الفرقان اگست ۵۳ء صفحہ ۴۰ ــ لہ الفرقان ستمبر ۵۳ء صفحہ ۴۰

پردہ ڈالنے کی جس قدر کوشش کی ہے شاید ہی کسی نے کی ہوگی - اس کی وجہ یہ تھی کہ قوت اُن کی پشت پر تھی - اوپر آپ نے ملاحظہ کیا ہوگا کہ امیر معاویہ کو حضرت علیؓ کے فرضی مثالب کی اشاعت کا کتنا اہتمام تھا (صحیح مسلم - طبری وغیرہ) اُن کے عہد سے مروان حمار کے عہد تک (حضرت عمر بن عبدالعزیز کا مبارک زمانہ چھوڑ کر) منبروں پر علی مرتضیٰ کو سب وشتم کی جاتی تھی - مزید تائید کی ضرورت ہو تو علامہ شبلی کا بیان سن لیجئے وہ لکھتے ہیں کہ: "حدیث کی تدوین بنو امیہ کے زمانہ میں ہوئی جنھوں نے پورے سوے برس تک سندھ سے ایشیائے کوچک اور اندلس تک مساجد جامع میں آلِ فاطمہؓ کی توہین کی اور جمعہ میں سرِ منبر حضرت علیؓ پر لعن کہلوایا - سیکڑوں ہزاروں حدیثیں امیر معاویہ وغیرہ کے فضایل میں بنوائیں - عباسیوں کے زمانہ میں ایک ایک خلیفہ کے نام بنام پیشین گوئیاں حدیثوں میں داخل ہوئیں - لیکن نتیجہ کیا ہوا - عین اُسی زمانہ میں محدثین نے علانیہ منادی کردی کہ یہ سب جھوٹی روایتیں ہیں - آج حدیث کا فن اِس خس و خاشاک سے پاک ہے - اور بنو امیہ اور بنو عباسیہ جو ظل اللہ اور جانشین پیمبر تھے اُسی مقام پر نظر آتے ہیں، جہاں اُن کو ہونا چاہئے تھا" خدا محدثین محققین کو جزائے خیر دے کہ انھوں نے کھوٹے کو کھرے سے الگ کیا، تاہم کرنے والوں نے تو اپنے نزدیک دین کی تخریب میں کسر اُٹھا نہ رکھی تھی - جی چاہتا تھا کہ اس قسم کی آخشل حدیثوں اور روایتوں کا پردہ چاک کیا جائے - لیکن مقالہ کافی طویل ہوگیا ہے - اس لئے باقی چند اہم اغلاط جو مضمون نگار کے بیانات میں ہیں اُن سے تعرض اور تعقب کرنے کے بعد اس کو ختم کرنا ہی مناسب معلوم ہوتا ہے -

(۶) انھوں نے اپنے مضمون میں نہایت جسارت سے حضرت کے اقدام کے متعلق بغاوت کا لفظ استعمال کیا ہے اور جب کسی شخص نے ٹوکا تو صاف صاف اظہار ندامت کرنے کی بجائے تاویل رکیک کی آڑ لی ہے - درآں حالیکہ انھوں نے حضرت علیؓ یا امام حسنؓ کے مقابلہ میں امیر معاویہ کے خروج کو کہیں بغاوت سے تعبیر کرنے کی جرأت نہیں کی جبکہ حدیث رسول خود اُس کو بغاوت قرار دیتی ہے - دراصل امام حسینؓ کے بارے میں یہ رائے اہل سنت کے مسلک کے سراسر منافی ہے - لیکن چونکہ بعد کو انھوں نے خود اس مکروہ اور مبغوض لفظ کی تاویل کی ہے ہم بھی زیادہ تعرض نہیں کرتے - اتنا ضرور کہیں گے کہ:

نہ تھی دل میں تو کیوں آئی زباں پر

(۷) انھوں نے بڑا زور اس امر پر دیا ہے کہ آخر میں حضرت اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دینے اور بیعت کرنے پر آمادہ ہوگئے تھے لیکن اس کے عمّال راضی نہیں ہوئے - سچ پوچھئے تو یہ بڑا گمراہ کن پروپاگنڈا ہے اور اگر اس کو صحیح مان لیا جاتا ہے تو سردارِ جوانانِ جنّت کی عظمت اور آپ کی شہادت کی وقعت مسلمانوں کی نگاہ میں بہت گر جاتی ہے - کہ لیجئے وہ تو بیعت کو طیار تھے عمالِ حکومت ہی نے قبول نہیں کیا -

اس روایت کی نسبت ذرا تفصیل سے عرض کرنے کی ضرورت ہے - ہمارا جہاں تک خیال ہے یہ پہلے پہل طبری کے یہاں ملتی ہے - اور طبری سے دوسروں نے نقل کی ہے - یہ روایۃً اور درایۃً ہرگز قابلِ اعتبار نہیں - روایۃً تو اس لئے کہ اس کے راویوں میں ایک شخص مجالد بن سعید محدثین کے نزدیک پایۂ اعتبار سے ساقط ہے[1]، حافظ ذہبی اور ابن حجر دونوں نے اُس پر جرح کی ہے (سیر الصحابہ جلد ۶ صفحہ ۱۸۵) اس کے علاوہ عقبہ بن سمعان جو مدینہ سے مکہ اور مکہ سے عراق تک امام کے رفیق رہے اور شہادت تک آپ سے جدا نہیں ہوئے اور اول سے آخر تک حضرت کے تمام مخاطبات سنتے رہے ہیں، حلف کہتے ہیں[2] "فواللہ ما اعطاہم ما یزعمون من انہ یضع یدہ فی ید یزید" بخدا آپ نے ہرگز یہ شرط جیسا کہ مشہور ہے پیش نہیں کی کہ آپ یزید کے ہاتھ میں ہاتھ دیدیں گے (تاریخ الحسین

---

[1] سیرۃ النبیؐ حصہ اول صفحہ ۶۱ — [2] اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ پروپاگنڈا وفاداران اڑلی نے اُس زمانہ میں کر رکھا تھا - جس کی عقبہ بن سمعان کو تردید کرنی پڑی - دیکھو ابن اثیر اور تاریخ الحسین مطبوعہ مصر -

از علی جلال حسینی - کتاب ثانی - مطبوعہ مصر - صفحہ ۵۴) عقبہ نے اس کا بھی انکار کیا ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ مجھے کسی سرحد پر بھیجو۔ ہاں آپ نے یہ ضرور کہا ہے کہ مجھے جہاں سے آیا ہوں وہاں لوٹ جانے دو یا خدا کی وسیع زمین میں کہیں نکل جانے دو۔ خود طبری میں اس روایت کی تین صورتیں ہیں - پہلی تو یہ ہے کہ آپ نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دیدیں گے یا یہ کہ کسی سرحد کی طرف ان کو جانے دیا جائے بلکہ یہ فرمایا کہ مجھے اس وسیع و عریض زمین میں کسی طرف نکل جانے دو۔ میں دیکھوں کہ انجام کیا ہوتا ہے۔ اس روایت میں تو کوئی مضایقہ نہیں۔ دوسری روایت ایک اور موقع پر یہ ہے کہ یا تو میں جہاں سے آیا ہوں وہیں چلا جاؤں یا مجھے یزید کے پاس چلا جانے دو یا کسی سرحد کی طرف نکل جانے دو۔ یہ بھی چنداں برا نہیں۔ البتہ تیسری صورت جس کا آغاز لفظ قیل سے ہے، یہ ہے کہ حضرت نے فرمایا کہ یا تو میں جہاں سے آیا ہوں وہیں چلا جاؤں۔ یا میں اپنا ہاتھ یزید کے ہاتھ میں دیدوں یا مملکت اسلام کی سرحد پر مجھے روانہ کر دیا جائے۔ اس روایت پر حرج اوپر گزری۔ مضمون نگار کا رویہ دیکھنے کے قابل ہے کہ انھوں نے طبری کے صرف اُس VERSION کو اختیار کیا جس میں یزید کی برتری اور امام کی ذہانت کا پہلو نکلتا ہے۔ اور اس کے برعکس دوسری روایت کو سرے سے حذف کر دیا۔ رسولؐ کی وصیت کا پاس اتنا تو ہو!

درایۃً دیکھا جائے تو بھی یہ داستان، دروغ بے فروغ معلوم ہوتی ہے۔ اول تو بعض کتابوں میں عمر ابن سعد کے قول کی حیثیت سے آئی ہے۔ اور مخالف کا بیان چوبک طرف ہے اُس کا اعتبار کیا، دوسرے طبری کا بیان ہے کہ امام اور ابن سعد کے باہمی مذاکرات تنہائی میں ہوئے تھے اور لوگوں میں اس کا چرچا تھا بغیر اس کے کہ انھوں نے کچھ سنا ہو یا جانتے ہوں۔ کتاب الحسین کی عبارت ہے: "تحدث الناس وان لم یسمعوہ" یعنی لوگوں میں بے سنے ہوئے اس کا چرچا ہو گیا۔ خوب۔ بازاری گپ کی کیا سند۔ مگر مضمون نگار کا تو مطلب ہی اور تھا تیسرے اگر حضرت اس پر آمادہ ہوتے تو مخالف کو لڑائی ہی کی کیا ضرورت تھی۔ چوتھے خود امام کا ارشاد اس بات کی تکذیب کرتا ہے۔ طبری لکھتے ہیں کہ جب حضرت نے یہ فرمایا کہ اگر تم لوگوں کو میرا آنا ناگوار ہو تو دنیا میں کسی گوشۂ امن کی طرف مجھے چلا جانے دو۔ اس پر کوفیوں میں سے قیس بن اشعث نے کہا کہ آپ اپنے قرابت داروں کا کہنا کیوں نہیں مان لیتے (یعنی یزید کی بیعت کیوں نہیں کر لیتے) آپ نے فرمایا کہ میں ذلت کے ساتھ ان لوگوں کے ہاتھ میں ہاتھ دینے والا اور غلاموں کی طرح اطاعت کا اقرار کرنے والا نہیں۔ اس کے بعد آپ نے یہ آیاتِ کریمہ تلاوت کیں:-

"انی عذت بربی و ربکم ان ترجمون - انی عذت بربی و ربکم من کل متکبر لا یومن بیوم الحساب" میں اپنے اور تمھارے رب کی پناہ مانگتا ہوں اس سے کہ تم مجھے سنگسار کرو۔ اور میں ہر متکبر سے جو روزِ حساب پر ایمان نہیں رکھتا خدا کی پناہ مانگتا ہوں۔ اگر بیعت کی آمادگی کا افسانہ صحیح ہوتا تو مخالف جواب دے سکتا تھا کہ کل (۹ محرم کی شب) تو آپ یزید کی بیعت کو آمادہ تھے۔ آج ۱۰ محرم) اُس سے بیزاری کی کیا وجہ۔ اگر کوئی یہ کہے کہ قرابت دار سے یزید نہیں بلکہ ابن زیاد مراد ہے جس کی بیعت پر قیس نے زور دیا۔ مگر امام نے انکار فرمایا۔ تو بھی غلط ہے۔ کیونکہ آپ کی قرابت یزید سے تھی ابن زیاد سے نہ تھی۔ اس کے ثبوت کے لئے کتب انساب کا حوالہ کافی ہے۔ علاوہ بریں حضرت مسلم کا قول ابن زیاد سے کہ واللہ اگر مجھ میں تجھ میں کچھ بھی قرابت ہوتی تو تو مجھے قتل نہ کرتا۔ نیز یزید کا کہنا کہ اگر ابن زیاد کو حسینؑ سے قرابت ہوتی تو اس حرکت کا مرتکب نہ ہوتا۔ ہمارے دعوے کا موید ہے۔ اگر قرابت دار ابن سعد مراد لیا جائے اور کہا جائے کہ وہ ابن زیاد کی بیعت کا موید تھا تو بھی صحیح نہیں۔ کیونکہ ابن سعد نے ابن زیاد کی بیعت کا سوال ہی کبھی نہیں اُٹھایا۔

(۸) اب رہا ان کا یہ قول کہ دیگر صحابۂ کرام نے یزید کی بیعت کر لی تھی۔ اس کا جواب ہم دے چکے۔ تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

(۹) یہ امر کہ حادثۂ کربلا پر یزید کا افسوس واقعی تھا یا اُس کے آنسو مگرمچھ کے آنسو تھے۔ اس کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ اس کے تاسف میں تصنع کا شائبہ معلوم ہوتا ہے۔ سب سے پہلے جو فرمان یزید کی طرف سے اپنے والیِ مدینہ کے نام جاتا ہے اس کے الفاظ بقول طبری یہ ہیں کہ ا۔ حسینؑ اور عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن زبیر سے بیعت لینے میں بہت تشدد کرو اور جب تک بیعت نہ کریں انھیں ذرا مہلت نہ دو۔ دوسرے مورخین کے یہاں بھی تشدد یا اُس سے ملتا ہوا لفظ پایا جاتا ہے۔ بعض نے تو در صورت عدم بیعت زندہ گرفتار کرکے یا سر قلم کرکے بھیجنے کا

ا تاریخ کامل ابن اثیر میں بھی تقریباً یہی روایت ہے۔

حکم نقل کیا ہے۔ اس کے بعد جب یہ حادثۂ فاجعہ ظہور پذیر ہو چکتا ہے تو اسیرانِ اہلِ بیت کوفہ سے دمشق روانہ کئے جاتے اور دربارِ یزید میں حاضر ہوتے ہیں۔ اُس وقت یزید کا حضرت کے دندانِ مبارک سے گستاخی کرنا اور حضرت ابو برزہ اسلمی کا ملامت کرنا طبری اور ابن اثیر وغیرہ نے نقل کیا ہے۔ اسی طرح ایک بدبخت شامی کا اسیرانِ اہلِ بیت میں سے ایک شہزادی کو (معاذ اللہ) کنیزی کے لئے طلب کرنا حضرت زینب کا اس کو جھڑکنا اور یزید کا آپ سے سخت کلامی کرنا وغیرہ وغیرہ ایسے امور ہیں جن پر پردہ ڈالنا ممکن نہیں۔

قریب آتا ہے روزِ محشر چھپے گا کشتوں کا خون کیونکر جو چپ رہے گی زبانِ خنجر لہو پکارے گا آستیں کا

بعد کو عام ملامت سے متاثر ہو کر وہ دُنیا دار عواقب کے خیال سے یا واقعی پچھتایا اور خاندانِ رسولؐ کے ساتھ حسنِ سلوک کیا۔ اس لئے حضرت سکینہ کا قول ہے کہ میں نے یزید سے اچھا کافر نہیں دیکھا۔ علامہ سیوطی کی عبارت یہ ہے کہ جب سرہائے شہدا یزید کے پاس آئے "فسُرّ بقتلہم اولاً ثم ندم لما مقتہ المسلمون علی ذلک وابغضہ الناس وحق لہم ان یبغضوہ" یعنی وہ ان کے قتل ہونے سے اول تو خوش ہوا اور جب مسلمانوں نے اس حرکت کو ناپسند کیا اور بجا طور پر اُس کو مبغوض رکھا تو وہ پچھتایا[1]۔ حضرت امام احمد بن حنبل کے متعلق مروی ہے کہ ان سے ان کے فرزند نے پوچھا کہ آپ یزید کے بارے میں کیا کہتے ہیں آپ نے فرمایا کہ میں کیوں نہ اُس پر لعنت کروں جس پر خدا نے لعنت کی ہے۔ اُس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت کی فہل عسیتم الخ۔ مضمون نگار نے اس سلسلہ میں ابن تیمیہ اور ابن کثیر کا حوالہ دیا ہے مگر ظاہر ہے کہ امام ابن حنبل کے مقابلہ میں ان کی رایوں کی کیا حقیقت۔

(۱۰) غلط روایات اور دوسری بدعات جو واقعۂ فاجعۂ کربلا کے ضمن میں مشہور و رائج ہو گئی ہیں ان کو ہم بھی صحیح نہیں سمجھتے۔ اور مضمون نگار صرف اُن سے تعرض کرتے تو مناسب تھا۔ مگر اُن کا فرض تھا کہ یہ کام اس طرح کرتے کہ عظمت اہلِ بیت مجروح ہوتی نہ حقائق سے چشم پوشی لازم آتی۔

تلک عشرۃ کاملہ

حق تو یہ ہے کہ:

بمقبولی کسے را دسترس نیست قبول خاطر اندر دست کس نیست

حسینؑ جو محبوب ربّ العالمین کے محبوب تھے ان کا نام معاندین کی تمام کوششوں کے باوجود آج بھی اہلِ ایمان کے لئے حرزِ جاں ہے۔ اور اس کے برخلاف تاریخ اسلام میں یزید کا ROLE مترادف شقاوت و خسراں۔ حد یہ ہے کہ:-

لفظِ یزید داخلِ دشنام ہو گیا

ایک سُنّی مُسلمان

---

[1] طبری و ابن اثیر۔ اس سے پہلے ابن زیاد خبیث سر مبارک سے گستاخی کر چکا تھا جس پر حضرت زید بن ارقم نے اس کو ٹوکا تھا۔ طبری و ابن اثیر نے شروع میں اس واقعہ پر یزید کا خوش ہونا اور ابن زیاد کو اعزاز دینا لکھا ہے۔ مگر مضمون نگار دیکھ لیں تو طبری و ابن اثیر سے استثنا کر دیتے ہیں۔ البتہ یزید کی طبیعت میں ان روایات سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔ [2] ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ بچھڑا دانستہ قتل سے ہے جیسے کہ کوئی اکثریت جب کسی اقلیت پر مظالم کرتی ہے تو ذمہ دار حکام ان افعال پر اظہارِ افسوس کر دیتے ہیں بغیر اس کے کہ ظالموں سے کسی قسم کا قانونی مواخذہ کیا جائے۔ سچ پوچھئے تو اس طرح ظلم پر راضی ہونے سے وہ لوگ بھی عقلاً و نقلاً شریکِ جرم ہو جاتے ہیں

کتابیات: - قرآن مجید - صحاح ستہ و دیگر کتب حدیث - تاریخ طبری حصہ اول - تاریخ کامل ابن اثیر جلد سوم - تنبیہ اشراف مسعودی - نہضۃ الحسین مطبوعہ بغداد - تاریخ الحسین مطبوعہ قاہرہ - تاریخ الخلفا و سیوطی - اکمال فی اسماء الرجال - الاستیعاب - اسد الغابہ - شرح عقاید نسفی - سیرۃ النبی جلد اول - سیر الصحابہ جلد ششم - سر الشہادتین - تحفہ اثنا عشریہ -

ایک نئی آواز

(احمد عظیم آبادی)

ضرورت ہے کہ ملک کے نوجوان شعراء کو جن میں ترقی کی اہلیت پائی جاتی ہے سامنے لایا جائے، چنانچہ پچھلی اشاعت میں جناب کوثر چاندپوری کا مضمون شفا گوالیاری پر اور اس مہینے احمد عظیم آبادی کی شاعری پر پروفیسر ارشد کاکوی کا تبصرہ اسی سلسلہ سے متعلق ہے۔

نیاز

آج کل اُردو شعر و ادب کی دنیا نقار خانہ سے کم نہیں۔ اپنی اپنی ڈفلی ہے اور اپنا اپنا راگ۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی اور اس ہنگامہ میں اگر کوئی آواز نمایاں ہو سکتی ہے تو نعرہ بازوں کی، چنانچہ چیخ چیخ کر بولنے والوں کا بازار بھاؤ سب سے گراں ہے۔ دُنیا بھاؤ پر جاتی ہے۔ جنس پر نہیں۔ اچھے اور برے کا فرق، علم و جہل کی تمیز، فن دانی اور نا اہلی کی تفریق کون کرے اور کیوں کرے۔

ع جو ہے سو موجِ رنگ کے دھوکے میں آگیا

اس افراتفری اور روا روی میں زیادہ نقصان اُن شعراء کا ہوا یا ہو رہا ہے جو نئے ہیں اور اپنی تمام اہلیتوں اور صلاحیتوں کے باوجود اس "بزمِ ہائے و ہو" میں خود کو اجنبی اور کٹا کٹا سا محسوس کرتے ہیں۔ نئے ہیں، اجنبی ہیں، چیخ نہیں سکتے، چلانا نہیں جانتے ایک کونے میں بیٹھ کر اپنا راگ چھیڑ دیتے ہیں لیکن نقار خانے میں طوطی کی آواز سنے تو کون سنے۔

"سازینہ" ایک ایسے ہی نئے شاعر کا پہلا مجموعۂ کلام ہے۔ احمد عظیم آبادی کی شاعری نئی آواز ہے لیکن اس میں کانوں کے راستے دل میں اُترنے کی صلاحیت ہے۔ نیاز فتحپوری غزل کو "زائیدہ تاثرات" کہتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ یہ جامع تعریف تمام فنونِ لطیفہ کا معیار ہے۔ اگر شاعری میں تاثیر نہیں تو کچھ نہیں اور یہ محض شاعری پر منحصر نہیں۔ آپ کسی کو گالیاں ہی دیجئے۔ اگر آپ کی گالیاں آپ کے معتوب کو جز بز نہ کر دیں۔ وہ مضطرب اور پریشان نہ ہو جائے تو خدا را بتائیے کہ آپ کی گالیوں کا مستحق آپ سے زیادہ اور کون ہو سکتا ہے اثر آفرینی محض گریۂ فراق میں نہیں ہوتی ہر بات میں ہوتی ہے بشرطیکہ بات کہنے کا سلیقہ ہو۔ بڑی سے بڑی بات کو بھونڈے طور سے کہہ دیجئے بے بات کی بات ہو کر رہ جائے گی۔ معمولی سی بات کو سلیقہ سے کہئے بات میں بات پیدا ہو جائے گی۔ شاعری میں اگر قوتِ ابلاغ نہ ہو تو وہ مجذوب کی بڑ ہے۔ کلام میں تاثیر پیدا ہونے کے بہت سارے عناصر ہوتے ہیں اور اُن میں پہلی چیز یہ ہے کہ آپ جو کچھ کہیں وہ دوسروں کی سمجھ میں آجائے۔ "اشاریت" کلام کا حُسن ہے لیکن وہ اس حد تک نہ ہو کہ سوائے شاعر کے کسی کے ذہن میں نہ ہو۔ ترقی پسندوں کی جماعت میں زیادہ تعداد ایسے لوگوں کی ہے جن کا کلام کسی کے پلّے نہیں پڑتا۔ جو کلام جتنا مبہم ہو وہ اتنا ہی بلند ہے۔

حسن عسکری اُردو کے ذہین نقاد ہیں لیکن اکثر وہ اپنی ذہانت کو "مسخرے پن" کی حد تک بڑھا دیتے ہیں۔ انھوں نے ایک بار بعض نقادوں سے یہ کہہ کر جھیکی لی تھی کہ انھیں شکایت ہے کہ جدید شاعروں کی نظمیں ان کی سمجھ میں کیوں نہیں آتیں۔ عسکری صاحب کو یہ کون بتائے کہ وہ نظمیں خود ان شاعروں کی سمجھ میں بھی تو نہیں آتیں جن کے "دماغ" سے ان کا ظہور ہوا ہے، پھر اگر عریب

نقادوں نے نہیں سمجھا تو کیا ہوا۔ غالب کے دور اول کے کلام کا کم از کم یہ حال تو تھا کہ خود وہ سمجھ لیتے تھے بلا سے کسی اور کے پتے کم پڑتا تھا۔

ہاں تو میں کہنے یہ جا رہا تھا کہ ترقی پسندوں کے یہاں زیادہ تر ایسا مال ہے جو مرعوب کرے تو کر دے متاثر نہیں کر سکتا۔ اگر کسی کے یہاں اپیل کرنے والی چیز ملتی ہے تو حیرت بھی ہوتی ہے اور مسرت بھی۔ احمد عظیم آبادی خود کو ترقی پسند طبقے کا ایک رکن کہتے ہیں اور خود بقول ان کے ترقی پسند ادب کی جانب ان کا رجحان اضطراری نہیں بلکہ غور و فکر کا نتیجہ ہے۔ وہ ادب کی فنی خوبیوں کو نظر انداز کر کے اور "عواسی ادب" کی تخلیق کر کے "سطحیت" پر آنا گوارا نہیں کرتے۔ وہ خود کو "موضوع زدگی" سے بچاتے رہے ہیں اور مواد کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی فنکارانہ پیش کش کو بھی اتنا ہی اہم سمجھتے ہیں۔ احمد عظیم آبادی کے یہ خیالات بجائے خود لائق ستائش ہیں اور اگر آج ان کے کلام میں زیادہ گہرائی اور گیرائی نہ بھی ہو تو اس بات کا سو فی صدی امکان ہے کہ اپنے ان خیالات کے پیش نظر وہ جو کچھ کہتے رہیں گے وہ بلند سے بلند تر اور خوب سے خوب تر ہوگا۔ ویسے ان کا موجودہ سرمایۂ کلام بھی ان کے نظریات کا روشن پرتو ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ ان کا کلام ابہام، پیچیدگی اور بڑھی ہوئی اشاریت سے پاک ہے اور وہ ہماری سمجھ میں آجاتا ہے اور دوسری چیز یہ ہے کہ انھوں نے شاعری کبھی بھی نہیں کی لیکن جو کچھ کہا ہے وہ شعر ہے اور شاعر ہی کی زبان میں ہے اور جس شاعر نے اپنے لئے یہ دونوں مرحلے طے کر لئے ہوں اس کے لئے آگے کی راہ چنداں مشکل نہیں۔ وہ نہ تو اس امر کو بھولے گا کہ وہ جو کچھ کہنے جا رہا ہے وہ دوسروں کے لئے ہے اور نہ وہ اس حقیقت سے غافل ہوگا کہ وہ خطیب، صحافی، صوفی، یا فلسفی نہیں بلکہ شاعر ہے۔

مخدوم کا ایک مصرع ہے کہ:۔ وقت کی پاپل سے ہم آواز ہے ساز جذبات

شکر ہے کہ احمد عظیم آبادی نے محض "وقت، آواز، اور جذبات" ہی کو نہیں اپنایا بلکہ "پاپل اور ساز" سے بھی اپنا رشتہ برقرار رکھا۔ "ساز بینہ" احمد عظیم آبادی کی شاعرانہ صلاحیتوں کا بھی اسی قدر آئینہ دار ہے جس قدر ان کی بیداری قلب و نظر کا۔

اس مجموعہ میں بائیس نظمیں، اٹھارہ غزلیں اور اٹھائیس رباعیاں ہیں لیکن یہ مختصر سا سرمایہ احمد عظیم آبادی کے فکر و فن کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔

مجھے رباعیوں اور غزلوں کا حصہ زیادہ باندار معلوم ہوا رباعیوں میں فکر کا بھی اتنا ہی زور ہے جتنا احساس کا

کانٹا بھی کبھی گلاب بن جاتا ہے — آنسو بھی کبھی شراب بن جاتا ہے
خورشید سے رو برو ملا کر آنکھیں — آئینہ بھی آفتاب بن جاتا ہے

کٹیا پہ جو پڑتا ہے محل کا سایہ — ہوتا ہے گراں کتنا یہ ہلکا سایہ
افلاس ہے یوں سایۂ زر میں جیسے — ہاتھ کے تیرہ ہو اجل کا سایہ

یا ظلمت شب مٹا دے کوئی — یا شمع صداقت ہی بجھا دے کوئی
یا شام کی ناگن کا کلیجہ چیرے — یا صبح کو زہر اب پلا دے کوئی

نادار کو مزدور کہا کرتے ہو — افلاس کو دستور کہا کرتے ہو
ہم خون شہیدان وطن کہتے ہیں لہو — تم خون کو سیندور کہا کرتے ہو

مذکورۂ بالا رباعیاں احمد عظیم آبادی کے فکر اور طرز فکر دونوں کی مکمل نمائندگی کرتی ہیں۔ احساس میں توانائی ہے، فکر میں صداقت ہے، اور بیان میں فن کا رچاؤ ہے۔ رباعی مشکل ترین صنف سخن ہے۔ اس میں قاری کے دماغ پر ایک اچانک اور خوشگوار ضرب پڑنی چاہئے۔ رباعی کا آخری مصرعہ خاص طور پر شاعر کا امتحان ہوتا ہے۔ اس آخری مصرع کو اسی قدر چونکانے والا، مصرع ہونا چاہئے جتنا منٹو کے افسانوں کا آخری جملہ ہوا کرتا ہے اس میں "دُرِ تہہ جام" کی قدری ہونی چاہئے، اور

احمد عظیم آبادی کی رباعیوں میں یہ کیف موجود ہے۔

غزلوں میں بھی شاعر کا انداز وہی ہے جو غزلیہ شاعر کا ہونا چاہئے۔ احمد عظیم آبادی فکر و فلسفہ کی طرف مائل نظر آتے ہیں، لیکن اپنی غزل کو غزل ہی رہنے دیتے ہیں ؎

اشک تھم جاتے ہیں جب سوز سوا ہوتا ہے — اوس اڑ جاتی ہے کچھ دھوپ نکل آنے سے
مژدہ باد اے لبِ منصور کہ اس دور میں بھی — بات بنتی ہے لبِ دار تک آجانے سے
اپنی ہی لذتِ لغزش سے گلہ ہے ورنہ — کون بہکا ہے کسی غیر کے بہکانے سے
جانے کیوں حلقۂ آہن سے بہلتا ہے جنوں — جانے کیا ربط ہے زنجیر کو دیوانے سے
اپنی وحشت کی قسم تیری فراست کی قسم — اور بڑھتا ہے جنوں عقل کے سمجھانے سے

یہ ایک غزل کے اشعار ہیں۔ ان سے اندازہ کیجئے کہ شاعر نے کیا کیا ہے اور کس طرح کہا ہے۔ اس دور کے بڑے سے بڑے ترقی پسند شاعر کی کوئی غزل لے لیجے احمد عظیم آبادی کی غزل مواد اور ہیئت دونوں اعتبار سے بہتر نہیں تو فروتر بھی نہ ہوگی۔ ان اشعار کو دیکھئے۔ ان میں فکر اور احساس کی کتنی دلکش مثالیں ہیں ؎

مجھے ڈبو گئی احمد رفاقتِ ساحل — قریبِ موج کناروں نے ساتھ چھوڑ دیا
کبھی ہم یوں بھی کھاتے ہیں فریبِ گشتِ آزادی — کہ شاخِ گل پہ خوشہ ہائے گندم دیکھ لیتے ہیں
چاک دامانی مری ہوتی گئی ہے دل عزیز — میرا اندازِ جنوں رسمِ جہاں ہوتا گیا
نگاہِ لکنۃ چیں نے آئینہ جس دن سے دیکھا ہے — متاعِ نقد کی بے مائگی کم ہوتی جاتی ہے
نظر عیبوں پہ میرے رکھنے والو — کوئی آئینہ رکھ لو بالمقابل

غرض کہ احمد عظیم آبادی کے یہاں خالی خولی سیٹھے پیکے جذبات نہیں جن کو ردیف و قوافی کی پابندیوں میں محبوس کر دیا گیا ہو بلکہ دل اور دماغ سے نکلے ہوئے وہ احساسات و خیالات ہیں جن کو فنکارانہ آرائش و زیبائش سے دلہن کی طرح سنوارا گیا ہے۔

احمد عظیم آبادی کی نظمیں بتاتی ہیں کہ انھیں ذرا اور محتاط ہونا چاہئے ان کی نظمیں شیطان کی آنت کی طرح طویل نہیں اور بڑی حد تک تکرارِ خیال اور تکرارِ بیان کے عیب سے پاک ہیں لیکن ان میں جامعیت کا فقدان نظر آتا ہے نظم کے وہ تین نقطے جو ابتدا، ارتقا، اور انتہا کے نام سے موسوم ہیں ہر نظم کے لئے ضروری ہیں۔ نظم کو آہستہ آہستہ بڑھنا چاہئے اور آخری حصہ کو سلیقے سے سمیٹ کر اس طرح قلم رکھ دینا چاہئے کہ اس کے بعد اضافے کی ضرورت ہو نہ گنجائش۔ ان کی نظمیں صاف ستھری تو ہوتی ہیں لیکن مذکورۂ بالا تین نقطوں کا نمایاں وجود مفقود ہے لیکن اس کے باوجود ان کی تمام نظموں میں بقول نیاز فتحپوری خیال کی تازگی و ندرت موجود ہے خواہ وہ پابند نظمیں ہوں یا معرّا۔

مجھے یہاں ایک بات اور بھی کہنی ہے۔ احمد عظیم آبادی کے یہاں معقولیت کا منھ چڑانے والی جدت نہ ہونے اور فن کی بے راہ روی کے شہ پائے جانے کے باوجود کہیں کہیں بیان کا کچّا پن موجود ہے جسے وہ اگر چاہتے تو خود دور کر سکتے تھے۔ انھوں نے نہیں نہیں الفاظ کا صحیح استعمال نہیں کیا ہے لیکن ان کی نوعیت ایسی ہے کہ ہم اسے شاعر کی "لاپروائی" سے تعبیر کر سکتے ہیں "ہٹ دھرمی" سے نہیں — جیسے جیسے وقت گزرتا جائیگا احمد عظیم آبادی کے کلام میں فنی خوبیاں بڑھتی جائینگی اسلئے کہ وہ فن کے پیچھے دوڑ رہے ہیں فن نے کے آگے نہیں — اب چلتے چلتے احمد عظیم آبادی کے دو چار شعر سن لیجئے اور مجھے اجازت دیجئے ؎

شبِ تنہائی میں جب بھی تمہاری یاد آتی ہے — تو ہم حسرت سے سمتِ بزمِ انجم دیکھ لیتے ہیں
آنسوؤں کی التجا صرفِ تبسم ہو گئی — آپ کی تصویر کے سینے میں شاید دل نہیں
کہیں دل میں چھپ نہ جائے کہیں زخم دکھ نہ جائے
کوئی نار کہہ رہا ہے کسی پھول کی کہانی
عالمِ انتظار میں احمد — اب کسی کا بھی انتظار نہیں

— قمر رئیس

غالب کی مثنوی نگاری

(ایک استفسار کے جواب میں)

(اڈیٹر)

جب کسی شاعر کا کلام ہمارے سامنے ہوتا ہے تو ہم اس کی قوتِ شاعری کا اندازہ یا اُس کا صحیح میلانِ طبع جن اصنافِ سخن کو دیکھ کر معلوم کرتے ہیں وہ غزل، قصیدہ اور مثنوی ہیں (قطعہ اور رباعی کا ذکر میں نے اس لئے نہیں کیا کہ محض قطعات و رباعیات کے لحاظ سے شہرت حاصل کرنے والے کم ہیں اور ایسے تو بہت ہی کم ہیں جن کی عمر کا ماحصل صرف یہی ہو) اور انھیں کا ذخیرہ اُردو فارسی میں کثرت سے موجود ہے۔

میں کسی طرح ماننے کے لئے طیار نہیں کہ ایک شاعر ان تینوں اصنافِ سخن میں یکساں قدرت رکھ سکتا ہے، کیونکہ بلحاظ شعر ہونے کے جس طرح یہ تینوں ایک ہی چیز نظر آتی ہیں، اسی طرح اپنے داعیات کے لحاظ سے ایک دوسرے کے منافی بھی ہیں۔ کیونکہ ان میں سے ہر ایک کا مقصود علٰحدہ ہے اور مقصود کی علٰحدگی حقیقتاً خیال کی علٰحدگی، زبان کی علٰحدگی ہے۔

قصیدہ و غزل کے فرق کو پیشِ نظر رکھ کر جب آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ ایک قصیدہ گو فیلسوف ہو سکتا ہے، خلاق معانی ہو سکتا ہے، ماہر لسانیات ہو سکتا ہے اور اگر اس کے دماغ کو مادی دُنیا کے مطالعہ کا موقع ملے تو ایک کامیاب تاجر، ہوشیار ماہرِ سیاست وغیرہ موجد و مخترع بھی ہو سکتا ہے، لیکن اس سے ہمدردی کو توقع رکھنا اس کے اندر جذبۂ ایثار و خدمت کی جستجو کرنا یا اس کا درستی اخلاق کی طرف مایل ہونا اور دُنیا میں اپنے آپ کو رحمت و برکت کی صورت سے پیش کرنا خلافِ عقل ہے۔ اسی طرح ایک اچھا غزل گو محبت میں قربانیاں کر سکتا ہے۔ ایک مفید متمدن انسان بن سکتا ہے۔ روحانیت میں ترقی کر کے وہ ایثار کرنے والا مصلح اور اپنے اوپر تکلیف اُٹھا کر دوسروں کے لئے امن و سکون کی راہیں نکالنے والا مردِ صالح بن سکتا ہے، لیکن اس سے یہ توقع کرنا کہ وہ مادی ترقی کی راہیں سوچے، سیاسیات میں ترقی کرے اور علوم و فنون کی اعانت کرے، بالکل عبث ہے۔

پھر جب ان دونوں کی راہیں اس قدر علٰحدہ علٰحدہ ہیں تو کیونکر ممکن ہے کہ ایک کامیاب قصیدہ گو، کامیاب غزل گو اور اچھا غزل کہنے والا اچھا قصیدہ خوان ہو سکتا ہے۔ خاقانی کا سارا کلام پڑھ جایئے۔ انوری کا سارا کلیات ختم کر جایئے، لیکن سعدی کی ان دو شعروں میں کسی ایک مصرعہ کا بھی جواب آپ کو نہ ملے گا۔

سرو سیمیا بصحرا میدوی ۔۔۔ نیک بدعہدی کہ بے مامیروی

دیدۂ سعدی و دل ہمراہ تست ۔۔۔ تا نہ پنداری کہ تنہا می میروی

خاقانی، غمِ عشق کا ذکر بھی کرتا ہے تو ان الفاظ میں

غم تخم شرمی ست کہ در یکدل افگنم ۔۔۔ درویست جنس من کہ بیک دن درآورم

کہ اگر حقیقتاً کسی پر کوئی کیفِ محبت طاری ہو تو بھی اس شعر کو سُن کر فوراً دور ہو جائے، الغرض قصیدہ یا غزل کے معیار بالکل جدا جدا ہیں اور مجھے حیرت ہوتی ہے کہ وہ لوگ جو اچھی غزل کہہ سکتے ہیں، کیونکر قصیدہ گوئی کی جرأت کرتے ہیں یا قصیدہ میں کامیاب ہونے والے غزل کی طرف کیوں مایل ہوتے ہیں۔

جس طرح قصیدہ و غزل کے لئے الگ الگ رنگ طبیعت درکار ہے اسی طرح مثنوی کے لئے بھی خاص دماغ چاہئے۔ مثنوی چونکہ بالکل مسلسل نظم ہوتی ہے اور اس میں واقعات سلسلہ کے ساتھ بیان کئے جاتے ہیں اس لئے اس میں وہی شخص کامیاب ہو سکتا ہے جو نہ صرف عام مطالعۂ جزئیات پر قادر ہے بلکہ بغیر کسی غیر ضروری رنگ آمیزی کے ان کو ظاہر کرنے کی بھی قدرت رکھتا ہے، کیونکہ اگر اس میں مبالغہ وغیرہ سے کام لیا گیا تو واقعات کی اصلی ہیئت خراب ہو جائے گی اور مثنوی کا حسن غارت۔ اس کے لئے ایک ایسے نقاد و مصور کی ضرورت ہے جو مختلف رنگوں کے امتزاج سے واقف ہونے کے بعد اُن کو متمایز بھی کر سکتا ہے اور اس امتزاج و تفریق کے اظہار و بیان پر بھی قادر ہے۔ اسی لئے مثنوی کی زبان کا سادہ اور اس کی تشبیہات کا سریع الانتقال الی الذہن ہونا بالکل ضروری ہے اس میں مغلق و دشوار الفاظ، پیچیدہ ترکیبوں کا پایا جانا بالکل ایسا ہی تکلیف دہ ہوتا ہے جیسے گرمی کی خنک چاندنی رات میں چاند کے اوپر بادل کا چھا جانا۔

اس مختصر بیان سے غالباً یہ امر واضح ہو گیا ہوگا کہ غزل، قصیدہ، مثنوی کی شاعری میں کیا فرق ہے اور ان تینوں کے لئے علٰحدہ علٰحدہ کن خصوصیات کا وجود ضروری ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ شبہ ضرور پیدا ہوتا ہے کہ بعض ایسے شاعر بھی ہوئے ہیں جنھوں نے قصیدہ و غزل دونوں میں شہرت حاصل کی اس لئے اگر ان تینوں کے لئے اس قدر تمایز طبائع درکار ہیں تو پھر اس جمع اضداد کے کیا معنی۔ یہ شبہ ایک حد تک بظاہر صحیح معلوم ہوتا ہے، لیکن حقیقتاً نادرست ہے، کیونکہ اگر ایسے شعراء کے کلام کا بغور مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ وضع تو ہوئے تھے صرف ایک ہی صنف سخن کے لئے لیکن کوئی ایسی خصوصیت جو عمومی طور پر سامع کے ذہن و خیال کو متوجہ کر سکتی ہے ان میں پائی جاتی تھی اور اس کے اشتراک نے ان کے تمام اصناف سخن کو فی الجملہ دلچسپ بنا دیا۔ علاوہ اس کے بعض ایسے شاعر بھی ہوتے ہیں جو قدرت کی طرف سے کسی صنف سخن کے لئے مخصوص دماغ لے کر نہیں آتے اور سب میں دخل دے سکتے ہیں۔ پھر چونکہ ان کا ذہن بہت رسا اور محل شناس ہوتا ہے اس لئے وہ ہر موقع کی خصوصیات کا لحاظ کر کے اپنے لئے کچھ نہ کچھ امتیاز پیدا ہی کر لیتے ہیں، یا پھر ان میں کوئی ایسی خاص بات ہوتی ہے، جس کا اظہار ہر صنف سخن میں ایک کیفیت پیدا کر دیتا ہے۔ ایسے شاعروں کے تسمیہ کے لئے انگریزی کا ایک لفظ (FACTOTUM) بہت موزوں ہے (جس کا ترجمہ فوربس نے ہر گُنا، ہر بابی یا ہر کارہ کیا ہے)

اس کی مزید وضاحت کے لئے یوں سمجھ لیجئے کہ موسیقی داں طبقہ میں ایک جماعت دھرپدیوں کی کہلاتی ہے جو صرف اُصولی طور پر ایک خاص گانے کی مشق کرتے ہیں اور اس میں ان کی زندگی صرف ہو جاتی ہے، بعض صرف خیال گاتے ہیں۔ بعض ٹھمری اچھی طرح ادا کرتے ہیں لیکن بعض ایسے ہوتے ہیں جو دھرپد، خیال اور ٹھمری تینوں میں دخل رکھتے ہیں اور ان کی قدرتی خوش گلوئی کا اثر ہمیں اس قدر مسحور کر لیتا ہے کہ ہم سمجھنا ہی نہیں چاہتے کہ یہ شخص حقیقتاً ماہر کس چیز کا ہے۔ بالکل یہی حال بعض شاعروں کا ہے کہ اُن کی رنگیں بیانی، یا اسلوب ادا، یا کوئی ایسی ہی اور خصوصیت ہم کو اس درجہ متاثر کر لیتی ہے کہ ہم اُسے ہر گُنا سمجھنے لگتے ہیں، یا یہ کہ اس پر غور ہی نہیں کرتے

مثلاً سعدی اپنی غزل گوئی کے لحاظ سے یا خاقانی اور انوری قصیدہ گوئی کی حیثیت سے بالکل ایک ایسے دھرپدیے کی حیثیت رکھتے ہیں جس میں کوئی اور خصوصیت ایسی نہیں ہے جو ان کو موسیقی کے کسی اور صنف میں کامیاب بنا سکے، برخلاف اس کے امیر خسرو، عرفی، اور غالب اس گویئے کی طرح ہیں جس کی خوش گلوئی اُسے ہر رنگ میں کامیاب کر کے دکھا دیتی ہے۔ حالانکہ وہ ماہر کسی کا نہیں ہے یا صرف ایک چیز کا ہے۔

آپ نے عرفی کے کلام کا مطالعہ کیا ہوگا اور اس کے قصاید کو دیکھ کر یہ حکم لگایا ہوگا کہ یہ قصاید ہی کے لئے وضع ہوا تھا، حالانکہ حقیقت یہ نہ تھی میرے نزدیک وہ صرف رنگین غزل گوئی کے لئے پیدا ہوا تھا۔ (صحیح تغزل سعدی کا اس کے یہاں بھی نہیں) لیکن چونکہ زبان کی رنگینی خیال کی لطافت، اسلوب بیان کی ملاحت ایک ایسی چیز ہے جو اپنا اثر پیدا کئے بغیر نہیں رہتی اس لئے ایک شخص اُس کے قصاید میں ان خصوصیات کو دیکھ کر یہی سمجھنے لگتا ہے کہ وہ قصیدہ گوئی کے لئے پیدا ہوا تھا۔ یہاں ایک شبہ پیدا ہو سکتا ہے کہ اگر عرفی صرف غزلگو شاعر تھا تو اس کا دیوان کیوں بھیکا ہے لیکن اس کا سبب صرف یہ تھا کہ زمانہ کی ضرورت نے اس کو مجبور کیا تھا کہ وہ قصاید ہی کی طرف توجہ کرے

اور اپنے کمال کی قوت اسی صنف میں ظاہر کرے، چنانچہ وہ اس میں کامیاب ہوا اور تمام وہ رنگینیاں، تمام وہ حلاوتیں، تمام وہ لوچ جو غزل ہی کے لئے مخصوص ہیں اس کے قصاید میں پیدا ہوگئے۔ پھر یہ آپ کو اختیار ہے کہ اس کی ان نظموں کو آپ قصاید کہئے یا کچھ اور لیکن میں تو اس کے قصاید کو ہمیشہ غزل سمجھ کر لطف اٹھاتا ہوں۔

عرفی کے وہ قصاید جن میں سے قصیدہ کا تمام شوکت و دبدبہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، صرف چند ہیں لیکن وہ اپنی فطری غزل گوئی سے یہاں بھی مجبور ہوگیا۔ انھیں چند میں سے اس کا ایک قصیدہ نعتیہ میں ہے جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

سپیدہ دم چو زدم آستیں بہ شمع شعور — شنیدم آیۂ استفتحو از عالم نور

اور یقیناً قصیدہ کا خالص رنگ رکھتا ہے، لیکن دوسرے ہی شعر سے فوراً یہ رنگ اس طرح تبدیل ہوجاتا ہے:-

بدل ز شاہد بزم ازل ندا آمد، — کہ اے تمام وفا از رضائے مابس دور
زہے اطاعت حسن ادب فہے طاعت — کہ با اجازت مائی ز وصل ما مہجور،
زیادہ زیں نہ علالست دوری از بر ما — اگر بحوصلہ تازی در آ بہ بزم حضور
طلب بیار دسترس از متاع منع کلیم، — بساط عذر میار اکہ نیستی معذور
اگر بچشمۂ مقصود دست عشوۂ ما، — شکست ساغر امید او بسنگ فتور،
ز کوتہی دعطا بود عشق مید اند، — کہ بر کرشمۂ مانگ بود نلعت طور،

اسی طرح کا ایک دوسرا نعتیہ قصیدہ ہے جو اس شعر سے شروع ہوتا ہے:

اقبال کرم میگزد ارباب ہم را، — ہمت سخور دنیشتر لاونعم را،

کیسا پرشوکت شعر ہے، لیکن دوسرا شعر ملاحظہ ہو:-

از رغبت دنیا الم آشوب نگردم — زیں باد پریشاں نکنم زلف الم را

زلف کا خیال آ ہی گیا۔ اس سے زیادہ لطف وہاں پیدا ہوتا ہے جب اسی قصیدہ میں آگے چل کر وہ حدوث و قدم جیسے خشک الفاظ کا استعمال اس طرح کرتا ہے:-

تقدیر بیک ناقہ نشاند دو محمل، — سلمائے حدوث تو و لیلائے قدم را

یہاں بھی اس کا کام بغیر سلمٰی اور لیلیٰ کے ذکر کے نہ چل سکا۔

یہ حال اس قصیدہ کا ہے جہاں وہ حدود غزل گوئی سے بہت بچ کر گیا ہے، لیکن جو قصاید اس نے پوری تغزل کی کیفیت پیدا کر کے کہے ہیں وہاں تو ان جواہر پاروں کا انبار نظر آتا ہے۔ آپ نے اس کا وہ مشہور قصیدہ دیکھا ہوگا جس کا پہلا شعر یہ ہے:-

جہاں بگردم و در دا بہیچ شہر و دیار — نیافتم کہ فروشند بخت در بازار

اور اس میں آپ نے ان قسموں سے بھی لطف اٹھایا ہوگا جو عرفی نے کھائی ہیں، پھر آپ ہی انصاف کیجئے کہ کیا غزل کے لئے اس سے زیادہ کسی اور کیفیت کی ضرورت ہے۔ سب سے پہلے وہ خدا کی قسم کھاتا ہے لیکن اس انداز سے:

بداں خدائے کہ در شہر بند امکاں نیست — متاع معرفتش نیم ذرہ در بازار

اس کے بعد وہ اور چند قسمیں کھا کر آخر کار ان قسموں پر آجاتا ہے:

بہ عشوۂ کہ زلیخا ہر ید از و کف دست — بہ فتنۂ کہ مسیحا گزید از و سر دار
بہ برقع مہ کنعاں کہ بود حسن آباد — بہ حجلہ گاہ زلیخا کہ بود یوسف زار
بہ آں متاع کہ گو ہر فروش کنعانی — بمصر بردو لباس زحسن شد بازار

بہ آں دروغ کہ فرہاد از دشہادت یافت — بہ آں ترانہ کہ منصور را کشید بدار
بہ ناقۂ کہ بہ لیلےٰ خیال مجنوں بُرد — بہ آں کرشمہ کہ لیلیٰ ہر آں نمود نثار
بہ یک اشارۂ کہ ہر اطراف صورتِ شیریں — ہمہ کرشمہ ترا شہد و ریخت بر کہسار
بہ نیم قطرہ شرابے کہ باز می ماند — پس از پیالہ کشیدن بہ ساغر از لب یار

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اشعار غزل کے نہیں ہیں۔ دوسرے قصیدوں کے اور چند اشعار ملاحظہ فرمایئے:

دمیکہ لشکرِ غم صف کشد بجانخواری — دلم بنالہ دہد منصب عماری
خراب فرصتِ مستانۂ توام کہ نہد — ہزار شیوۂ مستی بہ طبعِ ہوشیاری
دراں دیار کہ سودا رود دلم کہ دہند — بہائے لال بہ نعمر ابد بہ بسیاری

از در دوست چو گویم بچہ عنواں رفتم — ہمہ شوق آمدہ بودم ہمہ حرماں رفتم
دل و دیں و خرد و ہوش و زبان بازم دہ — تا بگویم ز در دوست بہ ساماں رفتم
منعم آں غنچۂ پژمردہ کہ از باد خزاں — خندہ بر لب گرہ و سر بہ گریباں رفتم

بیا کہ باد دلم آں حی کند پریشانی — کہ غمزۂ تو نکرد است با مسلمانی
ز دیدہ رفتی و مردم ہماں نفس فرزاد — کہ بے تو مردم و انگہ نہ بیں بآسانی
کسے کہ تشنہ لب ناز تست میداند — کہ موج آب حیات ست چین پیشانی

دہ بہشت غمزۂ اسلام دشمنت کہ دو روز — متاعِ حسن تو سرمایۂ تہید ستی
لبِ تو جرعہ دہِ بادۂ دل آشوبی — خیالِ زلف تو مجموعۂ پریشانی
گلِ کرشمہ بخند و چو چشم باز کنی — غمِ تو شانۂ کش طرۂ تن آسانی

باز گلہا بگ پریشاں می زنم — آستینے در عنداں می زنم
جلوۂ گل بہرہ من بستند و من — سر بدیوار گلستاں می زنم

میرے نزدیک یہ اشعار اور اسی قسم کے سیکڑوں شعر جن سے "قصائد عرفی" بھرے پڑے ہیں بالکل رنگین غزل گوئی کے تحت آتے ہیں۔

میں سلسلۂ کلام میں خدا جانے کہاں سے کہاں پہونچ گیا، بہرحال مدعا یہ ہے کہ بعض شعراء اپنے کلام میں بعض ایسی خصوصیات رکھتے ہیں کہ ان کے متعلق یہ حکم لگانا کہ ان کا صحیح رنگ طبیعت کیا ہے، مشکل ہو جاتا ہے، اور میری رائے میں غالب بھی انھیں میں سے ایک ہے۔ غالب کے فارسی کلام کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ جزوِ اعظم اس کے کلام کا بھی وہی رنگین بیانی ہے اور یہی اس کے کامیابی کا راز ہے ورنہ حقیقتاً وہ غزل گو تھا نہ کہ قصیدہ گو، مثنوی تو خیر چیز ہی اور ہے۔ قصائد میں اس نے بالکل عرفی کی تقلید کی اور اتنی کامل تقلید کہ مشکل سے دونوں میں امتیاز پیدا کر سکتے ہیں۔ چنانچہ وہ خود بھی اس کو محسوس کر کے کہتا ہے:

کیفیتِ عرفی طلب از طینتِ غالب — جامِ دگراں بادۂ شیراز ندارد

غزل میں اس نے نظیری اور بے دل کے رنگ کو اعتدال کے ساتھ ملا کر پیش کیا اور اس حسن کے ساتھ کہ اس سے زیادہ ممکن نہ تھا بیدل سے فایدہ اٹھانے کا اعلان اس نے اپنے آردو دیوان میں کیا ہے، اور نظیری کی پیروی کو یوں ظاہر کرتا ہے:

ز فیضِ نطق خوشم با نظیری ہمزباں غالب — چراغے را کہ دودے ہست در سر زود در گیرد

مدعا یہ کہ جو شمع نظیر جی کی ذات سے روشن تھی اسے اب غالب نے روشن کیا ہے۔

اب رہا مثنوی کا مسئلہ، سو غالب مثنوی کہنے کے لئے یقیناً وضع نہ ہوا تھا اور نہ صحیح معنی میں اس نے کوئی مثنوی کہی، لیکن چونکہ بادۂ شیراز کی اس کے ہاں کمی نہ تھی اس لئے مثنوی کے نام سے بھی اس نے جو کچھ کہا وہ رنگ و کیفیت سے خالی نہ رہا۔

کلیات غالب میں گیارہ مثنویاں نظر آتی ہیں، جن میں دس تو ایسی ہیں جو بہت مختصر ہیں اور جن کا موضوع مدح، تقریظ اور تہنیت وغیرہ ہے جنھیں مثنوی سے کوئی علاقہ نہیں۔ گیارھویں مثنوی جس کا عنوان ابرِ گہربار ہے بے شک طویل بھی ہے اور موضوع و ترتیب کے لحاظ سے بھی مثنوی کے تحت آتی ہے، اس میں حمد، نعت، منقبت، مناجات، حکایت، ساقی نامہ، مغنی نامہ سبھی کچھ ہے اور غالب کی طرف سے اگر کوئی کامیاب نمونہ مثنوی کا پیش کیا جا سکتا ہے تو یہی ہے۔

حمد و نعت یا مناجات کے لئے جس عجز و فنا دگی کی ضرورت ہے وہ بیشک اس کے کلام میں پیدا نہیں ہوئی کیونکہ یہ اس کا رنگ نہ تھا، لیکن جہاں تک جذبات کی بلندی خیال کی پاکیزگی زبان کی صلاحیت کا تعلق ہے وہ ان میں بھی پائی جاتی ہے۔ مگر اس مثنوی کا بہترین حصہ وہ ہے جہاں محشر کا منظر پیش کر کے خدا کے سامنے اپنی شکایات کا دفتر کھولتا ہے۔

ایک شاعر کے کلام کا بہترین حصہ وہ ہوتا ہے جس میں وہ بے اختیار ہو کر اپنے آپ کو ظاہر کرنے لگتا ہے اور مثنوی کے اس حصہ میں غالب نے اپنے آپ کو اس قدر تکمیل کے ساتھ ظاہر کر دیا ہے کہ اگر کوئی چاہے تو اس سے غالب کی زندگی کے تمام جذبات کا مطالعہ بیک وقت کر سکتا ہے۔ محشر میں نیکوں اور بدوں کے اجتماع کے ساتھ اپنے وجود کا ذکر کرتا ہے:

بروزے کہ مردم شود انجمن — شود تازہ پیوند جانہا بہ تن
رواں را بہ نیکی نوا زندگاں — بسرمایۂ خویش نازندگاں
گہرہائے شہوار پیش آورند — فروہیدہ کردار پیش آورند
زنورے کہ ریزند در من کنند — جہاں را بخود چشم روشن کنند
بہ ہنگامہ ہا ایں جگر گوشگاں — در آیند مشتے جگر توشگاں
زحسرت بہ دل بردہ دنداں فرد — زخجلت سر اندر گریباں فرد
دراں حلقہ من ہاشم و سہ بنہ — زغمہائے ایام گنجینہ
در آب و در آتش بسر بردۂ — ز دشواریِ زیستن مردۂ

اس کے بعد اور بہت سے شعر لکھ کر کہتا ہے:

حساب مے و رامش و رنگ و بوئے — زجمشید و بہرام و پرویز جوئے
کہ از بادہ تا چہرہ افروختند — دلِ دشمن و چشم بد سوختند
نہ از من کہ از تاب مے گاہ گاہ — بدیبوزہ رخ کردہ باشم سیاہ

یعنی کہاں تک ضبط کروں دل خون ہو گیا اور پیروں بھی جب تو مغیر کے سب کچھ جاتا ہے تو نہ کہنے سے کیا فائدہ۔ تجھے معلوم ہے کہ میں نے کافروں نہ گبرو ترسا نہ میں نے کسی کا خون کیا نہ راہزنی کی۔ البتہ اگر کوئی قصور ہوا ہے تو صرف یہ کہ شراب پی ہے، سو اس کا معاوضہ اگر کچھ ہے تو جمشید و بہرام وغیرہ سے ہونا چاہئے جن کی عمر ہی اس کی لطف میں بسر ہو گئی نہ کہ میں کبھی مجبور ہو کر پی بھی تو گدائی کر کے اور اس شان کے ساتھ کہ:

نہ بستاں سرائے نہ میخانۂ — نہ دستاں سرائے نہ جانانۂ
نہ رقصِ پری پیکراں ہر بساط — نہ طوغائے رامشگراں در رباط

اس کے بعد وہ اس خیال کو ظاہر کرتا ہے کہ خدا جانے کتنی بہاریں، کتنی برساتیں اور کتنی چاندنی راتیں، بے سر و سامانی اور بادہ نوشی کی

کی حسرتوں میں گزر گئیں، اگر کوئی سامان مہیا ہوا بھی تو "رقص بسمل" کی طرح ناپایدار، نہ دنیا میں مجھے کوئی ایسا قدر دان! دشناہ ملا جو مجھے مالا مال کر دیتا نہ کوئی ایسا معشوق ملا جو اسباب لطف پیدا کر دیتا۔ غالب کے الفاظ یہ ہیں:-

بسا روزگاراں بدلداد گی، بسا نو بہاراں بہ بے باد گی
بسا روز باراں و شبہائے آہ دبودست بے سیہ چشم سیاہ
افتہا بہ از ابر بہمن مہی، سفالینہ جام من از مے تہی
بہاران من در غم برگ و ساز دبر خانہ از بے نوائی فراز
جہاں از گل و لالہ پر بوئے و رنگ من و حجرۂ و دامنے زیر سنگ
دم عیش جز رقص بسمل نہ بود باندازۂ خواہش دل نہ بود،
اگر تافتم رشتہ گوہر شکست دگر یافتم بادہ ساغر شکست
بگیتی دمم بے نوا داشتی دلم را اسیر ہوا داشتی
نہ بخشندہ شاہے کہ بارم دہد ۲ سبکبار زیبلی بارم دہد
نہ نازک نگارے کہ نازش کشم ۲ ہر پوسہ زلف و رازش کشم

اس کے بعد وہ یہ خیال ظاہر کرتا ہے کہ اگر میں فردوس گیا تو بھی وہاں کیا خاک لطف آئے گا۔ اگر وہاں صہبوحی پی بھی تو جام بلور زہرۂ صبح اور ابر کا جھوم جھوم کر آنا کہاں؟ حور ملی بھی تو اس سے کیا لطف۔ معشوق کے ملنے کا لطف یہ ہے کہ پہلے اس سے فراق ہو، ہم ملائیں وہ گریز کرے، قسمیں کھائے اور وعدہ پورا نہ کرے اس کے علاوہ فردوس میں نظر بازی کا بھی کوئی لطف نہیں اور نہ وہاں دیوار میں کوئی روزن کہ اس سے جھانک تانک کیجائے وغیرہ وغیرہ غالب اس خیال کو جس تاثر و کیفیت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔ اس کا حسن اسی کے الفاظ میں دیکھنا چاہئے:-

چو آں نامرادی بیاد آیدم بفردوس ہم دل نیا سایدم
دلے را کہ کہتر شکیبد بباغ در آتش چہ سوزی بسوز ندہ داغ
صبوحی خورم در شراب طہور کجا زہرۂ صبح و جام بلور
دم شیر دیہائے مستانہ کو بہنگامہ غوغائے مستانہ کو
سیہ مستی ابر و باراں کجا خزاں چوں نباشد بہاراں کجا
اگر حور، در دل خیالش کہ چہ غم ہجر و ذوق وصالش کہ چہ
چہ منت نہد ناشناسا نگار چہ لذت دہد وصل بے انتظار
گریزد دمم بوسہ افشن کجا فریبد بہ سوگند و نیش کجا،
برو حکم و نبود بلبش تلخ گوئے دہد کام و نبود دلش کام جوئے
نظر بازی و ذوق دیدار کو بفردوس روزن بدیوار کو
نہ چشم آرزو مند و لالہ نہ دل تشنۂ آہ پر کالہ

اس کے بعد کہتا ہے کہ پھر جب میری حسرتوں اور ناکامیوں کا یہ عالم ہوگا تو

بفرمائے کایں دادری چہاں بود کہ از جیرم من حسرت افزوں بود

مثنوی کے اس نقطہ میں گویا غالب نے اپنے اس شعر کی تشریح بیان کی ہے!

ناکردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد یارب اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے

یا یوں سمجھئے کہ مثنوی کے اس حصہ کا خلاصہ اس شعر میں آگیا ہے۔ قصیدہ، غزل، مثنوی اور مرثیہ غالب کی ہر قسم کی شاعری میں مبالغہ اور نازک خیالی سے کام لیا گیا ہے اور ان کے مضامین کے بیان میں خاص ملکہ رکھتے تھے اور اسی لئے مثنوی میں جب یہ نقطہ آگیا تو انھوں نے کچھ بیان کر دیا، اور یوں مثنوی کی بیانیہ شاعری کا وہ رخ نہ ہوئے سکے۔

گاہے گاہے باز خواں ——!"

ایک معارضہ کے جواب میں

(بقائے روح و معاد)

معارضہ — (۱) آپ یہ باور نہیں کرتے کہ خدا (فعال لما یرید) ہے اور عالم کی ایک ایک چیز اور اس کے ایک ایک ذرے کی نگرانی کرتا ہے

(۲) آپ بقائے روح، حیات بعد الموت یا معاد کے قایل نہیں، بہرحال آپ اس کے قوایل ہیں کہ اسلام دنیا کا آخری اور خطری مذہب ہے پھر اگر یہ وہی اسلام ہے جسے قرآن مجید پیش کرتا ہے تو کیا آپ قرآن مجید سے نمبر (۱) و (۲) پہ کوئی دلیل پیش کر سکیں گے۔

بقائے روح کے باب میں آپ غالباً مغرب کے تازہ اکتشافات سے بے خبر نہ ہوں گے۔

میں آخرت کا قایل ہوں، اس لئے کہ:

(۱) لفظ دنیا آخرت پر دلالت کرتا ہے۔

(۲) آخرت دنیا کے لئے انتہائی بے نفسی کے ساتھ نیکی کئے جانے کی تعلیم ہے، پھر جب یہ نہیں کہا جا سکتا اور یقیناً نہیں کہا جا سکتا کہ ہر طاعت کا ثواب اور ہر گناہ کا عذاب ——— یا آپ کے زنگ میں ہر طاعت کا واقعی عذاب اور ہر گناہ کا واقعی ثواب انسان کو اسی دنیا میں مل جاتا ہے، تو پھر کیا وجہ ہے کہ اس شک کو یقین سے بدلنے کے لئے ایک یوم آخرت تسلیم نہ کر لیا جائے۔

(۳) بدرجہ آخر آخرت پر جناب علی کرم اللہ وجہہ کے اس منطقی استدلال کو دیکھئے جسے سن کر ایک یہودی حلقہ بگوش اسلام ہوا۔ یعنی اگر اس دنیا کے بعد کچھ نہیں تو نیک و بد کی جزا و سزا میں مسلم اور غیر مسلم دونوں برابر ہیں لیکن اگر آخرت ایک امر واقعی ہے تو پھر نقصان میں کون رہتا ہے اور نفع میں کون۔

چنانچہ میں اگر آخرت کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہوں تو اس میں کیا "حرج" ہے۔

میرا یہ کہنا کہ:— "خدا ایک ایک چیز، ایک ایک ذرہ کی نگرانی نہیں کرتا" صرف یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ انفرادی طور پر (Individually) کائنات کی ہر ہر چیز کے لئے اپنی قوت کو منقسم نہیں کرتا، بلکہ مجموعی طور پر تمام نظام عالم کے لئے چند اصول و ضوابط مقرر ہیں اور انہیں کے تحت یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

آپ کپڑا بننے کے کسی بڑے کارخانے میں ضرور کبھی نہ کبھی "شریف" لے گئے ہوں گے اور آپ نے دیکھا ہوگا کہ وہاں ہزاروں "کرگھے" خود بخود چل رہے ہیں، کپڑا بنا جا رہا ہے۔ روئی اپنے کپڑے کو لپیٹ رہی ہے۔ درآں حالیکہ وہاں کوئی انسانی ہاتھ موجود نہیں ——— پھر تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ کارخانہ کا انجینیر بجلی یا بھاپ کی مدد سے مشین کو حرکت دے کر عمومی طور پر یہ ہر ہر کام کی نگرانی کر رہا ہے لیکن یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ مشین کے ہر ہر پرزے کی نبشش کرنے کے ہر ہر تار کا اوپر نیچے ہونا، ایک ایک بنوٹے کا روئی کا علیحدہ ہونا، ایک ایک پونی کا طیار ہونا، ان سب پر انجینیر کی نگاہ ہے۔

پھر چونکہ انجینیر کے ہاتھ میں بھاپ یا بجلی کی وہ قوت موجود ہے۔ جس سے تمام کام انجام پا رہے ہیں، اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ

تمام کارخانوں کا نگراں ہے لیکن یہ کہنا کہ کارخانہ کے ہزاروں لاکھوں چھوٹے چھوٹے کاموں پر بھی علٰحدہ علٰحدہ اس کی نگاہ ہے کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔

۲ - بقاء روح اور مواد کے متعلق آپ کا مجھ سے مطالبہ ہے کہ اگر میں اسلام کو دنیا کا آخری فطری مذہب تسلیم کرتا ہوں، تو مجھے قرآن مجید سے ثابت کرنا چاہئے کہ بقاء روح اور معاد دونوں خیال صحیح نہیں ہیں۔ اسی کے ساتھ آپ نے نمبر ۱ کا بھی ثبوت قرآن پاک سے طلب کیا ہے۔

میرے عزیز دوست، آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں تو ان باتوں کا منکر ہوں، یعنی میں آپ کے اس دعوے کو نہیں مانتا کہ خدا ہر ہر ذرہ پر انفرادی طور سے نگرانی کرتا ہے اور اسے بھی تسلیم نہیں کرتا کہ روح باقی رہتی ہے اور حیات بعد الممات کوئی چیز ہے۔ اس لئے اصولاً پہلے آپ کو اس دعویٰ پر دلیل پیش کرنا چاہئے نہ کہ مجھے ـــــ آپ جس سے پوچھیں گے وہ بتا دے گا کہ ثبوت پیش کرنا اس شخص کا کام ہے جو کسی بات کا اقرار کرتا ہو یا کرانا چاہتا ہو، منکر یا تو آپ کی دلیل سے قایل ہو کر آپ کا ہمنوا ہو جائے گا یا آپ کے دلایل کی کمزوری کو ثابت کر کے دوسرا ثبوت آپ سے چاہے گا، اس لئے براہِ کرم پہلے آپ ہی کلام مجید سے یہ ثابت کیجئے کہ جو کچھ آپ فرما رہے ہیں وہ درست ہے، پھر میں بتاؤں گا کہ آپ کے دلایل کن وجوہ کی بنا پر ناقابل تسلیم ہیں۔

آپ مجھ سے پوچھتے ہیں کہ روح کے باب میں مغرب کے تازہ انکشافات سے غالباً میں بے خبر ہوں گا ـــــ یقیناً میں بے خبر نہیں ہوں، اور نہایت وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ مکر و فریب کا اتنا بڑا جال شاید ہی دنیا میں کبھی پھیلایا گیا ہو۔ اگر آپ نے امریکن کی شایع کی ہوئی وہ رپورٹ آپ کے سامنے ہے جو ایک کمیشن نے تمام بلاد یورپ کی سیاحت کرنے کے بعد مرتب کی تھی تو آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ اس وقت تک جتنے روحانیین یورپ میں پائے جاتے ہیں، ان میں سے ۹۰ فیصدی مکار و شعبدہ باز ہیں اور باقی دس فی صدی وہ ہیں جو اس فریب میں مبتلا ہونے کے بعد قصور فہم کی وجہ سے فریب کو حقیقت باور کرنے لگے ہیں۔

۳ - آپ نے آخرت کے وجوب پر تین دلیلیں پیش کی ہیں اور معاف فرمایئے اگر میں یہ کہوں کہ ان میں سے ایک دلیل بھی ایسی نہیں جو فریق ثانی کو قایل کر سکے۔

پہلی دلیل یہ ہے کہ لفظ دنیا، آخرت پر دلالت کرتا ہے اس لئے آخرت کا ماننا ضروری ہے ـــــ لیکن کیا میں یہ پوچھ سکتا ہوں کہ لفظ دنیا کا وہ مفہوم جو آخرت پر دلالت کرتا ہے کس کا متعین کیا ہوا ہے۔ کیا آپ ہی اس کے واضع اور آپ ہی اس کے مفسر نہیں ـــــ میرے سامنے اگر لاکھ مرتبہ لفظ دنیا بولا جائے تو کبھی ایک بار بھی اس کو سن کر آخرت کا یقین نہیں ہوتا ـــــ آپ دنیا کو آخرت کا نقیض بتاتے ہیں۔ میں اسے اعدام کا نقیض سمجھتا ہوں، یعنی جس لفظ دنیا بول کر آپ کا خیال اس کے نقیض و آخرت کی طرف منتقل ہوتا ہے کہ یوں ہم پھر اٹھیں گے، اس طرح اُن کا حساب و کتاب ہوگا، یوں عذاب میں مبتلا کئے جائیں گے وغیرہ وغیرہ، اسی طرح لفظ دنیا بول کر میرا خیال اسی کے نقیض اعدام محض کی طرف جاتا ہے کہ جب کوئی شخص مرجاتا ہے تو حالت عدم میں چلا جاتا ہے گویا کہ وہ کبھی پیدا ہی نہ ہوا تھا۔

آپ کی دوسری دلیل اس سے زیادہ عجیب و غریب ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ "آخرت انتہائی بے نفسی کے ساتھ نیکی کرنے کی تعلیم دیتا ہے"۔ درانحالیکہ آخرت کا جو مفہوم پیش کیا جاتا ہے، اس میں سوائے غرض و طمع کے کچھ اور ہی نہیں۔ کیا اچھے کاموں کے عوض میں سونے چاندی کے محلوں، دودھ شہد کی نہروں، حسین و جمیل دوشیزہ حوروں اور بے ریش و بروت لڑکوں کے دئے جانے کا وعدہ کرنا بے نفسی کے ساتھ نیکی کرنے کی تعلیم ہو سکتی ہے اور کیا برے کاموں کی پاداش میں شعلہ زار جہنم کا منظر پیش کرنا ایک شخص کو بے نفسی کے ساتھ نیکی کی طرف کر سکتا ہے۔ جبکہ بے نفسی کا تعلق نہ لالچ سے ہونا چاہئے نہ خوف سے اگر تم کسی کے ساتھ کچھ احسان کرتے ہو اس ڈر سے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو تم کو قید و بند میں ڈال دیا جائے گا یا اس لالچ سے کہ اس احسان کا معاوضہ زیادہ بہتر صورت میں ملے گا۔ تو کیا دنیا میں کوئی شخص تمہارے اس فعل کو بے نفسی پر محمول کر سکتا ہے؟ اسی نکتہ کو غالب نے اس طرح بیان کیا ہے:-

طاعت میں تا رہے نہ مئے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت میں

اگر آپ اس کے جواب میں یہ کہیں کہ جنت و دوزخ کا بیان صرف تشبیہی بیان ہے اور حقیقت کچھ اور ہے تو بھی اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اس بیان میں ترغیب و تخویف ضرور پائی جاتی ہے، جو بے نفسی کے بالکل منافی ہے، میں کہتا ہوں کہ مطلق جزا و سزا کا خیال ہی بے نفسی کو محو کر دینے والا ہے اور جب تک عذاب و ثواب کی تمام کارگاہ کو باطل ٹھہرا کر یہ اصول نہ قرار دیا جائے کہ "نیکی ایک فرض انسانی ہے جو بلا خیالِ مزد یا بغیر اندیشۂ تعزیر ظاہر ہونی چاہئے" بے نفسی کا خیال کبھی پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔

اس ضمن میں آپ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ جب ہر طاعت کا ثواب اور ہر گناہ کا عذاب اس دنیا میں نہیں ملتا تو کیا وجہ ہے کہ یوم آخرت کو تسلیم کیا جائے۔

اس میں بھی آپ نے خود ہی ایک بات فرض کر لی ہے، اور خود ہی اس کو دلیل بنا کر پیش کر دیا ـــ میں تو کہتا ہوں کہ کوئی طاعت ایسی نہیں جس کا ثواب یہاں نہ مل جاتا ہو اور کوئی گناہ ایسا نہیں جس کی سزا انسان کو یہاں نہ بھگتنا پڑتی ہو بشرطیکہ آپ طاعت کا مفہوم اچھا کام قرار دیں اور گناہ کا مفہوم برا کام۔ کیا آپ کہہ سکتے ہیں کہ فرض شناسی و ادائے فرض کے بعد ضمیر انسانی کو جو اطمینان و سکون حاصل ہوتا ہے اس سے زیادہ مسرت کسی اور چیز میں ہو سکتی ہے اور حق تلفی و ناحق کوشی کے بعد جو اضطراب نفس انسانی میں پیدا ہوتا ہے اس سے زیادہ عذاب کوئی اور ممکن ہے ـــ لیکن اگر کسی کا ضمیر بالکل محو ہو چکا ہے، اور حق و باطل کی تمیز کسی کو باقی نہیں رہی، تو تاریخ عالم اٹھا کر دیکھئے کہ اسی دنیا میں اس کا کیا انجام ہوا، افراد کو چھوڑئے میں تو قومی و اجتماعی زندگی میں بھی اسی اصول کو کارفرما دیکھتا ہوں اور قرآن پاک کی اس آیت پر پوری طرح ایمان لاتا ہوں کہ

"ہل یہلک الا القوم الفاسقون"

پھر بتائیے کہ کیا اس آیت میں جس ہلاکتِ قوم کا ذکر کیا گیا ہے وہ کسی اور دنیا سے متعلق ہے اور کیا یہ عذاب آپ کی مفروضہ اخروی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔

ممکن ہے ابھی آپ کی تسکین نہ ہوئی ہو، لیکن اگر میں خود کلام مجید سے یہ ثابت کر دوں کہ عذاب و ثواب کا تعلق اسی دنیا سے ہے تو پھر آپ کیا کہیں گے۔ اچھا تکلیف تو ہوگی کلام مجید اٹھائیے اور سورۂ ہود کی آیات ۱۰۶ و ۱۰۷ و ۱۰۸ ملاحظہ فرمائیے ارشاد ہوتا ہے:۔

"فاما الذین شقوا ففی النار لہم فیہا زفیر و شہیق۔ خالدین فیہا ما دامت السمٰوٰت والارض وما الذین سعدوا ففی الجنۃ خالدین فیہا ما دامت السمٰوٰت والارض"

جن لوگوں نے شقاوت کی وہ آگ میں پڑے کراہ رہے ہوں گے اور اسی حالت میں رہیں گے جب تک آسمان و زمین کا وجود ہے اور جن لوگوں نے اچھے کام کئے وہ جنت میں رہیں گے، جب تک آسمان و زمین کا وجود ہے۔

کیا عذاب و ثواب کو اس دنیا سے متعلق سمجھنے کے لئے اس سے زیادہ روشن و واضح الفاظ کی ضرورت ہے کیا "ما دامت السمٰوٰت والارض" کے الفاظ اس بات کا ثبوت نہیں کہ جنت و دوزخ اس دنیا سے علاوہ کسی اور عالم سے متعلق نہیں کیونکہ اگر آپ عذاب و ثواب کو عالم آخرت سے متعلق کریں گے تو پھر "ما دامت السمٰوٰت والارض" کہنا کوئی معنی نہ رکھے گا۔ کیونکہ عالم آخرت تو آپ کے نزدیک قیامت یا ماورا عالم دنیا سے واسطہ رکھتا ہے، جب یہ زمین و آسمان کچھ نہ ہوں گے۔

۳ - آپ کی تیسری دلیل جس میں آپ نے جناب امیر اور یہودی کی گفتگو کا حوالہ دیا ہے اس کے متعلق کیا عرض کروں کہ:

برتمنا یائے عرفی خندہ می آید مرا

اسی قسم کا ایک واقعہ جناب امام جعفر صادق کے متعلق بیان کیا جاتا ہے کہ کسی ملحد نے آپ سے سوال کیا کہ مرنے کے بعد روح کہاں

چلی جاتی ہے، آپ نے جواب دیا کہ چراغ گل ہونے کے بعد اس کی روشنی کہاں چلی جاتی ہے۔ راوی کا بیان ہے کہ جواب سننے کے بعد وہ ایمان بھی لے آیا۔

دراں حالیکہ نہ جناب امیر کے جواب پر یہودی کو آخرت پر ایمان لانے کی ضرورت تھی اور نہ ملحد کو جناب امام جعفر صادق کے استدلال پر مسلمان ہونے کی۔

میرے نزدیک یہ دونوں روایتیں نادرست ہیں اور میں کبھی یہ باور نہیں کر سکتا کہ جناب امیر یا جناب امام جعفر صادق نے ایسی بچکانہ سی باتیں کی ہوں گی، کیونکہ تھوڑی دیر کے لئے ہم مان بھی لیں کہ جناب امیر کا جواب مسکت تھا اور یہودی بھی آخرت پر ایمان بھی لے آیا تو کیا اس کا آخرت کے وجود کو تسلیم کرنا حقیقتاً اطمینان قلب کے ساتھ تھا یعنی اس دلیل سے کوئی اذعانی کیفیت اس کے دل میں پیدا ہو سکتی تھی، ہرگز نہیں، اس نے اگر مانا بھی تو صرف اس لئے کہ ایسا ماننے میں کوئی حرج نہیں اور مصلحت اسی میں ہے پھر مصلحت و یقین میں جتنا فرق ہے وہ کسی سے مخفی نہیں۔

فرض کیجئے میں آپ کے پاس آؤں اور کہوں کہ مجھ میں اتنی قوت موجود ہے کہ چاہوں تو آپ کے کپڑوں میں آگ لگا دوں اور واقعی میں آگ لگا دوں گا۔ اگر آپ نے میری اس قوت کا اعتراف نہ کیا، آپ کو ماننے میں تامل ہوتا ہے، لیکن آپ کا ایک دوست آتا ہے اور کہتا ہے کہ "مان بھی لو تمہارا کیا حرج ہے، اگر اس میں ایسی قوت نہیں ہے تو مان لینے میں تمہارا کیا نقصان ہے، لیکن خدا کے لئے بتایئے کہ کیا آپ کا یہ اعتراف تصدیق قلب کے ساتھ ہوگا، ہرگز نہیں۔ پھر اگر جناب امیر کی اس دلیل پر وہ یہودی ایمان لے بھی آیا تو کیا واقعی وہ مسلمان ہو گیا ہوگا۔ جبکہ اسلام و ایمان کے لئے تصدیق بالقلب ضروری ہے۔

یہی حال جناب امام جعفر صادق کی دلیل کا ہے ——— ایک ملحد جو روح بقا کا منکر ہے، آپ سے سوال کرتا ہے کہ مرنے کے بعد روح کہاں جاتی ہے، آپ چراغ کی روشنی کا حوالہ دے کر خود اسی سے پوچھتے ہیں کہ بتاؤ وہ کہاں چلی جاتی ہے، آپ ہی انصاف فرمایئے کہ اس میں بقائے روح کے لئے کون سی دلیل پیش کی گئی، بلکہ اس سے تو اور اسی ملحد کے خیال کی تائید ہوتی ہے کہ جس طرح چراغ گل ہونے کے بعد اس کی لو فنا ہو جاتی ہے اسی طرح مرنے کے بعد روح بھی فنا ہو جاتی ہے، اکابر اسلام سے اس قسم کی روایتوں کو نسبت دینا حقیقتاً ان کی توہین کرنا ہے اور یہ نتیجہ ہے صرف اُن ادنیٰ درجہ کی ذہنیتوں کا جو اپنی دماغی اپج کو اہمیت دینے کے لئے خواہ مخواہ بڑے بڑے لوگوں سے اس کو منسوب کر دیتے ہیں، جناب امیر اور جناب امام جعفر صادق کا کیا ذکر ہے، احادیث اُٹھا کر دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ خود رسول اللہ کی ذات گرامی سے ایسے افعال منسوب کئے جاتے ہیں کہ آج ان کو دیکھ کر شرم آتی ہے اور عقل حیران رہ جاتی ہے کہ کیا ایک رسول کے اخلاق واقعی ایسے ہو سکتے ہیں اور کیا ایک ملہم من اللہ ہستی سے ایسی باتوں کا اظہار ہونا کسی طرح ممکن ہو سکتا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ میں آخرت کو کیوں نہیں مانتا، یعنی قیامت اور جزا و سزا کے نظریہ کو کیوں قابل قبول نہیں جانتا۔ اس کے متعلق آپ مجھ سے کوئی استفسار نہ کیجئے بلکہ خود اُن تمام روایات کا تفصیلی طور پر مطالعہ کیجئے جو اس باب میں بیان کی جاتی ہیں کہ مرنے کے بعد سے لیکر دوزخ یا جنت میں پہونچنے تک کیا کیا مراحل و منازل سامنے آتے ہیں اور پھر خود ہی اپنی عقل سے کام لے کر فیصلہ کیجئے کہ وہ باور کرنے کے لائق ہیں یا نہیں۔

ستمبر کے "نگار" میں ایک جگہ

کتابت کی غلطی سے جناب شفا گوالیاری کے دو شعر حضرت کوثر چاندپوری کے مقاطع میں غلط شایع ہو گئے ہیں۔ انھیں یوں پڑھا جائے:

مرے اشکوں سے نسبت کیا تبسم کو ترے لیکن
شگفتِ گل کا کچھ شبنم پہ بھی الزام آتا ہے

کہاں کی یاد کس کا ذکر ان کی بزم رگیں میں
ہمارا نام بھی اب تو برائے نام آتا ہے

ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک عقلی نقطۂ نظر سے

(اوراقِ پارینہ)

نگار کے پچھلے دو نمبروں میں ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک کے چند نئے پہلوؤں پر مضامین نکل چکے ہیں مگر اس تحریک کے بعض دوسرے گوشے بھی بحث طلب ہیں، چنانچہ اس تحریک پر عقلی زاویۂ نگاہ سے بھی گفتگو کی جا سکتی ہے جو بعض حیثیتوں سے بحث کے بنیادی عنصر کا حکم رکھتی ہے، مودودی صاحب کا نقطۂ نظر اسلامی سیاست و امارت کی بابت جو بھی ہو ان چیزوں کا تعلق اس تحریک اور اس کے لٹریچر کی فروعات سے ہے سوال یہ ہے کہ اس تحریک کی وہ بنیادی غرض و غایت کیا ہے جس کے درپے یہ جدوجہد میں مصروف ہے، یہی ایک سوال ہے جو بنیادی حیثیت رکھتا ہے

اس تحریک کی غرض و غایت اور اس کی بنیاد "تجدید دین" کی ضرورت پر مبنی ہے، مگر اس سوال کے ساتھ یہ سوالات بھی پیدا ہو جاتے ہیں کہ خود دین کیا ہے؟ اور اس کی ضرورت کیوں پیش آئی، جس کی بنا پر اس کی تجدید کی ضرورت پڑی؟

جہاں تک دینوی و معیشتی معاملات کا تعلق ہے، انھیں اجتماعی طور پر بہتر سے بہتر جن طریقوں سے سلجھایا جا سکتا ہے انھیں طریقوں کے مجموعی دستور العمل کو دین، شریعت یا مذہب کہا جاتا ہے، اس تعریف سے مذہب اسلام کے مابعد الطبیعی تصورات سمجھ میں آئیں یا نہ آئیں اگر ایک شخص صرف اسلامی احکام ہی پر غور کرے، گا تو ان کے اسباب سمجھ میں آئے بغیر نہیں رہ سکتے کیونکہ احکام کا سارا تعلق دینوی حالات و مقتضیات کے طور طریقوں سے ہے اور دینوی حالات و مقتضیات ہمارے ہی اعمال و تجربات کے گرد گھومتے ہیں اور ان کے لئے اسلام جو طریقے اور قوانین پیش کرتا اور اپنے اندر جو اجتماعی اور اخلاقی روح (جو شاید مابعد الطبیعی تصورات کا بھی مقصود ہو) رکھتے ہیں وہی دین کی حقیقت ہے اور دین کا دینوی مقصد بھی۔

مذہب کے دو رخ ہیں، ایک وہ جس کا تعلق تصورات مابعد الطبیعت سے ہے اور ایک وہ جس کا تعلق یکسر دینوی زندگی اور اس کے احکام سے ہے، سوال یہ ہے کہ مذہب کے یہ دونوں پہلو (خواہ ایک دوسرے سے جڑے رہیں یا جدا جدا) بذاتِ خود انسان کا مقصود ہوتا ہے یا کہ کسی اور مقصود کا ذریعہ؟ مقصود کچھ بھی ہو مگر یہ سوال ہی اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ ہیئت اجتماعیہ کا مزاج عقلی بن جاتا ہے یا عقلیت کے قریب ہو جاتا ہے، اس مقام پر انسان مجبور ہو جاتا ہے کہ دوسرے مسایل کی طرح مذہب پر بھی عقلی حیثیت سے غور کرے، یہ اور بات ہے کہ لوگوں کا کوئی خاص طبقہ تاریخ کے اس مخصوص دور میں بھی اپنے کسی غیر موجہ خوف کی بنا پر عقلی حیثیت سے غور کرنے سے جھجکتا ہے اور غور کرنے والوں پر بگڑتا ہے۔ مذہب اسلام کا جس وقت ظہور ہوا اس وقت ہیئت اجتماعیہ کا مزاج عقلی نہیں تھا، وہ بہت اس کا انداز خطابی تھا، استدلالی نہیں تھا، کبھی چند خاص افراد ایسے عقلی سوالات کر دیتے تو بھی انھیں ویسا ہی جواب دیا جاتا جس کو ہیئت اجتماعیہ کا ذہن برداشت کر سکے۔

اب آیئے کہ اس سوال کی کہ اسلام بذاتِ خود مذہب کو مقصود تصور کرتا ہے یا کسی اور مقصود کا ذریعہ؟ — اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ اس کے ظہور کے بعد کسی نئے دین کی ضرورت نہیں پڑے گی اور خود کو ہمیشہ کے لئے اور ہر جگہ کے لئے دین یا مذہب کہتا ہے، انسانی اجتماع کی ضروریات و مقتضیات کی کوئی تجدید نہیں کی جا سکتی، ان میں اتنا ہی فرق اور تعدد ہے جتنا زمانوں اور مکانوں کا ہے، ایک وقت کی چیز دوسرے وقت کے لئے بے کار ہو جاتی ہے، ایک جگہ اور اس کے ماحول کی وہ حالت نہیں ہوتی جو کسی دوسری جگہ اور ماحول کی ہوتی ہے۔

یہ بھی ظاہر ہے کہ انسان کو خواہ وہ کسی وقت یا کسی جگہ کا رہنے والا ہو سب سے زیادہ جس چیز کی ضرورت ہے وہ یہ کہ اس کی اجتماعی اور انفرادی زندگی خوش اسلوبی کے ساتھ گزرے اگر یہ مذہب کے ذریعہ سے حاصل ہو سکتی ہے (اور یقیناً حاصل ہو سکتی ہے) تو مذہب ذریعہ ہو اس خوش اسلوبی کے حاصل کرنے کا جو انسان کی اپنی تمدنی حاجت ہے اور اگر مذہب ہی کے مقصود اصلی ہونے کا دعویٰ کیا جائے تو اس کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی!

یہ ظاہر ہے کہ مذہب اسلام پہلے ایک خاص مقام اور ایک خاص وقت میں ظاہر ہوا، اسی لئے اس نے اس وقت اور مقام و ماحول کا لحاظ رکھ کر اپنے قوانین نافذ کئے۔ یہاں معلوم ہوا کہ جو مذہب خود کو ہر زمانہ کا مذہب کہتا ہے ان خاص قوانین کا مجموعہ نہیں ہو سکتا کیونکہ وہ قوانین چند خاص حالات کے تحت نافذ ہوئے تھے، بلکہ وہ اس خاص اخلاقی روح کا نام ہے جو اس کے مابعد الطبیعی تصورات (خواہ وہ اور ان کا مقصد کسی زمانہ میں سمجھ میں نہ آئیں اور کبھی سمجھ میں آجائیں) اور ان خاص قوانین کے اثر (جو ان قوانین کی علت و غایت کے دریافت کرنے سے ظاہر ہوتا ہے) سے مقصود ہوتی ہے اور جو اپنے نافذ ہو جانے کی وجہ سے آنے والوں کے لئے نمونہ یا تہذیب بن گئی ہے ورنہ اگر ان چند قوانین ہی کے مجموعہ کا نام دین ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ کسی زمانہ اور کسی مقام میں ایک دوسرے کا فرق نہیں، حالات ہر جگہ اور ہر وقت کے ایک ہی ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اسلام کو حضرت نوح و ابراہیم وغیرہ سارے انبیا کا دین قرار دیا گیا ہے حالانکہ ہر نبی اور اس کی اُمت کے قوانین میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔

اس وقت جبکہ مذہب اسلام ملک عرب ہی تک محدود تھا، عربوں کے نزدیک دین انھیں خاص قوانین کے مجموعہ کا نام تھا، اور وہ یہ نہیں سمجھ سکتے تھے کہ دین اسلام ایک اصول ہے جس کو ہر قوم اپنے مزاج کے موافق اپنا سکتی ہے اگرچہ معاشرتی قوانین وہ نہیں رہیں گے جو ان کے مزاج کے پیش نظر بنائے گئے تھے، مگر جب اسلام ان ممالک میں پہونچا جہاں کے تمدنی و معاشرتی تقاضے عرب سے مختلف تھے اور جہاں کی ذہنیت عامہ عربوں سے مختلف تھی تو لازمی تھا کہ اجتماعی ہیئت وہ نہیں رہے جو ہیئت اس وقت کی تھی جبکہ اسلام عرب تک محدود تھا، یہ ایک فطری امر اور طبیعی نتیجہ تھا، مگر اس بدلی ہوئی صورت کی توجیہ عربوں یا مسلمانوں کے پاس یہ تھی (اور ہے) کہ خلافت نہیں رہی اور ملوکیت کا دور دورہ ہو گیا، اگر یہ توجیہ صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر خلافت باقی رہتی تو "فقہ" کا وجود بھی نہیں ہوتا چونکہ عین سبب تھا اسلام کے شعبۂ احکام کو غیر عربوں سے آشنا کرنے کا۔ چونکہ عرب یا وہ مسلمان جن پر عربی ذہنیت غالب تھی انھیں یہ گوارا نہیں تھا کہ اسلام کو ایک اصول کی حیثیت سے مانیں اسی لئے انھوں نے فقہ خصوصاً حنفی فقہ (جس کے اصول میں وسعت اور رواداری زیادہ سے زیادہ تھی) کی مخالفت کی، صرف اس لئے کہ اس میں عربیت کا لحاظ نہیں رکھا گیا تھا، بعضوں نے اس کے وجود ہی کے خلاف بن کر خطابت اور ظاہریت کی بنا ڈالی، بعضوں نے فقہ کو اس صورت میں پیش کیا یا اس کے اصول ایسے بنائے جن کا مقصد انھیں قوانین کو اس شکل میں پیش کرنا تھا جن کو صاحب شریعت معظم نے عربوں کے مزاج کے مطابق بنایا تھا، ہر چند حنفی فقہا نے بھی اپنے اصولوں کا رشتہ انھیں عربی قوانین سے جوڑنے کی کوشش کی مگر یہ اس اصول کی تقلید تھی جس کی بنا فقہ شافعی نے ڈالی تھی۔ ظاہر ہے کہ جب دین کا تصور ہی یہ رہ گیا تھا کہ ہر حرکت اور ہر عمل کا کچھ نہ کچھ رشتہ رسول اللہ کے حرکات و سکنات اور ان کے عربوں کے لئے بنائے ہوئے قوانین سے اگر ہے اس کے سوا چارہ نہیں تھا، یہی وجہ ہے کہ حنفی فقہ کو اس نظر سے دیکھا جائے تو اس کے بنائے ہوئے اصول ان قوانین سے بہت دور جا پڑتے ہیں جب اس اعتقاد کے ساتھ اس پر نظر ڈالی جائے کہ قرآن ایک اصول ہے جس کو ہر قوم ان خالص قوانین کے بغیر بھی اپنا سکتی ہے اور یہ سب سے بہتر ہیں اجتماعی زندگی گزارنے کا، تو یہ فقہ ایک یکسر نا بیگانہ نظر آتا ہے۔

اسی طرح عرب سے باہر جب اسلام نے قدم رکھا تو یہ بھی لازمی امر تھا کہ غیر عرب لوگوں نے جس طرح اسلامی احکام کی تعبیر فقہ سے کی اسی طرح اس کا دوسرا پہلو مابعد الطبیعی تصورات کو بھی اپنی نظر سے دیکھتے، چونکہ ان کا مزاج عربوں کا سا سادگی پسند نہیں تھا

کہ ان تصورات پر ایمان کے مطالبہ کے ساتھ ہی ایمان لے آتے یا اگر جبراً ایمان لے آتے تو ان تصورات پر عقلی حیثیت سے غور کئے بغیر رہتے، اسلئے انھوں نے ان پر غور کیا اور فلسفہ و عقل کی کسوٹی پر پرکھا، اسی لئے اب ان تصورات کی وہ عظمت و تقدیس نہیں رہی جو کسی چیز کو سمجھے بغیر ایمان لانے کی صورت میں پیدا ہوتی ہے۔ چونکہ عربوں کا مزاج سادہ تھا اس لئے انھوں نے ان تصورات کو بے چون و چرا تسلیم کر لیا اور یہ ایک نفسیاتی حقیقت ہے کہ جو چیز سمجھ سے بالاتر ہو اس کا مان لینا پہلے تعظیم اور اس کے بعد تقدیس کا موجب ہوتا ہے، تقدیس کے بعد یہ ہر چیز سے عزیز ہو جاتی ہے، یہی سبب تھا جس کی بنا پر عربیت سے متاثر لوگ عقل و فلسفہ سے معمولی تعلق رکھنے والے کو بھی کافر و زندیق کا خطاب عطا کرتے تھے، یہ ساری مشکلات اسی لئے پیش آتی تھیں کہ دین ان لوگوں کے نزدیک چند خاص قوانین، ضوابط کا مجموعہ تھا اور یہ ذہنیت اب تک بھی چلی آ رہی ہے، اسی لئے انھیں لوگوں میں تین کے معیار میں بڑا اختلاف ہے۔ اگر دین کو ایک اخلاقی اصول مان لیں جسے ہر قوم اپنے عوائد کو باقی رکھتے ہوئے اپنا سکتی ہے اور اس مقصود کو حاصل کر سکتی ہے جو زندگی کی اجتماعی خوش اسلوبی سے عبارت ہے تو کوئی جھگڑا ہی باقی نہیں رہتا۔

تجدید دین تجدید دین کا لفظ ہی ظاہر کرتا ہے کہ دین کا کبھی عروج رہا ہے اور کبھی زوال یا انحطاط، اس مسئلہ کی تاریخ پر نظر کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کو لے کر اٹھنے والوں نے دین کو عربی ذہنیت سے سمجھا ہے ان کے دینی حکومت و سیاست اور معاشرت کے نظریے سب کچھ وہی تھے جو رسول اللہ اور خلفائے راشدہ کے زمانہ میں رائج تھے اور انھوں نے ہمیشہ اسی کے قیام کی کوشش کی جس کو تجدید دین کہا گیا، اس کے علاوہ حالات کے پیش نظر ان کی جتنی صورتیں ہو سکتی تھیں ان کی نظر میں وہ سب غیر دینی تھیں خواہ وہ ان کی بنیاد خالص توحید و ایمان ہی پر کیوں نہ ہو چنانچہ جمال الدین افغانی، سنوسی اور مولانا عبیداللہ سندھی کی تحریکات اور ان کے عوائد کو یہ لوگ نہ تجدید دین میں شامل کرتے ہیں اور نہ ان کی ان کے یہاں کوئی اہمیت ہے انتہا یہ ہے کہ ان تحریکات کے بانیوں میں بعض کے متعلق ان لوگوں نے بے دینی اور الحاد کا الزام تراشا۔ یہ سب کچھ اس لئے ہوا کہ یہ لوگ دین کو عقلی بنانا نہیں چاہتے وہ رسول اللہ اور خلفاء راشدین کے طرز عمل سے کوئی علت مستنبط نہیں کرتے جس پر حالات کے پیش نظر دین کا قیام کیا جا سکے، چونکہ ان لوگوں کے نزدیک حالات و مقتضیات کا کوئی لحاظ نہیں تھا اس لئے یہ کبھی اپنی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس تجدیدی تحریک کا بھی تصور حکومت و سیاست وہی ہے جو رسول اللہ اور خلفاء راشدین نے اپنے زمانہ میں اپنے ماحول کے لئے اپنی سمجھ (جو ان کے اپنے ماحول اور اپنے تجربات سے پیدا ہوئی تھی) سے اختیار کیا تھا۔

محولۂ بالا سطور میں اس کا اشارہ کیا گیا تھا کہ اسلام جب ملک عرب سے باہر پھیلنے لگا تو لوگوں کے ذہنیت کے اعتبار سے دو طبقے بن گئے تھے، ایک وہ جو خالص عربی ذہنیت کا حامل تھا، جو دین و مذہب کو عقلی حیثیت سے سمجھنے کا قایل نہ تھا، دوسرا وہ جو مذہب کو عقل کے ذریعہ حل کرنا چاہتا تھا، آج تک کی پوری اسلامی تاریخ میں دوسرے طبقہ کی بہ نسبت، پہلے طبقہ کا غلبہ رہا ہے، اس کی پیدا کی ہوئی ذہنیت دوسرے سے زیادہ غیر شاعرانہ ہوتی ہے۔ دوسرا طبقہ یعنے اسلام میں "عقلیت" کو معیار بنانے والا عقلیت کو معیار بنانے میں کسی طبیعی تقاضے سے مجبور نہیں ہوا تھا بلکہ ایک حد تک یہ "معیار عقلیت" اس کو دوسروں کا دیا ہوا تھا، شاید یہی سبب تھا ان کا اپنا خاص اور نمایاں ورثہ ذہنی اثر چھوڑنے کا۔

تاریخ میں ایک طبیعی انقلاب ہوا ہے اور اس انقلاب کا ایک حد تک مکمل ظہور موجودہ دور میں ہوا، اس انقلاب سے مراد سائنسی انقلاب ہے، اس انقلاب نے طبیعی اصول و نوامیس کے ذریعہ مذہب و تاریخ ہر چیز پر غور کرنے پر مجبور کر دیا۔

ابھی بتایا جا چکا ہے کہ ابوالاعلیٰ مودودی کی تحریک تجدید پہلے طبقہ سے تعلق رکھنے والی چیز ہے، یعنی اس کے نزدیک مذہب بذات خود مقصود ہے، کسی دوسرے مقصود کا ذریعہ نہیں، اگر اس کے پاس مذہب اسلام کسی دوسرے مقصود کا ذریعہ ہوتا تو سب سے بڑی اہمیت اس مقصود کو دی جانی چاہئے تھی، مگر جب ہم اس کے لٹریچر پر نظر کرتے ہیں تو یہ پتہ نہیں چلتا کہ انسان کا مقصود اصلی کیا ہے؟ اور اس کو حاصل کرنے کے لئے

اسلام ذریعہ بنتا ہے یا نہیں ؟ - سبھی کہتے ہیں کہ اسلام ہی تو فوز و فلاح کا واحد ذریعہ ہے مگر اس میں نہ فوز و فلاح کی تشریح ہوتی ہے اور نہ اس سے اس کی اہمیت مقصود ہوتی ہے بلکہ لفظ "اسلام" کو منہ صیانہ اہمیت دینا مقصود ہوتا ہے۔

اس سے پہلے ہم نے سائنسی انقلاب کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ موجودہ ذہنیت عامہ عقلیت پر مبنی ہے اور عقلیت اسی انقلاب کا نتیجہ ہے اب اگر دین کی تجدید کی جائے گی تو اسی ذہنیت سے متاثر ہو کر اور اسی کو پیش نظر رکھ کر، مگر جب ہم مودودی صاحب کی تحریک تجدید دین پر نظر کرتے ہیں تو ہمیں اس سے مایوسی ہوتی ہے، یہ جتنے سیاسی، معاشرتی اور قانونی نظریئے پیش کرتی ہے، سب کے سب وہی ہیں جو تیرہ صدی پہلے کسی خاص مقام کے لئے اس کے پیش آمدہ حالات کے موافق بنائے گئے تھے، مثال کے طور پر معاشرتی رسم و رواج ہیں، رسم و رواج ایک مقام سے دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں اور ایک وقت کے دوسرے وقت سے، یہ تمام ان ذہنی خصائص کے تحت ہوتے ہیں جو ماحول و مزیوم کے اثر سے ہر قوم میں جدا جدا پیدا ہو جاتے ہیں اور جو اقوام میں صدیوں کے تناسلی اثرات پر مترتب ہوتے ہیں، جن کو جبراً بھی دور نہیں کیا جا سکتا تاوقتیکہ چند سازگار عوامل ان کے اندر پیدا نہ کر دئے جائیں اور ان کے استحکام کے لئے بھی صدیوں کی ضرورت نہ پڑے، اسلام کا منشا بھی یہی تھا کہ ہر قوم میں ایک اخلاقی روح پیدا کر دی جائے جس کو بآسانی قبول کر سکے اور اپنے حالات کو درست سے درست بنا سکے اور "انسانیت" کے درجہ پر پہونچ جائے، اسلام میں ایک بڑے طبقہ کا اسلام کی اس تعبیر کی مخالفت کرنے کے باوجود یہی حال ہوا ایک مقام کے اہل اسلام کے طور طریقے دوسری جگہ کے اہل اسلام کے طور طریقوں سے ہمیشہ مختلف رہے ہیں، یہ ایک فطری امر ہے جس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا، مگر اہل مذہب نے اسلام کو اسی مقابلہ کے لئے لا کھڑا کیا جس سے اسلام سے دنیا کو بیزاری اور نفرت کا موقعہ ملا اور یہی سبب ہے کہ خود انھیں میں چھوٹی سے چھوٹی تقلیدی حرکت کرنے یا نہ کرنے پر اتنے بڑے بڑے جھگڑے قایم ہوئے جو صدیوں تک چلتے رہے حتیٰ کہ اسلام کا مقصود اصلی اخلاق و انسانیت کا خاتمہ انھیں کے ہاتھوں سے ہوا، اگرچہ ان فروعی جھگڑوں وغیرہ کے ختم کرنے کا دعویٰ مودودی جماعت بھی کرتی ہے، مگر چونکہ اس جماعت کی بنیاد ہی تقلید پر ہے اس لئے ان کا خاتمہ اس سے ناممکن ہے اگر اسکی بنیاد عقلیت پر قایم ہو تو لازمی ہے کہ "تجدید" کی بنیاد "تعبیر" پر نہ ہو "تقلید" پر نہ ہو، یعنے یہ کہ دین کی تجدید اس طرح ہو کہ اس کی تعبیر زمان و مکان کے اختلاف سے بدلتی رہے، مگر مودودی صاحب کی جماعت اور اس کی تحریک کی بنیاد تقلید پر قایم ہے کیونکہ چھوٹی سے چھوٹی حالت کے پیش آنے پر بھی اس کے حل کے لئے روایات و آثار ہی پر ان کی نظر اٹھتی ہے جو اختلافات کا عین موجب ہیں، جماعت اسلامی کا ترجمان، ترجمان القرآن کے "رسایل و مسایل" والے باب کا جو لوگ مطالعہ کرتے ہیں ان پر یہ چیز اچھی طرح واضح ہے، مثال کے طور پر اس جماعت کے ایک رکن نے امیر جماعت سے یہ کہکر کہ نماز میں دست بستگی وغیرہ ان سب طریقوں پر میں عمل کرتا ہوں جو حدیث میں مذکور ہیں یہ دریافت کیا کہ کیا یہ میرا طریقہ عمل صحیح ہے یا غلط ؟ تو جواب میں امیر صاحب نے لکھا کہ آپ نے جو طریقہ اختیار کیا وہ عین سنت ہے کیونکہ ہر اس طریقہ پر جو رسول اللہ صلعم سے مروی ہے عمل کرنا ایک طرف پوری پوری اتباع ہے دوسری طرف اس سے مذہب کے فروعی جھگڑوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے، امیر صاحب کا خیال شاید یہ ہو کہ فروعی مسایل میں جو اختلافات ایک مرتبہ رونما ہو گئے اور ان کی بنیادوں پر جن فرقوں کی بنیاد پڑی اسی کو ختم کرنا ہے، حالانکہ روایات و اسانید جب تک دلیل کا ذریعہ بنے رہیں اس وقت تک نہ فرقے ختم ہو سکتے ہیں اور نہ فرقہ کا سلسلہ بند ہو سکتا ہے، ہاں یہ اس وقت ہو سکتا ہے جبکہ خود تحریک کی بنیاد عقلیت پر قایم کی جائے اگر مودودی پارٹی کی تحریک کی بنیاد عقلیت پر قایم ہوتی تو اس سوال کا جواب ناموس اسباب و نتائج کے تحت دیا جاتا اور کہتے کہ نماز ایک عبادت ہے اور استمرار رضا کے تصور کو ذہن سے محو نہ کرنے کی بنا پر ہے اور اس کی ہیئت ترکیبی تخشع اور تفرع کی رسم پر قایم ہے، اس لئے جس ماحول نے نیچے ہاتھ باندھنے کو ادب سمجھا وہاں کا رواج نیچے ہاتھ باندھنے کا ہوا اور جو لوگ اوپر ہاتھ باندھنے کو ادب سمجھتے ہیں وہ اوپر ہاتھ باندھتے ہیں بہر حال ادب میں یک عملی اور یکسوئی لازمی عنصر ہیں اسلئے نماز میں کوئی ایک طریقہ اختیار کیا جائے، ایک ہی نماز میں تین چار طریقے استعمال کرنے کے معنے یہ ہیں کہ ادب کے تصور سے گریز کر کے بے ادبی برتی جائے۔

بہرحال یہ تحریک جن مقتضیات پر مبنی ہونا چاہئے تھی ان پر یہ قایم نہیں - ترجمان القرآن کے پہلے صفحہ پر "تعلیمات قرآنی و حقایق فرقانی کا ذخیرہ" والی عبارت دیکھ کر مولانا نیاز فتحپوری نے لکھا تھا:

"اس رسالہ کا مقصود اس کے نام سے ظاہر ہے یعنی مطالب قرآنی اور تعلیمات قرآنی کو ان کی صحیح روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کرنا یقیناً اس مقصود کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا لیکن جیسا کہ خود فاضل اڈیٹر نے ظاہر کیا ہے عہد حاضر میں اس دعا کی تکمیل آسان نہیں، عہد ماضی میں مذہب نام صرف اسلاف پرستی اور قدامت پرستی کا تھا کسی شخص کا مصلح یا مبلغ بن جانا دشوار نہ تھا لیکن اب جبکہ علوم جدیدہ اور اکتشافات حاضرہ نے "عمل و خیال" کی بالکل نئی طرح ڈال کر "حریت فکر و ضمیر" کی دولت سے دماغوں کو مالا مال کر دیا ہے تو مذہب صرف اس دلیل کی بنیاد پر زندہ نہیں رہ سکتا کہ اس کے اسلاف کا طرز عمل بھی یہی تھا اور وہ بھی وہی سوچتے تھے جو اب بتایا جاتا ہے - (تنقیحات صفحہ ۱۰۹)

لکھنے کا منشا یہ معلوم ہوتا ہے کہ تعلیمات قرآنی اس دور میں اس کے حالات کو پیش نظر رکھ کر پیش کی جائیں، اس سے مذہب اور اس کی افادیت سے انکار نہیں تھا بلکہ اس کی تعمیر کی طرف اشارہ کیا گیا تھا کہ اس زمانہ میں کس طرح کی ہے جو جدید "تجدید" کا اصل منشا ہے، مگر اس قسم کا کوئی اثر لئے بغیر مودودی صاحب نے "تجدید کا پائے چوبیں" کے عنوان ایک مضمون لکھ کر اپنے "تجدیدی لٹریچر" میں محفوظ کر دیا، جن لوگوں نے یہ مضمون پڑھا ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ یہ اصول تنقید سے کتنا گرا ہوا ہے نفسیاتی طور پر نیم پختہ ذہن اس طرز سے بہت جلد متاثر ہوتے ہیں، مودودی صاحب کے طرز استدلال پر ایک مضمون درکار ہے اشارۃً اتنا کہنا کافی ہوگا کہ "مقدمہ بندی" اور "گریز" ان کے طرز کے نمایاں پہلو ہیں -

بہرحال آج بھی اگر مذہب یا دین کی تجدید مقصود ہو تو حریت فکر و ضمیر ہی کے نفسیاتی تقاضوں پر ہونا چاہئے، حریت فکر و ضمیر کو غلط سمجھ لینا اور چیز ہے اور اس کی چھائی ہوئی فضا کو محسوس کرنا اور اس تحریک کو اس کا احساس ہو یا نہ ہو، بہرحال یہ اسلاف پرستی اور روایات پرستی سے آزاد نہیں جو تجدید دین کے ارادے کو "تقلید" پر مجبور کرتی ہے - اس دور کے اقتضات کے مطابق تجدید دین "تعمیر دین" کی صورت سے ہونا چاہئے -

ہاں البتہ یہ صورت مولانا عبید اللہ سندھی کی تعلیمات اور ان کے خیالات میں نظر آتی ہے، اگر ان پر کسی تحریک یا عملی کوشش کی بنیاد رکھی گئی تو یقیناً ایک مستحسن بات ہوگی -

اسماعیل ربیعی

تاریخ جموں و کشمیر

کا

ایک نایاب نسخہ

جسے مولوی حشمت اللہ خاں نے ۱۹۳۹ء میں مرتب کیا تھا - اس کتاب میں قدیم راجگان و مسلم فرمانروایان کشمیر کے عہد سے لے کر ۱۹۳۴ء تک کے نہایت مفصل حالات درج ہیں اور اس موضوع پر اس سے بہتر کتاب نہ انگریزی میں پائی جاتی ہے نہ کسی اور زبان میں - یہ کتاب بڑی تقطیع کے ۹۴۴ صفحات کو محیط ہے، حاشیے کہیں کہیں کرم خوردہ ہیں، لیکن اصل متن محفوظ ہے - قیمت پچھتر روپئے

منیجر نگار لکھنؤ

اقتباسات ومعلومات

فلکی شعاعیں آفتاب کی روشنی کیسی ہی تیز ہو لیکن ایک باریک سا ورق بھی اُس کے لئے حجاب ہو جاتا ہے، یہ دُنیا میں ہر شخص کو معلوم تھا اور خیال کیا جاتا تھا کہ روشنی کی حقیقت صرف یہی ہے۔ جب رانجنی شعاع دریافت ہوئی تو معلوم ہوا کہ وہ لکڑی اور گوشت کے اندر بھی نفوذ کر جاتی ہے، اس کے بعد دوسری شعاع اور معلوم ہوئی جو معدنی ٹھوس اشیاء کے اندر بھی نفوذ کر جاتی ہے، اس شعاع کے دریافت ہونے کی تاریخ یہ ہے کہ ۱۹۰۳ء میں بعض علماء طبیعۃ نے محسوس کیا کہ الکٹرس کوپ کو کیسا ہی مضبوط طور پر بند کر دیا جائے، لیکن اس سے کہربائیت منتشر ہوتی ہے، اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ سلبی یا ایجابی کہربائی شعاعیں اس میں داخل ہوئیں اور اس کہربائیت سے مل کر جو اس آلہ کے اندر تھی زایل ہو گئیں، یعنی معلوم یہ ہوا کہ زمین میں بعض مواد ایسے ہیں جن سے کہربائی شعاعیں پیدا ہو کر الکٹرسکوپ کی کہربائیت سے مل جاتی ہیں۔

۱۹۱۰ء میں بعض جرمن علماء وغیرہ میں بیٹھ کر اُڑے اور اپنے ساتھ الیکٹرسکوپ بھی رکھ لیا، جب بلند ہوئے تو معلوم ہوا کہ اس آلہ کی کہربائیت بجائے کم ہونے کے اور زیادہ ہو گئی ہے، اس کے بعد چونکہ جنگ شروع ہو گئی اس لئے مزید تجربات نہ ہو سکے۔ اختتام جنگ کے بعد پھر یہ تجربہ شروع ہوا اور آخر کار نتیجہ یہ نکلا کہ یہ جدید کہربائی شعاعیں زمین سے نہیں بلکہ فضا سے پہونچتی ہیں اور معدنی اجسام کے اندر بھی نفوذ کر جاتی ہیں۔ اب رہا یہ امر کہ فضا میں اُن کا مصدر یا مخرج کیا ہو سکتا ہے اس کے متعلق اختلاف ہے، بعض کہتے ہیں کہ سدیم لوہی کے جواہر مادی میں جو تغیر پیدا ہوتا ہے اُس سے یہ شعاعیں نکلتی ہیں، بعض کا خیال ہے کہ ہوا کے بلند طبقات میں جو کہارب ( ) پائے جاتے ہیں اُن سے پیدا ہوتی ہیں۔

کواکب اور وہاں کے باشندے آفتاب نجوم میں سب سے چھوٹا ستارہ ہے اور زمین اُن کواکب میں جو آفتاب کے گرد گھوم رہے ہیں سب سے زیادہ حقیر سیارہ ہے، لیکن باوجود اس کے وہ انسان کا وطن ہے اور لاکھوں قسم کے حیوانات و نباتات اس میں پائے جاتے ہیں۔ پس سوال یہ ہے کہ کیا یہ شرف صرف زمین ہی کو حاصل ہے اور دوسرے کواکب اس سے محروم ہیں؟

اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ جاندار کے وجود کے لئے ایک خاص درجۂ حرارت و برودت کی ضرورت ہے (یعنی حرارت ایسی جو صفر سے ۱۰۰ درجہ سے زیادہ بلند نہ ہو اور برودت ایسی جو ۱۰۰ درجہ سے زیادہ کم نہ ہو) اور یہ کہ اجسام کا قوام عبارت ہے کاربن، آکسیجن اور ہیڈروجن کی ترکیب و امتزاج سے اور اسی کے ساتھ یہ کہ اس کو ہوا اور پانی کی بھی ضرورت ہے تو ہمیں یہ بھی ماننا پڑے گا کہ سوائے مریخ اور زہرہ کے یہ خصوصیات کسی اور سیارہ میں نہیں پائی جاتیں (یہ ذکر صرف اپنے نظام شمسی کا ہے کہ دوربین یہیں تک کام دے سکتی ہے، باقی اور نظام شمسی جو خدا معلوم کتنی تعداد میں پائے جاتے ہیں، ان کا علم کسی کو نہیں اور کوئی نہیں بتا سکتا کہ وہاں کس قسم کی مخلوق آباد ہے)

اب سب سے پہلے آفتاب کو لیجئے، سو ظاہر ہے کہ وہاں اس قدر شدید حرارت ہے کہ کوئی جاندار نہیں پایا جا سکتا، کیونکہ وہ مرکبات جن سے جسم انسانی کی تشکیل ہوتی ہے اتنی حرارت میں قایم نہیں رہ سکتے۔

مشتری، زحل، اورانوس اور نپٹون میں بھی کسی جاندار کا وجود متحمل نہیں ہے کیونکہ یہاں سردی نہایت سخت ہے، حتےٰ کہ مشتری میں بھی جس کی حرارت زحل وغیرہ سے بڑھی ہوئی ہے، حرارت صفر سے ۲۷۰ درجے نیچی ہے۔ عطارد، زہرہ اور مریخ، ضرور ایک حد تک زمین

سے مشابہ ہیں، لیکن عطارد کا درجۂ حرارت ۷۰ ۴ ہے اور مریخ کا ۷۰ درجے صفر سے نیچے ہے اس لئے یہاں بھی جاندار نہیں پیدا ہوسکتے، اب رہگیا زہرہ سو اس میں شک نہیں کہ اس میں بہ نسبت اور سیاروں کے زیادہ صلاحیت جاندار پیدا کرنے کی ہے، کیونکہ اس کی حرارت کا اوسط زمین کی اوسطِ حرارت سے ۹ درجے سے زیادہ نہیں بڑھتا، لیکن چونکہ یہاں بھی پانی کا وجود نہیں معلوم ہوتا ہے اس لئے جاندار کا پایا جانا یہاں بھی دشوار ہے، اسی طرح چاند میں بھی پانی اور ہوا نہیں ہے اور یہاں بھی کوئی جاندار نہیں پایا جاسکتا۔ ذیل کے نقشے سے ہر سیارہ کی حرارت وغیرہ کا اجمالی علم حاصل ہوسکتا ہے :-

نام سیارہ	قطر میلوں میں	دوری آفتاب سے	دن کی لمبائی	سال کی لمبائی	درجۂ حرارت
آفتاب	۸۶۵۰۰۰	..	۶۰۰ گھنٹے	..	+ ۱۲۰۰۰ -
عطارد	۳۰۳۰	۳۶۰۰۰۰۰۰ میل	؟	۸۸ دن	+ ۴۲۰
زہرہ	۷۷۰۰	۶۷۲۰۰۰۰۰ ″	؟	۲۲۵ ″	+ ۶۸
زمین	۷۹۱۸	۹۲۹۰۰۰۰۰ ″	۲۴ گھنٹے	۳۶۵ ″	+ ۵۹
مریخ	۴۲۳۰	۱۴۱۰۰۰۰۰۰ ″	۲۴ ½ ″	۶۸۷ ″	—— ۶۰
مشتری	۸۶۵۰۰	۴۸۳۳۰۰۰۰۰ ″	۹۵۸ ″	۴۳۳۲ ″	—— ۲۷۰
زحل	۷۰۰۰۰	۸۸۷۰۰۰۰۰۰ ″	۱۰۶۳ ″	۱۰۷۹۵ ″	—— ۳۳۰
اورانوس	۳۱۵۰۰	۱۷۸۱۹۰۰۰۰۰ ″	؟	۳۰۶۸۷ ″	—— ۳۸۰
نپٹون	۳۴۸۰۰	۲۷۹۱۰۰۰۰۰۰ ″	؟	۶۰۱۸۱ ″	—— ۴۰۰

مکھی بطور غذا کے شہر مکسیک سے جانب شرق ریل کی ایک گھنٹہ کی مسافت پر نہایت چھوٹا سا گاؤں نظر آتا ہے جو دلدل کے کنارے واقع ہے۔ اس گاؤں کا شمالی غربی جانب دلدل کے کیچڑ سے محصور ہے جو سانپوں اور حشرات سے بھرا ہوا ہے، یہی حال شمالی شرقی حصے کا ہے، جنوبی طرف ایک خشک بلند پہاڑ ہے جس کے دامن سے مکسیک کو راستہ جاتا ہے، اس قریہ کی آب و ہوا خراب ہے اور حیرت ہوتی ہے کہ لوگ یہاں کیونکر زندگی بسر کرتے ہیں۔

یہاں کے باشندوں کی آمدنی کا خاص ذریعہ پانی کی مکھی اور اس کے انڈے ہیں، صبح ہوتے ہی یہاں کے لوگ دل دل کے کنارے پہونچ جاتے ہیں اور جتنی زندہ یا مردہ مکھیاں انھیں ملتی ہیں پکڑ لیتے ہیں۔ ان کو وہ ریت پر دھوپ میں پھیلا دیتے ہیں اور پھر شہر مکسیکو (پایۂ تخت) میں لیجاکر انھیں فروخت کرتے ہیں۔ یہ بہت گراں قیمت پر فروخت ہوتی ہیں، اور لوگ نہایت شوق سے مول لیتے ہیں، بعض لوگ کشتیوں میں بیٹھکر دور نکل جاتے ہیں اور ایک خاص جال کے ذریعہ سے کشتی بھر کر مکھیاں پکڑ لاتے ہیں، ان کے انڈے حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ گھاس کے پولے قطار در قطار پانی کے اندر گاڑ دیتے ہیں، جن کے سرے پانی سے اوپر ہوتے ہیں، مکھیاں شام کو آکر یہاں بیٹھتی ہیں اور انڈے دیتی ہیں، چند دنوں میں ساری گھاس انڈوں سے بھر جاتی ہے۔ جنھیں خشک کرکے آٹے کی طرح پیس لیتے ہیں اور پھر اُن کی گول ٹکیاں بناکر گراں قیمت پر فروخت کرتے ہیں۔

مردوں کی روحیں امریکہ کے ایک شخص نے ارواح موتے کے متعلق ریاضیات کے نقطۂ نظر سے گفتگو کرکے ظاہر کیا ہے کہ انسان زمین میں کم از کم ۵ لاکھ سال سے آباد ہے، لیکن اگر کم از کم اس کو ۲۵۰۰۰ سال فرض کرلیا جائے تو بھی اس وقت انسانی آبادی کم از کم

ایک ارب رہی ہوگی اُس وقت انسانی آبادی ..... ۱۷۴۸۰۰۰۰۰ ہے، جس میں سے سالانہ ۴۳۴۲۹۸۱۳ اموات ہوتی ہیں اس لئے اگر اسی نسبت سے گزشتہ ۲½ لاکھ سال کے مردوں کا شمار کیا جائے تو اُن کی تعداد کم از کم ..... ۱۰۸۴۲۵۳۲۵۰۰۰ ہوگی۔ اگر واقعی روح فنا نہیں ہوتی اور فضا میں باقی رہتی ہے اور اُسی کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ وہ آپس میں مل بھی سکتی ہے تو کیا یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک روح اپنی شناسا روح کو اتنی تعداد میں سے بآسانی ڈھونڈ لے گی۔

اگر بعض عیسائی علماء کے بیان کے مطابق روح کی مخصوص شکل تسلیم کی جائے اور کم از کم ایک چیونٹی کے برابر اُس کا جسم مانا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ اس وقت تک جتنے لوگ مر چکے ہیں اُن کی روحوں کے لئے کم از کم ۲۱۳۹۰۷۶۹ میل کی جگہ درکار ہے، یا دوسرے الفاظ میں یوں سمجھئے کہ اگر ان کو برابر جوڑ کر ایک فیتہ بنایا جائے تو خط استواء پر ۱۱۱ مرتبہ اس کو لپیٹ سکتے ہیں اور اگر ان سے ایک چوکور مینار بنایا جائے تو اس کا ہر ضلع ۶½ میل اور بلندی ۱۹½ میل ہوگی، حالانکہ دنیا کا سب سے اونچا پہاڑ اور سٹ بھی ۵½ میل سے زیادہ بلند نہیں ہے۔

زمانۂ ماضی کی تصویر

اگر کسی سے یہ کہا جائے کہ دوربین کے ذریعہ سے زمانۂ ماضی بھی نظر آسکتا ہے تو وہ ہنسے گا، کیونکہ دوربین کا کام صرف یہ ہے کہ سامنے کی مرئی چیزوں کو بڑا کرکے دکھا دے نہ یہ کہ زمانۂ ماضی کو جو بالکل مرئی ہے اور جس کا تعلق مادی اشیاء سے نہیں ہے پیش کر سکے۔ لیکن اگر غور کیا جائے تو ڈاکٹر لوکیش کے بیان کے مطابق ایسا ہونا ناممکن معلوم ہوتا ہے۔

یہ امر ثابت ہے کہ بعض ستارے اتنی دور واقع ہوئے ہیں کہ ان کی روشنی زمین تک اور زمین کی روشنی ان تک ہزاروں سال میں پہونچتی ہے یعنی اگر کوئی واقعہ آج یہاں رونما ہو تو اس کو شعاعیں ہزاروں سال کے بعد دوسرے ستاروں کو پہونچائیں گی اس لئے معلوم ہوا کہ اب سے ہزاروں سال قبل کے حالات زمین ایسے ہیں جو ہنوز بعض سیاروں تک نہیں پہونچے اور بعض میں اب پہونچ رہے ہیں۔ پھر چونکہ زمین کی شعاعیں اُن سیاروں تک پہونچکر دوبارہ واپس آتی ہیں اس لئے اگر اُن کو وقت نظر سے دیکھا جائے تو ہم زمین کے گزشتہ واقعات کی تصویر بھی لے سکتے ہیں۔

مثلاً ریجل ایک ستارہ ہے جس کی روشنی ۴۶۶ سال میں ہم تک پہونچتی ہے، یعنی زمین کا ہر واقعہ وہاں تک ۴۶۶ سال میں پہونچتا ہے اسلئے اگر اس ستارہ کی شعاعوں کا دقیق مطالعہ تفصیل کے ساتھ کر سکیں تو ہم کو زمین کے وہ واقعات جو ۴۶۶ قبل گزر چکے ہیں نظر آسکتے ہیں، اور یہ ناممکن نہیں اگر دوربین کی ساخت میں اور زیادہ ترقی ہو جائے۔

بظاہر یہ خیال بالکل ناممکن العمل معلوم ہوتا ہے لیکن اگر کسی وقت یہ محال ممکن ہو گیا تو خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جو دُنیا کے تمام گزشتہ حوادث کو اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں گے۔

اقوال زرّیں

——— جو شخص سب سے زیادہ محبت کرنے کا مدعی ہے وہ کسی سے محبت نہیں کرتا۔

——— عورت ایک بُت ہے، مرد جس کی پرستش کرتا ہے، لیکن پھر اُسے توڑ ڈالتا ہے۔

——— عورت کا امتحان کرو غصّہ کے وقت خوشی کے وقت نہیں۔

——— عورت اپنے پاس کسی چیز کے کم ہونے کا افسوس نہیں کرتی بلکہ اس کو افسوس ہوتا ہے اس بات کا کہ دوسرے کے پاس کیوں زیادہ ہے۔

——— جس عورت کے جتنے بڑے بال ہیں اتنی ہی وہ کم عقل ہے۔

——— ایسا شخص جو اپنی بیوی کو دیکھتا ہے اس حال میں کہ وہ حسین ملبوس میں آراستہ ہے، فیلسوف ہے یا بیوقوف۔

——— دُنیا کا کوئی احساس اتنا مغرور نہیں، جتنا عورت کا وہ احساس جو اول اول ماں بننے پر ہوتا ہے۔

——— عورت کی ایک ٹھنڈی سانس مرد کے تمام دلایل باطل کر دینے کے لئے کافی ہے۔

——— آنکھوں کے آنسو رنج و ملال کی دلیل نہیں۔

——— حُسنِ انسانی میں تہذیب سے زیادہ حسین کوئی چیز نہیں۔

——— عورت کا دل عنبر کی طرح ہے، جب تک اس میں جلن پیدا نہیں ہوتی خوشبو نہیں پھیلتی۔

یزداں — جبرئیل — اہرمن

(فضا ابن فیضی)

یزداں — جبریل! یہ ہنگامہ ہے بالائے زمیں کیا!
بخشی تھی جسے ہم نے زمینوں کی خلافت
قندیل دھواں دیتی ہے کیوں بزمِ فنا کی
کچھ کہہ تو ہے کس حال میں وہ آدمِ خاکی

جبریل — کیا واسطہ اب سلسلۂ شام و سحر سے
مدت ہوئی آئے ہوئے دُنیا کے سفر سے
وہ رنگ ہوں باقی جو نہیں لالہ و گل پر
وہ جلوہ ہوں جو روٹھ گیا ذوقِ نظر سے
گہوارۂ الہام نہیں اب مرے انفاس
میں وہ صدفستاں ہوں جو خالی ہے گہر سے
اب شامِ حرا بھی مرے تاروں کو نہیں یاد
مشرق مرا محروم ہے طیبہ کی سحر سے
کیسے کہوں اس دور میں کیا حال ہے اسکا
واقف نہیں میں آدمِ خاکی کے ہنر سے
اس بات کو پوچھ اس سے کہ یہ نکتہ نہ ہوگا
پوشیدہ کچھ ابلیس کی بیتاب نظر سے

اہرمن — خاموش رہوں میں تو منافی ہے ادب کے
بولوں تو ٹھہرتا ہوں عقوبت کا سزاوار
ہر چند مرا منصبِ ذاتی یہ نہیں ہے
پوچھا ہے مگر تو نے تو لازم بھی ہے اظہار
کیا تجھ سے کہوں آدمِ خاکی کی میں روداد
کانپ اٹھتی ہے میری رگِ جرأتِ گفتار
ٹوٹا نہ فسوں اس کی زبوئیِ خرد کا،
یہ شوخ کمین ہے ابھی شبنم میں گرفتار
یہ خام و زبوں جنس نہیں اب کسی قابل
سنتا ہوں کہ اس جنس کا تو بھی ہے خریدار
ہے بندِ حبابوں میں حقیقت کا یہ طوفاں
نے رفعتِ کردار ہے نے جرأتِ گفتار
بُت بنکے ہوں میں اسکے عقابیر کے حرم میں
پھر بھی یہ نہیں میری سیاست سے خبردار
چاہوں تو اسے کعبہ کی گردن پہ جھکا دوں
مومن ہے ترا آج مرے ہاتھ کی تلوار
صدیوں سے ہے ٹھہری ہوئی جو اسکے بدن میں
وہ روح، ابھی تک نہ ہوئی خواب سے بیدار
یہ سوزِ خود افروز کی دولت سے ہے محروم
ہے اسکی ہر اک صبح اندھیروں سے گرانبار
خطۂ نگہ غیب پہ قانع ہے ابھی تک
یہ ذلتِ محکومیِ جاوید کا شہکار
زرخیز مگر تر نہ ہوا خاکِ چمن کو،
وہ جس نے کیا آتشِ نمرود کو گلزار
تھراتے ہیں طوفاں پہ آنسوؤں سے اسکے
کاشانۂ تقدیرِ امم کے در و دیوار
کیا تیرا خلیفہ ہے یہی بندۂ بے ذوق
تجھ سے بھی ترے امر و نواہی سے بھی بیزار

تو دیکھ چکا جذبۂ تخلیق کا انجام
خورشید سے کہدے کہ ہو مغرب سے نمودار

حدیثِ میکدہ

رُباعیات

(عزیز عظیم آبادی)

ناصح جذبات میں بہکتے ہی رہے — ساغرِ مئے ناب کے - چھلکتے ہی رہے
گلشن پہ خزاں کا زور چلتا ہی رہا — جو نغمہ نواز تھے - چہکتے ہی رہے

ہنگامِ سحر جو دور چل جاتا ہے — سانچے میں ہر اک خیال ڈھل جاتا ہے
یہ آبِ عنب ہے کچھ عجب شے کہ عزیز — کونین کا نقشہ ہی بدل جاتا ہے

اک آن میں - مرکزِ صفت تک پہونچے — اک جست میں حسنِ بے جہت تک پہونچے
ہر شخص کے بس کا یہ نہیں روگ عزیز — رندی کے علوئے مرتبت تک پہونچے

ہر جام پہ - رندوں کی وہ کیفیت نو — وہ عالمِ بے خودی - وہ دلکش تگ و دو
وہ آخرِ شب کا میکدہ لے ساقی — وہ پچھلے پہر کی جھلملاتی ہوئی لو

سیراب قدح ، کبھی بنا کر دیکھیں — ہاں ، بادہ پرست ہوں - پلا کر دیکھیں
اک پھول کو سو طرح کھلاتا ہوں عزیز — جو اہلِ نظر ہیں آزما کر دیکھیں ،

ہر بات میں - نامراد و ناکام رہے — لب تشنہ رہے - گرچہ مے آشام رہے
خالی ہی رہا - سا غر و مینا - اپنا — لائے کی طرح - ہم بھی تہی جام رہے

رندوں کو نوید کامرانی آئی ،، — کیا چاند بھری رات سہانی آئی ،
گردش میں وہ زرفشاں گھٹاؤں کی بہار — مخمور ہوئی فضا - جوانی آئی ،

پیغامِ بہار - جب صبا لاتی ہے — یادِ مئے ناب دل کو برماتی ہے
جنت کی ہوس کرے - تو کافر سمجھو ، — پینے کو جسے شراب مل جاتی ہے

ساقی کے قدم پہ سر جھکا لیتے ہیں — مستی کو نشاطِ دل - بنا لیتے ہیں
ساغر کے لبوں کو چوم لیتے ہیں عزیز — مینا کو گلے سے ہم - لگا لیتے ہیں

مخمورِ مئے بے اثری - ہوں ساقی — آشفتۂ سوزِ جگری - ہوں ساقی
اتنی تو پلا کہ دل کو حسرت نہ رہے — اب میں بھی چراغِ سحری ہوں ساقی

پیگانۂ آرزو - ہوئی جاتی ہے — اس دور میں - تند خو - ہوئی جاتی ہے
اگلی سی نظر - کہاں ہے رندوں پہ عزیز — رحمت بھی بہانہ جو ہوئی جاتی ہے

جب تک نہ سحر فراز موتی چھلکے — چلتا رہے دورِ بادہ ہلکے ہلکے
رندو انداز سے نہ باہر ہوں قدم — بوتل سے مے گرے نہ ساغر چھلکے

آخری فیصلہ

(ساقی جاوید۔ بی۔ اے)

جہاں لالہ رخ بھی ہیں گل پیرہن بھی
وہاں سینکڑوں ہیں سلگتے کفن بھی

جہاں عارضوں پہ ہیں خطہائے بادہ
وہاں آنچلوں کے ورق بھی ہیں سادہ

ہلاہل سے لبریز ہیں جام و خم بھی
زمانے کے کنجیر ہم بھی ہیں تم بھی

جبینوں پہ فاقوں کے خط کھینچتی ہے
سیاست لہو سے زمیں سینچتی ہے

عجب ہیں یہ دانش کی باریکیاں بھی،
چراغوں کا تلفہ ہیں تاریکیاں بھی

محل اور مینار اب بھی کھڑے ہیں
تمدن کے شہکار اب بھی کھڑے ہیں

یہاں ظلمتوں کے سوا کچھ نہیں ہے
یقین گماں ہے گمان یقیں ہے

اگر تم یہاں زندگی چاہتے ہو
ضمیروں کی تابندگی چاہتے ہو

اگر تم یہاں چاہتے ہو اُجالے
تمہاری زمیں چاند تارے اُچھالے

اگر تم کبھی قوسِ قزح چاہتے ہو
اِسی میکدے میں قدح چاہتے ہو

اگر کوئی سنگیت سننا ہے تم کو
زمیں سے اگر پھول چننا ہے تم کو

تو پھر آتشیں راگ بننا پڑے گا
بھڑک کر تمھیں آگ بننا پڑے گا

زمانہ یہاں امتحاں لے رہا ہے
سنو وقت کیا فیصلہ دے رہا ہے

اٹھو بن کے صرصر بڑھو بن کے طوفاں
زمیں ہے انھیں مشعلوں سے چراغاں

جہاں آدمی کی جبیں جھک گئی ہے
سحر ہوتے ہوتے وہیں رک گئی ہے

کاوش حیدرآبادی :

یاد آرہے ہو تم اور بھی بھلانے سے
ولولے چمک اُٹھے دل کے ٹوٹ جانے سے

کوئی فتنۂ تازہ یاد آگیا شاید!
دل دھڑک رہا ہے پھر اُنکے مسکرانے سے

تم نہ چھیڑتے بھی گر تذکرہ غمِ دل کا
کیا سنا نہ دیتے ہم خود کسی بہانے سے

اُف یہ دن بھی آئیں گے کچھ نہ تھی خبر اس کی
سر اُٹھا رہا ہوں میں تیرے آستانے سے

اکرم دھولیوی :

اور وحشت آفریں بادِ بہاری ہوگئی
ہم تو سمجھے تھے کہ اب موسم سہانا آگیا

چپکے چپکے دل میں گھر کرتی گئی اک آرزو
رفتہ رفتہ جی سے جانے کا زمانہ آگیا

مدعا یہ ہے مری شمعِ تمنا گل نہ ہو
اب سمجھ میں آپ کا دامن بچانا آگیا

(سعادت نظیر)

آج دل سے اُٹھتا ہے کیوں دھواں؟ نہیں معلوم — جل رہا ہے کس کس کا آشیاں؟ نہیں معلوم
زندگی عبارت ہے دل پہ چوٹ کھانے سے — دل نے چوٹ کھائی ہے کب؟ کہاں؟ نہیں معلوم
جو بلند ہر دل سے ہو رہی ہے رہ رہ کے — یہ صدائے نغمہ ہے یا فغاں؟ نہیں معلوم
ہے یہ ذوقِ تعمیری یا ہے ذوقِ تخریبی — کیوں بنا رہا ہوں پھر آشیاں؟ نہیں معلوم
دشمنی کے پردے میں دوستی جو کرتا تھا — چھپ گیا کہاں ایسا مہرباں؟ نہیں معلوم
ایک شیشۂ نازک دل کبھی تھا لیکن آج — سنگ سے زیادہ ہے کیوں گراں؟ نہیں معلوم
بن گئی خلشِ دل کی نالہ و فغاں آخر — بات آج کی پہونچے کل کہاں؟ نہیں معلوم
اے نظیر! کیا کہئے کیوں رُکی زباں میری — رہ گئی ادھوری کیوں داستاں؟ نہیں معلوم

(جوہر ٹونکی)

جلا نہ دیں کہیں یہ نفس کی قفس کو برق و شرر سے پہلے — مجھے تو صیاد فکر یہ ہے لگے نہ آگ اپنے گھر سے پہلے،
وہ حرفِ آخر کہ جس کی تصویر اشکِ غم پیش کر رہا تھا — مریضِ غم کی خموشیوں نے سنا دیا چشم تر سے پہلے
مرے سجودوں نے کانٹے چن لئے ہیں راہِ منزل کے — سفر بے خوف میرے بعد اہلِ کارواں کر لیں
چمن کی زندگی تو میں چمن ہی میں گزاروں گا — جو چاہیں فیصلہ صیاد برق و باغباں کر لیں

(انور معظم)

رہزن نے مجھ کو سب سے دیا درس آگہی — رہبر کو راز دار بنانا نہیں کبھی
بابل مجھے کبھی یاد ہیں ایسی کہانیاں — یہ اور بات ہے کہ سنانا نہیں کبھی
جہاں پہونچ کے محبت کو ہوش آتا ہے — اسی مقامِ جنوں سے میں لوٹ آیا ہوں
جہاں منزلیں دل کی آساں ہوئی ہیں، — قدم ڈگمگائے ہیں اکثر وہیں پر

(ارشد کاکوی)

حجاب میں بھی ہے اک طرز دلربائی کی — مگر وہ رسم جو ہوتی ہے روشنائی کی
شمع امید بجھ گئی لیکن — روشنی ہے کہ کم نہیں ہوتی
کھلتا جاتا ہے ایک اک غنچہ — اور شوقِ رواں ہے پانی میں
زندگی اور یہ تمنائیں — جل رہا ہے چراغ پانی میں
تری رہبری سے یا رب مرے ناخدا، خدارا — مرا فیصلہ ابھی کر وہ سفینہ، ہو یا کنارا
یہ حیاتِ چند روزہ بھی عجیب طرح گزاری — کبھی زیست کی دعا کی کبھی موت کو پکارا

(شارق میرٹھی)

کھاتے رہے فریب سنبھلتے رہے قدم — چلتے رہے جنوں کا سہارا لئے ہوئے
تھی آشیاں سے عبارت چمن کی آزادی — اب اس کے بعد خزاں آئے یا بہار آئے
کیں نہیں بلکہ ہوگئیں شارق — ہیں کچھ ایسی بھی اپنی تقصیریں
کسی طرح خلشِ آرزو مٹا نہ سکے — ترے قریب بھی آکر سکون پا نہ سکے

بابُ الاستفسار

سیاہی — روشنائی

(جناب کوثر چاندپوری)

ایک بات مجھے جناب سے دریافت کرنی ہے اور وہ یہ کہ ایک بزرگ اس پر مصر ہیں کہ سیاہی کو اسم معرفہ، ان کو سُرخ سیاہی، اور سفید سیاہی، کی ترکیب کو جائز سمجھیں، میں ان سے عرض کر رہا ہوں کہ یہ بالکل غلط ہے آپ روشنائی کو اسم معرفہ کہہ سکتے ہیں اور سُرخ روشنائی، سیاہ روشنائی یا سفید روشنائی کے الفاظ استعمال کر سکتے ہیں کیونکہ روشنائی کے معنی چمکانے کے ہیں اور چونکہ وہ لکھے ہوئے حروف کو نمایاں کرتی ہے اس لئے اسم معرفہ کے طور پر لکھنے کے سیال کے معنی میں استعمال ہو رہی ہے، ان کا استدلال لفظ مداد سے ہے جس کے معنے لغت میں "سیاہی دوات" کے ہیں، حالانکہ "سیاہی دوات" ہی سے سیاہی کے اسم معرفہ ہونے کی نفی ہوتی ہے، امید ہے کہ میری تسکین اور اطمینان کے لئے تفصیلی جواب عنایت فرمائیں گے۔

(نگار) قبل اس سے کہ اس باب میں اپنی کوئی رائے پیش کروں، یہ ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ سیاہی اور روشنائی دونوں اسم معرفہ نہیں ہیں بلکہ اسم نکرہ ہیں (بالکل اسی طرح جیسے پانی، شراب) اور مختلف صفات سے متصف ہو سکتے ہیں، اس لئے ان کو اسم معرفہ سمجھ کر کوئی دلیل لانا درست نہیں اب رہا یہ امر کہ "سرخ سیاہی" کہنا صحیح ہے یا "سرخ روشنائی" اس باب میں لغت و ذوق دونوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔

عربی میں اس کے لئے دو لفظ ہیں: مداد اور حبر۔ مداد کے معنی ہیں، سیاہی (خواہ دوات میں ہو یا اس سے باہر) گوند، سرگیں، تیل جس سے چراغ روشن کیا جاتا ہے، نہج و طریقہ۔ حبر کے معنی بھی مداد (INK) کے ہیں، لیکن نشان، داغ کو بھی حبر کہتے ہیں اور سیاہ تعاب کو حبرہ۔ فارسی میں بھی حبر و مداد (CNK) کے معنی میں مستعمل ہیں، چنانچہ دوات کو حبردان کہتے ہیں۔ یحییٰ کاشی لکھتا ہے:۔

یک قلم از تیرگی شب جہاں ۔۔۔ گر نہ سیاہی شدہ چوں حبر دان

فارسی میں لکھنے کی سیاہی کو مرکب بھی کہتے ہیں، شاید اس لئے کہ وہ کئی اشیاء کو ملا کر طیار کی جاتی ہے۔ عربی میں مرکب، سیاہی کے معنی میں نہیں آیا۔

اب سیاہی اور روشنائی کو لیجئے:۔ فارسی میں سیاہی کے معنی تاریکی کے ہیں، لیکن مجازاً مداد (صرف کالی سیاہی) کے مفہوم میں مستعمل ہے، وہ کبھی سرخ نہیں گہیں گے بلکہ اسے مرکب سُرخ کہیں گے۔ روشنائی کا مفہوم ان کے یہاں صرف روشنی اور چمک کا ہے اور مداد کے معنے میں کبھی استعمال نہیں کرتے۔ اُردو میں روشنائی اور سیاہی دونوں مداد کے معنے میں مستعمل ہیں۔ اب رہی یہ بحث کہ سُرخ، سبز، یا کسی اور رنگ کی نسبت لفظ سیاہی کے ساتھ زیادہ مناسب ہے یا روشنائی کے ساتھ، اس باب میں یہ امر غور طلب ہے کہ اُردو یا فارسی میں (INK) کو سیاہی کیوں کہتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس کے رنگ کے لحاظ سے اس کا نام سیاہی قرار پایا کیونکہ وہ عموماً سیاہ ہی ہوتی ہے اور عربی میں بھی حبر و مداد اسی لئے کہتے ہیں کہ ان دونوں کے مفہوم کا صحیح پس منظر سیاہی، تاریکی ہی ہے۔

روشنائی یعنی (INK) خالص اُردو کا لفظ ہے اور فارسی میں اسے (INK) کے معنے میں کبھی استعمال نہیں کرتے، اس لئے اُردو میں سُرخ و سفید کی نسبت لفظ روشنائی کے ساتھ زیادہ مناسب ہے نہ کہ سیاہی کے ساتھ جسے مجازی معنی میں مداد کہتے ہیں۔

اس کے علاوہ اگر سیاہی کے معنے صرف اس سیال شے کے لئے جائیں جو لکھنے کے کام آتی ہے، تو پھر سرخ سیاہی، سفید سیاہی کی طرح کالی سیاہی کو بھی سیاہ سیاہی کہنا چاہئے ـــــ حالانکہ سیاہی صرف، صرف کالی سیاہی ہی کو کہتے ہیں اور یہ مفہوم اتنا ذہن نشین ہو چکا ہے کہ اس کے ساتھ سُرخ و سفید کی نسبت بے جوڑ معلوم ہوتی ہے۔

مطبوعات موصولہ

اُردو ساہتیہ کا اتہاس یعنی اُردو ادب کی تاریخ جسے پروفیسر سید احتشام حسین نے ہندی زبان اور ہندی رسم خط میں مرتب کی ہے۔

یہ کتاب گیارہ ابواب میں منقسم ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے اُردو کی تخلیق و ترقی پر بحث کی ہے، اس کے بعد دکن، ولی، اودھ اور عہدِ نظیر کا ذکر کیا ہے اور پھر اُردو نثر کے مختلف ادوار پر سرسری تبصرہ کرتے ہوئے جدید رجحانات پر گفتگو کی ہے۔

احتشام صاحب مشہور نقاد ہیں اور اُردو میں ان کی متعدد کتابیں تاریخ ادب پر نکل چکی ہیں، اس لئے اس کتاب میں جو کچھ لکھا گیا ہے وہ مفہوم و مواد کے لحاظ سے نیا نہیں ہے، لیکن زبان و رسم خط کے لحاظ سے یقیناً ان کی یہ پہلی کوشش ہے جسے دیکھ کر ہمیں بہت سے اندیشہ ہائے دور و دراز پیدا ہوتے ہیں، کیونکہ ہندی کی اپنی پہلی ہی تصنیف میں انھوں نے اتنے ثقیل و مشکل الفاظ استعمال کئے ہیں کہ معمولی ہندی داں حضرات بھی انھیں نہیں سمجھ سکتے اور اگر احتشام صاحب کا یہ ذوق دشوار پسندی ترقی کرتا رہا تو شاید ان کی آئندہ ہندی تصانیف خالص سنسکرت کے اشلوک کا مجموعہ نظر آئیں گی، جو ممکن ہے تبرک کے طور پر دیکھ لی جائیں لیکن افادیت کے لحاظ سے عوام کیا خواص کے لئے بھی غالباً زیادہ دلچسپ ثابت نہ ہوں گی۔ اس سے قبل ہندی اداروں سے بھی اُردو شاعری پر کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں لیکن ان کی زبان صاف ہے۔

اس لئے بیساختہ ہے کہ احتشام صاحب نے کیوں یہ باغی اختیار کی، جبکہ ایک مسلمان کو خواہ وہ ہندو پاک دھیا ہی کیوں نہ ہو جلد یا بدیر ہندو صحیح معنی میں ہندی داں نہیں سمجھ سکتے۔

بہر حال تحقیق کے لحاظ سے یہ کتاب یقیناً سید احتشام حسین کی ہے لیکن زبان کے لحاظ سے پنڈت احتشام حسین کی ہے، خدا کرے ان کے اس "پنڈت پن" کو ہندی پرچارنی سبھا بھی تسلیم کرلے۔

یہ کتاب انجمن ترقی اُردو علیگڈھ نے شایع کی ہے۔ قیمت درج نہیں ہے۔

الحسین اُردو ترجمہ ہے عمر ابوالنصر کی عربی کتاب الحسین کا۔ ترجمہ شیخ محمد احمد پانی پتی کا ہے اور خوب ہے۔

اس کتاب میں حضرت امام حسینؓ کی زندگی اور واقعۂ شہادت پر تبصرہ کیا گیا ہے اور اسی کے ساتھ اُس زمانہ کے سیاسی حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے جو شہادت حسین کا باعث ہوئیں۔

فاضل مصنف نے پہلے حق خلافت کے مسئلہ پر اظہار خیال کیا ہے اور پھر حضرت علی، امیر معاویہ، جناب حسین اور یزید کی ذہنی خصوصیات کا ذکر کرکے واقعۂ شہادت کے پس منظر اور اس کی بعض تفصیلات کو پیش کیا ہے۔ یہ کتاب ایک طرح کا سیاسی و تاریخی تبصرہ ہے جس میں فاضل مصنف نے کافی احتیاط سے کام لیا ہے۔ تاہم کہیں کہیں وہ اخذ نتائج میں اعتدال سے تجاوز کر گئے ہیں، مثلاً ان کا یہ لکھنا کہ حضرت علی نے ابوبکر صدیق کا حق خلافت تسلیم نہیں کیا، بہت عجیب سی بات ہے جس سے خود حضرت علی کا کیرکٹر معرض بحث میں آجاتا ہے، کیونکہ حضرت علی نے عملی طور سے ہمیشہ اپنے پیش رو تینوں خلفاء کا ساتھ دیا اور کبھی حصول خلافت کی کوشش نہیں کی، ہاں اگر یہ کہا جائے کہ حضرت علی نے فقیہ کیا تھا اور وہ رسمی طور پر محض دکھانے کو ان کے شریک کار رہتے تھے تو البتہ یہ بات درست ہو سکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ مذہبی حکومت حضرت علی کے ساتھ ختم ہو گئی اور امیر معاویہ کے عہد سے حکومت اسلام شروع ہوئی، لیکن سوال

یہ ہے کہ اگر امیر معاویہ، یزید کو اپنا جانشین مقرر نہ کرتے اور شہادت حسین کا واقعہ پیش نہ آتا تو کیا اس وقت بھی موخرین کا نقطۂ نظر امیر معاویہ کے متعلق وہی ہوتا جو عام طور پر ظاہر کیا جاتا ہے، غالباً نہیں اور یہیں سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ دُنیا نے حسین اور امیر معاویہ دونوں کا مطالعہ صرف اہلِ بیت کے حقِ خلافت اور واقعۂ شہادت کو سامنے رکھ کر کیا اور مورخانہ صداقت کو بڑی حد تک نظر انداز کر دیا یہی نقص اس کتاب میں بھی پایا جاتا ہے۔

اس سے انکار ممکن نہیں کہ اگر حضرت علی کے بعد منصب خلافت پر حسینؓ (حسنؓ نہیں) متمکن ہو جاتے تو اسلام میں ملوکیت کا آغاز اتنا جلد نہ ہوتا، لیکن یہ خیال یا اعتقاد کہ خلافت بہر حال اہلبیت ہی کا حق ہے، کسی نہ کسی دن ضرور اسی دور تک پہونچا دیتا جس کی ابتدا امیر معاویہ کے عہد سے ذرا جلد ہو گئی تھی۔

خلافت کا مسئلہ یکسر اجتماعی مسئلہ تھا، اور اعتقاد سے اس کا تعلق نہ تھا۔ ہر چند حضرت علی اور حسین کے بعد بھی اہلبیت میں سے خلافت کی اہلیت رکھنے والے دو چار حضرات کا پیدا ہو جانا ناممکن نہ تھا، لیکن ضروری بھی نہ تھا اور اس لئے وہ بنیادی غلطی جس نے عالم اسلامی کا شیرازہ منتشر کر دیا۔ یہی تھی کہ بعض جماعتوں نے حق خلافت صرف قریش اور قریش میں بھی رسول کی اولاد ہی کے لئے مخصوص و منصوص سمجھا۔

اس کتاب کے مصنف نے اچھا کیا کہ اس نوع کے نزاعی مسایل کو ہاتھ نہیں لگایا اور صرف تاریخی و سیاسی حیثیت سے واقعۂ شہادت پر نظر ڈالی۔ ہر چند اس کتاب کی حیثیت اک بسیط مقالہ کی سی ہے، لیکن تاریخی تبصرہ کی حیثیت سے وہ بڑی حد تک تمام پہلوؤں کو محیط ہے۔

کتاب نہایت نفیس کاغذ پر ٹائپ میں چھاپی گئی ہے اور مکتبۂ جدید لاہور سے دو روپیہ میں مل سکتی ہے۔

نئے پُرانے چراغ

پروفیسر آلِ احمد سرور کے ۱۲ انتقادی مجموعۂ مضامین کا تیسرا اڈیشن ہے۔ جسے ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ نے شایع کیا ہے۔ اس کا پہلا اڈیشن ۱۹۴۲ء میں شایع ہوا تھا، اس کے بعد دوسرا اڈیشن مع اضافہ کے ۱۹۵۱ء میں اور تیسرا اڈیشن اب ۱۹۵۸ء میں شایع ہوا ہے۔ تیرہ سال کے اندر کسی کتاب کے صرف تین اڈیشن شایع ہونا کوئی امید افزا بات نہیں لیکن ہمارے یہاں ذوقِ مطالعہ عام طور پر صرف تیسرے درجہ کے ناولوں اور قصّے کہانیوں تک محدود ہے، اس لئے کسی سنجیدہ کتاب کے تین اڈیشن شایع ہو جانا بھی بڑی بات ہے۔

جناب سرور معلم و متعلم دونوں طبقوں میں یکساں مقبول ہیں اور ایک "شگفتہ نگار" نقاد کی حیثیت سے خاص امتیاز کے مالک ہیں۔ اس کتاب میں ان کے ۱۲ انتقادی مقالات شامل ہیں اور سب کے سب اپنی جگہ بہت دلچسپ و مفید ہیں۔ قیمت پانچ روپیہ ضخامت ۲۰۸ صفحے

قدر و نظر

مجموعہ ہے جناب اختر اورینوی (صدر شعبۂ اُردو پٹنہ یونیورسٹی) کے اٹھارہ انتقادی مقالات کا۔

جناب اختر بڑے مشہور کہنہ مشق نقاد ہیں اور ۲۰ سال سے ادب کی گرانقدر خدمات انجام دے رہے ہیں۔

اس مجموعہ کا پہلا مضمون "اُردو زبان کا ارتقاء" بڑا مفید و پر از معلومات مقالہ ہے جس میں انھوں نے نہایت جامعیت کے ساتھ اس موضوع کے تمام پہلوؤں کو سمیٹ لیا ہے۔ اسی طرح صوبۂ بہار کی ادبی خدمات کی گرانمایگی کا ذکر انھوں نے متعدد مقالوں میں نہایت خوبی سے کیا ہے۔ حسرت، اقبال اور غالب پر بھی انھوں نے بہت متوازن و معتدل انداز میں اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ "جبلت اور اقدار" کا ایک نیا عنوان تلاش کر کے انھوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے اور ضرورت ہے کہ ملک کے دوسرے نقاد بھی اس طرف متوجہ ہوں۔

جناب اختر کا لب و لہجہ اور انداز گفتگو بہت سلیس و دلکش ہے اور اسی کے ساتھ وزنی و سنجیدہ بھی اس کی افادیت عام ہے اور قدرتاً اسے مقبول ہونا چاہئے۔ اس مجموعہ کا حجم ۳۲۰ صفحات ہے اور یہ ہیں ادارۂ فروغ اُردو لکھنؤ سے مل سکتا ہے۔

حرفِ تمنا

مجموعہ ہے جناب میکش اکبر آبادی کی غزلوں اور نظموں کا۔ ابتدا میں انھوں نے "حرفِ اول" کے عنوان سے اپنے "ذوقِ شعری" کے بارہ میں جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی جگہ بڑی صحیح تنقید ہے اور اس سے ہمیں ان کے کلام کے سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

مجھے یہ بات بہت پسند آئی کہ انھوں نے اس مجموعہ میں کسی کا مقدمہ یا تعارُف شامل نہیں کیا، کیونکہ جو شعراء ایسا کرتے ہیں، ان میں خود اعتمادی کی کمی ہوتی ہے اور اگر کسی شاعر کو خود اپنے کلام پر اعتماد نہ ہو تو وہ اسے شایع ہی کیوں کرے۔

جناب میکش اس قسم کے "شعراء مذبذبین" میں سے نہیں ہیں بلکہ جو کچھ وہ کہتے ہیں بڑے اعتماد کے ساتھ کہتے ہیں اور اس یقین کے ساتھ کہ اگر اس جنس کا کوئی خریدار نہیں تو اس کا سبب یہ ہے کہ بازار میں اس کا کوئی پرکھنے والا نہیں، نہ یہ کہ جنس کا سد ہے اور مجھے ان کے لب و لہجہ کا یہ اعتماد بہت پسند ہے۔

میکش نئے شاعر نہیں ہیں لیکن ایسے پُرانے بھی نہیں۔ اور اسی لئے ان کے کلام میں ہم کو "تداخلی دور" کی تمام وہ خصوصیات نظر آتی ہیں، جو ایک "سنگ میل" کی طرح پچھلے اور آیندہ دونوں فاصلوں کو صحیح طور پر متعین کر سکتی ہیں۔

میکش، آگرہ کی ادب خیز سرزمین سے تعلق رکھتے ہیں اور وہاں کی تمام فنی وزن رکھنے والی ادبی روایات سے واقف ہیں۔ اسی لئے ان کے کلام میں بھی وزن ہے، فکر ہے، متانت و سنجیدگی ہے اور اسی کے ساتھ شگفتگی و ترنم بھی۔ ان کے جذبات جتنے گہرے ہیں اتنا ہی ٹھہراؤ ان کے اظہار میں بھی پایا جاتا ہے۔ وہ محض حُسن و عشق کے شاعر نہیں ہیں، لیکن ان کی شاعری کی بنیاد یکسر خلوص و صداقت ہے اور وہ معاملات کو بھی جمالیاتی نظریہ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ وہ سوچ کر شعر کہتے ہیں اور سننے والوں کو بھی اپنے دائرۂ فکر میں کھینچ لاتے ہیں غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

چراغ کشتہ لے کر ہم تری محفل میں کیا آتے ۔۔۔ جو دن تھے زندگی کے وہ تو رستے میں گزار آئے
یہ مانا زندگی میں غم بہت ہیں ۔۔۔ ہنسے بھی زندگی میں ہم بہت ہیں
نہیں ہے منحصر کچھ فصلِ گل پر ۔۔۔ جنوں کے اور بھی موسم بہت ہیں
بڑھا دئے مری جانب گلوں نے پھر خسار ۔۔۔ کہاں ہوا تھا ابھی خشک ہونٹ کا چھالا
ہزار صبحیں شبِ انتظار میں دیکھیں ۔۔۔ کہ جو چراغ جلایا وہی بجھا ڈالا
وہ مجھ کو ڈھونڈھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں ۔۔۔ پلکوں پہ اک نگاہ مکرر لئے ہوئے
نہ گر سکی کوئی بجلی مرے جنوں کے بغیر ۔۔۔ تمھارے جلووں نے ایمن بنا کے دیکھ لیا
جو چپ رہئے تو ممکن ہے کہ وہ کافر پہچانے ۔۔۔ جو کچھ کہئے تو پھر بھولے فسانے یاد آئیں گے

اس رنگ کے اشعار صرف غزلوں ہی میں نہیں پائے جاتے بلکہ انکی نظمیں بھی اس لطیف تغزل و ترنم سے خالی نہیں ہیں جن میں سے اکثر رومانی، جذباتی اور محاکاتی ہیں۔

یہ مجموعہ تین روپیہ میں جناب میکش اکبرآبادی سے میرہ کٹرہ آگرہ کے پتہ پر مل سکتا ہے اور دانش محل لکھنؤ سے بھی۔

سیاسیات کے اصول

یہ کتاب تین حصوں میں انجمن ترقی اُردو (ہند) علیگڈھ نے شایع کی ہے۔ اس کے مصنف حیدرآباد کے مشہور مفکر اہلِ قلم پروفیسر یاور دین خاں شروانی ہیں۔ اس سے قبل آپ کی متعدد کتابیں تاریخ و سیاست پر شایع ہو کر مقبول ہو چکی ہیں۔ اس خاص موضوع پر آپ نے سب سے پہلے "مبادی سیاسیات" لکھی تھی اور اب تین حصوں میں "اصول سیاست" کی وضاحت کی ہے۔

پہلے حصہ میں حکومت یا سلطنت کے متعلق تمام نظریوں کی وضاحت کی گئی ہے اور دوسرے حصہ میں حکومت کی مشینری پر بڑی جامع گفتگو کی ہے۔ تیسرے حصہ میں "بین الاقوامیت" اور اس کے اثرات و نتائج کو ظاہر کیا گیا ہے۔

اخیر میں تقریباً ۷۰۰ اصطلاحات کا ترجمہ انگریزی اُردو اور اُردو انگریزی فرہنگوں کے ذریعہ سے شامل کر دیا گیا ہے، ہو سکتا ہے کہ اصطلاحات کے ان ترجموں سے کسی کو اختلاف ہو، لیکن ان کی افادیت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

ادبی و قومی تذکرے

پنڈت کشن پرشاد کول مرحوم کے ادبی و قومی مضامین کا دوسرا مجموعہ ہے۔ ادبی حصہ گیارہ مضامین پر مشتمل ہے جن میں سرشار، چکبست، نسیم لکھنوی اور اودھ پنچ کے نوترین خصوصیت کے ساتھ اس لئے زیادہ اہم ہیں کہ ان میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ زیادہ تر کول صاحب کے ذاتی تجربات و تاثرات کا نتیجہ ہیں۔

قومی حصہ صرف دو مضمونوں پر مشتمل ہے، ایک سرونٹ آف انڈیا سوسائٹی سے تعلق رکھتا ہے اور دوسرا گاندھی جی سے۔

کول صاحب بڑے سلجھے ہوئے دماغ کے با اصول انسان تھے اور یہی خصوصیت ان کے مضامین میں بھی پائی جاتی ہے۔

یہ مجموعہ انجمن ترقی اُردو علیگڈھ سے تین روپیہ میں مل سکتا ہے۔

نبضِ حیات

مجموعہ ہے جناب شفا گوالیاری کی تازہ غزلوں کا جسے سکریٹری مرکزِ ادب بھوپال نے شایع کیا ہے۔ شفا صاحب ڈاکٹر و طبیب ہیں اس لئے ان کی شاعری کو غیر علیل تو ہونا ہی چاہئے، لیکن مجھے اس میں توانائی کے آثار بھی نظر آتے ہیں۔ اس سے قبل جب ان کا پہلا مجموعہ "آیاتِ شفا" شایع ہوا تھا تو اہلِ نظر نے اسے پسند کیا تھا، اس لئے کوئی وجہ نہیں کہ ان کا دوسرا مجموعہ "نبضِ حیات" بھی پسند نہ کیا جائے، جس میں انھوں نے حیاتِ انسانی کی دُکھتی ہوئی رگ کو پکڑنے کا زیادہ اہتمام کیا ہے۔

ابتداء میں مولانا کوثر چاندپوری نے اپنے پیش لفظ میں ان کی شاعری کے بابت بڑی جچی تلی رائے ظاہر کی ہے اور ہمیں امید ہے کہ شفا صاحب اسی کو سامنے رکھ کر اپنے "اقدامات شعری" کی راہیں متعین کریں گے۔

شفا صاحب کی شاعری بڑے بلند عزائم کی شاعری ہے اور وہ اشعار جن میں الفاظ نے بھی ان عزائم کا ساتھ دیا ہے، بہت بلند نظر آتے ہیں۔

شعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر خیال کو تکمیل کے ساتھ پیش کیا جائے اور اس میں کوئی مبہم مرموزیت (SYMBOLISM) نہ پائی جائے۔ شفا صاحب کے یہاں ہم کو اس کے نمونے اچھے اور بُرے دونوں ملتے ہیں، لیکن اچھے زیادہ، بُرے کم۔

الفاظ و تراکیب کے استعمال میں بھی زیادہ احتیاط سے کام نہیں لیا گیا، وہ لفظ معتبر استعمال کرنے کے بہت شایق ہیں۔ مثلاً حسنِ معتبر، منزلِ معتبر، سحر معتبر وغیرہ۔ لیکن یہ استعمال صحیح نہیں ہے۔ معتبر اسم مفعول ہے اعتبار کا۔ اعتبار کے معنی ہیں غور کرنا، سوچنا جب اس کی نسبت کسی انسان کے ساتھ ہوگی جیسے "اعتبر الرجل" تو اس کے معنی عزت کرنے کے ہو جائیں گے اور مردِ معتبر، "مردِ معزز" کو کہیں گے۔ جب اس کی نسبت کسی شے کی طرف ہوگی تو اس کا مفہوم صرف غور کرنا ہوگا۔ جیسے "اعتبر الامر" (یعنی کسی امر پر غور کیا) عربی میں "اعتبار" عبرت حاصل کرنے کے مفہوم میں بھی آتا ہے جب اس کا صلہ حرف با ہو، لیکن اُردو میں بغیر کسی حرف صلہ کے بھی اس معنی میں مستعمل ہے۔ شفا صاحب نے معتبر کا استعمال ان معانی میں سے کسی معنی میں نہیں کیا ہے بلکہ "دیرپا یا پایدار" کے مفہوم میں کیا ہے جو صحیح نہیں ہے۔

اسی طرح انھوں نے ایک جگہ لفظ شگفت، شگفتگی کے مفہوم میں استعمال کیا ہے، حالانکہ "شگفت" فارسی میں صرف تعجب کے مفہوم میں مستعمل ہے اور کھلنے کو اہلِ زبان ہمیشہ شگفتن یا اس کے حاصل مصدر شگفتگی ہی سے ظاہر کرتے ہیں۔ سیماب صاحب نے بھی کئی جگہ اسی غلطی کا ارتکاب کیا ہے۔

شفا صاحب اچھے شاعر ہیں اس لئے اچھا نہیں معلوم ہوتا کہ ان کے کلام میں اس قسم کے نقائص پائے جائیں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

خوشی غم کی نزاکت کو نہ راس آئی تو کیا ہوگا — تری آغوش میں بھی روح گھبرائی تو کیا ہوگا
مسلم ذوقِ آزادی، آدابِ اسیری بھی — قفس تک اُڑ کے خاکِ آشیاں آئی تو کیا ہوگا
اس کو ہی مسکرانے کا حق ہے حقیقتاً — آنکھوں میں جس کے اشک ہو اور مسکرا سکے

شفاؔ کچھ ایسے مقام بھی ہیں ہماری ہستی کی منزلوں میں — جہاں فضا زندگی کے قدموں پہ خود سسکی ہوئی ملیگی
اک ذرا سے موڑ میں دُنیا بدل جائے ابھی — موت کا غم کرنے والے زندگی کا غم کریں
جو جبینوں میں جلا دیتے ہیں منزل کا چراغ — اس نمایشگاہ میں کچھ آستاں ایسے بھی ہیں
ہر اک قدم سے حیات اُبھرے گی منزل کامیاب بکنار — جہاں سے اک کاروان مٹا ہو دیکھ سو کارواں بنیں گے
چلے تو ہیں تلاشِ آستاں میں لے شفاؔ ہم بھی — مگر اپنا ہی پہلے سنگِ در آیا تو کیا ہوگا
نوں کی دھڑکنیں تو جذب کرلاؤں گا گلشن سے — کسی غنچہ کی لیکن آنکھ بھر آئی تو کیا ہوگا

یہ تمام اشعار خیال و جذبات کے لحاظ سے بہت پاکیزہ ہیں، اور ابتدائی چھ شعر تو زبان و بیان کے لحاظ سے بھی بالکل بے عیب ہے لیکن ساتویں شعر کے دوسرے مصرعہ میں سے دونوں جگہ بیکار ہے، آٹھویں شعر میں تلاش کا استعمال اضافی صورت میں محلِ نظر ہے (کیونکہ تلاش بمعنی جستجو ہندی ہے) یہ مصرعہ یوں ہونا چاہئے: "چلے ہیں جستجو کے آستاں میں اسے شفاؔ ہم بھی"

نویں شعر کا دوسرا مصرع بڑا پاکیزہ ہے لیکن پہلا مصرع غزل کی زبان نہیں کیسر "تکلفِ بارد" ہے۔

اول تو گل میں دھڑکن کہاں غنچہ کے "انتظارِ شگفتگی" کو البتہ دھڑکن سے تعبیر کرسکتے ہیں، دھڑکن کو جذب کرلانا" کیا؟ علاوہ اس کے اگر شاعر یہ دھڑکن جذب کرلایا تو بھی غنچہ کی آنکھ کیوں بھر آئے۔ غنچہ کی آنکھ بھر آنے کی وجہ صرف یہ ہوسکتی ہے کہ پھول جو اس کے ساتھی ہیں اس سے جدا کردئے جائیں اور اس مفہوم کو صاف صاف یوں کہنا چاہئے تھا کہ:-

چمن سے پھول تو چن لاؤں ہمدم اپنے دامن میں
کسی غنچہ کی لیکن آنکھ بھر آئی تو کیا ہوگا

شفاؔ صاحب سوچتے خوب ہیں لیکن جو کچھ سوچتے ہیں اس کے اظہار میں جن تعبیرات سے کام لیتے ہیں وہ زیادہ واضح نہیں ہوتے۔ غزل میں اظہارِ خیال کے لئے ہمیشہ منفرج زاویوں سے کام لینا چاہئے، حاد زاویوں سے نہیں۔

شعر کی خوبی بیان کی سلاست، تراکیب کی روانی زبان کی صحت پر قایم ہے، اگر صرف ایک مصرعہ صاف ہے اور دوسرا اُلجھا ہوا تو پورا شعر بے لطف ہوجائے گا۔

شفاؔ دوسرے مصرعے تو اکثر و بیشتر بہت صاف کہہ جاتے ہیں، لیکن معنی آفرینی کے خیال سے پہلے مصرعہ میں وہ کبھی کبھی بہت اُلجھ جاتے ہیں اور شعر غیر متوازن ہوجاتا ہے۔

مثلاً ان کا ایک مصرعہ ہے:

اگر شریکِ سفر اپنی گمرہی نہ رہی

بہت صاف و سلیس مصرع ہے، لیکن پہلا مصرعہ ملاحظہ ہو:-

وقارِ ذوقِ تجسس پہ حرف آئے گا

اسی زمین کا ایک شعر اور ملاحظہ ہو:

فسانہ گردشِ دوراں کا نظم کرلیتے — مگر نگاہ میں ان کی وہ برہمی نہ رہی

دوسرا مصرعہ کتنا صاف اور پہلا کس قدر پُرجھول ہے ـــــ شفاؔ صاحب کے کلام میں یہ عیب زیادہ نہیں لیکن ہے، اور اگر وہ چاہیں تو آسانی سے اسے دور کرسکتے ہیں۔

یہ مجموعہ ایک روپیہ میں مرکزِ ادب بھوپال سے مل سکتا ہے۔

بعض کمیاب کتابیں

لغت عربی مطبوعہ

منتہی الارب ۴ حصے - مرزا عبدالرحیم --- ۶۰ر
اقاموس چہار حصص --- محمد مجدالدین احمد --- ۲۵ر
صراح مع فرہنگ قراح - ابوالفضل محمد بن عمر --- ۱۰ر
فقہ اللسان ۳ حصے - کرامت حسین --- ۲۵ر
کشاف اصطلاحات الفنون - شیخ محمد علی --- ۱۰ر

تاریخ فارسی مطبوعہ

جذب القلوب الی دیار محبوب - شیخ عبدالحق محدث دہلوی - ۱۰ر
جہانگیر نامہ --- خواجہ ابوالحسن --- ۵ر
وقایع نعمت خان عالی، افشائے حسن وعشق --- ۵ر
درۂ نادرہ --- مرزا محمد مہدی خاں --- ۱۰ر
تاریخ گلستان ہند مصور - درگا پرشاد --- ۱۵ر
تاریخ جامع التواریخ - فقیر محمد --- ۱۲ر
اقبال نامہ جہانگیری سہ حصہ - محمد شریف معتمد خاں --- ۲۰ر
سیر المتاخرین سہ حصہ - غلام حسین خاں --- ۳۰ر

تذکرہ و سیر فارسی مطبوعہ

تذکرہ صبح گلشن -- علی حسن خاں --- ۳۵ر
تذکرہ دولت شاہ، دولت شاہ سمرقندی --- ۱۰ر
تذکرہ خزینۃ الاصفیا - غلام سرور --- ۲۵ر

ادب فارسی قلمی و مطبوعہ

کلیات اسماعیل - اسماعیل اصفہانی --- ۱۰ر
دیوان شمس تبریز - محمد بن ملک داؤد --- ۵ر
دیوان صائب - محمد علی صائب --- ۳۰ر
کلیات صائب - محمد علی --- ۱۰ر
کلیات ظہیر - حکیم ظہیر فاریابی --- ۱۰ر
قصاید عرفی مع محشی - جمال الدین --- ۳۰ر
کلیات سعدی - شیخ مصلح الدین سعدی --- ۱۲ر
دیوان قصاید عنصری - حکیم ابوالقاسم --- ۵ر

لغت فارسی قلمی و مطبوعہ

منتخب اللغات شاہجہانی - عبدالرشید الحسینی --- ۵ر
مصطلحات بہار عجم جلد اول - منشی ٹیک چند بہار --- ۱۰ر
غیاث اللغات - محمد غیاث الدین مطبوعہ ۱۲۹۵ھ --- ۱۵ر
برہان قاطع کشوری ۲ حصے کامل - محمد حسین برہان --- ۱۰ر
تشحیذ اللغات - انگریزی سے فارسی و ہندی و سنسکرت - ۱۰ر
منتخب لغات عثمانیہ ۲ حصے کامل فارسی و عربی سے ترکی - ۲۵ر

تاریخ اردو مطبوعہ

قدیم ہنر و ہنرمندان اودھ مصور - امراحسین --- ۴ر
احسن التواریخ - تاریخ صوبۂ اودھ مصور - منشی رام سہائے تمنا - ۶ر
محل خانۂ شاہی - فدا علی نجم حالات محلات واجد علی شاہ - ۳ر
آثار الصنادید پہلا اڈیشن ۱۲۷۴ھ سرسید احمد خاں - ۴ کامل مصور ۱۵ر
تاریخ ڈھاکہ مصور - رحمان علی طپش --- ۱۰ر
تاج التواریخ مصور سہ جلد کامل - نصرت علی --- ۲۵ر
دربار اکبری - محمد حسین آزاد --- ۱۶ر
سلسلۂ آصفیہ تاریخ دکن ۲ حصے - سید علی بلگرامی --- ۱۵ر

سوانح عمری اردو مطبوعہ

آثار غالب - شیخ محمد اکرام --- ۶ر
غالب --- غلام رسول مہر --- ۶ر
یادگار غالب - الطاف حسین حالی --- ۶ر
الفزالی --- شبلی نعمانی --- ۳ر
حیات خسرو --- " --- ۲ر
حیات انیس --- امجد علی اشہری --- ۱۰ر
واقعات انیس - میر مہدی حسن احسن --- ۳ر
البرامکہ - یحییٰ و جعفر برمکی کی سوانح - محمد عبدالرزاق --- ۱۰ر

تذکرہ شعراء اردو مطبوعہ

تذکرہ گل رعنا - عبدالحئی --- ۱۰ر
سخن شعراء - عبدالغفور خاں --- ۱۵ر

منیجر نگار لکھنؤ

ان کتابوں پر کمیشن نہیں دیا جائے گا - قیمتیں علاوہ محصول ڈاک ہیں -

مکتوبات نیاز

(تین حصوں میں)

ایڈیٹر نگار کے تمام وہ خطوط جو خدا بخش لائبریری، سلاست بیان، شگفتگی اور البیلے پن کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل پہلی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں، ان ایڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر طبع ہوئی ہے، قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ (علاوہ محصول)

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے اہل طریقت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے کس درجہ سم قاتل ہے، زبان، پلاٹ، انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے، قیمت آٹھ آنے (علاوہ محصول)

شاعر کا انجام

جناب نقوان شہاب کا لکھا ہوا افسانہ جس عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس حد تک پہنچا ہے کہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی، تازہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط، قیمت بارہ آنہ (علاوہ محصول)

مالہ و ماعلیہ

حضرت نیاز نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ فن شاعری کس قدر مشکل فن ہے اور اس میدان میں بڑے بڑے شاعروں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں، اور اس کا ثبوت انھوں نے دور حاضر کے بعض نامور شعراء مثلاً جوش، جگر، سیماب وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھکر پیش کیا ہے، ملک کے نوجوان شاعروں کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے، قیمت دو روپیہ

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اس کی زبان، تخیل، اس کی نزاکت بیان، اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے، یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔ قیمت دو روپے عہ (علاوہ محصول)

مذاکرات نیاز

یعنی حضرت نیاز کی ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب خزینہ ہے، ایک بار اس رسالہ کو شروع کرنیوالا اخیر تک پڑھ لیتا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن ہے جس میں صحت و نفاست کا خاص اہتمام کیا گیا ہے۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے علاوہ محصول

مذہب

حضرت نیاز کا وہ معرکۃ الآرا مقالہ جس میں انھوں نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت کیا ہے اور دنیا میں یہ کیونکر رائج ہوا، اسکے مطالعہ کے بعد انسان خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ مذہب کی پابندی کیا معنی رکھتی ہے، قیمت ایک روپیہ (علاوہ محصول)

انتقادیات

حضرت نیاز کے انتقادی مقالات کا مجموعہ، فہرست مضامین یہ ہے، ایران و ہندوستان کا اثر جرمن شاعری پر، فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اُردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، اُردو غزل گوئی پر عمدہ تبصرہ، نقشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول انتقاد فنون لطیفہ و حقیقت نگاری، قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

قراست الید

اسکے مطالعہ سے ہر ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اور اسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و گمنامی پر پیشینگوئی کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مینجر نگار لکھنؤ

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۲۸ء

(مومن نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے، مومن کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپے عا/

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کیا تھی۔ قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)

فروری۔ مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد پر ملک کے بہترین اہل قلم و ارباب فکر کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ عا/ (علاوہ محصول)

جنوری۔ فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا جوبلی نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ اور تمدن اسلام کے بلند حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل ت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائیں جو پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

پیش کش ہوں جنوری فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر جس میں تقریباً تیس افسانے بہترین اہل قلم کے شائع کیے گئے ہیں اس سال نامہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسلوب ہیں اور ہر اسلوب کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیے۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

جنوری۔ فروری ۱۹۵۱ء

اس سالنامے کے دو حصے ہیں پہلے حصے میں (اس ہندی کی مشہور عالم کتاب ایک مسکتیل کی تلاش کا ترجمہ اقتباس ہے۔ جس میں اس نے ایران مصر عراق فلسطین وغیرہ ممالک اسلامی کی سیاحت کے بعد وہاں کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور اس کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا مستقبل کتنا روشن ہے اگر وہ ترقی کے یہ خواہ ہیں کو جان لیں۔ سالنامہ کا دوسرا حصہ ایڈیٹر نگار کے قلم سے ہے جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم ممالک کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت (دو روپے عا (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۲ء حسرت نمبر

جس میں ملک کے تمام اکابر نقاد و ادب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کی شاعری کا مرتبہ معلوم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے قیمت دو روپے عا/ (علاوہ محصول)

جنوری، فروری ۱۹۵۳ء

اداغ نمبر جس میں داغ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کیے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں قیام رامپور، حیدرآباد کے زمانہ کے علاوہ انکی حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت دو روپے عا/ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۴ء

(فرماں روایان اسلام نمبر) یہ تاریخ اسلامی کا نچوڑ ہے جس میں ولادت نبوی سے لیکر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے عروج و زوال کو بتایا گیا ہے۔ یہ سالنامہ دراصل تاریخی کتاب ہے جو ہر پڑھے لکھے کے پاس ہونا چاہیے۔ قیمت تین روپے آٹھ آنے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۵ء

(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر) متقدمین۔ جس میں اسلامی علوم و فنون پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات دے کر ان کی علمی خدمات اور تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قیمت تین روپیہ آٹھ آنہ ہے (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

دھنیا کی ازدواجی زندگی میں مصنف کی ازدواجی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے۔ ہوری کے کردار میں پریم چند کے کردار کا جزوی عکس موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہوری کا کردار حقیقت نگاری کا اعلیٰ ترین نمونہ بن گیا ہے۔

کلثوم سلطانہ

غزل

دل میں ترا خیال بھی پیدا نہ کر سکے
ہم زندگی کے غم کا مداوا نہ کر سکے

اک وہ بھی دور تھا کہ جفا کا گلہ رہا
اک یہ بھی دور ہے کہ تقاضا نہ کر سکے

دل آستانِ حسن سے آگے نکل گیا
کیا جانے کس خیال سے سجدہ نہ کر سکے

اشکوں میں ڈھل رہی تھی غمِ دل کی داستاں
اک تیر ادا تھا جسے افشا نہ کر سکے

رقصاں تھی اپنے دل میں بھی جلووں کی آرزو
یہ اور بات ہے کہ تقاضا نہ کر سکے

پہنچے کہاں مقامِ محبت پہ اے کلیمؔ
اپنی نگاہ پر جو بھروسا نہ کر سکے

محمد خاں کلیم

غزل

ادائے خاص سے دیکھا عطائے جام سے پہلے
ہوا ساقی کا لطفِ خاص لطفِ عام سے پہلے

کسے معلوم کب خورشید ڈوبے ماہتاب اچھلے
تم آجاؤ نمودِ جلوہ ہائے شام سے پہلے

کسے معلوم پھر کب دن پھریں ابرِ بہاراں کے
تم آجاؤ بہارِ ابر کے ہنگام سے پہلے

تمہارا حُسن کیوں بے پردہ ہو ہنگامۂ گل میں
چلے آؤ بہاروں کے ہجومِ عام سے پہلے

میں تکمیلِ نشیمن چاہتا تھا آگئی آندھی
یہ تنکے بھی چلے تشکیلِ سقف و بام سے پہلے

دمِ توبہ یہ حکمِ مفتیٔ ابرِ بہار آیا
شکستِ توبہ لازم ہے شکستِ جام سے پہلے

سوادِ ہند میں وہ زلف ہے عنبر فشاں اب بھی
جسے چھیڑا تھا اک دن گردشِ ایام سے پہلے

نگاہوں کی زباں میں کس ادا سے کہہ دیا کیا کچھ
جواب اُن کا ملا مجھ کو مرے پیغام سے پہلے

میں ناواقف نہیں صیّاد کے انجام سے لیکن
چمن ہی لُٹ گیا صیّاد کے انجام سے پہلے

وہ آئے صبح بن کر شام سے میرے شبستاں میں
ہوا خورشید روشن ماہتابِ شام سے پہلے

تعالیٰ اللہ کیا رتبہ ہے راہِ عشق کا نیّرؔ
فرشتے سجدہ کرتے ہیں یہاں ہر گام سے پہلے

نیّر واسطی

"میرا بھائی"

اب وہ زندگی کی سرحد کے اُس پار جا پہنچا ہے جہاں منجمد خاموشی کا راج ہے اور موت کا تسلط!

ابھی تک ہم سب ایک عجیب سی اذیت میں مبتلا ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ وہ شخص جو صرف چند روز ہوئے یہاں سے ہنستا کھیلتا ایک معمولی آپریشن کے لئے شہر گیا تھا آج اُسی کا خاموش بے حس جسم، ایک ٹرک میں لاد کر یہاں لایا گیا ہے ـــــ چاروں طرف نالہ و شیون کی آوازیں بلند ہیں۔ عزیز و اقارب، بچے بوڑھے اپنے پرائے سب بے اختیار آنسو بہا رہے ہیں اور میں اس انوکھے شور میں ساکت و صامت کھڑا دُور افق کی سمت دیکھتا چلا جا رہا ہوں۔

موت سے کسی کو بھی مفر نہیں۔ مجھے اس حقیقت کا احساس ہے اور شاید اسی لئے میری آنکھیں آنسوؤں سے لبریز نہیں۔ مگر اس اچانک حادثے نے میرے ذہن کو چند مضطرب سوالات کی آماج گاہ بنا دیا ہے۔ اور میں ایک اذیت ناک خلش میں مبتلا ہو گیا ہوں۔ میں سوچتا ہوں اگر واقعتاً اس عظیم کائنات میں زندگی مادے کی ارتقائی صورت ہے اور لاکھوں کروڑوں ستاروں میں محض اتفاق سے کسی ایک کو اپنا مسکن بناتی ہے تو پھر اس کی ارزانی کا یہ عالم کیوں ہے؟ آخر یہ کیوں ہوتا ہے کہ ایک شخص آہستہ آہستہ تجربات، حوادث، تحصیل علم اور انتھک محنت کے بعد زندگی کے ایک خاص مقام تک پہنچتا ہے اور پھر اچانک موت کا خونیں ہاتھ اس قیمتی شخصیت کو بے رحمی سے کچل دیتا ہے؟ اب اگر کوئی یہ چاہے کہ وہ اُس شخصیت کے دائرۂ عمل سے ذرا آگے بڑھے تو کیا اس کے لئے ضروری نہیں کہ وہ اُس تمام دشوار گزار راستے کو پھر سے عبور کرے اور تب دو قدم اس شخصیت سے آگے بڑھائے۔ سوچتا ہوں یہ کاوش کتنی طویل ہے لیکن نتیجہ کتنا مختصر!

اس اچانک موت نے میری زندگی کی خاموش اور پرسکون جھیل میں ایک طوفان سا پیدا کر دیا ہے۔ کل تک یہ فضا کتنی مسرت آفرین اور نشاط انگیز تھی۔ چہرے مسرور تھے۔ زمین اور آسمان کے مابین ہر شے نکھری ہوئی اور تازہ و شگفتہ نظر آ رہی تھی اور آج اس شادکامی کی لہر میں اداسیوں اور تاریکیوں کے سوا اور کچھ نہیں۔ درخت اور

مکان ملول اور اُداس کھڑے ہیں، آسمان پر ایک ملگجی سی دھند مسلّط ہے اور چہ دیران سے ہو گئے ہیں۔ یا شاید ماحول میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ ویسے ہی شگفتہ و تازہ ہے۔ صرف میرا دل بجھ گیا ہے اور مجھے اس کے آئینے میں ہر شے دھندلی اور غم زدہ نظر آ رہی ہے۔

آج مجھے شدید ترین احساس یہ ہے کہ یہاں کوئی زندہ شے ابدی نہیں۔ یہ احساس روح فرسا ہے۔ یہ سوچ کہ وجود اور عدم وجود کے درمیان زندگی محض سانس لینے کا وقفہ ہے، ایک عجیب سی بے یقینی کو فضا پر مسلّط کر رہی ہے۔ میں سوچتا ہوں موت اور سکوت تو ابدی حقائق ہیں۔ لیکن یہ زندگی کا لمحاتی رقص کیا شے ہے آخر اتنی بڑی بڑی دشواریوں کے باوجود یہ زندگی تا حال کیسے جاری و ساری ہے کیا اسی زمین پر جو بغیر کسی سہارے کے ایک اندھی، سیاہ کائنات میں ایک بڑے سے آفتاب کے گرد اگرد دیوانہ وار گھوم رہی ہے، زندگی کی نمود محض اتفاقیہ نہیں ہے؟ اور پھر کیا زمین اور آفتاب کے درمیانی فاصلہ میں ذرا سی کمی بیشی بھی اس زندگی کے حق میں مہلک نہیں؟ مثلاً اگر یہ زمین سورج کی طرف محض ذرا سی جھک جائے تو کیا یہاں ہر شے جل کر راکھ نہیں ہو جائے گی؟ اور اگر یہ آفتاب سے ذرا دوری اختیار کر لے تو کیا یہاں ہر شے پر ابدی سکوت مسلّط نہیں ہو جائے گا؟ ——— یوں لگتا ہے جیسے یہ زمین ایک "پل صراط" پر رواں دواں ہے اور زندگی کو ہر لحظہ فنا ہو جانے کا ایک عظیم خطرہ درپیش ہے ——— یہی حال اُس "جسم" کا ہے، جسے زندگی نے اپنا مسکن بنایا ہے۔ جسم زمین سے بھی نازک تر "پل صراط" پر قائم ہے۔ اور یہاں محض ذرا سی ڈگمگاہٹ بھی اسے بہ آسانی تباہ کر سکتی ہے ——— کتنی نازک ڈور پر ہم ہر لحظہ چل رہے ہیں! لیکن ہم میں سے کتنوں کو اس خوفناک صورتِ حال کا احساس ہے؟ جب ہمارے سامنے کوئی شخص اس ڈور سے لڑکھڑا کر موت کے گہرے کنوئیں میں جا گرتا ہے تو ہم لحظہ بھر کے لئے ٹھٹھک کر رُک جاتے ہیں، ڈولتے ہیں، سنبھلتے ہیں۔ اور پھر سے گرم سفر ہو جاتے ہیں۔ کتنی بڑی مجبوری ہے! میں مانتا ہوں زندہ رہنے کے لئے خود فراموشی ضروری ہے لیکن مجبوری کتنی بڑی ہے اور کتنی اذیت ناک!

بچپن میں ایک کہانی سُنی تھی کہ ایک شخص سفر کرتا ہوا ایک ایسے شہر کے پاس پہنچا جہاں بہت سے لوگ باہر میدان میں خاموش کھڑے سامنے کے سیاہ پہاڑ کو غور سے دیکھ رہے تھے۔ اچانک پہاڑ پر سے ایک مہیب آواز آئی اور انبوہ میں سے ایک شخص بے تحاشہ پہاڑ کی طرف بھاگنے لگا۔ وہ بھاگتا چلا گیا، پہاڑ پر تیزی سے چڑھتا چلا گیا اور پھر ایک دہشت ناک چیخ کے ساتھ پہاڑ کی دوسری طرف غائب ہو گیا۔ استفسار

سالانہ چندہ ہندوستان و پاکستان
آٹھ روپیہ چھ آنہ (مع سالنامہ)

ہندوستان و پاکستان دونوں جگہ
قیمت فی کاپی دس آنہ ۱۰/

تصانیف نیاز فتح پوری

نگارستان

حضرت نیاز کے بہترین ادبی، مقالات اور افسانوں کا مجموعہ نگارستان نے ملک میں جو درجۂ قبول حاصل کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اسکے متعدد ضمائر غیر زبانوں میں منتقل کئے گئے۔ اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اور ادبی مقالات اپنے اضافہ کیے گئے ہیں جو پچھلے ایڈیشنوں میں نہ تھے اس لیے ضخامت بھی زیادہ ہو۔
قیمت چار روپیہ للہ (علاوہ محصول)

جمالستان

ایڈیٹر نگار کے افسانوں اور مقالات ادبی کا دوسرا مجموعہ جس میں حسن بیان، ندرت خیالات اور پاکیزگی زبان کے بہترین شاہکاروں کے علاوہ بہت سے اجتماعی و معاشرتی مسائل کا حل بھی نظر آئے گا۔ ہر افسانہ ہر مقالہ اپنی جگہ معجزۂ ادب کی حیثیت رکھتا ہے، اس ایڈیشن میں متعدد افسانے اضافہ کئے گئے ہیں جو پہلے ایڈیشنوں میں نہ تھے۔
قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے ہیر (علاوہ محصول)

من و یزداں

ہندو مسلم نزاع کو ہمیشہ کیلئے ختم کر دینے والی انجیل انسانیت

مولانا نیاز فتحپوری کی بہ سالہ دور تصنیف و صحافت کا ایک غیر فانی کارنامہ جس میں اسلام کے صحیح مفہوم کو پیش کر کے تمام نوع انسانی کو انسانیت کبریٰ و اخوت عامہ کے ایک رشتہ سے وابستہ ہونے کی دعوت دی گئی ہے، جس میں مذاہب کی تخلیق دینی عقائد رسالت کے مفہوم اور صحائف مقدسہ کی حقیقت پر تاریخی، علمی، اخلاقی اور نفسیاتی نقطۂ نظر سے نہایت بلند و انشائیاں اور پُر زور خطیبانہ انداز میں بحث کی گئی ہے
قیمت سات روپیہ آٹھ آنے ہیر (علاوہ محصول)

مجموعہ مذہبی استفسارات و جوابات

اس مجموعہ میں جن مسائل پر حضرت نیاز نے روشنی ڈالی ہے ان کی مختصر فہرست یہ ہے (۱) اصحاب کہف (۲) معجزہ (۳) انسان مجبور ہے یا مختار (۴) مذہب و عقل (۵) طوفان نوح (۶) خضر کی حقیقت (۷) مسیح علم و تاریخ کی روشنی میں (۸) یونس، یونس و ہابون (۹) حسن یوسف کی داستان (۱۰) قارون (۱۱) سامری (۱۲) علم غیب (۱۳) دعا (۱۴) توبہ (۱۵) علم نبیؐ (۱۶) یاجوج ماجوج (۱۷) ہاروت ماروت (۱۸) حوض کوثر (۱۹) امام مہدی (۲۰) نور محمدی (۲۱) پل صراط (۲۲) آتش نمرود وغیرہ وغیرہ ضخامت ۲۲۰ صفحات کاغذ سفید دبیز قیمت ہیر

حسن کی عیاریاں

اور دوسرے افسانے

حضرت نیاز کے افسانوں کا تیسرا مجموعہ جس میں تاریخی اور انشا لطیف کا بہترین امتزاج آپ کو نظر آئے گا اور ان افسانوں کے مطالعہ سے آپ واضح ہوگا کہ تاریخ کے بھولے ہوئے اوراق میں کتنی دلکش حقیقتیں پوشیدہ تھیں جنھیں حضرت نیاز کی انشا نے اور زیادہ دلکش بنا دیا ہے، قیمت پانچ روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)

ترغیبات جنسی یا شہوانیات

اس کتاب میں فحاشی کی تمام قسموں کے حالات پر تاریخی و نفسیاتی حیثیت سے نہایت شرح و بسط کے ساتھ محققانہ تبصرہ کیا گیا ہے کہ فحاشی دنیا میں کب اور کس طرح رائج ہوئی، نیز یہ کہ مذاہب عالم نے اسکے رواج میں کتنی مدد کی اس کتاب میں آپ کو عبرت انگیز واقعات نظر آئیں گے۔ نیا ایڈیشن۔ قیمت چار روپیہ للہ

فلاسفۂ قدیم

اس مجموعہ میں حضرت نیاز کے دو علمی مضامین شامل ہیں (۱) چند گھنٹے فلاسفہ قدیم کی روح کے ساتھ (۲) مانی کا مذہب، نہایت مفید اور دلچسپ کتاب ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۵۶ء — "خدا نمبر"

جنوری ۵۶ء کے پہلے ہفتہ میں شائع ہو جائے گا

جن کا چندہ دسمبر ۵۵ء میں ختم ہو چکا ہے ان کے نام ذریعہ وی پی ہے میں روانہ ہوگا لیکن جن کا چندہ ابھی باقی ہے وہ اس کے محفوظ پہونچنے کے لئے ۲ر کے ٹکٹ مصارف رجسٹری کے لئے بھیج دیں۔

یہ خالص تاریخی چیز ہوگا، جس میں بتایا جائے گا کہ تمام امم سابقہ میں اول اول مذہب کا خیال کس طرح پیدا ہوا، کن کن صورتوں اور پیکروں میں خالق عالم یا مدبر عالم کی پرستش کی، نیز یہ کہ اس تصور ربوبیت و خلاقی میں جغرافیہ، ماحول اور سماج کے کیا اثرات تھے اور رفتہ رفتہ ذہنی ترقیوں کے ساتھ ساتھ خدا کا تصور کیونکر منزہ ہوتا گیا۔

یہ سالنامہ در اصل تمام مذاہب عالم کی مستند تاریخ ہوگا جس میں خالص تاریخی نقطۂ نظر سے تمام قوموں کی مذہبی زندگی، جملہ بانیان مذہب کی تعلیم و اصلاح اور مقدس کتابوں کی ہدایات پر موقعانہ تبصرہ کیا جائے گا، اس میں کوئی مناظرہ کا پہلو نہ ہوگا اور نہ کسی مذہب کے خصوصی تصورات، و شعائر تعلیمات و ہدایت پر کوئی تنقید ہوگی۔ متعدد نقوش و تصاویر بھی اس میں شامل ہوں گی تاکہ بعض عقاید کے سمجھنے میں سہولت ہو

اردو میں اپنی نوعیت کے لحاظ سے بالکل پہلا مجموعہ ہوگا، جس میں پوری جامعیت و تحقیق کے ساتھ دنیا کے مذاہب کو پیش کیا جائے گا

منیجر نگار لکھنؤ

پاکستان کے خریداران "نگار"

سالانہ چندہ (۱۲ روپے) ذریعہ منی آرڈر ذیل کے پتہ پر روانہ فرمائیں اور رسید ڈاک ہمارے پاس لکھنؤ بھیج دیں ہماری مطبوعات بھی اسی پتہ پر خط و کتابت کرنے سے مل سکتی ہیں :-

ڈاکٹر ضیا عباس ہاشمی - ۱۰۵، سوبھ راج چیتوال روڈ - ویسٹ گارڈن - کراچی

ضروری اطلاع پاکستان کے خریداروں کو

اگر آپ کا چندہ دسمبر ۵۵ء میں یا اس سے پہلے ختم ہو چکا ہے تو آئندہ چندہ ۱۲ نمایندہ نگار کے پاس کراچی بھیجدیجئے اور رسید ڈاک خانہ ہمارے پاس، تاکہ سالنامہ روانہ کیا جائے۔

منیجر نگار لکھنؤ

بعض کمیاب کتابیں

متفرق اُردو مطبوعہ

دریائے لطافت ... انشاء اللہ خاں ... ۷ے
ہوائے انیس و دبیر ... شبلی نعمانی ... ۵ر
تذکرۂ آبِ بقا ... عبدالرؤف عشرت ... ۳ے
فرہنگ آصفیہ - ۲ حصے حرف الف تا س ... ۱۰ر
چراغِ سخن ... مرزا واجد حسین یاس ... ۲ر
کلیات جان صاحب ... میر یار علی جان ... ۲ر
کلیات سودا ... مرزا رفیع سودا ... ۷ر
کلیات ظفر، چہار دیوان ... بہادر شاہ ظفر ... ۱۵ر
نشتر ... یاس عظیم آبادی ... ۲ر
دیوان فلق ... ۵ر
نقش چغتائی ... ۱۰ر
کلیات تراب ... ۷ر
تذکرہ کاملانِ رام پور ... ۱۰ر
مشاہیر عالم طبقۂ حکماء ... ۵ر
اہبار دن ... مصباح الدین ... ۷ر
قاموس المشاہیر، حصۂ اول ... ۱۰ر
نور جہاں بیگم ... اشہری ... ۵ر
ہندو ادیب ... ناظر کاکوروی ... ۷ر

لغت فارسی قلمی و مطبوعہ

منتخب اللغات شاہجہانی ... عبدالرشید الحسینی ... ۵ر
مصطلحات بہار عجم جلد اول - منشی ٹیک چند بہار ... ۱۰ر
غیاث اللغات ... محمد غیاث الدین، مطبوعہ ۱۲۶۵ھ ... ۱۵ر
برہانِ قاطع کشوری ۲ حصے کامل - محمد حسین برہان ... ۲۰ر
تثلیث اللغات ... انگریزی سے فارسی و ہندی و سنسکرت - ۱۵ر
منتخب لغات عثمانیہ ۲ حصے کامل، فارسی و عربی سے ترکی - ۲۵ر

ادب فارسی قلمی و مطبوعہ

کلیات اسماعیل ... اسماعیل اصفہانی ... ۱۰ر
دیوان شمس تبریز ... محمد بن ملک داؤد ... ۵ر
دیوان صائب ... محمد علی صائب ... ۳ے
کلیات صائب ... محمد علی ... ۱۰ر
کلیات ظہیر ... حکیم ظہیر فاریابی ... ۲ر
کلیات سعدی ... شیخ مصلح الدین سعدی ... ۱۰ر
دیوان قصاید عنصری ... حکیم ابوالقاسم ... ۵ر

تذکرہ و سیر فارسی و مطبوعہ

تذکرہ صبح گلشن ... علی حسن خاں ... ۲۵ر
تذکرۂ دولت شاہ ... دولت شاہ سمرقندی ... ۳ے
تذکرہ خزینۃ الاصفیا ... غلام سرور ۲۵ر

لغت عربی مطبوعہ

منتہی الارب ۴ حصے ... مرزا عبدالرحیم ... ۳۰ر
القاموس، چہار حصص ... محمد مجدالدین احمد ... ۲۵ر
صراح مع فرہنگ قراح ... ابوالفضل محمد بن عمر ... ۱۲ر
فقہ اللسان ۳ حصے ... کرامت حسین ... ۲۵ر
کشاف اصطلاحات الفنون ... شیخ محمد علی ... ۱۰ر

تاریخ فارسی مطبوعہ

جذب القلوب الی دیار المحبوب ... شیخ عبدالحق محدث دہلوی ... ۳۰ر
جہانگیر نامہ ... خواجہ ابوالحسن ... ۵ر
وقایع نعمت خان عالی، انشائے حسن و عشق ... ۵ر
درۂ نادرہ ... مرزا محمد مہدی خاں ... ۱۰ر
تاریخ گلستانِ ہند مصور ... درگا پرشاد ... ۱۵ر
تاریخ جامع التواریخ ... فقیر محمد ... ۱۲ر
اقبال نامہ جہانگیری ۲ حصہ ... محمد شریف معتمد خاں ... ۲۰ر

ان کتابوں پر کمیشن نہیں دیا جائے گا - قیمتیں علاوہ محصول ڈاک ہیں

منیجر نگار لکھنؤ

داہنی طرف کا صلیبی نشان علامت ہے اس امر کی کہ آپ کا چندہ دسمبر میں ختم ہو گیا اور جنوری کا "نگار" آٹھ روپیہ آٹھ آنے میں وی پی ہوگا، جس میں سالنامہ ۱۹۵۵ء کی قیمت (مع مصارف رجسٹری) بھی شامل ہے

نگار

اڈیٹر:- نیاز فتحپوری

جلد ۶۸	فہرست مضامین دسمبر ۱۹۵۵ء	شمار ۶

ملاحظات ---------- ۳
قصاص سے پہلے ---- (نوابزادہ) رشید الظفر خاں (بھوپال) -- ۵
کچھ مدیر نگار سے ---------- وقار احمد رضوی ------ ۱۷
داستان شاہین و کنجشک ---- اڈیٹر ---------- ۲۴
اقبال اور غالب ---------- فرمان فتحپوری ------ ۳۲
عہد بنی امیہ و بنی عباس میں کنیزوں کا اثر و اقتدار ... اڈیٹر... ۴۴
ایٹلانٹک سمندر سے ایک خط .... سید نظیر حسین ۴۹
غزل ---------- مائی جایسی ---------- ۵۲
مشاعرۂ نگار ---------- ۵۳
منظومات:- قضا ابن فیضی - دل شاہجہانپوری سیف حسن پوری - ۵۴

ملاحظات

امن کی تلاش

تقسیم ہند کے بعد بھارت کی بین الاقوامی سیاسیات کے پس منظر کو اُبھارنے اور مغربی سیاستدانوں کو اندیشہ ہائے دور و دراز میں مبتلا کرنے کے لئے نہرو کا روس جانا اور اس کے بعد ہی اکابر سوویٹ یونین کا ہندوستان آنا دونوں واقعے خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ مہمانوں کی خاطر مدارات دُنیا میں کوئی نئی چیز نہیں ہے، لیکن حالات کے لحاظ سے اس کے نتائج و اثرات ہمیشہ بدلتے رہے ہیں اور اس وقت جبکہ دُنیا میں ہر طرف سے صلح و امن کی خواہش تو ظاہر کی جارہی ہے لیکن اس کے باوجود دل کی دھڑکنیں بدستور قایم ہیں، حکومتوں کی بڑی بڑی ہستیوں کا ایک دوسرے سے دوستانہ فضا میں ملنا اور ملکی پیمانوں پر تبادلۂ خیال کرنا غیر معمولی اہمیت رکھتے ہیں۔

اکابر سوویٹ یونین کا جو پُرجوش خیر مقدم یہاں ہوا ہے وہ چنداں قابلِ لحاظ نہیں لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ مارشل بلگانن اور خروشچوف نے اس خیر مقدم کو کس نگاہ سے دیکھا اور اپنے جذبات کے اظہار میں کس قدر بیباکی سے کام لیا، خواہ وہ کہیں کہیں متانت و سنجیدگی اور سیاسی مشرب کے اقتضاء کے منافی ہی کیوں نہ رہا ہو۔ انھوں نے نہ صرف ہندوستان کے امن پسندانہ پالیسی کو سراہا بلکہ خود اپنی صلح کو شیوں کو اس قدر مبالغہ کے ساتھ ظاہر کیا گویا۔" ہمارے سر پہ کبھی آسماں نہ تھا"۔ اور اگر ان تمام بیانات کے حشو و زواید کو نکال دیا جائے تو کم از کم اس کا یقین تو کرنا ہی پڑے گا کہ موجودہ روس، اسٹالین کے روس سے بہت مختلف ہے اور وہ اپنے اشتراکی مقاصد تک کسی اور راستہ سے پہونچنا چاہتا ہے۔ یعنی

راہے کہ خضر داشت ز سرچشمہ دور بود
لب تشنگی ز راہ دگر بردہ ایم ما

اسی کے ساتھ جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اکابر چین و مقدونیا و انڈونیشیا بھی اس سے قبل ہندوستان آکر وہی سب کچھ کہہ گئے ہیں جو سوویٹ

اکابر کہہ رہے ہیں، اور اب شاہ سعود بھی وہی پیام امن وصلح لیکر ہندوستان آئے ہیں، تو کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ شاید تاریخ اب نیا موڑ لینے والی ہے اور وہ امریکی صدی جو دوسری جنگ عظیم کے بعد شروع ہوئی تھی غالباً نہایت مختصر صدی ثابت ہوگی، لیکن اگر ایسا نہ ہوا جس کا امکان کم ہے تو پھر اس میں کلام نہیں کہ دُنیا کو تباہ و برباد ہو جانا ہے اور یہ تباہی و بربادی وہ نہ ہوگی جس کے بعد کرۂ زمین کو پھر کبھی آباد ہونے کی سعادت نصیب ہو سکے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا دُنیا کا کھویا ہوا امن وسکون یوں آسانی سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

جنگ کو ختم کر دینے کا خواب دنیا صدیوں سے دیکھ رہی ہے لیکن یہ خواب اب تک شرمندۂ تعبیر نہیں ہوا اور غالباً اس کا سبب یہ تھا کہ اس وقت تک جنگ کی مخالفت میں جو کچھ کہا گیا وہ زیادہ تر اخلاقی و روحانی دلایل پر مبنی ہوتا تھا اور انسان کے ذہنی و اخلاقی اقدار اتنے بلند کبھی نہیں ہو سکتے کہ وہ نفسی و ذاتی علایق سے ہٹ کر اجتماعی علایق پر غور کر سکے۔ لیکن اب حالات بالکل دوسرے ہیں اور سائنس کی ترقی نے دست قضا میں بجلی کا وہ جوا ہر فرد دے کہ انسان کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیا ہے کہ اگر اس نے امن وصلح کی راہ اختیار نہ کی تو انفرادی و اجتماعی دونوں حیثیتوں سے اسے فنا ہو جانا ہے اور یہ وہ حقیقت ہے جسے روس کے آہنی پردے کے پیچھے اور باہر دونوں طرف یکساں محسوس کیا جا رہا ہے۔ دُنیا اچھی طرح سمجھ گئی ہے کہ اب زمانہ معاہدوں اور صلح ناموں کا نہیں، عہد و پیمان، قول و قرار کا نہیں کیونکہ اس ضمن کے تجربات ہمیشہ ناکام ثابت ہوئے ہیں، اس لئے ہو سکتا ہے کہ آخر کار وہ اسی نتیجہ پر پہونچے کہ جب تک غیر مشروط طور پر جنگ کو ناجایزہ وخلاف قانون قرار دیکر اس فیصلہ پر تمام قومیں مہر توثیق ثبت نہ کر دیں، بقاء عالم یا "جیو اور جینے دو" کی پالیسی کامیاب نہیں ہو سکتی، اور آج نہیں تو کل سرمایہ دار اور الٹرا کیپٹ پسند دونوں حکومتوں کو اپنے ڈھانچوں کے انتلافات سے ہٹ کر دنیا کے مستقبل کو اس خاص زاویہ سے دیکھنا ہوگا اور تخریب کی راہ سے تعمیر کی طرف جانے کا خیال ہمیشہ کے لئے ترک کرنا پڑے گا اور اگر موجودہ رجحانات نے یہی رخ اختیار کیا تو اس میں شک نہیں کہ اس کا بڑا کریڈٹ ہندوستان کو حاصل ہوگا۔

پاکستان اور بغداد پیکٹ پاکستان کا بغداد پیکٹ میں شامل ہونا مشرق وسطیٰ کی برطانوی پالیسی کے لئے مفید ہو یا نہ ہو، لیکن خود پاکستان کے لئے یقیناً ضرر رساں ہے۔ وزیر اعظم پاکستان نے بغداد روانہ ہونے سے قبل ظاہر کیا تھا کہ وہ مشرق وسطیٰ کی دفاعی اسکیم کو کامیاب بنانے کے لئے ہر عملی اقدام کے لئے طیار ہیں اور اگر بغداد پیکٹ میں پاکستان کا شمول واقعی اس حد تک وسیع ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وقت ضرورت پاکستانی فوجیں برطانوی و امریکی کمان میں ملک سے باہر بھی جا سکیں گی اور خود اندرون ملک کے تمام بری، بحری و فضائی مرکزوں پر برطانیہ و امریکہ کا اقتدار تسلیم کر لیا جائے گا۔ جب تک جنگ نہیں ہوتی اس وقت تک تو لفظاً یہ بات بہت معمولی معلوم ہوتی ہے، لیکن اگر کسی وقت لڑائی شروع ہو گئی تو پاکستان کے تمام اہم فوجی مرکزوں پر امریکہ کا چھا جانا یقینی ہے اور جنگ کے ختم ہونے پر امریکہ کا ہٹانا ناممکن ہو جائے گا۔ مصر ایک صدی کی کوشش کے بعد برطانیہ کو اسکندریہ سے ہٹانے میں کامیاب ہوا لیکن پاکستان تو صدیوں کے بعد بھی اس میں کامیاب نہ ہوگا کیونکہ برطانیہ کا عذر صرف یہ تھا کہ برطانوی سلطنت کے تحفظ کے لئے اسکندریہ پر قبضہ ضروری ہے لیکن امریکہ تو تمام دُنیا میں اشاعت تہذیب و خوشحالی کے لئے ایسا کرے گا اور ظاہر ہے کہ اس عذر کی وسعت و معقولیت کے پیش نظر پاکستان کب یہ ہمت کر سکتا ہے کہ وہ امریکہ کے ایسے بلند اخلاقی مقاصد کی مخالفت کرے اور دُنیا میں جاہل و غیر مہذب کہلائے۔

کشمیر کانفرنس تقسیم ہند کے بعد کشمیر کانفرنس کا انعقاد سب سے پہلا معقول قدم ہے جو نزاع کشمیر کے سلسلہ میں پاکستان نے اُٹھایا ہے۔ کانفرنس میں ہر طبقۂ خیال کے لوگ موجود تھے اور انھوں نے پوری آزادی کے ساتھ جو کچھ کہنا تھا کہا۔ اس سلسلہ میں پہلے یہ معلوم ہوا کہ خان عبدالغفار خاں اور ڈاکٹر خان، ہندوستان آکر نہرو سے گفتگو کریں گے، لیکن بعد کو یہ خبر آئی کہ خان عبدالغفار خاں نے اس خدمت کو قبول نہیں کیا کیونکہ بقول ان کے "جب خود پاکستان کے ارباب حل وعقد ہی انھیں غدار کہتے ہیں تو وہ کیا منہ لیکر ہندوستان جا سکتے ہیں"۔ اگر یہ خبر صحیح ہے تو یقیناً افسوسناک ہے کیونکہ اس خدمت کے لئے عبدالغفار خاں سے زیادہ موزوں شخص کوئی دوسرا ہو ہی نہیں سکتا، تاہم ہمیں خوشی اس بات کی ضرور ہے کہ پاکستان نے ابھی گفت وشنید کا دروازہ بند نہیں کیا اور اگر ہندوستان و پاکستان دونوں مل کر کوئی معقول صورت رائے شماری کی پیدا کر سکے تو یہ جھگڑا آسانی سے طے ہو جائے گا۔

قصاص سے پہلے

(موت کا انتظار)

(نوابزادہ رشید الظفر خاں)

یہ فسانہ جسے ایک سانحہ یا واقعاتی المیہ کہنا زیادہ موزوں ہوگا، مارچ ۱۹۵۵ء کے "ریڈرس ڈائجسٹ" میں شائع ہوا تھا۔ جس وقت میں نے اسے پڑھا تو بے اختیار جی چاہا کہ اس کا ترجمہ ہو جائے، لیکن چونکہ اب میں کام سے جی چرانے لگا ہوں اس لئے یہ خیال پورا نہ ہو سکا

پچھلی مرتبہ جب میں بھوپال گیا اور وہاں گفتگو میں نوابزادہ رشید الظفر خاں بہادر سے اس کا ذکر آیا تو معلوم ہوا کہ وہ مجھ سے زیادہ اس فسانہ سے متاثر ہیں۔ اور ان کا یہ تاثر اتنا گہرا تھا کہ جب میں نے ان سے اس کے ترجمہ کرنے کی درخواست کی تو وہ فوراً اس کے لئے آمادہ ہو گئے۔

یہ فسانہ کوئی فرضی کہانی نہیں ہے بلکہ تحقیقی تاثرات ہیں ایک عورت کے جس کو پھانسی کا حکم سنایا جا چکا ہے اور قصاص سے قبل چند دن جیل میں گزار رہی ہے

ہوں تو دنیا میں نفسیاتی مطالعہ اپنی جگہ بہت دلچسپ چیز ہے، لیکن ایسے شخص کے تاثرات و احساسات کا تجزیہ جو اپنی جان دینے جا رہا ہے، جو موت کے انتظار میں، وقت کے ہر ہر لمحہ کے ساتھ پھانسی کے پھندے کو اپنی گردن سے قریب آتے دیکھ رہا ہے، اور جو بقسمتی سے یہ بھی محسوس کر رہا ہے کہ اس کی موت نفسیاتی نقصان کا تقاضہ نہیں بلکہ محض قانون کی بیرحم انگلیوں کی حرکت کا نتیجہ ہے۔ بڑا مشکل کام ہے۔ جس طرح مرنے کے بعد کا علم صرف اسی کو ہو سکتا ہے جو مر چکا ہے، اسی طرح مرنے سے قبل انسانی دل پر جو گزرتی ہے اس کا علم صرف اسی کو ہو سکتا ہے جو مرنے جا رہا ہے اور اگر کوئی شخص دل و دماغ کے اس تشنج اور ہیجان کی اس بے ساختہ چیخ کو قلمبند کر سکے تو وہ بھی لٹریچر میں نئی چیز ہوگا۔

اس فسانہ میں اسی "عالم یاس و یقین" کے تاثرات کو پیش کیا گیا ہے، اور اتنی صداقت کے ساتھ کہ انتظار مرگ کی ہچکیوں اور سسکیوں سے لیکر پھانسی کے جھٹکے تک کی تمام ناشنیدہ آوازیں پوری طرح ہمارے دل و دماغ تک پہونچ جاتی ہیں

ظاہر ہے کہ نفسیاتی نزاکتوں کا اظہار خاص زبان اور خاص انداز بیان چاہتا ہے جس کی کامیاب مثالیں ہمیں انگریزی میں تو ملجاتی ہیں، لیکن اردو میں بہت کم نظر آتی ہیں۔ پھر اگر اردو میں کوئی طبعزاد فسانہ اس رنگ کا لکھا جاتا تو وہ اپنے لٹریچر کے مزاج کے لحاظ سے اس کو اسی انداز میں پیش کیا جا سکتا تھا لیکن ایک غیر زبان سے ترجمہ کرنا اور اصلی زبان کی خصوصیات بیان کو قایم رکھتے ہوئے، خود اپنے لب و لہجہ کو بھی ہاتھ سے نہ جانے دینا آسان کام نہ تھا۔ اس لئے نوابزادہ کا اس دشوار خدمت کو اپنے سر لینا اور اصل ان کے ادبی ذوق کا بڑا نازک امتحان تھا جس سے وہ اگر اتنی کامیابی کے ساتھ نہ گزرتے تو غالباً ہم بھی قارئین نگار کے سامنے اس جنس گراں مایہ کو کبھی نہ پیش کر سکتے

واقعہ صرف اتنا ہے کہ ایک لڑکی میری ہملٹن کو ایک شخص سے محبت ہو جاتی ہے جس کا نام جم ہے، جم بھی اول اول

محبت کا جواب محبت سے دیتا ہے، لیکن پھر وہ ایک دوسری لڑکی لیوسی سے وابستہ ہو کر ہملٹن کو چھوڑ بیٹھتا ہے۔ قدرت اس بے وفائی کا انتقام اس سے اس طرح لیتی ہے کہ لیوسی بھی جم کو چھوڑ کر کسی اور کی طرف ملتفت ہو جاتی ہے اور جم اس صدمہ کو برداشت نہ کر کے خودکشی کر لیتا ہے۔ ہملٹن جو جم کی بیوفائی کے باوجود اس سے غیر معمولی محبت رکھتی ہے اس حادثہ کو برداشت نہیں کر سکتی اور وہ لیوسی کو جم کا قاتل سمجھ کر ایک رات اس کے مکان پر جاتی ہے اور پستول سے اس کو ہلاک کر ڈالتی ہے۔ پھانسی کی سزا تجویز کرتا ہے اور ہملٹن چند دن انتظارِ مرگ میں بسر کرنے کے لئے جیل بھیجدی جاتی ہے۔ اور یہاں وہ اپنے تاثرات کی ڈائری مرتب کرتی ہے۔ جس میں غم و غصہ، انتقام، نفرت، شک و محبت، مایوسی و مجبوری اور خدا جانے کن کن جذبات کی تصویر اس نے کھینچی ہے۔ یہاں تک کہ قصاص کا وقت آتا ہے، اس کی آنکھوں پر پٹی باندھ دی جاتی ہے، ہاتھ پاؤں رسیوں سے کس دئے جاتے ہیں، گلے میں پھندا ڈال کر تختہ کھینچ لیا جاتا ہے اور اس کے گھٹے ہوئے حلق سے نکلنے والی آخری چیخ پر یہ ڈائری ختم ہو جاتی ہے

نوابزادہ صاحب نے اپنے خط میں مجھ سے یہ خواہش بھی ظاہر کی تھی کہ میں اس امر پر بھی روشنی ڈالوں کہ جن حالات میں لڑکی نے قتل کیا تھا ان کے پیشِ نظر وہ واقعی سزائے موت کی مستوجب تھی یا نہیں،

میں پوری طرح محسوس کرتا ہوں کہ نوابزادہ کے دل میں یہ خیال کیوں پیدا ہوا اور مجھے یقین ہے کہ اگر فیصلہ نوابزادہ کے اختیار میں ہوتا تو وہ کبھی اس لڑکی کو سزائے موت کا حکم نہ سناتے۔ کیونکہ اس نے جس دوسری لڑکی کو قتل کیا تھا وہ خود ایک شخص کی جان لے چکی تھی (ہاتھوں سے نہ سہی باتوں سے) اور ذہنی نفسیاتی انصاف کا تقاضہ یہی تھا کہ جب ایک بار جان کا بدلہ جان سے ہو چکا تھا تو اس سلسلہ کو آئندہ جاری نہ رہنا چاہئے تھا۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا جم نقض عہد کر کے میری ہملٹن کے جذبات کا خون اس سے قبل نہ کر چکا تھا اور وہ سزا کا مستحق نہ تھا۔ بہرحال جو صورت بھی ہو ——

بقول ٹینی سن، فطرت و قانون دونوں کے "ناخن و چنگال" خون سے رنگین رہتے ہیں اور ان کو رنگین رکھنے کے لئے کسی نہ کسی کو اپنا خون پیش کرنا ہی پڑتا ہے، جذبات کا ہو یا عروق و شرائین کا! (نیاز)

میں میری ہملٹن ہوں —— کون جان سکتا ہے، کہ میں اس وقت کتنی خوف زدہ ہوں —!! آج صبح میری قید کی کوٹھری میں جیلر آئی، اور اُس نے مجھ سے کہا کہ: "میری اپیل نامنظور ہو گئی —— یہ نیلی وردی والیاں جو میری نگراں ہیں۔ ہر وقت مجھ پر نگاہ رکھتی ہیں اور دو - دو۔ ہر وقت مجھ پر مسلط رہتی ہیں —— اس کے جانے کے بعد چپ بیٹھی ہوئی ہیں۔

دوپہر کے کھانے کے بعد مس برانڈن (نگراں) بار بار مجھ سے پادری کا ذکر کرتی ہے اور کہتی ہے کہ میں اُس سے ملوں۔ تین مرتبہ میں انکار کر چکی ہوں۔ لیکن ممکن ہے آئندہ شاید انکار نہ کر سکوں، کیونکہ مجھے اس کی ناکامی و مایوسی کو دیکھ کر افسوس ہوتا ہے۔ میں نے سگریٹ جلایا —— مگر سگریٹ مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا۔ میں اپنے پلنگ کے پاس کرسی پر بیٹھ گئی۔ اس وقت میرے خیالات پراگندہ ہیں۔ لیکن مجھے اب بیٹھ کر سوچ میں نہیں پڑنا چاہئے!۔ سوتے وقت دیکھا جائے گا —— مہربانی کر کے ایک سیاہ کپڑا مجھے دیدیا گیا ہے تاکہ اُس کو میں اپنی آنکھوں پر رکھ کر سو جاؤں۔ مجھے کبھی روشنی میں نیند نہیں آتی۔ اُس مرتبہ جب جم اور میں گرمیوں کے موسم میں بنگلے میں رہنے چلے گئے تھے، تو روز صبح پانچ بجے، روشنی سے میری آنکھ کھل جاتی تھی۔

—— میں صرف اندھیرے میں سو سکتی ہوں، لیکن یہ میں نے کیا کہا۔ ارے! - یہ تو ہونا ہی ہے —— اندھیرا —— کبھی نہ ختم ہونے والا اندھیرا! —— میں فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ان عورتوں سے میں بیزار ہوں - یہ ڈیوٹی پر آنے جانے والی عورتیں، نیلی وردی میں۔ میرے سامنے سے ہر وقت گزرتی رہنے والی عورتیں! —— ہر طرف عورتیں!! - میرے لئے عذاب ہو کر رہ گئی ہیں۔

——— جب تک کہ خود میرے کانوں نے پوری آواز نہ سنی - مجھے اس کا احساس ہی نہ تھا کہ میں زور سے بول رہی ہوں - میں یہ کہہ رہی تھی کہ " بلاؤ - پادری کو بلاؤ " میں اس سے ملنا چاہتی ہوں -

پادری آیا - میں کھڑی ہوگئی - وہ کم عمر معلوم ہوتا تھا - دودھ کی طرح سفید کالر کے مقابلہ میں اُس کا رنگ خشندلا اور راکھ جیسا معلوم ہوتا تھا - نگراں عورتیں میرے زندان سے باہر ہوگئیں - اُصولاً صرف پادری ہی مجھ سے تنہائی میں مل سکتا ہے - اُسنے پوچھا : " تمھیں ڈاک برابر مل رہی ہے ؟ " - میں بولی :- " ہاں ! ایک خط ماں نے لکھا - اور ایک بھائی نے "

——— " تم کچھ چاہتی ہو ؟ - کتابوں کی ضرورت ہے ؟ - مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو ؟ "

——— " نہیں ! نہیں ! ابھی نہیں ! " - میں کبھی زیادہ پڑھنے کی عادی نہیں تھی - میں زیادہ مذہبی بھی نہیں ہوں - پھر میں نے پوچھا ، گویا میں جیلر کی بات سن ہی نہ رہی تھی ، " وہ وقت کب آئے گا ؟ " ——— پادری کے چہرہ پر ایک رنج کا تناؤ سا پیدا ہوا - اور میں سوچ میں پڑگئی کہ " کیا وہ اُلٹی میری ہی ہمدردی چاہتا ہے " ——— پادری کھڑا ہوگیا اور بولا :-

" یہاں تمھیں ابھی دو ہفتے اور گزارنے ہیں - اور پھر ——— بشرطیکہ ——— ملتوی نہ ہوجائے ، تیسرے ہفتہ میں ....."

میرا جی چاہا کہ وہ جلد چلا جائے ——— کیونکہ مجھے اب متلی سی ہونے لگی تھی ——— ایک لمحہ وہ مجھے دیکھا کیا - پھر پہرے والیوں کی طرف جو اس وقت باہر کھڑی تھیں - اس نے اشارہ کیا - اور چل دیا - " اب مجھے تے آرہی تھی ، میں علیحدگی کی طرف بڑھی اور برانڈن میری طرف لپکی ——— میں پلنگ پر پڑگئی - اس نے اپنی گھڑی دیکھی - اور کہا " دوسری گارڈ والیاں تھوڑی دیر میں آجائیں گی " میں نے دیوار کی طرف اپنا منھ پھیر لیا - چابی پھرانے کی آواز آئی - جس سے میں سمجھی - کہ گارڈ بدل گیا - یہ چھ ، چھ گھنٹے کی ڈیوٹی کرتی تھیں - میں نے کوٹ لی مس مکفرلین ٹوپی اُتار چکی تھی - اُس کے ہلکے رنگ کے بالوں پر روشنی پڑرہی تھی - دونوں نے تاش کھیلنا شروع کیا - انھوں نے مجھے پلٹ کر دیکھا - میں بولی :- " مجھے کالا کپڑا دیدو " وہ لے آئی ——— ایک گلاس میں پانی بھی لائی اور ایک گولی دے کر کہا : " ڈاکٹر چاہتے ہیں کہ یہ تم کھالو - اس سے نیند آجائے گی " ——— میں نے گولی کھالی - اور پانی بھی پی لیا - اس نے مجھ کو چادر احتیاط سے اڑھادی ——— جیسے میں کوئی بچہ ہوں ، اور بولی :- " چپ چاپ سوجاؤ "

کاش میں مکفرلین کے ساتھ تنہا ہوتی ، کیونکہ اسی کے پاس ہونے سے میرے دل کو سکون ملتا ہے - اس میں ایک متانت و سکون ہے دوسروں کی طرح بے قرار نہیں رہتی ، نہ میری طرف تکتی رہتی ہے باوجود سیاہ وردی کے وہ مجھے نہایت شائستہ اور سنجیدہ معلوم ہوتی ہے میں شائستہ عورتوں سے ہمیشہ مانوس رہی ہوں - میں نے ایک BEAUTYPARLOUR ——— میں کام کیا ہے - وہیں میری جم (JIM) سے پہلی ملاقات ہوئی تھی ——— " جم ، تم پہلے مجھ سے خوش تھے - شاید اس لئے کہ میں بھی تم سے محبت کرتی تھی ، لیکن نہیں - میں سمجھتی ہوں غالباً میری محبت ہی کی وجہ سے تم کو مجھ سے نفرت ہوئی - واقعی میں کیا تھی ! کچھ نہیں ، اور لیوسی کے پاس سب کچھ تھا - لیکن اب ہمارے ——— کسی کے پاس کچھ نہیں ہے "

یہ سوچ کر ——— مجھے کچھ عجیب احساس ہوا - چکر سے آنے لگے - غنودگی بڑھی - شاید یہ گولی کا اثر ہے مکفرلین نے کالا کپڑا اُٹھایا وہ زمین پر گر گیا تھا اور میری آنکھوں پر رکھدیا - " کیا پھانسی سے پہلے یہی ہوگا ؟ " - اس کا جواب اُس نے نہیں دیا - سیاہ کپڑے کی اوٹ کی وجہ سے میں اس کے احساسات کا اثر اُس کے چہرے پر کچھ نہ دیکھ سکی !

میری ماں جب کبھی اخبار میں قتل کا کوئی واقعہ دیکھتی تو کہا کرتی کہ لوگوں کو قاتل کے ساتھ بہت ہمدردی ہوجاتی ہے مگر مقتول کا بھی تو کچھ خیال کرنا چاہئے - بیچاری ماں !! - اسے کیا خبر تھی - کہ یہی بات خود اس کے گھر میں بھی ہونے والی ہے ——— ہاں مجھے لیوسی سے بھی ہمدردی ہونا چاہئے ——— بیچاری لیوسی ——— لیکن آخر میں بھی تو دل رکھتی تھی -

" قتل عمد " جج کے الفاظ غالباً یہی تھے - اور قتل عمد شاید بہت بری بات ہے ——— اشتعال میں قتل کرنے سے زیادہ بُری ! -

وہ لیوسی کو نہیں جانتے تھے - اگر اُسے جم کے ساتھ ہمدردی ہوتی، تو میں شاید معاف کر دیتی - خیر، دنیا اس سے پاک تو ہو گئی:- مگر کس قدر عجیب بات ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ جم ایسی عورت کے لئے اپنی جان دیدے گا؟"

مجھے بھوک نہیں ہے — میں آج کھانا نہیں کھاؤں گی — گارڈ کو کچھ شک ہوئی ——— بولی:- "تھوڑا سا کھانے کی کوشش خود کرو" گویا میں کوئی جانور تھی جسے بڑے دن کی دعوت کے لئے فربہ کیا جا رہا تھا۔

"لو، یہ کوکو پی لو" ——— "ہاں، برانڈن بی لوں گی"

"کچھ لوگ تم سے ملنے آئے ہیں" ——— "خدا کرے میری ماں آج رو نے نہیں - ابھی تو کچھ وقت باقی ہے - آخری ملاقات میں جتنا چاہیں رو لیں - خدا کرے وہ وقت جلد آجائے - یہ انتظار بہت تکلیف دہ ہے - میں اسی میں گھلی جا رہی ہوں ——— کوئی یہ انتظار نہیں کرنا پڑا - مجھے کیوں یہ تکلیف دی جا رہی ہے" ——— میری ماں اور بھائی ——— دروازہ کی جالی اور کانچ کے پیچھے عجیب سے معلوم ہو رہے ہیں -

ایلن اچھی صورت کا لڑکا ہے - ۱۸ سال کی عمر کے لحاظ سے قد بھی کافی بڑا ہے - میرے بعد یہ ماں کے دل کا سہارا ہوگا - ماں جس قدر اس سے محبت کرتی تھی مجھ سے نہیں - پھر بھی یہ واقعہ اس پر بہت شاق گزرے گا - آئن نے کہا: "ماں، ہم سکرٹری کو لکھ رہی ہیں - اور ہم رحم کی درخواست طیار کرا رہے ہیں" ——— میری ماں کے آنکھوں میں آنسو آگئے - یکایک افسر نے کہا کہ "وقت ہو گیا" - میری آنکھوں پر اندھیرا سا چھا گیا ——— میں صرف یہ آوازیں آتی رہیں - کہ "لیٹ جاؤ - لیٹ جاؤ - ذرا آرام کرو" ڈاکٹر آیا، میری آستین چڑھائی - اور مجھے ایک انجکشن دیا -

چند روز میں میری سالگرہ ہوگی اور میں ۳۲ سال کی ہو جاؤں گی ——— فریڈ سے میری شادی ۱۸ سال کی عمر میں ہوئی تھی - اس سے الگ ہونے پر میری ماں ہمیشہ مجھ کو الزام دیتی تھیں - مگر میں نے اس پر کبھی افسوس نہ کیا - اگر ہمارے بچے ہو جاتے - اگر جنگ نہ شروع ہو جاتی تو شاید نوعیت کچھ اور ہو جاتی - جب وہ جنگ سے لوٹا - تو بہت بدلا ہوا تھا - افسردہ اور جھنجھلایا ہوا سا رہتا تھا - اگر میں اُس کے ساتھ لگی لپٹی رہتی - تو شاید یہ واقعات کبھی نہ ہوتے - کیا جم سے میری ملاقات ناگزیر تھی - کیا یہ بھی لازم تھا کہ میں جم سے ملتی اور لیوسی کو مار ڈالتی - کاش جم یہاں ہوتا اور مجھ سے ملتا - لیکن وہ تو لیوسی پر اتنا دیوانہ تھا؟ - ایسا دیوانہ کہ جب اسے یقین ہو گیا کہ لیوسی اس کی نہیں ہو سکتی تو خودکشی کر لی ——— مگر میں بھی تو جم سے محبت کرتی تھی ——— اتنی محبت میں نے کسی سے نہیں کی

آہ، جم، تم نے ایسا کیوں کیا؟ — تمہاری زندگی میرے لئے بہت عزیز تھی، تم نے اُسے کیوں ختم کر دیا؟ — ہاں، میں نے لیوسی کو ——— بیشک میں نے اسے مار ڈالا - اُس نے بھی تو میری زندگی ختم کر دی تھی - اب میں مرنے والی ہوں ——— نہیں، میں مرنا نہیں چاہتی — مجھے یقین ہے کہ یہ عورتیں جو مجھ پر پہرا دے رہی ہیں، خود بڑی تکلیف میں ہیں - لیکن ان میں سے کوئی نہیں سمجھ سکتا - کہ میں کیا سوچتی رہتی ہوں - اور وہ سمجھ بھی کیا سکتی ہیں جبکہ میرے دل کی بات زبان تک آتی ہی نہیں - خواب میں شاید کچھ زبان سے نکل جاتا ہو، اس کا مجھے علم نہیں — آج صبح پادری نے مجھ سے پوچھا - کہ "تم نماز پڑھنا چاہتی ہو" میں "ہاں" کہوں تو کس قدر فریب ہوگا — میں برسوں سے گرجے کے قریب بھی نہیں گئی ——— پھر بھی شاید ہاں کہدینا زیادہ آسان ہوگا -

معلوم ایسا ہوتا ہے - کہ پادری عورتوں سے گھبراتا ہے، اس کے لئے شاید یہ پہلا موقع ہے مجھے اس کے ایک ناخن پر چھوٹا سا سفید دھبہ نظر آیا، میں سوچنے لگی، جب ناخن بڑھ جائے گا تو وہ سفید دھبہ نکل جائے گا - مگر اس وقت شاید میں نہ ہوں گی -

ہفتہ پہاڑ ہو کر رہ گیا ہے کسی طرح کٹتا ہی نہیں، لیکن اب وقت زیادہ دور نہیں، اور باقی دن جلد کٹ جائیں گے — عذاب زندگی کا ایک ایک لمحہ، ایک ایک دھبہ مجھے معلوم ہے - کہ کسی کی ہر ہر روز سے واقف ہوں - میں نے نظروں سے ہر ہر چیز اور

کل رات میں نے لیوسی کو خواب میں دیکھا، بڑا بھیانک خواب تھا۔ وہ زندہ تھی اور مجھ سے ملنے کے لئے آئی تھی۔ سلاخوں کے باہر سے مجھ سے باتیں کر رہی تھی۔ اب مجھے یہ یاد نہیں کہ میں وہاں کیوں تھی اور وہ مجھ سے کیا کہہ رہی تھی۔ اُس کی شبیہہ میرے سامنے تھی۔ اور اُسکی نیلی آنکھیں مجھے تک رہی تھیں۔ میں نے نظر چُرائی، دریچہ سے بھی نظر ہٹالی۔ جب میں نے دوبارہ اُس کی طرف دیکھا، تو وہ ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی اور آنکھوں کی جگہ دو بڑے بڑے سیاہ سوراخ نظر آنے لگے، اُس وقت مجھے یاد آیا کہ میں نے تو اُسے قتل کر دیا تھا اور میں چیخنے لگی۔ جب میں اُٹھی تو دیکھا کہ مس مکفرلین میرے پاس کھڑی تھی اس نے میرے منہ پر ہاتھ رکھا۔ اور نرمی سے کہا:۔ گھبراؤ مت تم نے شام کوئی بُرا خواب دیکھا تھا، مگر وہ غلط کہہ رہی تھی خواب کیسا، میں نے تو واقعی لیوسی کو قتل کیا تھا اور میرا خواب جھوٹا نہ تھا۔

اوٹھتے ہی میں نے پوچھا کہ آج کیا دن ہے ـــــ بدھ ـــــ اگر التواء نہ ہوا، تو آج ہی کے دن آیندہ ہفتہ جو کچھ ہونا ہے ہو جائے گا۔

پادری نے مجھے ایک کتاب دی ہے، اُس میں کچھ اشعار اور مشہور مقولے درج ہیں، اس کا ایک جملہ ہے، جس کو میں صدہا بار پڑھ چکی ہوں، میں نے کتاب کے آخر صفحہ پر اُسے لکھ بھی لیا ہے ـــ "رات تو اب آ ہی گئی ہے اور خود کو رات کے سپرد کر دینا ہی بہتر ہے" ـــ ہاں، میرے لئے بھی شاید یہی بہتر ہوگا۔ لیکن، میں اپنی جان کو خود سپرد نہیں کر سکتی، میں زندہ رہنا چاہتی ہوں، اس وقت جان سے زیادہ عزیز مجھے کوئی شے نہیں ہے۔

میرا آج صبح اُٹھنے کو جی ہی نہیں چاہتا تھا، میں نے اُٹھنے سے انکار بھی کر دیا۔ اس انکار کا میرے گارڈ نے جو اثر لیا وہ مضحکہ خیز تھا۔ لیکن روزانہ یکساں طور پر وقت کاٹتے کاٹتے میں تھک گئی تھی اس لئے میں نے حکم عدولی کی ٹھان لی۔ گارڈ نے کہا:۔ "ہٹلن اگر تم بیمار ہو تو یہ دوسری بات ہے، ورنہ قاعدہ کی پابندی تمھیں کرنا ہی پڑے گی، اُٹھو۔ ہل کے سفید بال کچھ اُلجھے سے تھے اور پریشانی کے آثار اس کے چہرہ کی جھرّیوں سے ظاہر ہو رہے تھے۔

وہ بولی:۔ "معلوم ہوتا ہے، مجھے ڈاکٹر کو بلانا پڑے گا"۔ ڈاکٹر آیا، اور بولا:۔ "کیا تمھیں کوئی تکلیف ہے"۔ میں نے اپنے پلنگ پر کچھ حرکت کی، اور سوچا۔ "اور کیا تکلیف ہی تو ہے"

میں نے کہا:۔ "بیشک مجھے تکلیف ہے۔ لیکن ایسی تکلیف نہیں ہے۔ جسے تم دور کر سکو"۔ یہ کہکر میں بے ساختہ رونے لگی، اور میرے رخساروں سے گرم گرم آنسو ڈھلکتے ہوئے محسوس ہونے لگے۔ ڈاکٹر نے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا کہ "یہ انتظار کسی کے لئے بھی آسان نہیں ہے۔ لیکن قاعدہ کی پابندی (خواہ کتنی ہی مشکل کیوں نہ ہو) کرنے کا یہ اثر ضرور ہوگا کہ جب وقت آئے تو تم اپنے آپ کو زیادہ طیار پاؤ گی"۔ میرے کاندھے پر اُس کے ہاتھ کا دباؤ بڑھ چلا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ مہین سے کہہ رہا تھا:۔

"ان کے کپڑے لاؤ، اور ان کو پہنا کر طیار کرو"

مس بلائی آج پھر آئیں۔ وہ جیل کسی کام سے آئی تھیں۔ جب وہ اِدھر اُدھر کی باتیں کر چکیں تو اچانک اُنھوں نے مجھ سے پوچھا "کیا تمھیں اپنے کئے کا افسوس نہیں ہے؟" میں سوچنے لگی، اُس نے میری طرف غور سے دیکھا۔ اگر اس کی جگہ کوئی اور ہوتا تو میں جھوٹ بول دیتی، اس خیال سے کہ میں ڈوب تو رہی ہوں، شاید کسی تنکے کا سہارا مل جائے، لیکن اس کے چہرہ پر سراقت و خلوص کے آثار دیکھ کر میں جھوٹ نہ بول سکی اور کہہ اُٹھی کہ "مجھے اپنے کئے پر ذرا بھی افسوس نہیں ہے"

میں نے بلا ارادہ ایک سخت لہجہ اختیار کر لیا تھا۔

اس نے ٹھنڈی سانس لی اور بولی: "مجھے اس کا یقین نہیں کہ تم جو کچھ کہہ رہی ہو، وہ دل سے کہہ رہی ہو، بہرحال میں تم سے جرح کرنے نہیں آئی ہوں، اتنے دنوں میں تم نے خود اس معاملہ پر کافی غور کر لیا ہوگا"

وہ اُٹھی اور خدا حافظ بھی نہیں کہا اور چل دی۔

میں آج شام بالکل بے قابو ہوں، آج میری ماں یکایک آگئی ہے، پہلے تو اپنے کمرے تک جانے کا ارادہ کیا تھا لیکن پھر فیصلہ کیا کہ نہ جاؤں گی۔ اور اپنی ماں سے نہیں ملوں گی۔ میری نگراں نے خاموشی سے اپنے کمرے تک پھر مجھے واپس پہونچا دیا۔ میں بہت روئی ——— مس کلفرلین کہنے لگیں خواہ کچھ ہو، پھر بھی وہ تمہاری ماں ہے۔ تمھیں اُس سے ملنا چاہئے۔ اب وہ پلنگ کے قریب کھڑی تھی اور میں پلنگ پر بیٹھی ہوئی تھی، اُس کا چہرہ دھیما مگر جاگرانہ تھا۔ اُس نے کہا کہ "اب بھی تم کو اپنے سوا کسی سے ہمدردی نہیں ہے" ۔ یہ سُنکر میں ٹھٹک کر رہ گئی اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے ——— اس نے کہا: "کیا تمھیں یہ احساس نہیں ہے، کہ یہ وقت تمہارے عزیزوں کے لئے کس قدر سخت ہے، تمہارا کیا ہے، چند دن بعد رہو یا نہ رہو۔ لیکن اُن کو تو زندگی بھر یہ غم سہنا پڑے گا" جب وہ یہ کہہ رہی تھی، تو میرا عجیب حال تھا۔ میں روتی تھی۔ اور ہنستی بھی تھی۔ پھر میسن آئی اور اُس نے کہا: "اپنی ماں کو اتنا انتظار نہ کراؤ" ۔ مکفرلین نے میری طرف دیکھا اور میں نے اُس کی طرف، کچھ دیر بعد میں اُٹھی اور اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی تو گئی لیکن جب ایسا وقت آتا ہے، تو دوسروں کی آنکھوں میں جذبۂ ہمدردی دیکھنے کو بھی جی گوارا نہیں کرتا۔

آج پیر کا دن ہے، اب ہر آنے والا دن بہت اہم ہوتا جا رہا ہے۔ جب جیلر مجھے دیکھنے آئے ——— تو مجھے اعلان سننے کے لئے طیار رہنا چاہئے، مجھے معلوم ہے کہ پھانسی کی تاریخ وہی بتلائے گی ——— محبت - نفرت - حسد - جلاپا، ان سب جذبات سے وہ بھی بخوبی واقف ہوگی، لیکن جو کچھ میں کر گزری، شاید وہ کبھی نہ کر سکی!

آج کی رات بہت سخت ہے۔ کسی پہلو چین نہیں ——— برانڈن نے میری طرف دیکھے بغیر کہا:- "ٹہلنا بند کر دو اور اپنے پلنگ پر لیٹ جاؤ، شاید یہ آخری رات ہے" ۔ میں نے اپنے تصور میں جیلر کو دیکھا کہ وہ آکر مجھ سے کہہ رہی ہے ——— یہ میں ضرور معلوم کرنا چاہتی ہوں کہ پھانسی کی کونسی تاریخ ہے، مگر کوئی مجھ سے کہے نہیں کہ فلاں تاریخ میرے گلے میں پھانسی ڈالکر لٹکا دیا جائے گا۔

میں آج صبح جلد اُٹھی ——— جیل میں ایک خاموشی سی چھائی ہوئی ہے، جب تک گھنٹہ نہیں بجے گا۔ خاموشی چھائی رہے گی۔ گھنٹہ سے قیدیوں کو پتہ چل جاتا ہے کہ ایک رات اور گزر گئی، اور دوسرا دن شروع ہو گیا۔

کل بھی آج ہی جیسی صبح ہوگی اور میں اُٹھ کر یہ محسوس کروں گی کہ دن ختم ہونے پر وہ رات آئے گی۔ جس کی صبح میں آخری مرتبہ پلنگ سے اُٹھوں گی ——— "جیلر تم سے ملنے آئی ہے ——— پادری تم سے ملنے آیا ہے ——— یہ ہیں تمہارے خط ——— یہ ہیں اخبار ——— یہ لو صاف کپڑے - کپڑے بدلو"۔

میں اُٹھ کر جیلر کے سامنے آئی۔ وہ میری آنکھوں کی طرف نہیں دیکھ رہی تھی، اُس کی نظر میری پیشانی سے کسی قدر اونچی جمی ہوئی تھی۔ اُس نے کہا ملہٹن مجھے تم سے کہنا ہے کہ ہوم ڈپارٹمنٹ نے التواء منظور نہیں کیا! جمعرات کی صبح تم کو پھانسی دیجائیگی" اس وقت اُس کی آواز مجھے بہت دور سے آرہی ہے۔ اور اُس کی شکل میری آنکھوں میں دھندلی ہوتی جا رہی ہے آج منگل ہے۔ میں نے چائے پی لی ——— آج منگل ہے۔ پھانسی جمعرات کی صبح کو ہوگی۔

تالے میں کنجی کے پھرانے کی آواز میرے کانوں میں آئی۔ اب دروازہ بند ہے ——— اب دروازہ کھل رہا ہے۔ زمین پاؤں تلے سے نکل رہی ہے ——— ارے گری ——— گری ——— کالا کپڑا ہٹاؤ، بتیاں بجھائی جا رہی ہیں۔ میری پیاری "میری پیاری" یہ جم کے آخری الفاظ تھے ——— مگر میں اُس وقت اُس کی پیاری کہاں تھی شاید میں کبھی بھی نہ تھی ——— مجھے یقین تھا ——— کہ وہ لیوسی سے ہفتوں نہیں ملا ہے ——— وہ مجھے یقین دلا چکا تھا کہ لیوسی سے اُس کا واسطہ ختم ہو چکا ہے۔ مجھے یاد ہے میں اس وقت اپنا آسمانی رنگ کا لباس پہنے ہوئے تھی۔ اور نیلم کے وہ بُندے بھی جو جم نے میری سالگرہ پر دئے تھے ——— سینما سے نکلتے ہی بارش شروع

ہوگئی تھی - میں نے جلد - جلد اپنے کمرے کا رُخ کیا - راستہ میں اُس نے کوئی بات نہ کی، جب ہم شام کہیں ساتھ گزارتے تو رات وہ اکثر میرے ہی کمرے پر گزارتا تھا - وہ جھک کر میرے رخساروں پر ہاتھ پھیرتا رہا اور بہلا کر مجھ سے کہہ رہا تھا کہ "ہمارے تمہارے لئے یہی اچھا ہے کہ ہم جدا ہو جائیں - میں لیوسی کو نہیں چھوڑ سکتا، میں اُسے ہرگز نہیں چھوڑ سکتا" میں نے کہا:- جم اُس نے تم پر کیا جادو کر دیا ہے! تم تو اُس سے زیادہ مانوس نہ تھے" یہ کہکر میں نے اُسے اپنی طرف کھینچا - اُس نے میری گردن میں ہاتھ ڈالا اور سوچنے لگا -

مجھے اپنی کمزوری پر شرم بھی آئی - لیکن میں نے اُس سے نہایت عاجزی سے کہا کہ "کل مجھ سے ضرور ملنا" اُس نے وعدہ کیا اور کہا:- "اچھا، میں ایک بار اُس سے اور مل لوں، شاید میں اُسے علٰحدہ ہونے کے لئے طیار کر سکوں - پیر کی صبح کو تم سے ضرور ملوں گا" دروازہ تک گیا، پھر لوٹا - میری ٹھوڑی پر ہاتھ رکھ کر میرا سر اُٹھایا، جب میں نے اُس کی آنکھوں کی طرف دیکھا تو اُس نے مجھے پیار کیا اور چلا گیا -

وہ پیر کی رات کو نہیں آیا، رات بھر میں اُس کا انتظار کرتی رہی - صبح میں نے اس کو ٹیلیفون کیا، مالک مکان بولا:- "میں اُسے بلاتا ہوں" ـــــ کافی دیر کے بعد جب وہ لوٹا تو اُس نے مجھ سے کہا کہ غضب ہوگیا - جم نے کمرہ میں گیس کھول کر خودکشی کر لی - ایک پرچہ لیوسی کے لئے چھوڑ گیا ہے، جس میں لکھا ہے کہ "زندگی سے موت بہتر سمجھتے ہوئے میں خودکشی کر رہا ہوں" ـــ اس تحریر میں میرے لئے کوئی پیغام نہ تھا -

بعد کو معلوم ہوا کہ اتوار کی شام کو وہ لیوسی سے مل چکا تھا اور اس نے جم سے صاف کہدیا تھا کہ وہ کسی اور سے شادی کر رہی ہے اور اب جم سے اُس کا ملنا ممکن نہیں ہے -

جم پیر کے روز سے اپنے کام پر بھی نہیں گیا، دن بھر شراب پیتا رہا ـــ اس کی خودکشی کا اخبار میں بھی ذکر تھا - لیکن اخبار کے ایک گوشہ میں صرف دو سطریں تھیں، جم غریب دنیا کے لئے معمولی انسان رہا ہو، لیکن کوئی میرے دل سے پوچھے - کہ وہ کیا اہمیت رکھتا تھا - زندگی میں، میں نے کبھی کسی سے نفرت نہ کی تھی، لیکن لیوسی کا قصہ اور تھا - اُس کے خیال سے مجھے تشنج سا ہونے لگتا تھا ـــ اس واقعہ کو تین مہینے گزر گئے تو دفعتاً مجھ میں جذبۂ انتقام پیدا ہونے لگا، اور میں نے اُس کو مار ڈالنے کا پختہ ارادہ کر لیا

مقتول کے وکیل نے اس بات پر بہت زور دیا - اگر میں اُسی وقت لیوسی کو قتل کر دیتی تو شاید بچ جاتی - میرے پاس اگر بل کا پستول نہ ہوتا، تو شاید کبھی قتل نہ کرتی - اب میرے خیالات میں پھر اُلجھن پیدا ہوئی، خاص کر اُس وقت جبکہ میں پادری کے سوال پر غور کرتی ہوں اب میں یہ کیسے سوچوں کہ مجھے اپنے کئے پر افسوس ہے، یا نہیں - پادری کہتے تھے کہ مجھے روحانی سکون صرف اُس وقت ہو سکتا ہے - جبکہ میں اپنے کئے پر پشیمان ہو جاؤں، جب تک مجھے صرف اپنے حال پر افسوس رہے گا - اُس وقت تک مجھے کوئی سکون نہیں مل سکتا اور میں اسی اُدھیڑ بُن میں ختم ہو جاؤں گی - میرے سوچنے کے لئے صرف ایک دن اور ایک رات باقی ہے -

میں سمجھتی تھی کہ میں تمام واقعات پر دوبارہ غور کر سکوں گی، لیکن مجھ سے نہ ہو سکا - کیونکہ میں اپنا یقین کھو چکی ہوں -

مجھے کسی بات پر اعتماد نہیں ہے - جب ڈر چھایا ہوا ہو - تو یہ چیز اور بھی مشکل ہو جاتی ہے، مجھے وہ وقت اچھی طرح یاد بھی نہیں آتا - جب میں نے لیوسی کو قتل کرنے کا ارادہ کر لیا تھا، ہاں، اتنا یاد ہے کہ کنجی ملنے سے پہلے میرا ارادہ مستحکم ہو گیا تھا - چابی جم کے پرانے اوورکوٹ کی جیب میں پڑی تھی - یہ کوٹ وہ میرے ہاں ایک بار چھوڑ گیا تھا، یہ مجھے معلوم بھی نہ تھا کہ یہ کنجی لیوسی کے کمرے کی ہے - یہ میری صرف امید موہوم تھی - ایک رات جب کافی اندھیرا ہو گیا تو میں اس کے کمرے پر گئی اور چابی لگا کر دیکھی، وہ اُسی کی نکلی - پھر ایک روز شام کو میں پستول لیکر وہاں پہونچی، بیشک میں نے بڑا خطرہ مول لیا - ممکن تھا کہ اُس کے ساتھ اُس وقت کوئی مرد ہوتا، اب پھر مجھے کچھ یاد نہیں آتا کہ کیا ہوا - اتنا ضرور یاد ہے کہ میں نشست گاہ میں کھڑی تھی - پستول میں نے پیٹھ کے پیچھے چھپا لیا - کسی کے آنے کی آہٹ ہوئی ـــــ وہ

زمین پر پڑی تھی اور پستول میرے ہاتھ میں تھا، میں نے کبھی کسی کو مردہ نہیں دیکھا تھا، لیکن مجھے یقین تھا کہ وہ مر چکی ہے - میں نے ——— اس کا خون جذبۂ انتقام میں کیا - اب مجھے قتل کیا جائے گا - کسی کو کیا اگر مجھے اس بات پر افسوس ہے یا نہیں - اب تو میں ایک جانور کی حیثیت رکھتی ہوں - دن رات میرے رکھوالے مجھ پر نظر رکھتے ہیں - اُن کو میرے بھاگ جانے کا ڈر ہر وقت رہتا ہے - بس -

اس کمرے کی چار دیواری میں جو خوف ہے - وہ ہر چیز میں سما چکا ہے وہ میرے جسم میں ہے - میں اسے چھو سکتی ہوں - وہ میرے دل کی پرشور دھڑکنوں میں ہے، وہ میرے پہرے والیوں کی آنکھوں میں ہے - وہ پادری کے سیاہ جبہ کی سلوٹوں میں ہے - اور جب میں نماز پڑھتی ہوں تو میرے ارکان نماز میں شامل رہتا ہے - وہ میری ہی طرح ایک مہیب حیوان ہے - میں اُس کے ساتھ رہ نہیں سکتی اور بغیر اُس کے مر بھی نہیں سکتی بار بار غسل خانہ جاتی ہوں - پیٹ کی شدید مروڑ ہر منٹ بڑھتی جا رہی ہے، یہاں تک کہ رانوں اور ٹانگوں تک پہونچکر اُن کو مفلوج سا کر دیتی ہے -

مجھے تعجب ہے کہ میں چلتی، پھرتی کیونکر ہوں -

آج صبح میں نے اپنی صورت آئینہ میں دیکھی، چہرہ سُست گیا ہے - میری آنکھیں کبھی اتنی بڑی اور ڈراؤنی نہ تھیں، اب میں اپنے بالوں کو کیوں بناؤں، غازہ کیوں لگاؤں - مُردے کا سنگھار کون کرتا ہے -

---

آج شام کو ایک عجیب واقعہ پیش آیا - جب میں چائے پی رہی تھی، تو یکایک مجھے محسوس ہوا کہ گرم چائے حلق سے نہیں اُتر رہی - مجبوراً میں نے اُبکائی لی - ہاتھ میرے گردن کی طرف بڑھے، میری اُنگلیاں خود بخود میرے گلے کو زور سے دبانے لگیں، پھر پھانسی کا منظر میری آنکھوں کے سامنے آگیا اور خوف سے سمٹ کر کرسی پر بیٹھ گئی -

بیکر میرے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی اور اپنے ہاتھ - میرے گھٹنوں پر رکھ دئے اور مجھ سے آہستہ آہستہ کہتی رہی، مجھے بہت افسوس ہے ——— خدا تم پر اپنا رحم کرے — جب میں نے اُس کی طرف دیکھا، تو وہ رو رہی تھی -

آج بُدھ کا دن ہے - مجھے اکثر چیخوں کی آوازیں آتی رہتی ہیں اور میں خواہ مخواہ کچھ نہ کچھ اپنے دل میں بکتی رہتی ہوں، کچھ بے ربط جملے، بے جوڑ باتیں - میں سوچتی ہوں کہ کہاں دفن کرتے ہوں گے، شاید اسی مٹی کے ڈھیر پر، جہاں میں چہل قدمی کو لیجائی جاتی ہوں -

برانڈن بولی :- آج صبح کافی گرمی ہے - آج تمھیں شال کی ضرورت نہیں ہوگی، میرے شانہ پر ہاتھ رکھا اور کہا :- آج شام کو باہر بہت ہی اچھا معلوم ہو رہا ہے، چلتی ہو باہر؟ میں نے کہا " اچھا "، اس نے معمول سے زیادہ دیر تک مجھے باہر رکھا - بلّی پھر میرے پاس آئی - میرے منھ سے منھ ملاتی تھی اور غرغر کرتی تھی، پھر اچانک بلا کسی اشارہ کے کود کر نکل گئی - میں تھوڑی دیر تک کھڑے ہو کر دھندلے آسمان کی طرف جس میں جا بجا سفید ابر کے دھبے نظر آ رہے تھے، دیکھتی رہی - یہ میرا آسمان کو دیکھنا بالکل آخری بار تھا -

میں بھول چکی تھی کہ میں نے مس بلائی سے ملنے کے لئے کہا تھا - جب برانڈن انھیں لیکر آئی - تو مجھے کسی قدر تعجب ہوا -

میں نے محسوس کیا کہ اس مرتبہ اس نے مجھ سے نظریں چرالیں، شاید وہ مجھے دیکھنے کی تاب نہ لا سکتی تھی - اُس نے اپنے دستانے اُتار کر، اپنی جیبوں میں ٹھونسنا شروع کر دئے، جب وہ بولی تو اُس کی آواز دبی - دبی تھی - گو وہ میری طرح پہرے والیوں کی موجودگی سے باخبر تھی - لیکن اُن کی موجودگی ایک دھندلے پس منظر میں ڈوبی ہوئی تھی -

وہ بولی :- " کیا تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو؟ " میں نے تھوڑا سا توقف کیا، لیکن جواب میں الفاظ بے ساختہ میری زبان پر آ رہے تھے - " میں آپ کے کہنے پر غور کر چکی ہوں، میں اپنے کئے پر شرمندہ ہونا چاہتی ہوں، مگر اب وقت نہیں ہے " میری زبان سے الفاظ بے ساختہ جلدی جلدی نکل رہے تھے - میری آواز کچھ ایسی تھی کہ میں مشکل سے اسے اپنی آواز سمجھ سکتی تھی، میں اپنے کئے پر پشیمان ہونے سے بھی

فاصلہ کا اندازہ لگا لیا ہے - جہاں جہاں سے رنگ پیڑا گیا ہے، اس کا ہر نشان میرے ذہن میں ہے - جب مجھے چہل قدمی کے لئے آج باہر لیجایا گیا - تو دیوار پر ایک بڑی بلی بیٹھی ہوئی تھی - وہ میری طرف آئی اور میرے پاؤں سے اپنا جسم رگڑنے لگی اور خوشی کی ایک آواز نکالی - میں نے اُس کے نرم بالوں پر اپنا ہاتھ پھیرا "تم سے بہت خوش ہے" — ہل نے کہا: "دوسرے اجنبیوں کی طرف تو وہ رخ بھی نہیں کرتی" جب ہم واپس ہوئے - تو اُس نے "میاؤں" کیا اور ہماری طرف دیکھا - میرا جی چاہا کہ میں اُسے اندر لیجاؤں ——— آج اتوار کی صبح ہے - جیل کا گھنٹہ بج رہا ہے - کسی نے کہا: "ہلٹن پادری آنے ہی والا ہے" - پادری اپنا جُبہ پہنے ہوئے عجیب سے معلوم ہو رہے تھے، دُعا پڑھی - اور مجھ سے بھی پڑھوائی -

"اے خدا تو نے وعدہ کیا ہے کہ تو ہمارے گناہوں کو بخش دے گا، اس لئے مجھ پر رحم کر، رحم فرما ——— (مگر خدا پر تو مجھے عقیدہ ہی نہیں ہے ——— اور میرے سامنے عدالت کا کمرہ ہے جہاں جوری کے ممبروں سے میرے گناہگار یا بیگناہ ہونے کے بارہ میں رائے طلب کی جاتی ہے اور مجھے قتلِ عمد کا مجرم قرار دیکر پھانسی کی سزا سنائی جاتی ہے)

اخیر میں پادری آمین کہتا ہے اور میں بھی نہایت آہستگی سے آمین کہہ دیتی ہوں -

---

ہل کی ڈیوٹی ہے - جب میں نظر اُٹھاتی ہوں، اسے اپنی ہی طرف دیکھتا ہوا پاتی ہوں - شاید وہ اپنے دوستوں کو میری داستان سنائے گی — لوگ تو صرف وہی باتیں جانتے ہیں، جو اخباروں میں آتی ہیں — وہ یہ کیا جانیں کہ ایسی بات کرنے سے قبل دل پر کیا گزرتی ہے اور وہ جذبۂ نفرت کتنا سخت ہوتا ہے جو انسان کسی کو قتل کر دینے پر مجبور کر دیتا ہے -

میرے جوتے مجھے تکلیف دے رہے ہیں - جیل کے افسر چاہتے ہیں کہ دوسری جوڑ مجھے لا دیں — اس خیال کے ساتھ ہی لیوسی کی تصویر میرے سامنے آگئی جب وہ BEAUTY SHOP میں پہلی بار آئی تھی - اور سب سے پہلے میں نے اس کو خوبصورت سیاہ سوئیڈ کے جوتے پہنے دیکھا تھا - جن کی ایڑیاں بہت اونچی اور سبک تھیں - اُس کی ٹانگیں بہت سڈول تھیں، اُس کے جسم میں کوئی خاص بات نہ تھی - لیکن اُسے کپڑے پہننا [illegible] بموجب حیثیت سے وہ اچھی معلوم ہوتی تھی، اُس کا حسن سادہ تھا اور چہرہ کا رنگ بڑا پیارا اس کی آنکھیں گڑیوں کی طرح معصوم تھیں [illegible] طرح چمکیلی اور نیلگوں ——— پھر بھی اُس کو خوبصورت نہیں کہا جا سکتا تھا - اس کی عمر ۴۰ سال کی تھی، لیکن پھر بھی وہ معمر نہیں معلوم ہوتی تھی -

جب اول دن دوکان میں آئی - تو مجھے وہم بھی نہ تھا کہ جم اُس کو جانتا ہے - سنا ہے — کہ وہ اُس سے پہلے پہل، اول کسی شراب خانہ میں ملا تھا - دونوں پی کر مخمور ہوئے، اور ایک دوسرے پر فریفتہ ہو گئے، شاید لیوسی نے پہلے اس میں کچھ کشش محسوس کی - لیکن وہ ایسی تھی ہی نہیں کہ کسی مرد کی پابند ہو کے رہ جاتی تاوقتیکہ وہ اس کی سطح و خیال کا انسان نہ ہو -

جم بے چارہ ہفتہ میں تین بار ایک معمولی درجہ کے نائٹ کلب میں پیانو بجاتا تھا - مگر مخمور ہو جانے کے باعث اپنے کام کو کبھی نہیں پہونچتا تھا - فن کے اعتبار سے اس میں بڑی خوبیاں تھیں - لیکن کاہل تھا - اگر کبھی وہ کچھ روپیہ کما بھی لیتا، تو جوئے کی نذر کر دیتا - لیوسی اُس کو روپیہ دیتی تھی اور اپنے ساتھ اچھے اچھے کلبوں میں لے جاتی تھی - جہاں وہ خود نہ جا سکتا تھا — تعجب ہے کہ وہ اس پر کس طرح قابو پا گئی - وہ تو ایسا نہ تھا — کہ کسی عورت کے پیچھے دیوانہ ہو جاتا، وہ تو خود اپنی مرضی کے مطابق، عورت پر حکمرانی کرنے کا شایق تھا اور اس پر اکثر ناز کرتا تھا - لیکن خیر، اب ان باتوں کو یاد کرنے سے کیا فایدہ - وہ تو مر گیا — اور عنقریب میں بھی مر جاؤں گی - لیکن سوچتی ہوں کہ مجھ میں کیا کمی تھی کہ میں اُس کو پسند نہ آسکی - مجھے یاد ہے کہ جب جم مجھے پہلی بار سینما لے گیا - تو ہم آخری قطار میں تھے - اُس نے مجھے اپنی باہوں میں لے کر - مجھے اپنے سے لگا لیا، میں اپنا کوٹ اُتار چکی تھی اور میں بلاؤز کے باریک کپڑے کے نیچے اس کے ہاتھ کا دباؤ محسوس کر کے خوش ہو رہی تھی — میں نے اُس کی طرف دیکھا - تو اُس نے مجھے جھک کر پیار کیا - جی چاہتا تھا کہ وہ

بوسہ دائمی ہو کر رہ جائے! — اس رات وہ میرے گھر پر آیا - میں ہرگز یہ نہ سمجھتی تھی کہ ایسا ہوگا - میں ڈرتی رہی - ایسا محسوس ہوتا تھا کہ میں کوئی اور ہوں بالکل اجنبی و بیگانہ - جو ایک ایسی آواز سے رو رو کر شکوہ کر رہی ہے جس کو میں خود نہیں جانتی اور بار بار کہتی ہے کہ مجھے چھوڑ دو - مجھ سے دور ہٹ جاؤ — میں چونک کر اُٹھ بیٹھی اور پھر اپنے آپ کو وہیں زنداں میں پایا - کھڑکیوں مجھے قریب سے جھک کر دیکھ رہی تھی — اتنی قریب سے — کہ اُس کی آنکھوں کی باریک نیلی رگیں - صاف دکھائی دے رہی تھیں - اُس کے گال پر بائیں جانب ایک چھوٹا سا نشان تھا - نرمی سے وہ مجھ سے کہہ رہی تھی: "سو جاؤ - تمھیں سونا چاہئے - سو جاؤ - سو جاؤ" - رفتہ رفتہ اُس کی صورت دھندلی ہوتے ہوتے چھپ گئی -

صبح ہوگئی - ڈاکٹر مجھ سے باتیں کر رہا ہے - آج ایک خاتون تم سے ملنے آرہی ہے - وہ ایک مصنفہ ہے، اور جیل خانوں کے نظام کی اصلاح کے متعلق بہت کچھ لکھ چکی ہے -

مجھے امید ہے کہ تم اُسے پسند کرو گی - اگر اپنے دل کا حال سنانا چاہتی ہو - تو اُس سے بہتر تمھیں کوئی نہیں ملے گا - میں نے کچھ نہیں کہا - اور نہ میں کچھ کہنے کے قابل رہی تھی - میں اس قدر تھکی ہوئی اور افسردہ تھی کہ انکار بھی میرے بس سے باہر تھا -

مس بلائی آئی - اُس کی شکل عجیب سی تھی - لیکن وہ کچھ بہت اچھے مزاج کی - صبح صبح ۵۰ پھولوں کی "نمائش" سے ہو کر آئی تھی - آتے ہی مجھے ایک فہرست دی - جس میں بہت سے پھولوں کے بیج چودہ اپنے باغ کے لئے خرید کر لائی تھی، درج تھے - بعض لوگ شاید سمجھیں کہ یہ بڑی ناموزوں سی بات تھی - لیکن مجھے اس کی سادگی اچھی معلوم ہوئی - اس نے بنفشہ کے پھولوں کا ایک بٹن اپنے کوٹ سے نکال کر مس برانڈن کو دیکر کہا کہ اسے ایک گلاس میں پانی بھر کر میرے پاس رکھ دے - اس نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور نہ میں نے اُس سے کچھ کہا - اُس نے صرف اتنا کہا کہ میں پھر آنے کی کوشش کروں گی - اس نے مجھ سے ہاتھ تک نہ ملایا اور چلی گئی میں سوچتی رہی کہ اُس کے پاس جو بیج تھے - وہ جب اپنے باغ میں لگائے گی تو وہ اُگ بھی آئیں گے، لیکن مجھے کبھی اس کا حال نہ معلوم ہوگا -

کل یہ ہفتہ بھی ختم ہو جائے گا - کبھی کبھی یہ بھی پتہ نہیں چلتا کہ دن کب ختم ہوا اور رات کب آئی - وقت میرے لئے ساکن ہے - لیکن ٹکڑے ٹکڑے ہو کر - وقت کی تقسیم میرے لئے اب صرف اس طرح ہے: چہل قدمی کرنا - کپڑے اُتارنا - کپڑے پہننا اور جیل کے افسروں کو آتے جاتے دیکھنا - یہ سب مجھے ایسے نظر آتے ہیں، جیسے خواب کے سائے!

معلوم نہیں بِل کا کیا حشر ہوا - وہ گزشتہ جنگ میں اسٹاف افسر تھا - اُس سے میں دو مہینے تک ملتی رہی - وہ میرے لئے اکثر کھانے کی چیزیں لایا کرتا تھا، جو لام پر اُس کی ماں بھیجتی رہتی تھی - وہ کھانا بہت ہی اچھا پکاتا تھا - اکثر میرے کمرے پر آتا کھانا پکاتا، کھاتا اور وہسکی پیتا رہتا - اُس کے پاس ایک پستول تھا، جس کا ذکر عدالت میں بار بار آیا - گو وہ اس کے رکھنے کا مجاز نہ تھا، تاہم اُس نے مجھے اُس کا چلانا سکھایا میرے پاس چھوڑ گیا اور کہہ گیا کہ اسے رکھو - یہ چوروں کو ڈرانے کے لئے کبھی نہ کبھی کام آئے گا - ایک عرصہ کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ وہ فرانس میں مارا گیا - اس کا پستول میرے پاس برسوں سے میز کے سب سے نیچے کے خانہ میں پڑا رہا - اُس کا ذکر میں نے جم سے مصلحتاً نہیں کیا، وہ بھی تو بعض باتیں مجھ کو نہیں بتاتا تھا — اس کا حال مجھے کبھی معلوم نہ ہوتا - اگر مس روز مجھ سے اُس کا ذکر نہ کرتی - وہ اسی دوکان میں کام کرتی تھی - جم کو دور سے پہچانتی تھی - کیونکہ وہ مجھ سے اسی دوکان میں ملنے آتا تھا - ایک روز اُس نے مجھ سے کہا کہ اُس نے جم کو ایک عورت کے ساتھ کسی کلب میں دیکھا تھا - مجھے شبہ پیدا ہوا - کیونکہ مجھ سے تو وہ کہہ کر گیا تھا، کہ میں اپنے ایک مرد دوست کے ساتھ جا رہا ہوں - جب وہ ملا، تو میں نے اُس سے پوچھا، اُس نے جواب دیا کہ مس روز کو غالباً دھوکا ہوا، وہ میں نہ تھا کوئی اور رہا ہوگا - کچھ دن کے بعد — لیونسی پھر آئی اور مس روز نے مجھے بتایا کہ یہ وہی ہے - جو اُس رات کو جم کے ساتھ تھی — بعد کو جم نے بھی اقبال کیا - اور کہا کہ وہ میرے ایک دوست کے ساتھ آئی تھی اور ہم تینوں ایک جگہ بیٹھ گئے تھے" جھوٹ بولنے میں تو وہ مشاق تھا - اُن دنوں تو میں خواب میں نہ سوچ سکتی تھی کہ وہ میرے سوا کسی اور سے کوئی واسطہ رکھ سکتا ہے - عورتیں بھی مردوں کے بارہ میں کتنا دھوکا کھاتی ہیں -

ڈرتی ہوں - میں ہمت سے کام لینا چاہتی ہوں، مگر یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا، اب وقت بہت قریب ہے - میں اور کچھ نہیں سوچ سکتی، سوا اس کے کہ میں کل صبح مرنے والی ہوں — میں اس کی طرف دیکھ نہیں سکتی تھی، مگر نظر ان کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کی طرف تھی، جو اسوقت میز پر رکھے ہوئے تھے — پھر وہ بولی :- "یقین کرو کہ جب تم صبح بیدار ہوگی تو تمھارا بُرے سے بُرا وقت گزر چکا ہوگا، تمھارے جرم کا بار تمھارے شانوں سے اُٹھا دیا گیا ہوگا، تم آزاد ہوگی، تمھارے اعضاء تمھاری ہر نشاء کی تعمیل خود بخود کریں گے، تمھارے خیالات کچھ ایسے ہوں گے، جیسے خواب میں ہوتے ہیں"۔ یہ کہتے کہتے اس نے آنکھیں بند کرلیں - آخر میں اس نے کہا کہ " جب تم اُس خواب سے بیدار ہوگی تو تم خدا کے سایۂ عاطفت میں پہونچ جاؤ گی"۔

میں نے کھانا کھایا - جیلر مجھے دیکھنے آئی - مجھ سے پوچھا :- "کیا میں کچھ کہنا چاہتی ہوں" - میری سمجھ میں کچھ نہیں آیا - اس نے پھر کہا کہ " ڈاکٹر مجھے کوئی خواب آور دوا دے گا اور مجھے اب اپنے دماغ سے ہر بات نکال دینے کی کوشش کرنا چاہئے"۔

میں اس کو دیکھ رہی ہوں، - مگر دیکھ نہیں سکتی - وہ چلی جاتی ہے - میرے پاس ماں اور بھائی کے خط آئے - میں نے اب تک نہیں پڑھے - میں ڈاکٹر سے کہوں گی کہ آج رات کو مجھے خواب آور دوا نہ دے - یہ میری آخری رات ہے، میں اسے جاگ کر گزارنا چاہتی ہوں - کوئی مجھے غور سے دیکھ رہا ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مجھے سخت بخار ہے - کاش میں اس وقت جی بھر کر رو سکتی -

پادری میرے روبرو بیٹھا ہوا ہے - اس کی آنکھوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اپنے اہم کام کو انجام دینے کے لئے کس قدر بیتاب ہے میرے اس کے درمیان ایک خلیج حایل ہے - جس کو میں سمجھ نہیں سکتی - شاید وہ میرے گناہ کو نہیں سمجھ سکتا اور نہ اس کے نزدیک اُس گناہ کا کوئی کفارہ ہے -

پادری :- کیا تم مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہو، اگر تمھاری کوئی آخری آرزو ہے تو مجھ سے کہدو - میں کوشش کرکے اُس کو پوری کرونگا، میں نے سر ہلا دیا -

پادری کی اب آواز دھیمی پڑ گئی، اُس میں اب جھرجھراہٹ سی محسوس ہوتی تھی -

وہ بولا :- " میں تمھاری مدد کرنا چاہتا ہوں، میں تمھیں روحانی تسکین وتقویت دینا چاہتا ہوں، تاکہ تم کل بلا خوف وخطر عالم بقا میں داخل ہوسکو" میں نے کوئی جواب نہ دیا -

پادری نے انجیل ہاتھ میں لیکر جلد اُس کی ورق گردانی شروع کی - میں خاموش سنتی رہی -

پادری رخصت ہوا اور یہ کہکر چلا گیا کہ " کل صبح میں تمھارے ساتھ ہی رہونگا - گارڈ نے مجھ سے کہا :- "اب لیٹ جاؤ"

مکفرلین سے ملنے کو میرا بہت جی چاہا - میں نے پوچھنا بھی چاہا کہ وہ آج ڈیوٹی پر آئے گی یا نہیں - لیکن نہیں پوچھا، میں اُس سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہونا چاہتی تھی - آج تمام دنیا میں وہی ایک ہے، جس کے چھوڑنے کا مجھے افسوس ہے - آج میں رات کے کپڑے آخری بار پہن رہی ہوں - پادری شاید صبح نو بجے پہونچے گا، ہاں شاید اُس نے نو بجے ہی آنے کو کہا تھا - (نیند میں) جم، جم نہیں، آج رات کو ہرگز نہیں میں تمھارے قابل نہیں ہوں، اب مت آنا - کبھی نہ آنا -

میں چونک کر اُٹھی، مکفرلین میرے پاس بیٹھی تھی، میں نے اس کی آستین پر ہاتھ رکھا اور پوچھا - " دیر تو نہیں لگے گی" اُس نے جواب دیا :- " نہیں صرف چند لمحے — وہ بہت آہستہ آہستہ بول رہی تھی - دوسری گارڈ بھی موجود تھی، مگر مجھے اُس کی موجودگی کا احساس نہ تھا - میں نے دریافت کیا کہ " مس مکفرلین، آپ کا مذہب اور آپ کے اعتقادات آپ کے لئے بڑی اہمیت رکھتے ہوں گے" اُس نے جواب دیا کہ :- " میں اُن کے بغیر جی ہی نہیں سکتی"

جم بغیر یسوع کے بھی زندہ نہیں رہ سکتا تھا - میں جم کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی تھی، اب میں تنہا بغیر کسی کی معیت کے مرنے والی ہوں

شاید مکفرلین نے میرے خیالات کا اندازہ لگالیا اور کہا: "خدا ہم سب کے ساتھ ہے۔ خواہ ہم اُس پر ایمان رکھتے ہوں۔ یا نہیں۔ اُس وقت بھی جبکہ ہم اُس کے وجود کے منکر ہوں۔"

میں نے کروٹ لیکر دیوار کی جانب اپنا منھ پھیر لیا اور تکیہ میں چہرہ چھپا لیا۔ میرے خیالات کا اولجھا ہوا ڈراؤنا خواب میرے ہول کو نہ دبا سکا۔ ایک چیخ اندر سے اُٹھتی ہوئی محسوس ہوتی تھی جو زیادہ بڑھتی جاتی تھی۔ مجھ پر لرزہ طاری تھا۔

مجھ کو کمبل پر کمبل اُڑھائے جارہے تھے۔ میں نے اُٹھ کر دیکھا، مکفرلین نے اپنی ٹوپی پہن لی تھی۔ جس سے میں سمجھی کہ گارڈ بدل رہا ہے۔ اُس نے جھک کر میرے شانوں پر ہاتھ پھیرا۔ اور کہا کہ:۔ "میری، تمھیں خدا کے سپرد کرتی ہوں"۔ گارڈ نے مجھے اُٹھایا۔ میں پلنگ سے گھبرا کر اُٹھی، کپڑے بدلنا کچھ عجیب بات معلوم ہوتی تھی۔ میرا نیلا سایہ میرا سفید بلاؤز دُھل چکا تھا دونوں صاف اور نفیس شکن کے تھے۔ اب وہ میلے نہ تھے۔ جب میں نے انھیں عدالت میں پہنا تھا تو کافی میلے تھے، میں نے خود بخود اُس کا کالر ٹھیک کیا۔

"نہیں۔ نہیں۔ میں کچھ نہیں کھاؤں گی"۔ دریچہ کھلا۔ صبح ہوگئی، لیکن بہت دھندلی صبح ہے۔ کچھ کُہر کے بھی آثار ہیں۔ میرے کپڑے کس قدر سخت معلوم ہوتے ہیں، میں بار بار اُن پر ہاتھ پھیرتی ہوں۔ کیا یہ میرے ہی کپڑے ہیں؟ میرے ہی جوتے ہیں؟ جب میں اُن کی پالش کی چمک دیکھتی ہوں۔ تو مجھے وہ بہت دور معلوم ہوتے ہیں۔ ان کو کس نے پالش کیا۔ کیوں کیا۔ کیا میں بول رہی ہوں نہیں۔ ہرگز نہیں۔ کچھ نہیں کھاؤں گی۔

وہ مجھے لینے آرہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے۔ اب میں لیجائی جاؤں گی۔ ان ہی کپڑوں میں۔ اسی بلاؤز میں۔ اسی لباس میں۔ انھیں جوتوں کو پہنے ہوئے۔

کسی نے آواز دی۔ ہلٹن، ہلٹن ــــ "یہ کیا کہہ رہے ہیں"۔ شاید پادری آیا۔ پادری کچھ پڑھ رہا ہے۔

لو پی لو۔ میں نے پی لی۔ شاید برانڈی ہے۔ میرے پیٹ میں گرمی محسوس ہوتی ہے۔ میں نے پلٹ کر گلاس اُسے واپس کیا۔ اب اُس کی شکل دھندلی نظر آرہی ہے۔ میرے ہاتھ میری پیٹھ کے پیچھے باندھے جارہے ہیں۔ چیخوں؟ نہیں۔ کیا فایدہ۔ اب چل چلاؤ ہے۔ کوئی چیز میرے چہرے پر ڈالی گئی۔ کچھ گردن میں پہنایا گیا۔ اب صرف اندھیرا ہے، نہایت گہرا اندھیرا اور میں اس میں ڈوبتی جارہی ہوں۔ میرے پاؤں کسی چیز سے باندھے جارہے ہیں، اُف تاریکی، اتنی سخت تاریکی ــ جم، تم کہاں ہو ــــــــ!

"نگار" کے پچھلے تین سالنامے

سالنامہ ۱۹۳۱ء جس میں علم "فراست التحریر" کے اصول پیش کئے گئے تھے اور جن کو دیکھ کر آپ ایک شخص کا سوا دخط دیکھ کر اس کے کیرکٹر کا صحیح اندازہ کرسکتے ہیں ــــ صرف ایک کاپی باقی ہے ــــــــ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۳۷ء اس میں "ڈراما اصحاب کہف" اوڈیٹر کے قلم سے پورا شایع ہوا ہے اور "خلافت وامامت" کے مسئلہ پر گفت گو کا آغاز ہوا ہے ــــــــ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

سالنامہ ۱۹۳۸ء اس میں "تاریخ اسلامی" کے عہد خلافت وامامت پر مختتم بحث کی گئی ہے جس کی ابتداء ۱۹۳۷ء میں ہوئی تھی ــــ ــــــــ قیمت تین روپیہ علاوہ محصول

منیجر نگار لکھنؤ

کچھ مدیر "نگار" سے

(وقار احمد رضوی)

(الف) "نگار" کے "علوم اسلامی و علماء اسلام نمبر" کے حصۂ اول میں آپ نے خلافتِ عثمانی کا تذکرہ فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ "اس عہد میں بنو امیہ برسر اقتدار آگئے تھے۔ جس سے باہمی اختلاف رونما ہوئے اور خلیفۂ عثمان کو علمی خدمات کے لئے کوئی موقع نہیں مل سکا (حالانکہ پھر بھی ان کے عہد میں فرقانِ مجید کی ترتیب و تدوین ہو سکی) ۔ اس کی مزید تشریح آپ نے پچھلے سالنامہ ۵۴ء میں کی ہے۔ جس میں یہ نتیجہ اخذ ہوتا ہے کہ خلیفۂ عثمان نے اپنی خلافت میں "اقربا نوازی" سے کام لیا تھا۔ اور ولایت و امارت پر زیادہ تر اپنے رشتہ داروں کو مامور کیا تھا۔

ویسے یہ کوئی نیا اعتراض نہیں۔ خلافتِ عثمانی پر "عزل عمال" اور "اقربا نوازی" کے اعتراضات قدیم زمانہ سے غیر مدلل طور پر دہرائے جاتے رہے ہیں۔ مورخین کے ایک گروہ نے حضرت عثمان کی زندگی کے حقایق کو بڑی حد تک پردۂ خفا میں رکھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن اگر تحقیق و جستجو سے تاریخ کی ورق گردانی کی جائے تو اس خلیفۂ معصوم کی زندگی کے صحیح حالات معلوم کرنا کچھ زیادہ مشکل نہیں۔ حضرت عثمان کی نرم دلی، مروت اور رقیق المزاجی نے جہاں اُن کی حیات طیبہ کو صدمہ پہونچایا وہاں اُس سے اسلامی تاریخ بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکی۔ عام طور پر ان کے متعلق یہ خیال کیا جاتا ہے کہ ان کی سیاسی زندگی "عزل عمال" اور "اقربا نوازی" کی اُلجھنوں میں پھنس کر رہ گئی تھی (کاش! اس نظریہ کے موجدین خلافتِ راشدہ کے آخری ابواب کو گہری نظر سے مطالعہ کرنے کی زحمت فرماتیں) حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو بہت سے مقامات تو ایسے ہیں، جہاں عزلِ عمال ہوا ہی نہیں۔ اور جن چند علاقوں میں عزلِ عمال ہوا وہاں کے ارباب نظامت کو عثمانی نسب سے کسی قسم کا تعلق نہ تھا۔ چنانچہ یمن کے دارالسلطنت، صنعاء پر یعلی بن منبہ اور نجد پر عبداللہ بن ربیعہ، عہدِ فاروقی سے اپنی جگہوں پر متمکن تھے اور خلافتِ عثمانی کے آخری دن تک یہ لوگ اپنی جگہوں پر بدستور کام کرتے رہے۔ اس کے علاوہ مکہ پر عبداللہ بن حضرمی، طائف پر قاسم بن ربیعہ، حمص پر عبدالرحمن بن ربیعہ اور رے پر سعید بن قیس، وہ لوگ ہیں جن کو حضرت عثمان سے کسی قسم کی قرابت نہیں تھی۔ اب رہے مصر و شام و کوفہ و بصرہ جو خلافتِ عثمانی کے چار بڑے عسکری مرکز تھے۔ ان میں سے شام پر معاویہ عہدِ فاروقی سے مامور تھے۔ اُن کا انتخاب ظاہر ہے عہدِ عثمانی میں نہیں ہوا۔ کوفہ کے لئے حضرت عمر کی وصیت تھی کہ مغیرہ بن شعبہ کے بجائے سعد بن وقاص کو وہاں کا گورنر بنایا جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ گو کہ بعد میں ان کے بجائے ابو موسیٰ اشعری کو اس عہدہ پر مامور کیا گیا جو حضرت عثمان کے عزیز نہ تھے۔ بصرہ میں عبداللہ بن ابی سرح کو معزول کرنے کے بعد محمد بن ابی بکر کو وہاں کا والی مقرر کیا گیا تھا۔ حالانکہ محمد بن ابی بکر حضرت عثمان کے رشتہ دار نہیں تھے۔ بلکہ کچھ مخالف ہی تھے۔ رہے وہ عبداللہ بن عامر، بصرہ کے گورنر ہیں، جو ان کے عزیز کہے جا سکتے ہیں۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے تقرر میں حضرت عثمان کی ذاتی رائے کو کوئی دخل نہ تھا۔ اہلِ بصرہ نے جب ابو موسیٰ اشعری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی تو اہلِ بصرہ کی خواہش کے مطابق عبداللہ بن عامر کو وہاں کا گورنر بنا دیا گیا۔

یہ وہ تاریخی حقایق ہیں، جن سے خلیفۂ سوم کی سیاسی زندگی پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی بہت سے واقعات ایسے ہیں جن سے اس بحث کے منفی پہلو کو تقویت پہونچتی ہے۔ چنانچہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے (جس کو علامہ خضری نے اپنی کتاب کی دوسری جلد میں بڑی وضاحت سے لکھا ہے) کہ محمد بن حذیفہ نہ صرف حضرت عثمان کے قریبی عزیز تھے بلکہ ان کے خاص پروردہ تھے۔ حضرت عثمان نے

قبیلے کے دوسرے یتیموں کی طرح ان کی پرورش بھی بڑی محبت و شفقت سے کی تھی۔ لیکن بڑے ہو کر جب محمد بن حذیفہ نے حضرت عثمان سے کسی ولایت کی درخواست کی تو آپ نے سختی سے انکار کر دیا۔ جس کی وجہ سے محمد بن حذیفہ ناراض ہو کر مصر چلے گئے اور وہاں کی شورش پسند جماعت سے وابستہ ہو کر حضرت عثمان کے خلاف پروپیگنڈا کرتے رہے۔ اگر حضرت عثمان کو صفتِ اقربا نوازی یعنی صلۂ رحمی (؟) اس قدر عزیز تھی جیسا کہ بیان کیا جاتا ہے تو وہ محمد بن حذیفہ کو ولایت و امارت نہ سہی تو اسی قسم کا کوئی دوسرا عہدہ ضرور دے سکتے تھے۔ لیکن اب اس کو کیا کہیے کہ تاریخ۔ خلافتِ عثمانی کے متعلق اس قسم کے واقعات کی طرف بھی اشارہ کرتی ہے۔ اور پھر اگر بالفرض آپ کے اس جملہ کو تسلیم بھی کر لیا جائے کہ "عہدِ عثمانی میں بنو امیہ برسرِ اقتدار آ گئے تھے" تو پھر اس پر ایک منطقی اور عقلی شبہ واقع ہوتا ہے اور وہ یہ کہ اگر خلافتِ عثمانی میں بنو امیہ پوری طرح برسرِ اقتدار آ گئے تھے تو خلیفۂ سوم کی شہادت (جو دراصل شہادت عظمیٰ تھی؟) اس قدر دردناک طریقے سے واقع نہ ہوتی جیسا کہ تاریخ بتاتی ہے۔

آخر میں اگر میں شاہ عبدالعزیز صاحب کے اُس جملہ کو بھی یہاں نقل کر دوں تو شاید بے جا نہ ہوگا جو انھوں نے اس سلسلہ میں عقلی و نقلی دلائل سے بحث کرتے ہوئے "تحفۂ اثنا عشریہ" میں تحریر فرمایا ہے۔ کہنے کو تو وہ ایک جملہ ہے لیکن درحقیقت اُس ایک جملے سے شاہ صاحب نے اِس گتھی کو بڑی خوبی سے حل کرنے کی کوشش کی ہے۔ فرماتے ہیں:-

"عزل و نصبِ عمال کا بہ خلفاء و ائمہ است لازم نیست کہ عمالِ سابق را برقرار دارند"

دراصل یہ ایک یہودی تحریک تھی جس کا مقصد ہی یہ تھا کہ کسی صورت سے اسلامی تاریخ کے دامن طہارت پر دھبہ لگا دیا جائے۔ خلافتِ راشدہ کے ابتدائی دور میں اس کو پنپنے کے مواقع نہ مل سکے تھے۔ فاروقی جاہ و جلال کے سامنے اس تحریک کی شانِ عنکبوتی محض تارِ عنکبوت بن کر رہ گئی تھی۔ لیکن افسوس ہے کہ حضرت عثمان کی فرشتہ خصلتی یا ان کی سرشت کی مکتبت سے اس کو اُجاگر ہونے کے اچھے مواقع مل سکے۔ ابنِ سبا نے پورے ملک میں اسلام کے خلاف سازش کا ایک جال بچھا دیا تھا اور مسلمانوں میں آپس میں پھوٹ ڈال کر، خلافت کے مشہور اور اہم صوبوں مثلاً مصر و شام، کوفہ و بصرہ وغیرہ میں اپنی جماعت کے مرکز قایم کر دئے تھے۔ ان مرکزوں کے ذریعہ خلیفۂ وقت کے خلاف اُس نے جو کام لئے ان کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ تاہم یہ ضرور ہے کہ باغیوں کے جس گروہ نے حضرت عثمان کے گھر کا محاصرہ کیا تھا وہ اسی تحریک کے تاثر سے متاثر تھا۔ ابن سبا کے جماعتی مرکزوں سے شورش پسندوں نے خلیفۂ وقت پر اقربا نوازی اور عزلِ عمال کی تہمتیں لگا کر، حکومت کی بدنظمی کے خلاف ملک کے اطراف و اکناف کو جعلی خطوط بھیجے۔ جس سے پوری قوم نے یہ سمجھ لیا کہ گویا پورا ملک بنو امیہ کے مظالم سے نیم جان ہے۔ اس سے حضرت عثمان کی معصومیت، صالحیت اور طہارتِ قلب کو تو ضرور مطرم قرار دیا جا سکتا ہے۔ اگر دنیائے انسانیت میں کسی بھی صالح انسان کی صالحیت کو مجرم قرار دینا جائز سمجھا جاتا ہو جبکہ دنیا کے مختلف حصوں کی تاریخوں کے علاوہ خود خلافتِ راشدہ کے آخری دور میں بھی اس قسم کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن اس سے کسی بھی انسان کی شخصیت یا ذاتی عظمت پر حملہ کرنا کہاں تک درست ہے؟ میں ابھی تک اس کا فیصلہ نہیں کر سکا۔

(ب) آپ نے اسی سالنامہ ۱۹۵۵ء میں "بنو امیہ" کے باب میں تحریر فرمایا ہے کہ انہی کے عہد میں خوارج کی جماعت پیدا ہوئی۔ حالانکہ خارجی تصور کی نشو و نما عہدِ عثمانی سے شروع ہو چکی تھی۔ اور اگر غور سے دیکھا جائے تو مذہب کے باب میں ذہنی آزادی کی بنیادیں بھی عہدِ عثمانی میں مضبوط و مستحکم ہو چکی تھیں، نہ کہ بنو امیہ کے عہد میں، چنانچہ ابنِ سبا نے اس تخم کی آبیاری میں جو کارہائے نمایاں کئے ہیں، ان سے کون انکار کر سکتا ہے۔ کیا فتنۂ سبائیہ اسلام میں خارجی نظریات اور یزیدیت کی جڑ نہیں کہا جا سکتا؟

(ج) آپ نے اسی نمبر میں "خطابت و شاعری" کے باب میں لکھتے ہوئے فرمایا ہے کہ "اس سے قبل عرب شاعری صرف قصاید پر مشتمل تھی لیکن عہد امویین میں خالص عشقیہ شاعری شروع ہوئی"۔ پہلے جملہ میں لفظ "صرف" سے پوری عرب شاعری صرف قصیدے کے تنگ دائرے میں محدود ہو کر رہ گئی ہے۔ حالانکہ قصیدہ کے علاوہ عرب شاعری میں مرثیہ، ہجو، رجز، بہادری کے قصے، حرب لبوس، حرب واحس کے تذکرے، مناقر

ومقابلہ اور فخر و شجاعت کے اشعار بھی ملتے ہیں، اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ اُس وقت کی عرب شاعری کا ماحول ہی خود اس بات کا متقاضی تھا کہ ان کے اشعار میں قتل و جدال، عزم و شجاعت اور عشق و شراب کے مضامین آتے۔ چنانچہ "سبع معلقات" کے بیشتر قصاید اس تصور کی ضرب فارائی سے نہ بچ سکے۔ اس بناء پر اگر میں یہ کہوں تو نادرست نہ ہوگا کہ ان میں سے اکثر اشعار شعراء کی زندگی کے قصے اور واقعاتِ عرب کی داستانیں زیادہ ہیں۔ قصیدہ کم۔ خود اس کتاب کا پہلا ہی قصیدہ (اگر اس کو قصیدہ تسلیم کرلیا جائے) امرؤالقیس کی عشقیہ زندگی کے واقعات کی ایک منظوم شکل ہے نہ کہ کسی شخصیت کی مدح سرائی کا نقش فریادی۔

زہیر کا قصیدہ دراصل حارث بن عوف بن حارثہ مری اور ہرم بن سنان مری کے لئے لکھا گیا تھا۔ لیکن اس کے بیشتر اشعار حرب داحس وغبراء کے واقعات کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ جس سے قصیدہ کی فنیت کو بہت بھاری ضرب پہونچتی ہے۔ اس کے علاوہ اس قصیدہ میں زہیر کے عشقیہ رجحانات کے متعلق بھی لطف اشارات ملتے ہیں امرؤالقیس کے بعد زہیر غالباً پہلا شاعر ہے جس کے ہاں عشق کا تصور امرؤالقیس کی بہ نسبت زیادہ نکھرا ہوا، زیادہ پاک وصاف اور طاہر ہے۔

اوپر کی پوری بحث سے ہمارا مطلب صرف یہ ہے کہ قصیدہ کا وہ تصور جو انوری نے فارسی ادب کو اور سودا نے اُردو ادب کو دیا تھا عربی ادب میں تقریباً مفقود ہے۔ حسنیہ مدحیہ اشعار ضرور ملتے ہیں اور وہ بھی زیادہ تر اُن شعراء کے ہاں جو ملوکِ حیرہ اور آلِ غسان کے دربار سے وابستہ تھے۔ لیکن اس سے یہ تو کسی بھی صورت سے لازم نہیں آتا کہ ادب جاہلیہ کی پوری شاعری صرف قصیدے کی تنگ و تاریک حلقے میں محصور تھی

اول تو یہی سمجھ میں نہیں آتا کہ خالص عشقیہ شاعری سے مراد کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ عشق تو عرب شاعری کی ہمیشہ سے بنیاد رہا ہے۔ میرا تو خیال ہے کہ اگر شعراءِ عرب کے دلوں میں عشق کی جلن، محبت کی کسک اور لذتِ درد سے لگاؤ نہ ہوتا تو آج ادب جاہلیہ کا پورا لٹریچر بے جان سا نظر آتا۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ زہیر بن سلمیٰ، مرقش الاکبر اور خنساء، کے علاوہ امرؤالقیس کو خصوصیت سے شعراءِ عرب میں جو مقبولیت حاصل ہوئی وہ کسی عربی شاعر کو نصیب نہ ہوسکی۔ اور آج تک وہ عرب شاعری کی عظمت کا اعتراف فرماتے ہوئے اس کے بارے میں فرمایا ہے:۔

"ھو اشعر الشعراء وقائدھم الی النار" اور اُس کی شاعری کی مقبولیت کی وجہ صرف یہی تھی کہ وہ اپنے سینے میں ایک عشق پسند دل اور جمال دوست جذبۂ احساس رکھتا تھا۔

دوسرے شعراء کے ہاں بھی حُسن و عشق کے اس تصور کی مثالیں مل سکتی ہیں لیکن خالص عشق و لاسپتی عشق کی اس بحث میں نہ معلوم اُن عاشق مزاج شاعروں کا کیا مرتبہ ہوگا، جن سے عرب کی چند حسین معشوقاؤں مثلاً عنیزہ (فاطمہ)، ام اوفیٰ، ام رباب، سلمیٰ اور اسماء کے نام منسوب کئے جاتے ہیں۔ شاید ان لوگوں کے وہاں خالص عشق کے بجائے وفا سپتی عشق تھا؟

(۹) اسی نمبر میں آپ نے "موسیقی" کے سلسلے میں تذکرہ فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ "رسول اللہ نے شعر و غنا دونوں کے رواج کو روکا" مخصوص آلاتِ غنا کی ممانعت کے سلسلہ میں تو احادیث ملتی ہیں۔ لیکن شعر کے متعلق کوئی منفی حدیث آج تک نظر سے نہیں گزری۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے۔ میں پوری وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ شعر کے متعلق کوئی بھی امتناعی صریحی حدیث صحیحہ نہیں ہے۔ البتہ شعر کے جواز میں کچھ احادیث ضرور ملتی ہیں۔ چنانچہ بخاری کی مشہور حدیث ہے:۔ "اِنَّ من الشعر لحکمۃ واِنَّ من البیان لسحرا"[1] ۔ امام بخاری کی صرف یہی ایک حدیث صحیحہ ایسی ہے جس سے شعر کے جواز اور اس کے رواج کا حتمی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگر رسول پر شعر کے سلسلہ میں امتناعی احکام کا "الزام" لگا دیا جائے تو پھر اس کو اس کے سوا اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ "فھم لا یبصرون"

اس کے علاوہ یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کعب بن زہیر کے قصیدہ بانت سعاد کو سننے کے بعد حضور نے ان کو اپنی چادر مبارک عنایت فرمائی تھی۔

---

[1] اور یہ مقولہ بھی مشہور ہے:۔ "الشعراء تلامیذ الرحمٰن"

حسان بن ثابت کے "اسلامی شاعر" ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے، احادیث سے ثابت ہے کہ جب وہ اشعار پڑھنے کھڑے ہوتے تھے تو حضور ان کے لئے منبر کو خالی فرما دیا کرتے تھے۔ حضور نے ان کو کفار کی ہجو لکھنے کا بھی بار ہا حکم فرمایا تھا۔ احادیث میں یہ بھی صراحتاً موجود ہے کہ حسان بن ثابت کے متعلق حضور فرمایا کرتے تھے کہ حسان کے شعر دشمنوں کے دلوں پر وہی اثر کرتے ہیں جو تیر و نشتر انسان کے جسم پر۔ آپ نے حضرت حسان کے اشعار کو سن کر ان کے متعلق یہ دعا بھی فرمائی تھی کہ "ایدہ بروح القدس"۔ (بخاری)

اس کے علاوہ عہد جاہلیہ کے کہنے ہی اشعار ایسے ہیں جن کی سماعت حضور نے فرمائی تھی۔ چنانچہ صاحب مشکوٰۃ نے حضرت ابو ہریرہ سے یہ حدیث روایت کی ہے، جس پر تمام محدثین متفق ہیں کہ حضور نے جب لبید بن ربیعہ کے ایک شعر کا یہ مصرعہ سنا تو آپ بہت مسرور ہوئے اور بار بار آپ اس کو دہراتے رہے ع "الا کل شیئ ماخلا اللہ باطل"

بہرکیف یہ وہ حقائق ہیں جن کی روشنی میں مسئلے کی صحیح پوزیشن سامنے آجاتی ہے۔ ان حقائق کے باوجود سمجھ میں نہیں آتا کہ آپ نے یہ کیسے تسلیم کر لیا کہ حضور نے شعر گوئی یا اس کے رواج کو ممنوع قرار دیا تھا۔ "نگار" کی علمی عظمت سے اس قسم کی فروگذاشتوں کی توقع تو نہیں تھی۔ تاہم اچھا ہوگا اگر آپ کے نظریہ کی تاریکی کچھ ذرا واضح اور روشن شکل میں سامنے آجائے۔

(نگار) آپ کا مقالہ پڑھکر مجھے بہت خوشی ہوئی، اس لئے نہیں کہ اس سے مجھے اتفاق ہے، بلکہ محض اس بنا پر کہ آپ نے نگار کے سالنامہ کو غور سے پڑھا اور اس کے مطالعہ کے بعد آپ نے آزادی سے اپنی رائے ظاہر کی۔

آپ نے چار اعتراضات کئے ہیں، جن میں سب سے زیادہ اہم اور کافی حوصلہ اعتراض وہ ہے جو حضرت عثمان سے تعلق رکھتا ہے اور سب سے پہلے میں اسی پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔

آپ کے اعتراض کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عثمان پر "اقربا نوازی" کا الزام صحیح نہیں اور اس بات کا محرک غالباً یہ خیال ہے کہ اس طرح ان کا کردار داغدار ہو جاتا ہے اور اس بات کے تسلیم کرنے کو آپ کا جی گوارا نہیں کرتا۔ اس سلسلہ میں زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ بحث کے دو ٹکڑے کر کے دو جداگانہ تنقیحیں قائم کر دی جائیں۔ ایک یہ کہ حضرت عثمان نے اقربا نوازی سے کام لیا یا نہیں اور دوسرے یہ کہ اگر انھوں نے ایسا کیا تو کیا واقعی اس سے ان کی دیانت و امانت پر کوئی حرف آتا ہے؟

تنقیح اول کے سلسلہ میں سب سے پہلے (اگر آپ میرے ساتھ ہوتے) آپ ہی سے یہ دریافت کرتا کہ حضرت عثمان کا زمانہ امن و سکون کا زمانہ تھا یا عہد تشتت و انتشار کا، یعنی مسلمانوں کے تمام مفتوحہ دیار اعصار میں کوئی صحیح اجتماعی روح ایسی پائی جاتی تھی یا نہیں اور کیا یہ تمام منتشر علاقے واقعی مرکز خلافت کے مطیع و فرمانبردار تھے؟ غالباً آپ کو بھی اس سے انکار نہ ہوگا کہ فتوحات اسلامی کے ساتھ ساتھ خود حضرت عمر کو بھی یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ مسلمانوں میں قبائلی یا جماعتی اختلاف پیدا ہوتا جا رہا ہے اور اس کی روک تھام کے لئے انھوں نے مختلف تدابیر سے کام لینا شروع کر دیا تھا جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔ جب حضرت عمر کے انتقال کے بعد حضرت عثمان کا دور خلافت آیا تو اس زمانہ میں بعض ایسے عسکری اقدامات بھی تکمیل کو پہونچے جن کا آغاز حضرت عمر کے زمانہ میں ہوا تھا اور اس طرح فتوحات کا سلسلہ وسیع تر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ جماعتی و سیاسی اختلافات بھی زیادہ بڑھنے لگے جن کی بنا حضرت عمر کے زمانہ میں پڑ چکی تھی۔ پھر اگر یہ اختلافات صرف مذہبی یا خالصتہً للہ ہوتے تو بھی غنیمت تھا، لیکن وہاں تو یہ تمام سرگرمیاں محض دنیاوی اغراض اور حصول جاہ و دولت سے تعلق رکھتی تھیں اور برابر بڑھتی ہی جا رہی تھیں، یہاں تک کہ حضرت عثمان کے عہد میں اسلام کا قائم کیا ہوا ذہنی و جسمانی [illegible] بہت زیادہ متزلزل ہو گیا اور کھلم کھلا مرکز خلافت کے خلاف صدائے احتجاج بلند

ہونے لگی۔ بہرحال اس سے انکار ممکن نہیں کہ بنو امیہ اور مہاجرین و انصار کے چند افراد کو چھوڑ کر سبھی حضرت عثمانؓ کے خلاف تھے اور ان کے خلاف شکایتوں کا ایک دفتر کھل گیا تھا۔ میں ان تمام شکایات کا ذکر یہاں غیر ضروری سمجھتا ہوں۔ (محب الدین الطبری کی تصنیف "الریاض النادرہ فی مناقب العشرہ" میں نہایت تفصیل کے ساتھ ان کا ذکر کیا گیا ہے)، لیکن سب سے بڑا اعتراض جس کا تعلق موضوع زیر بحث سے ہے، یہی تھا کہ حضرت عثمانؓ کے عہد میں سب نہیں تو اکثر اہم صوبوں کے گورنر انھیں کے اعزہ و اقربا یا افراد بنی امیہ تھے (عام اس سے کہ وہ پہلے ہی سے اس عہدہ پر مامور رہے ہوں یا خود حضرت عثمانؓ نے انھیں مامور کیا ہو) اور وہ دوسرے قبایل کی حق تلفی کر رہے تھے۔

آپ نے ان چند صوبوں (مثلاً یمن و صنعاء وغیرہ) کا ذکر تو کر دیا جو کوئی مخصوص اہمیت نہ رکھتے تھے، لیکن کوفہ و بصرہ اور مصر و شام کے متعلق جو خاص عسکری مرکز تھے صرف سرسری ذکر کر دینا کافی سمجھا۔ بہرحال شام میں امیر معاویہ پہلے ہی سے گورنری کی خدمت پر مامور تھے اور حضرت عثمانؓ نے ان کا تقرر نہ کیا تھا لیکن تھے بہرحال حضرت عثمانؓ کے قبیلہ بنی امیہ ہی میں سے۔ بصرہ میں ابو موسیٰ الاشعری اور کوفہ میں سعد بن ابی وقاص عہد فاروقی کے گورنر تھے، لیکن حضرت عثمانؓ نے انھیں ہٹا کر عبداللہ بن عامر اور ولید بن عقبہ کو گورنر مقرر کیا اور یہ دونوں حضرت عثمانؓ کے عزیز تھے۔ بعد کو جب ولید بن عقبہ ایک خاص بدنامی کی وجہ سے ہٹائے گئے تو ان کی جگہ سعید بن العاص کو گورنر مقرر کیا جو بنو امیہ میں سے تھے۔ مصر میں عمر بن العاص کو جنھوں نے مصر فتح کیا تھا اور وہاں کی گورنری کے لئے بہت موزوں تھے، ہٹا کر عبداللہ بن سعد کو گورنر مقرر کیا جو حضرت عثمانؓ کے رضاعی بھائی تھے۔ اور ان تمام گورنروں کے عہد میں بنو امیہ اپنے اعزہ و اقربا کے لئے غیر معمولی اکرام سے کام لیتے تھے جس سے عام طور پر بنو ہاشم کو شکایت کا موقع مل گیا تھا۔ اسی کے ساتھ ایک بڑا اعتراض لوگوں کو یہ بھی تھا کہ حضرت عثمانؓ نے مروان بن الحکم کو جو ان کے نہایت قریب کے عزیز تھے، اپنا سکرٹری مقرر کر لیا تھا اور ان کا اتنا اثر تھا کہ تمام امور خلافت انھیں کی رائے سے طے پاتے تھے، حالانکہ ان کو کوئی دینی اہمیت حاصل نہ تھی۔ الغرض یہ تھیں وہ تمام باتیں جن کی بنا پر حضرت عثمانؓ کو "اقربا نواز" کہا جاتا ہے۔

اب دوسری تنقیح کی طرف آیئے کہ کیا حضرت عثمانؓ کی اقربا نوازی کوئی ایسا فعل تھا جس سے ان کی امانت و دیانت یا خلوص نیت پر حرف آسکتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ حضرت عثمانؓ نے امور خلافت و انتظام مملکت میں بنو امیہ کے درخور کے ذمہ دار تھے، لیکن سوال یہ ہے کہ انھوں نے ایسا کیوں کیا اس کے سمجھنے کے لئے خلافت فاروقی کی تاریخ کے کچھ اوراق پلٹنا پڑیں گے۔

یہ بات خود عمرؓ نے محسوس کر لی تھی کہ مفتوحہ علاقوں کے گورنروں میں خود سری کے آثار پیدا ہو چلے ہیں اور وہ بیباکی جو ابتداء اسلام میں پائی جاتی تھی کم ہوتی جا رہی ہے، لیکن حضرت عمرؓ کی حکمت عملی و دوراندیشی کی وجہ سے یہ بات آگے نہ بڑھنے پائی، جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے بھی بالکل وہی پالیسی اختیار کرنا چاہی جو حضرت عمرؓ نے اختیار کی تھی لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ آپ کے خلیفہ ہوتے ہی بنو امیہ کی بہت سی خواہیدہ تمنا بیدار ہو گئیں اور وہ آپ کی نیکی سے ناجائز فایدہ اٹھانے لگے۔ خود حضرت عثمانؓ کے سامنے کوئی سوال بنو امیہ اور بنو ہاشم کی تفریق و امتیاز کا نہ تھا اور آپ نے قصداً کوئی بات ایسی نہیں کی جس سے بنو امیہ کے ارادے بلند اور بنو ہاشم کے پست ہو جاتے۔ آپ اپنی طرح ہر مسلمان کو ایماندار اور صاف دل سمجھتے تھے اور چونکہ آپ خود بنو امیہ کے ایک فرد تھے اس لئے سمجھتے تھے کہ میرا اثر ان پر زیادہ ہوگا اور اگر انتظام ان کے سپرد کر دیا گیا تو بہتر طریق سے انجام دیں گے۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ سرداران بنی امیہ کو آپ سے اسی حد تک دلچسپی تھی کہ وہ آپ کی ذات سے فایدہ اٹھاتے رہیں، اس سے آگے انھیں حضرت عثمانؓ سے کوئی تعلق نہ تھا۔

آپ نے یہ عجیب بات لکھی کہ اگر خلافتِ عثمانی میں بنو امیہ پوری طرح برسر اقتدار آگئے ہوتے تو خلیفہ سوم کی شہادت نہ ہوتی حالانکہ شہادت ہی اس لئے ہوئی کہ بنو امیہ برسر اقتدار آگئے تھے اور لوگوں میں ان کے جور و ستم کی وجہ سے جو غصہ بڑھ گیا تھا اس کا نشانہ حضرت عثمانؓ کو بننا پڑا، اب رہی بنو امیہ کی دلچسپی حضرت عثمانؓ کے ساتھ سو اس کا حال یہ تھا کہ جب حضرت عثمانؓ پر دشمنوں کا زور چلا تو امیر معاویہ نے ایک لشکر کی مدد کیلئے روانہ کیا لیکن جب راستہ میں یہ معلوم ہوا کہ آپ شہید ہو چکے ہیں تو وہیں سے لوٹ گیا اور کوئی جذبہ طلبِ انتقام کا اس میں پیدا نہ ہوا۔

آپ نے اپنے دعوے کے ثبوت میں ایک جگہ شاہ عبدالعزیز صاحب کا بھی قول نقل کیا ہے، حالانکہ خود اسی سے پتہ چلتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے زمانہ میں کافی عزل و نصب سے کام لیا جس کو آپ تسلیم نہیں کرتے۔

آپ نے اسی سلسلہ میں عبداللہ ابن سبا کا بھی ذکر کیا ہے اور آپ کا خیال ہے اسی کے پروپیگنڈے نے لوگوں کو حضرت عثمانؓ کا مخالف بنا دیا تھا اور بنو امیہ کے مظالم سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ حالانکہ یہ عثمانؓ ہی کے زمانہ میں اسلام لایا تھا اور بعد کو جب مذہبی جنون کا دورہ اس پر پڑا تو "رسول اللہؐ کی رجعت" کا نظریہ پیش کرکے اس نے چند ساتھی پیدا کرلئے جن کا کوئی خاص اثر ممالک اسلامی میں نہ تھا۔ اس کی غیر اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ خود حضرت علیؓ نے جن کو وہ رسول اللہؐ کا وصی تسلیم کرتا تھا اسے منہ نہ لگایا اور مدائن کی طرف نکال دیا۔ حیرت ہے کہ آپ ایسے شخص کو تمام اضطراب و انتشار کا سبب بتاتے ہیں اور سرداران بنی امیہ کی امارت کو شیوں کو نظر انداز کر جاتے ہیں۔

(ب) آپ نے "ظہور خوارج" کے زمانہ کی تعیین میں بھی مجھ سے اختلاف کیا ہے اور عبداللہ بن سبا کو اس کا اصلی اصل قرار دیتے ہیں حالانکہ خوارج جنگ صفین کے بعد وجود میں آئے۔ حیرت ہے آپ عبداللہ ابن سبا کی ہستی میں ذہنی آزادی کی جستجو کرتے ہیں، حالانکہ وہ درجہ پست و پلید ذہنیت کا انسان تھا اور اسی لئے اس کی تحریک "رجعتِ رسول" جو تناسخ کی دوسری صورت تھی کامیاب نہ ہو سکی۔

(ج) میری مراد قصاید سے، قصاید کا ٹکنک ہے جو عرب شاعری میں شروع سے ایک سا چلا آرہا تھا۔ عرب شاعری کسی وقت سے بھی شروع ہوئی ہو لیکن ہم تک جو معلومات پہونچی ہیں وہ رسول اللہؐ سے صرف ۱۵۰ سال قبل تک کی شاعری سے تعلق رکھتی ہیں جو سب قصیدہ ہی کہلاتی ہیں۔ عربی میں ہر طویل نظم کو قصیدہ کہتے تھے۔ اس کا مادہ قصد ہے جس کے معنی ارادہ کرنے کے ہیں چونکہ ان نظموں سے شعراء کا مقصود یہ ہوتا تھا کہ وہ اپنے قبایل کی تعریف اور دوسرے قبایل کی ہجو کریں، اس لئے اس نوع کی نظموں کو وہ غرض بھی قصیدہ ہی کہتے تھے۔ ان سب کی ٹکنک ایک سی ہوتی تھی اور الفاظ کے ردوبدل کے سوا ترتیب میں کوئی فرق نہ ہوتا تھا۔ قصیدے کے تین حصے ہوتے تھے۔ پہلے حصہ میں عموماً وہ اپنی محبوبہ کی سرزمین کا ذکر کرکے اس پر آنسو بہاتا تھا، اس کے بعد وہ گیتا ہی سفر کی دشواریوں کا ذکر کرتے ہوئے اپنے اونٹ کی تعریف کرتا تھا، اخیر میں وہ قصیدہ کے اس حصہ پر پہونچتا تھا جو کسی کی مدح یا ہجو پر ختم ہوتا تھا کبھی کبھی وہ اس سلسلہ میں ایام عرب کے قصے بھی بیان کر جاتے تھے، لیکن ان کو بھی وہ قصیدہ ہی کہتے تھے۔ اس میں شک نہیں کہ اکثر شعراء نے اپنے قصاید کی ابتداء جذبات محبت ہی سے کی ہے، لیکن وہ تمام تر روایتی چیز ہے اور کسی شاعر کی انفرادیت اس سے نمایاں نہیں ہوتی۔ مرثیہ البتہ قصیدہ سے علحدہ چیز تھا لیکن اس کی ٹکنک بھی روایتی تھی۔

ابن رشیق کی زبردست انتقادی اہلیت سے آپ بھی واقف ہوں گے، پھر اس کی کتاب عمدہ اٹھا کر دیکھئے اور مجھے بتایئے کہ اس نے کتنے شاعروں کی جدت فن و بداعت شعری کی تعریف کی ہے۔

عشقیہ شاعری سے میری مراد خالص غزلیہ شاعری یا نغمات (گیتوں) سے ہے، جس سے ہر شاعر کی جذباتی انفرادیت نمایاں ہو سکے اور جو قصاید کی پامال راہ سے علحدہ ہو اور یہ چیز آپ کو اموی دورِ خلافت ہی کے بعض شعراء میں نظر آئے گی۔ مثلاً عمر بن ابی ربیعہ

حارث بن خالد، عبداللہ بن قیس الرقیات اور عبداللہ بن عمر العرجی -

ولید بن عبدالملک کے عہد میں دمشق میں جٹھ کر، رقاصہ اور خلیفہ کی بیوی سے اظہار عشق کرتا ہے اور اپنی جان کھو دیتا ہے - خود خلیفہ ولید اپنی سالی سلمٰی کے عشق میں مبتلا ہو کر نغمات محبت پیش کرتا ہے اور بدنام ہو جاتا ہے - شاعری کا یہ رنگ جو قصیدہ کی ٹکنک سے بالکل علٰحدہ محض نغماتی حیثیت رکھتا تھا، امویین ہی کے زمانہ میں پیدا ہوا - اس سے قبل شعراء عرب کے قصاید میں اگر کہیں کہیں اظہار عشق کیا جاتا تھا تو وہ بالکل ضمنی چیز تھی یا محض ایسے پس منظر کی حیثیت رکھتی تھی جو اصل نقش سے بعد کو بالکل بے تعلق نظر آتا تھا -

(د) یہاں تک تو آپ کے اعتراضات دلچسپ تھے اور میں نے دلچسپی سے جواب بھی دیا، لیکن آپ کے چوتھے اعتراض نے بدمزہ کر دیا - خود آپ ہی نے امرؤ القیس کے متعلق رسول اللہ کا یہ قول نقل کیا ہے کہ " ہو قائدہم الی النار " اور پھر یہ بھی فرماتے ہیں کہ رسول اللہ نے شعر و غنا کو پسند فرمایا ہے - علاوہ اس کے آپ نے شعر کی حمایت میں بخاری کی حیثیت تو پیش کر دی لیکن قرآن کا ارشاد " ما علمناہ الشعر " اور " الشعراء یتبعہم الغاوون " یاد نہ آیا - جایئے آپ بھی بخاری کے مارے ہوئے نکلے -

رعایتی قیمت

تصانیف نیاز فتحپوری

اعلانی قیمت

من و یزداں — مذہبی استفسارات و جوابات — جمالستان — نگارستان — شہوانیات -
مغہ ۲ مہ ۲ مہ ۲ مہ ۲

مکتوبات نیاز تین حصے — انتقادیات — حسن کی عیاریاں — مالہ و ماعلیہ — شہاب کی سرگزشت
عہ ۱۲ مہ ۲ مہ ۲ مہ ۲

فلاسفۂ قدیم — مذاکرات نیاز — فراست الید — مذہب — نقاب اٹھ جانے کے بعد —
عہ ۲ عہ ۲ عہ ۲ عہ ۲ ۸ ۲

میزان
مہ ۵ ۳

تمام کتابیں ایک ساتھ طلب کرنے پر معہ محصول صرف چالیس روپے میں مل سکتی ہیں

منیجر نگار لکھنؤ

داستانِ شاہین و کنجشک

ادارۂ فحاشی اور مرد

(ایک لڑکی کسبی ہوجانے کے بعد)

پہلا خط :-

نیاز صاحب ، سب کہتے ہیں کہ کسبی بُری ہے لیکن خدا کے لئے مجھے یہ بتلا دیجئے کہ ان کہنے والوں میں سے کتنے ایسے ہیں جنھوں نے اپنی زندگی میں کم از کم دو چار معصوم لڑکیوں کو کسبی نہ بنایا ہو، جائیے اور ان کی زندگیوں کو ٹٹول کر دیکھئے کہ ان کے چچا اور پھوپھی کی لڑکیاں، ان کے گھر میں آنے جانے والیاں، ان کے گھر کی خادمائیں، ان سے پڑھنے والی بچیاں ـــــ غرض کہ کتنی ہیں جن کو یہ "معصوم فرشتے" محبت اور خلوص کے نام پر، ادب و شاعری کے نام پر، نکاح و شادی کے نام پر، بلند ذوقی اور رومانیت کے نام پر، رشتہ داری اور قرابت کے نام پر، مستقبل کی خوشگوار توقعات کے نام پر ـــــ دن رات رومالوں، ناولوں، شب ناچوں، انگوٹھیوں اور ساریوں کے تحفے پیش کر کر کے "کسبی" بناتے رہتے ہیں !!

نیاز صاحب، کون ماں کے پیٹ سے افلاطون اور ارسطو بن کر پیدا ہوتا ہے ! لڑکی کا بھی یہی حال ہے۔ پھر اگر وہ خاموش، شرمناک اور بالکل سادہ ہو، داغ اور حلیل کے اشعار کو نہ سمجھتی ہو اور نہ پڑھتی ہو تو "تعلیم یافتہ" نوجوان کی نظروں میں وہ "منہ لگانے" کے قابل نہیں۔ اور اس لئے فطرتاً والدین کے کندھوں پر ایک مستقل عذاب ـــــ لیکن اگر وہ ذہین ہے، طباع ہے، چست و چالاک ہے تو پھر اس کا وہ حشر ہوتا ہے جو ابھی عرض کیا گیا۔

نیاز صاحب، میں اپنی داستان لے کر بیٹھنا نہیں چاہتی لیکن اتنا کہوں گی کہ مجھے میری زندگی کے بارھویں سال سے جس نے "کوٹھوں" پر بھیجنے کے لئے طیار کیا وہ میرا "روحانی باپ" تھا اور میرا "خالہ زاد بھائی" ـــ میرے سامنے زندگی کو جس طرح پیش کیا گیا اسی طرح سمجھنا چاہئے تھا۔ حتیٰ کہ خواب ختم ہوا، آنکھ کھلی اور میں تنہا تھی !!

مسجدوں کے مُلّا، کالجوں کے طلبہ، اخباروں کے اڈیٹر، ادیب، انشا پرداز، شاعر، واعظ، بڑے اور چھوٹے ـــــ سب چاہے آپس میں کتنے ہی مختلف الخیال کیوں نہ ہوں لیکن "عورت" کو درجہ بدرجہ اس انحطاط تک پہونچانے میں ایک حیثیت سے ایک دوسرے کے شریک ہیں۔

نیاز صاحب ، کسی کو بُرا کہنے والے کبھی اپنے دل پر ہاتھ رکھ کر یہ بھی غور کرتے ہیں کہ ان کے قبا کے دامن میں کتنی کسبیاں چھپی ہیں اور یہ معصیت سے روکنے والے راست کردار، کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر یہ بھی دیکھتے ہیں کہ وہ دن رات کتنی لڑکیوں کو (حسبِ استطاعت) اپنی نظروں، گفتگوؤں، شعروں، مضمونوں اور خطوں سے دن رات زینت آغوش بنانے کی سعی کرتے رہتے ہیں ـــــ خدا کی قسم یہ جھوٹے ہیں، اگر ان کا بس چلے تو پہلے سے ساری کائنات کو لڑکی بنا دیں اور پھر ہر لڑکی کو کسبی۔

نیاز صاحب، آپ خفا ہوں گے کہ ایک لڑکی اور اتنی منہ پھٹ، لیکن آپ کو کیا معلوم کہ میں نے کتنی مرتبہ آپ کو خط لکھنے کا ارادہ کیا اور پھر نہ معلوم کن کن چیزوں سے ڈر کر رُک گئی۔ اور اب جو لکھ رہی ہوں تو کتنی رُک رُک کر۔

نیاز صاحب، آپ کسی طرح میری حالت کا صحیح تصور نہیں کر سکتے۔ دُنیا کا ہر قریب و بعید انسان ہم کو کسی نہ کسی طرح "کھانا چاہتا ہے" اور پھر کھا لینے کے بعد ہم سے اس لئے نفرت کرتا ہے کہ اس نے ہمیں کیوں کھایا۔"

(نگار) جس حد تک آپ کے ذاتی حالات و واقعات کا تعلق ہے میں سوا اس کے کیا عرض کر سکتا ہوں کہ یقیناً آپ پر بہت ظلم کیا گیا، لیکن سوال یہ ہے کہ ان تمام بلند شریفانہ احساسات کے نشو و نما پانے کے بعد آپ نے عملاً احتجاج کی کوئی صورت اختیار کی یا نہیں اس میں شک نہیں کہ ایک انسان کسی مخصوص ماحول میں عرصہ تک زندگی بسر کرنے کے بعد کچھ ایسا مجبور ہو جاتا ہے کہ اُس ماحول سے علٰحدہ ہونے کی جرأت اس میں باقی رہتی ہے اور نہ سوسائٹی کی طرف سے ہمت افزائی ہوتی ہے، تاہم انسانی آبادی میں اگر سو شیطان ہیں تو دو چار انسان بھی مل جاتے ہیں اور متعدد مثالیں اس امر کی ملیں گی کہ آپ سا احساس رکھنے والی عورتوں کا جواب کافی ایثار و بہادری سے دیا گیا، بہرحال یہ آپ کے مخصوص حالات ہیں اور ان کے متعلق میں یا کوئی کیا کہہ سکتا ہے جب تک پورا علم نہ حاصل ہو۔ لیکن اس میں کلام نہیں کہ سوسائٹی کی عام اخلاقی حالت کا جو اندازہ آپ نے کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور پیشہ ور عورتوں سے کہیں زیادہ قابل الزام وہ مرد ہیں جو بظاہر نہایت مہذب و شائستہ، حد درجہ شریف و نستعلیق نظر آتے ہیں، لیکن اپنے اخلاق کے لحاظ سے حقیقتاً وہ بھیڑئے ہیں جو بھیڑ کی کھال اوڑھے ہوئے آہستہ آہستہ سماج میں ہلاکت پھیلا رہے ہیں۔

اس میں شک نہیں کہ مرد، عورت کا تعلق بالکل فطری چیز ہے اور چونکہ اس تعلق میں مرد کے اندر قدرتاً ایک ہلکی سی کیفیت عجز و افتادگی کی پیدا ہوتی ہے، اس لئے آن نہیں، بلکہ عہدِ وحشت ہی میں مرد نے اپنی اس جذباتی کمزوری کو اپنی جسمانی قوت سے پورا کرنا چاہا اور باوصف اس کے کہ اس کی روح عورت کے لئے یکسر التماس و سوال تھی، اس نے اپنے اعصاب کی قوت، ہاتھ پاؤں کی مضبوطی، اور پھاڑ کھانے والی جسمانی طاقت کا مظاہرہ کر کے، اپنے اس عجز کو کبھی عورت پر ظاہر ہونے نہیں دیا اور اس کے اندر ہمیشہ یہ غلط احساس پیدا کیا کہ وہ مرد کی حفاظت کی محتاج ہے، اور تنہا کچھ نہیں کر سکتی۔

اس کے بعد جب ذہنی و تمدنی ترقی وسیع ہوئی تو مرد کا یہ احساس بھی اس کے ساتھ بڑھتا رہا لیکن اس فرق کے ساتھ کہ پہلے عورت کو مجبور و پابند رکھنے کے لئے کوئی خالص قاعدہ نہ تھا، اور اب اس نے عورت کو شکنجہ میں کس نے اور اپنے آپ کو آزاد رکھنے کے لئے آئین و قانون وضع کرنے شروع کئے۔

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ قرونِ ماضیہ میں ایک زمانہ ایسا بھی گزرا ہے جب عورت برسرِ اقتدار تھی اور کہا جاتا ہے کہ اس کا ثبوت ان دیویوں کا وجود ہے جو عہدِ قدیم کے صنمیات میں پائی جاتی ہیں۔ لیکن میرے نزدیک یہ قیاس درست نہیں۔ کیونکہ عہدِ وحشت کے مرد کا، دیوی کی پرستش کرنا حقیقتاً صرف احساسِ عجز کے بنا پر تھا جو فطری طور پر عورت کے مقابلہ میں اُس کے اندر پایا جاتا تھا، لیکن جس حد تک کاروبارِ دنیا کا تعلق ہے اس نے ہمیشہ اپنی ہی پرستش عورت سے کرائی اور اپنی خواہشات کے مقابلہ میں اس کے جذبات کی کبھی پروا نہیں کی۔ عورت کی رضامندی حاصل کئے بغیر اس کو بیوی بنا لینا، ایک ہی وقت میں متعدد مردوں سے تعلق رکھنے پر مجبور کرنا، جب چاہنا چھوڑ دینا اور جب جی میں آئے قیمت ادا کر کے دوسری عورت لے آنا، اور اس سے بھی زیادہ مال بہن کی تمیز اٹھا دینا، یہ سب مرد ہی کے قابلِ فخر کارنامے ہیں اور تاریخ عالم میں کوئی زمانہ عورت پر ایسا نہیں گزرا جب خود اس نے ان بدتمیزیوں کی ابتدا اپنی طرف سے کی ہو۔ اس کے ساتھ طرفہ تماشہ یہ ہے کہ پہلے تو خود اسی نے عورتوں کی آبروریزی کی خود ہی ان کو عصمت فروشی پر مجبور کیا۔ اور پھر انکو حقارت کی نظر سے دیکھنے لگا۔

آج مرد "ادارۂ نسواں" کو انسانیت کے لئے ذلت و لعنت قرار دیتا ہے، مالی تباہیوں کا ذمہ دار پیشہ ور عورتوں کو قرار دیتا ہے۔ گرد و بیماریوں اور نسلی خرابیوں کا سبب کسبیوں کو ظاہر کرتا ہے، لیکن اس حقیقت سے بے خبر ہے کہ یہ لعنت اسی کی لائی ہوئی ہے، یہ بربادیاں اسی کے ہاتھوں نے پیدا کی ہیں اور یہ جسمانی و اقتصادی خرابیاں خود اسی کے وحشیانہ جذبات کا نتیجہ ہیں۔ اگر آج کالی شخص اس تحقیق میں کامیاب ہو جائے

کہ دنیا میں کس مخصوص خاندان یا قبیلہ سے فحاشی کی ابتدا ہوئی تو یقیناً اس خاندان یا قبیلہ کی سب سے پہلی وہ عورت جس نے اول اول فحاشی کو متعدد کی ہوگی وہی ہوگی جسے پہلے مرد نے خراب کیا ہوگا اور پھر بعد کو غارتِ حسن و شباب کے بعد ذلت کی زندگی بسر کرنے کے لئے گھر سے باہر نکال دیا ہوگا۔

ایک معلم اخلاق احتجاج کرتا ہے کہ کسبیوں کے وجود سے دنیا کو پاک کر دینا چاہئے، لیکن اگر ہمارے کان ہوں تو ہم سنیں کہ عورت کی فریاد کیا ہے اور وہ کس کس طرح مرد سے پناہ مانگ رہی ہے جبکہ اسے کبھی بلینے اور کبھی رہنے پر مجبور کر دیا ہے۔ ایک ڈاکٹر شہر قوم کے نوجوانوں کی بیماریوں کا سبب پیشہ ور عورتوں کو بتا کر ان کے فنا کر دینے کا مشورہ دیتا ہے۔ حالانکہ اصولاً وہ خود مردوں کے مٹا دئے جانے کا مطالبہ کر سکتی ہیں جنہوں نے ان کو یہ تمام بیماریاں لگائیں اور جو تمام تر ان کی اور اپنی خرابیٔ صحت کے ذمہ دار ہیں۔

آپ نے اس باب میں جو کچھ لکھا ہے اُس سے مجھے حرف بحرف اتفاق ہے، اور اس میں مطلقاً شک کی گنجایش نہیں کہ وہ لوگ جو آج عمر ڈھل جانے کے بعد اپنے آپ کو بڑا پُرجوش معلم اخلاق کہتے ہیں، حقیقتاً وہی ہیں، جن کی جوانی سب سے زیادہ ناپاک بسر ہوئی ہے اور جنہوں نے خالقاہوں کے حجروں میں بیٹھ کر تختۂ بازار پر بیٹھنے والی کسبیوں سے زیادہ ادارۂ فحاشی کے رواج میں مدد دی ہے۔

بہرحال ماضی کے استبداد نے جو طرح جور و ستمرانی کی ڈالی ہے اس کے اثرات تو اب مٹ نہیں سکتے اور یہ ناممکن ہے کہ وہ مرد جو پہلے علانیہ عورت کی عصمت کو خراب کر دیتا تھا، اب چوری چھپے بھی یہ حرکت نہ کرے، لیکن اس دور میں ایک انقلاب ضرور آنے والا ہے جو یقیناً فحاشی کا محو کرنے والا تو نہ ہوگا، لیکن اس کی نوعیت کو بدل کر مرد سے اس کی گزشتہ تخریب اخلاق کا انتقام عورت کی طرف سے لیکر رہے گا۔

عورت جب تک جاہل تھی، نہ وہ اپنے جائز حقوق سے آگاہ تھی نہ ان عطایا و فطرت سے جو مرد ہی کی طرح اس کی خلقت میں بھی ودیعت کئے گئے تھے۔ لیکن اب کہ وہ اپنی اہمیت اور اپنی دماغی صلاحیت سے واقف ہو گئی ہے وہ مرد سے بے نیاز ہوتی جا رہی ہے اور اپنا وجود علٰحدہ قایم کر کے مرد کے جذبات اسی طرح ٹھکرا دے گی، جس طرح اب سے قبل مرد کیا کرتا تھا۔

مجھے نہیں معلوم نہ آپ کو کبھی جدید تعلیم یافتہ عورت کے مطالعہ کا موقع ملا ہے یا نہیں، لیکن بدقسمتی یا خوش قسمتی سے چونکہ مجھے روزانہ اس کی فرصت نصیب ہو جاتی ہے اس لئے میں جانتا ہوں کہ وہ مرد سے گزشتہ مظالم کا انتقام کس کس طرح لے رہی ہے اور وہی مرد جو پہلے عورت کی نراسی بدعنوانی پر تیغ خارا شگاف لے کر کھڑا ہو جاتا تھا اب اس کے سینہ پر عورت کیسی کیسی چھریاں چلا رہی ہے اور وہ ہے کہ خون کے سے گھونٹ پی پی کر رہ جاتا ہے۔ اس نے مرد کے بنائے ہوئے قانون و اخلاق کو پارہ پارہ کر کے رکھ دیا ہے، اس نے مرد کے تراشے ہوئے آئینِ شرم و حیا کو ٹھکرا کر اس کے منہ پر کھینچ مارا ہے اور اب وہ مرد کے کام و دہن کو ان تمام تلخیوں کے گوارا کرنے پر مجبور کر رہی ہے جو کسی وقت عورت کو گوارا کرنے پڑے تھے ـــ الغرض اب عورت آزاد ہے، جسمانی و اخلاقی دونوں حیثیتوں سے، پہلے وہ مرد کا کہا ماننے پر مجبور تھی کیونکہ کسب معاش میں اس کا کوئی حصہ نہ تھا، لیکن اب کہ وہ مردوں کے دوش بدوش ہر کام پر آمادہ ہے اور اپنی پردہ داری کی بندشیں علٰحدہ کر چکی ہے، اپنا قانون، اخلاق و معاشرت خود علٰحدہ بنائے گی اور مرد کو اس کی پابندی پر مجبور ہونا پڑے گا، خواہ اس کو کتنا ہی "جو بر تقیب" کے صدمے کیوں نہ اٹھانا پڑیں ـــ پھر آپ کو معلوم ہے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوگا ـــ جب عورت کی آزادی کی انتہا ہو جائے گی جب سارا عالم موجودہ اخلاق کے لحاظ سے یکسر ادارۂ فحاشی ہو کر رہ جائے گا، جب عورت کی وفاداری و عصمت کا مفہوم سوا اس کے کچھ نہ ہوگا کہ وہ کسی کی طرف مائل ہے اور کسی کی طرف نہیں ـــ اُس وقت مرد مجبور و ذلیل مرد، اخلاق و معاشرت کا ایک جدید قانون مرتب کرے گا، جس میں یہ نہ ہوگا اور رواج کوئی چیز رہے گا، نہ نفسِ وجدان "دنیا ایک فردوس ہوگی" "خیالی" نہیں، "عملی" اس کی ہیئت اجتماعی ہو جائے گی ـــ جہاں عورت مرد کے ساتھ کھیتی رہے گی جب تک اس کا جی چاہے اور مرد عورتوں کے ساتھ کھیلتا رہے گا جب تک عورت اس کی اہانت سے کچھ اس زندگی کے جدید نظریے قایم ہوں گے، بہت سی نفسیاتی پیچیدگیوں کا وہاں پتہ نہ چلایا جائے گا ـــ اور ـــ ہر چند اس وقت بھی مرد میں اتنی جرأت تو نہ ہوگی کہ وہ اپنی عورتوں کو کسی کہہ سکے، لیکن کسبیوں کے سامنے اپنی آغوش کھول کر یہ کہنے میں وہ تکلف و دریغ نہ ہوگا کہ :-

"بیا بیا عزیزی تو ز خاصگان مائی"

دوسرا خط :-

نیاز صاحب ! - آپ کی تحریر سے ایک خاص قسم کا عتاب ٹپکتا ہے - مجھے افسوس ہے کہ میں کیوں آپ کے لئے وجہ تفکر بنی - آپ کو نہ آئے یا نہ آئے لیکن خدا کی قسم میں نے آپ کو جو کچھ لکھا تھا وہ صرف میرے دل کی تڑپ تھی - جو بے ساختہ قلم سے نکل پڑی تھی - زندگی میں ایسی حماقتیں سرزد نہ ہوں تو قسمت کو کون روئے -

نیاز صاحب ! آپ فرماتے ہیں کہ میں اپنا نقاب چاک کر کے دوسری جنس کو تلافی کا موقع دوں - لیکن خدا را مجھے یہ بتلا دیجئے - کہ کیا ان "ہمدردوں" کے لئے ہندوستان کے کروروں کمزور بے زبان متحرک مجسموں میں صرف ایک میں ہی ہمدردی کی مستحق رہ گئی ہوں - للہ ان سے پوچھئے وہ اپنے شہر، اپنے محلے، اور اپنے گھر میں ان بیسیوں تڑپتی ہوئی لاشوں کی طرف نظر کیوں نہیں کرتے جو صرف انھیں کی بے اعتنائیوں اور کم نگاہیوں کا شکار بنی موت کی سسکیاں لے رہی ہیں - ؟ ـــــ وہ ہزاروں شوہر جنھوں نے اپنی نظر التفات کا جائز یا ناجائز مرکز دوسری عورت کو بنا کر ایک معصوم مورتی کو رُلا رکھا ہے - وہ بے شمار نوجوان جو سینکڑوں جھوٹے وعدوں کے ساتھ عورت کا سب کچھ لوٹ کر بے اعتنائی کے ساتھ احباب کی مجلسوں میں بیٹھے سرگرم عشرت ہیں - وہ ہزاروں "بلند ذوق" لڑکے جو مقصود حاصل کرنے کے بعد والدین کی اطاعت اور اخلاق کی پاکیزگی کی لڑی میں اپنے شکار کو تڑپتا چھوڑ چکے ہیں - وہ بیسیوں بلند حوصلہ طلبہ جو ادیبانہ انداز سے تقریر و تحریر میں اپنے اسیروں کو لوٹ چکنے کے بعد تعلیمی مشغولیت کے پردے میں شادی سے ہمیشہ کے لئے انکار کر چکے ہیں ـــــ ہاں تو یہ سوسائٹی کے "ہونہار سپوت" اگر تلافی کے خواہاں ہیں، تو اُٹھ کر اپنی غلطیوں کا جائزہ کیوں نہیں لیتے ؟

نیاز صاحب ! میں اپنی زندگی سے بیزار ہوں - لیکن قاضی عبدالغفار صاحب کی "لیلیٰ" کی طرح اس لئے نہیں کہ میں کسی ایک مرد سے متعلق ہو کر کئی بچوں کی ماں کیوں نہ بنی - بلکہ صرف اس لئے کہ آخر یہ مرد مجھے اپنی طرح کا انسان کیوں نہیں سمجھتے ؟

نیاز صاحب ! کتنے ہیں ایسے ادیب - انشا پرداز - لیڈر - اڈیٹر اور اخبار نویس جو بندو نصائح کے دفتر کے دفتر دن رات کھولتے رہتے ہیں - جو بلند سے بلند سوسائٹی کے مہذب رکن بنے پھرتے ہیں - جو لوگوں کی نظروں میں عزیز ہیں - حالانکہ اُن کے چنگل کا ہر ناخن بے گناہ لڑکیوں کے خون سے رنگین ہے - پھر آپ کہتے ہیں کہ یہ ان کا ذاتی فعل ہے - جو اُن کے لیڈرانہ فرایض سے علیحدہ ہے - اُن کی ان دونوں زندگیوں کو نہ ملاؤ -

نیاز صاحب ! لوگ کسبی کو صرف اس لئے بُرا کہتے ہیں کہ اسے چند چاندی کے ٹکڑوں اور جھوٹے آنسوؤں سے مرعوب کر کے اپنی کنیز نہیں بنا سکتا اور برخلاف اس کے ایک "معصوم" لڑکی جھوٹی محبت ہی کے فریب میں آکر گردن ڈال دیتی ہے -

نیاز صاحب ! میں کہنا تو نہ معلوم کیا کیا چاہتی ہوں - لیکن ڈرتی ہوں ـــ آپ سے اور سب سے ـــ اپنی زندگی کا ایک ورق بھیج رہی ہوں - اس کے بعد آپ مجھے مُردہ سمجھیں -

میری زندگی کا ایک ورق

مجھے اُن سے شرم آتی تھی - میں ان سے چھپی چھپی پھرتی تھی - مگر جب ان کو موقع ملتا وہ میری کتاب میں خط چھپا جاتے - آخر میری خاموشی کو دیکھ کر ایک دن ایک مختصر سا پرچار کو سوتے وقت وہ میرے پاس پھینک گئے - لکھا تھا - "جب میری زندگی کی بہار مجھ سے بیزار ہے - میری تمناؤں کی دیوی مجھ سے کنارہ کش ہے - تو پھر میں کیوں زندہ رہوں - صبح آپ میری لاش دیکھیں گی" مجھے اس وقت کیا خبر تھی کہ اس قسم کے دعوے محض کمزو فریب کا نتیجہ ہوتے ہیں - میرا دل دھڑکنے لگا - میں گھبرا کر اٹھی - کمرہ میں ٹہلتی رہی - پھر چپکے ان کے کمرہ کی طرف گئی - وہ لکڑی پر سر رکھے بیٹھے تھے - میں واپس چلی آئی - کئی دفعہ گئی اور واپس آگئی - بالآخر بارہ بجے کے قریب میں دل سخت کر کے ان کے کمرہ میں داخل ہوئی - انھوں نے سر اٹھا کر مجھے دیکھا - میں نے کہا، - "کیا ارادہ ہے ؟" اُن کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے - کھڑے ہو گئے - ایک کاغذ [illegible] لگا - وہ سنکھیا ہے یہ نہ سمجھتی ہوگی ..... " بہت سے ادیبانہ جملے دُہراتے رہے - میں دم بخود میز سے ٹیک لگائے کھڑی تھی - وہ اٹھے - کواڑ بند کئے

اور میرا بازو پکڑ کر کہنے لگے۔ "میری معبودہ ....." میں بیٹھ گئی۔ میں آہستہ آہستہ ان کی ہو رہی تھی۔ میری آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی جاری تھی۔ بالآخر میں واپس آئی تو اپنی کائنات انھیں سونپ چکی تھی۔

لیکن چند دن بعد ہی مجھے دُنیا بدلتی نظر آنے لگی مجھے ان کے طرزِ عمل پر شبہ ہونے لگا تھا۔ میں نے ان سے شکایت کی۔ لیکن انھوں نے بات ٹال دی۔ لیکن جب میں نے واقعات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ تو میرا دماغ کھولنے لگا۔ میں نے اُن سے شکایت کی۔ بولے: "یہ زندگی کی روانی ہے۔ تم مجھ سے بدگمان کیوں ہوتی ہو" لیکن اب آندھی اُتر چکی تھی۔ بادل رفتہ رفتہ چھٹ رہے تھے۔

..... میں نے اس زندگی کو چھوڑا یا اس نے مجھے۔ یہ ایک لمبی سی گفتگو ہے۔ لیکن مجھے اس حادثہ کی خبر نہ تھی۔ اس دن "صاحب" سے سخت گفتگو ہوئی۔ دوسرے دن تھانیدار صاحب تشریف لائے۔ فرمانے لگے۔ "آپ کون ہیں؟"

میں نے کہا: "میں اس وقت تک جواب دینا نہیں چاہتی جب تک آپ مجھے یہ نہ بتلا دیں کہ آپ کے اس سوال کا مدعا کیا ہے؟"

بولے: "میں پوچھتا ہوں تم کون ہو۔ کہاں سے آئی۔ تمھارے ساتھ کون ہے؟"

اُس نے سوالات کا تانتا باندھ دیا۔ اس کی آواز میں بتدریج خشونت پیدا ہو چلی تھی۔ میرے جسم کا ریشہ ریشہ کانپنے لگا۔ میں نے سمجھ لیا شاید میری موت کی ساعت قریب آگئی ہے۔ میں سکتہ کے عالم میں اس کا منہ تکنے لگی۔ وہ پھر بولا:۔

"اچھا عیاشی کرنا ہے تو" ..... "میں جاؤ۔ یہاں رنڈیاں نہیں رہ سکتیں۔ چوبیس گھنٹہ میں یہاں سے چلی جاؤ۔ ورنہ کوتوالی میں بیٹھی نظر آؤ گی۔"

میرے حواس گم ہو گئے۔ میرے لئے زندگی میں پہلا موقعہ تھا کہ اس طرح ڈانٹی جاؤں۔ میں نے سہمی ہوئی آواز میں کہا:۔ "لیکن آپ مجھے سمجھ کیا رہے ہیں؟"

بولا:۔ "جو کچھ آپ ہیں۔ سب کو معلوم ہے۔ میں نے جو کچھ کہہ دیا ہے اس سے آپ کے لئے مفر نہیں ہے۔"

اس کے بعد میں نے پہلی ٹرین سے "ب" کو تو ضرور چھوڑ دیا۔ لیکن میرے لئے غور و فکر کی ایک بالکل نئی شاہراہ کھل گئی۔ راستہ بھر اسی اُدھیڑ بن میں لگی رہی کہ کہاں جاؤں اور کیا کروں۔ سوچتی تھی کہ آج یہ ماجرا کیا ہے۔ میں نے ایک مرتبہ بھی علانیہ طور پر اپنی متاع کو بازار میں نہیں لیکن پھر بھی میرے اوپر یہ عتاب۔ لیکن اس سوال کا میرے پاس کوئی جواب نہ تھا۔

میرا سب سے بڑا گناہ یہ تھا کہ میں نے شادی کیوں نہیں کی۔ میں نے کہا کہ "دنیا کے بڑے بڑے انسان غیر شادی شدہ ہیں"۔ بولے: "مگر عورت کے لئے یہ جائز نہیں"۔ میں نے کہا "کیوں؟"۔ بولے، "اسی لئے کہ وہ عورت ہے"۔ میں نے کہا: "تو عورت کا سب سے جرم اس کا عورت ہونا؟" بولے "ہاں"۔

اس پر میں کیا کہتی۔ وہ خفا ہو کر چلے گئے۔ اور میں دیر تک سناٹے میں بیٹھی رہی۔

(نگار) آپ نے جن واقعات و حالات کو اپنے "ورق زندگی" کے نام سے پیش کیا ہے۔ اُن کے متعلق تو مجھے کچھ نہیں لکھنا سوا اس کے کہ اگر آپ کی موجودہ معاشرت و معیشت حقیقتاً نتیجہ ہے اس اولین فریب کا جو جھوٹی محبت کے جھوٹے آنسوؤں کے پردہ میں آپ کو دیا گیا تو میں کیا ساری دُنیا کو آپ سے ہمدردی ہوگی۔ درآنحالیکہ دنیا میں ایسے واقعات بھی مل سکتے ہیں کہ مرد نے جس عورت کو گلے کا ہار بنایا اسی نے ناگن بن کر اُس کو ڈس لیا۔ لیکن سوال اس وقت تو صرف یہ ہے کہ اب جبکہ اپنی موجودہ زندگی کی تلخیوں کو آپ اچھی طرح محسوس کر رہی ہیں۔ کیوں اس کے چھوڑنے پر آمادہ نہیں؟ اگر اس سے مقصود مرد سے

اختتام ہی لینا ہے تو مجبوری ہے۔ ورنہ محض سوسائٹی کے رسم و رواج کو نباہنا بنانا کسی طرح درست نہیں ہو سکتا۔ جبکہ ہزاروں بار یہ رواج اس سے قبل توڑا جا چکا ہے اور آئندہ بھی برابر ٹوٹتا رہے گا، اگر واقعی کوئی عورت محبت کا رشتہ جوڑنے کے لئے تیار ہے۔ رہا آپ کا تلخ تجربہ سو دنیا میں یہ کوئی نیا تجربہ نہیں، عورتوں سے پوچھئے تو وہ سو مثالیں ایسی ہی مردوں میں سے پیش کر دیں گی، اور مرد سے دریافت کیجئے تو وہ بھی ہزاروں مثالیں عورتوں کی پیش کر دے گا۔ لیکن بانہمہ عہد وفا کی استواری کا خیال دنیا سے مٹ نہیں سکتا۔ اور مٹے کیونکر جبکہ آپ کا مجھ سے کٹ کر کسی دوسرے سے مل جانا اس کا امکان بھی رکھتا ہے کہ آپ پھر اس سے کٹ کر مجھ سے مل رہیں ؎

زما گسستی و با دیگراں گرو بستی بیا کہ عہدِ وفا نیست استوار، بیا

انسان کی یہ فطرت ہے کہ وہ اپنی اذیت و تکلیف کو بہت زیادہ اہم سمجھتا ہے اور کبھی اس بات کو نہیں دیکھتا کہ دنیا کا کوئی تلخ واقعہ ایسا نہیں ہے جس سے تلخ تر کوئی اور پہلے نہ گزر چکا ہو۔ قدرت کا ترکش تیروں سے بھرا ہوا ہے۔ اور اسے یہ بھی خبر نہیں کہ کون تیر کتنا سم آلود ہے۔ آنکھ بند ہے اور تیر پر تیر چلیوں سے چھوڑے جا رہے ہیں۔ پھر یہ بھی ہوتا ہے کہ جس کو واقعی بہت زیادہ تڑپنا چاہئے، اس کو وہ صرف چھوتے ہوئے گزر جاتا ہے اور جو یونہی پہلے سے خراب خستہ ہے اس کا دل چھلنی کر کے رکھ دیتے ہیں۔ الغرض یہ ضرور نہیں کہ آپ کا دل سچی محبت کا طلبگار رہا ہو تو اس کو کمرو فریب سے کبھی واسطہ ہی نہ پڑے اور میں کہ یکسر مکر و فریب ہوں، مجھے کوئی سچی محبت کرنے والے کبھی ملے ہی نہیں۔ اس لئے اگر واقعی آپ کو کسی مرد کی بیوفائی کی طرف سے سخت صدمہ پہونچا ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ آپ مرد کی پوری جنس کو ایسا ہی نامعقول سمجھنے لگیں۔ کیونکہ اگر اس قسم کی دلیل سے کام لیا گیا تو پھر مردوں کو بھی عورت کی تمام صنف کو مکار و بے وفا سمجھنے کا حق حاصل ہوگا۔ درانحالیکہ آپ اور وہ دونوں ایسا سمجھنے میں غلطی کریں گے۔

ہر چند یہ ایک حد تک درست ہے کہ عورت کی لغزش کو ایک مرد مشکل سے معاف کرتا ہے اور خود اپنی لغزش کے متعلق وہ یہ چاہتا ہے کہ عورت اسے بھلا دے، گویا اگر نہ کرے۔ لیکن اگر آپ غور کریں گی تو معلوم ہوگا کہ مرد کا تفوق اسی کا مقتضی ہے اور مظلوم کا احتجاج ایک فطری کیفیت ہمیشہ بے معنی ہوا کرتا ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مرد کا یہ سلوک عورت کے ساتھ درست ہے۔ لیکن وہ درست ہو یا نادرست اس کا علاج عورت کے پاس کچھ نہیں۔ اور اسے یہ تمام مظالم برداشت کرنا پڑیں گے، جب تک وہ ہر چیز میں مرد کے برابر نہ ہو جائے۔ اور مرد سے بے نیاز ہو کر وہ دنیا میں اتنی ہی ترقی نہ کر لے جتنی مرد نے کی ہے۔ خیر۔ یہ تو وہ باتیں ہیں جو خواہ مخواہ آپ کی تحریر کو دیکھ کر زبان سے نکل گئیں۔ اصل معاملہ تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ آپ نے اپنے خط میں جو کچھ لکھا ہے وہ کس حد تک مناسب ہے اور اس میں آپ نے اپنا کیا فایدہ سوچا ہے

آپ نے میرے جواب میں عتاب و سرزنش کا انداز محسوس کیا، درانحالیکہ یہ بالکل خلاف حقیقت ہے۔ باور کیجئے کہ آپ کیا دنیا کی ہر عورت خواہ وہ کسی طبقہ و درجہ سے متعلق ہو۔ انفرادی طور پر میری برہمی کے حدود سے بہت بلند ہے اور آج تک میری زندگی میں کوئی ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا کہ کسی عورت کی طرف سے جذبۂ غضب و انتقام کی پرورش میں نے اپنے دل میں کی ہو۔ میں عورت سے محبت نہیں بلکہ اس کی پرستش کرتا ہوں اور اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہوں کہ نوعِ انسانی کی نجات صرف عورت ہی کی اصلاح پر منحصر ہے۔ اس لئے یہ تو ہو سکتا ہے کہ فرطِ تاثر سے کوئی بات ایسی منہ سے نکل جائے جسے آپ زیادہ سے زیادہ "واسوخت" کہہ سکیں۔ لیکن غصہ و برہمی کا اظہار تو مجھ سے اس وقت بھی ممکن نہیں جب وہ اوروں کے نزدیک فرض کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔

آپ کی تحریر سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ کے ساتھ جو ہمدردی لوگوں کو پیدا ہوئی ہے آپ اس کے قبول کرنے کے لئے طیار

نہیں ۔ بہتر ہے آپ قبول نہ کیجئے ۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جو چیز آپ کو پسند نہیں وہ دُنیا کی اور تمام عورتوں کے لئے کیوں پسند فرمائی ہے اور آپ کیوں ساری دُنیا کی عورتوں کا درد اپنے دل میں لئے ہوئے کُڑھ رہی ہیں ۔ جبکہ آپ کو یقین ہے کہ نہ مرد کبھی اپنی مکاری سے باز آنے والا ہے اور نہ عورت ، باوجود اتنی تعلیم و فراست کے فریبِ محبت میں مبتلا ہونے سے اپنے آپ کو بچا سکتی ہے یاد رکھئے جس وقت تک عورت میں یہ احساس باقی ہے کہ مرد کوئی ایسی چیز بھی دے سکتا ہے جو عورت کے پاس نہیں ہے اور جب تک مرد کو عورت کی اس کمزوری کا علم ہے ۔ یہی ہنگامہ قایم رہے گا اور سچ پوچھئے تو کائنات کی رونق اسی پر قایم ہے ۔ اگر آج دُنیا میں کوئی مرد یہ کہنے والا باقی نہ رہے کہ " میں تم پر جان دیتا ہوں " اور کسی عورت کی زبان سے یہ سننے میں نہ آئے کہ " میں تمہاری ہوں " ۔ تو آپ ہی بتائیے کہ آپ کا جی ایسی خشک دُنیا میں لگ سکتا ہے ۔ رہ گیا سوال مکر و فریب کا ۔ وفا یا عدم خلوص کا ، سو اس کے متعلق اب کیا کہوں سوا اس کے کہ یہ الفاظ بھی ہمارے ہی وضع کئے ہوئے ہیں ۔ اور ہمیں نے ان کو ایک خاص مفہوم دے رکھا ہے ۔ ورنہ فطرت کا تو یہ حال ہے کہ اگر وہ ایک قزاق کی خون آلود تلوار کو دیکھ کر قہقہہ لگاتی ہے ، تو ایک بیکس و مظلوم کی آہ و زاری سن کر بھی مسکرانے سے باز نہیں رہتی ۔ ہماری سوسائٹی ہے اور ہمیں نے کچھ قوانین اس کے وضع کر لئے ہیں ۔ پھر اگر ہم ہی ان کو توڑ دیں تو شکایت کی کونسی بات ہے ۔ یہ شکست و ریخت ۔ یہ تعمیر و تخریب تو برابر اسی طرح جاری رہے گی اور قدرت کو کیا غرض پڑی ہے کہ وہ کرۂ ارض میں " کرۂ بیاہی ملاء اعلیٰ " کو بسا کر اپنی تفریح کھو بیٹھے ۔ اگر وہ " سخن نسبح بحمدک " سے خوش ہوتی تو باوجود اس علم اور پیشین گوئی کے کہ انسان بجز فساد اور خون بہانے کے دُنیا میں اور کچھ نہ کرے گا ، کیوں اس کو دُنیا کی آبادی کے لئے منتخب کرتی ۔ آپ کو معلوم ہوگا جب خدا نے انسان کو اپنا خلیفہ بنا کر بھیجنے کا مقصد ظاہر کیا تو فرشتوں نے یہی کہا تھا کہ اس کے مستحق تو ہم ہیں ۔ جو رات دن تیری حمد و ثناء میں مشغول رہتے ہیں ۔ نہ کہ انسان جو بجز فتنہ و فساد کے کچھ نہ کرے گا ۔ اس اعتراض کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ " انی اعلم مالا تعلمون " یعنی تم اس کو کیا جانو ۔ مجھے معلوم ہے کہ ایسا کیوں کیا جاتا ہے ۔ معلوم نہیں مفسروں نے اس کو کیا سمجھا اور کیا بیان کیا ہے ۔ لیکن میں اس " کیوں " کا مفہوم صرف یہی قرار دیتا ہوں کہ دُنیا کی رونق اور کائنات کی چہل پہل فتنہ و فساد ہی پر قایم ہے ۔ معصیت و عدوان ہی سے وابستہ ہے ۔ اور " سبوح قدوس " سنتے سنتے شاید خدا کو بھی یہ خیال پیدا ہوا کہ " دیکھوں تو سہی مجھ سے سرتاپا بیان کرنے والے کیا کیا دلچسپ حرکتیں کرتے ہیں " ۔ اور ہو سکتا ہے کہ اپنے عفو و کرم کے مقابلہ میں " دریائے معاصی کی تنک آبی " کا تماشہ دیکھنا منظور ہو ۔ بہرحال اگر آپ یہ چاہیں کہ دُنیا میں جتنے مرد ہیں وہ مُجتہد و بایزید ہو کر رہ جائیں تو ناممکن ہے ، جبکہ ہر عورت رابعہ بصری ہونے کے لئے طیار نہیں ۔ جب تک عورتوں میں کلیوپیٹرا پیدا ہو سکتی ہے ۔ ان کو کوئی حق حاصل نہیں کہ وہ مردوں میں نیرو اور کالیگولا کی پیدایش پر اعتراض کریں ۔ اس لئے یہ شکوہ و شکایت بالکل بیکار بات ہے ۔ اگر آپ عورتوں کی مظلومیت کی تلافی مردوں سے چاہتی ہیں تو اس کی ترکیب یہ نہیں ہے کہ مردوں کے ہاتھ میں تسبیح و دیگر لوازمِ دین نمازیں پڑھوایا کریں ۔ کیونکہ اس کلیسوں میں وہ بہت زیادہ خونخوار ہو جاتا ہے ۔ بلکہ اس کی تدبیر صرف یہ ہے کہ عورتوں میں " لقمۂ تر " بننے کی صلاحیت کو کم کریں ۔ تاکہ وہ اُن کو آسانی سے نگل نہ سکے ۔ اور یہ صرف اس طرح ممکن ہے کہ یا تو آپ " اخلاق " کا مفہوم بدل کر اس کو ایسا کر دیں کہ عورت بجائے " لقمۂ تر " کے " لقمۂ خشک " بن جائے اور مرد کے لئے اس میں کوئی دلکشی و دلچسپی باقی نہ رہے ۔ یا پھر میدانِ عمل میں آ کر اتنی ترقی کر لیں کہ مرد کے ہاتھ باؤں توڑ کر ایک جگہ بٹھا دیں اگر یہ زیادہ مشکل ہے تو یہی سہی ۔

آپ نے یہ خیال بھی ظاہر کیا ہے کہ آیندہ آپ کسی قسم کی خط و کتابت نہ کریں گی ۔ اور یہ بھی تقاضا ہے کہ آپ کو مُردہ سمجھ لیا جائے ۔ سو معاف فرمایئے مجھے اس سے اتفاق نہیں ۔ کیونکہ آپ کو مُردہ سمجھنے سے دُنیا کی زندہ دلی ختم ہو جاتی

دائرہ کو تنگ کرنے کے لئے اسلام نے صرف انھیں لوگوں کو غلام بنانے کی اجازت دی جو اسیرانِ جنگ کی حیثیت سے ہاتھ آئیں اور جو نہ مسلمان ہوں، نہ جزیہ ادا کریں۔ ہر چند یہ صورت بردہ فروشی کی وسعت کو کم کرنے والی تھی لیکن پھر بھی مسلمانوں کی فتوحات کے ساتھ اس کو وسیع ہونا تھا۔ اور ہوئی، چنانچہ بعض جنگوں میں ایک ایک سپاہی کو سو سو غلام اور سو سو کنیزیں تقسیم ہوئیں اور امراء و سرداران کو ہزار ہزار۔ خلیفۂ ثالث حضرت عثمان ہزار غلاموں کے مالک تھے۔ اور واقعۂ ارک کے بعد ایک ایک درہم میں لونڈی غلاموں کو فروخت کیا گیا۔ غلاموں کی کثرت کا ایک سبب عہد اسلام میں یہ بھی تھا کہ بربر وغیرہ کے بعض ذمی، جزیہ کے عوض غلاموں ہی کو پیش کرتے تھے۔

اسلام نے ایک طرف غلامی کا دائرہ تنگ کرنے کی کوشش کی تو دوسری طرف ان کی تعلیم و تہذیب کی ہدایت کرکے سوسائٹی میں ان کے مرتبہ کو بلند کرنا چاہا۔ چنانچہ رسول اللہ کا ارشاد ہے:-

"من کانت لھا جاریۃ فعلمھا واحسن الیھا وتزوجھا کان لھا اجران"، اجر بالزواج والتعلیم واجر بالعتق۔

(یعنی اگر کوئی شخص اپنی کنیز کو تعلیم دے گا، اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے گا۔ اور شادی کرے گا تو اس کے لئے دو اجر ہیں۔ ایک اجر نکاح و تعلیم کے عوض میں، دوسرا آزاد کرنے کے صلہ میں۔)

چنانچہ اسی تعلیم کا اثر تھا کہ غلاموں کو بلاد اسلامیہ میں وہی حقوق حاصل تھے جن سے آزاد لوگ متمتع ہوتے تھے اور معاملات میں اتنی رعایت ملحوظ تھی کہ ایک غلام کو بہ نسبت آزاد کے نصف سزا ملتی تھی۔

لونڈیوں کے ساتھ نکاح کرنے اور ان کو آزاد کردینے کی ہدایت کرنا، اسلام کی بڑی زبردست حکمت تھی اور عربوں کے حالات واقعاتِ طبیعت کو دیکھتے ہوئے اس سے بہتر طریقہ اس رسم قبیح کے انسداد کا کوئی اور ہو ہی نہ سکتا تھا، چنانچہ تاریخ اسلام میں کثرت سے ایسے واقعات ملیں گے کہ لونڈیوں سے نکاح کرنے کے بعد ان کی اولاد نے سوسائٹی میں بڑا بلند مرتبہ حاصل کیا اور لوگوں نے کثرت کے ساتھ غلاموں کو آزاد کیا۔

جہاں تک اسلام کی تعلیم کا تعلق ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ اس نے اس رسم کے دور کرنے کی پوری کوشش نہیں کی، البتہ سلطنتِ اسلامی نے اس ہدایت کی غایت کو نظر انداز کیا اور بردہ فروشی کا سلسلہ امارت و سیادت کی اور بہت سی ناجائز خواہشات کی طرح، بدستور قایم رہا۔ تاہم اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ باوجود اس رسم کے قیام کے اس کی نوعیت بہت کچھ بدل گئی اور کنیز عہد اسلام سے قبل ایک جنس ناکارہ سمجھی جاتی تھی۔ اس کی ذہنی دماغی و معاشرتی ترقی کس حد تک پہونچ گئی۔

گزشتہ بیان سے معلوم ہوا ہوگا کہ عربوں میں بعد آغاز اسلام کنیزوں کی کثرت کا سبب فتوحات کی وسعت تھی کہ باوجود ہزاروں کی تعداد میں آزاد کردینے کے بھی ایک کثیر تعداد ان کے پاس رہجاتی تھی جب امارت و حکومت کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کے تمدن و معاشرت، عمران و تہذیب، جاہ و حشمت، شوکت و جلال میں ترقی ہوئی تو امراء و خلفاء کے حضور میں کنیزوں کے پیش کئے جانے کا دستور قایم ہوا، گویا کہ وہ بھی زر و جواہر کی طرح ایک چیز ہدیہ کے قابل سمجھی جاتی تھیں اگر معلوم ہوتا تھا کہ کس امیر کو صناعت کی طرف توجہ ہے تو اس کے سامنے صناع کنیز پیش کی جاتی تھی۔ اور اگر جاں و غنا کی طرف کوئی خلیفہ مایل ہوتا تھا تو انھیں خصوصیات کی حامل کنیز ڈھونڈھی جاتی۔ رفتہ رفتہ یہ دستور بہت وسیع و عام ہوگیا اور عہد بنی عباس میں تو اس کے تمام جمالیاتی پہلو کھل کر رہ گئے ــــ کنیزوں کے ساتھ جب خلفاء عہد نکاح کرلیتے تھے تو انھیں آزاد کردیتے تھے۔ اور پھر ان کا مرتبہ بہت بلند ہوجاتا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ متوکل کے پاس ۴۰۰ کنیزیں تھیں۔ (المسعودی ص ۲۷۹ ج ۲) اور ہارون الرشید کے پاس ۲۰۰۰، جن میں سے ۳۰۰ ارباب نشاط میں شامل تھیں۔ اور گانے بجانے کی ماہر تھیں۔ (الاغانی ص ۸۸، ج ۲) محض زینت و آرایش اور نمایش جاہ و جلال کے لئے بھی کنیزوں کو رکھا جاتا تھا۔ چنانچہ زبیدہ اور ام جعفر برمکی کے پاس ہزاروں کنیزیں صرف

اس لئے تھیں کہ ان سے شان و شوکت کا اظہار ہو۔

جب فتوحات کا سلسلہ محدود ہو گیا اور لڑائیاں بند ہوئیں تو کنیزوں کی فراہمی بھی کم ہونے لگی، لیکن چونکہ لوگ ان کے رکھنے کے عادی ہو گئے تھے، اس لئے ایک جماعت بردہ فروشوں کی پیدا ہو گئی جو بلادِ ترک و صقالبہ، ہند، آرمینیا، روم، اور افریقہ وغیرہ سے نوجوان لڑکیاں کسی نہ کسی طرح لاتے تھے اور یہاں فروخت کرتے تھے۔

اس تجارت کے لئے یہاں بڑے بڑے بازار قایم تھے جہاں کنیزوں کی خرید و فروخت نہایت کثرت سے ہوتی تھی، بغداد کا بازار اس باب میں خاص اہمیت رکھتا تھا۔ یہ بہت کھلے ہوئے میدان میں تھا اور اس کا نام "سوق الرقیق" یا "سوق النخاسین" تھا۔ اس میں متعدد مکان، دوکانیں اور احاطے تھے۔ جہاں مختلف ملکوں کی کنیزیں، عمر و رنگ، زبان و لباس، تہذیب و علم کے لحاظ سے علٰحدہ علٰحدہ رکھی جاتی تھیں۔ یوں تو یہاں سرکیشیا، روم، جارجیا، صقلبیہ، ایران، ارمینیا اور حبش وغیرہ تمام اطراف ملک کی کنیزیں آتی تھیں، لیکن سب سے زیادہ قیمتی وہ کنیزیں ہوتی تھیں جو مدینہ، طائف، بصرہ، کوفہ، بغداد و مصر سے حاصل کی جاتی تھیں، کیونکہ یہ نہایت ہی شیریں کلام اور حاضر جواب ہوتی تھیں۔

اس بازار کا ایک حصہ صرف ان کنیزوں کے لئے وقف تھا جو بالکل تازہ وارد ہوتی تھیں اور غیر تربیت یافتہ حالت میں فروخت کر دیجاتی تھیں یہ بالکل عریاں حالت میں لائی جاتی تھیں۔ اس حال میں کہ ان کے بال کھلے ہوتے تھے اور زینت و آرایش کا کہیں نام نہ ہوتا تھا۔ اس سے مقصود یہ تھا کہ ان کا طبیعی حسن جو صنعت آرایش سے علٰحدہ ہو۔ ہر شخص کو معلوم ہو سکے۔ بڑے بڑے تاجر ان کی شکل و صورت، رعنائی و دلکشی کا اندازہ کر کے مختلف داموں میں خرید لیتے تھے۔ اور پھر ان کے فطری ذوق کے لحاظ سے ان کو تعلیم و تہذیب سے آراستہ کر کے بہت گراں قیمت پر فروخت کرتے تھے۔ چنانچہ عہدِ اسلام کی بہت سی مشہور ماہر موسیقی، صاحب علم و فضل اور سیاست داں عورتیں انھیں کنیزوں سے تعلق رکھتی تھیں۔

اول اول جب یہ بازار میں آتی تھیں تو اُن کی وحشت و خشونت کا وہی عالم ہوتا تھا جو ایک نو گرفتار ہرنی کے اضطراب کا، لیکن جب تعلیم و تربیت کے بعد، مکلف لباس سے آراستہ، اور فنِ دلربائی کی گھاتوں سے واقف ہو کر، ہاتھ میں رباب، زبان پر نغمۂ شیریں[1]، نگاہوں میں دلربایانہ افسوں اور جسم میں حرکات رقصیہ کا لوچ لئے ہوئے نکلتیں تو طبقۂ امرا میں تہلکہ مچ جاتا اور وہی کنیز جو چند درہموں میں خریدی گئی تھی، لاکھوں میں فروخت ہوتیں۔

اگر نفس بردہ فروشی کی کراہت سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اہلِ عرب کنیزوں کے ساتھ جو سلوک کرتے تھے۔ وہ ان کے قوائے ذہنیہ کو تباہ کر ڈالنا تھا بلکہ ان کو مہذب و شایستہ بنانے والا تھا۔ اس سلسلہ میں جس قدر وحشی و ناتراشیدہ عورتیں زیور علم و فضل سے آراستہ کی گئیں۔ ان کا شمار مشکل ہے اور انھیں کنیزوں میں جیسی جیسی صاحب علم و فضل عورتیں ہوئیں اور خود ان کے بطن سے جیسے جیسے خلفاء عظام اور علماء کرام پیدا ہوئے، ان کے حالات سے تاریخ عرب کے صفحات مالا مال ہیں۔

ان بازاروں میں کنیزیں علی العموم نیلام کی صورت سے بیچی جاتی تھیں۔ یعنی جب کنیزوں کے خریدار خواہ وہ امراء ہوں یا تجار جمع ہو جاتے اور بازار مختلف ممالک کی کنیزوں سے بھر جاتا تو کنیزیں فروخت کرنے والے کھڑے ہو جاتے اور نہایت بلند آواز سے اپنی کنیزوں کی تعریف ان الفاظ میں کرتے:-

---

[1] ان کے تغزل و غنا کا صحیح رنگ کیا تھا اس کا اندازہ اس وقت کے گیتوں سے ہو سکتا ہے۔ صاحب آغانی نے جا بجا ان گیتوں کا ذکر کیا ہے ان میں سے وہ نہایت مشہور و محبوب وہ تھے جن کی ابتدا ان فقروں سے ہوتی ہے۔ "من کان لنا، لنالہ" (یعنی جو ہمارا ہے ہم اُس کے ہیں)۔ "وجمع الحبّ لکھوی عز" (فرط محبت سے گال پر گال رکھدینا کس قدر پیاری بات ہے)

"یا تجار، یا ارباب الاموال ! ما کل مدوّر رجوزة، وکل مستطیلة موزة ولا کل حمراء لحمة ولا کل بیضاء شحمة، ولا کل صفراء خمرة ولا کل سمراء تمرة، یا تجار، ہذہ الدرة الیتیمة اللتی لا تفنی الاموال لها بقیمة کم تفتحون باب الثمن"

(اے تاجرو، اے دولتمندو، نہ ہر گول چیز اخروٹ ہوتی ہے نہ ہر مستطیل چیز کیلا، ہر وہ چیز جو سُرخ ہے گوشت نہیں کہلاتی اور نہ ہر سپید چیز چربی، اسی طرح نہ ہر صہبا شراب ہوتی ہے اور نہ ہر زرد چیز کھجور۔ اے تاجرو، یہ ایک بے بہا موتی ہے کہ زرِ خطیر بھی اس کی قیمت نہیں ہو سکتا۔ پھر بتاؤ کہ تم کیا قیمت اس کی لگاتے ہو)

اس آواز پر لوگ چاروں طرف سے گھیر لیتے اور بولی شروع ہو جاتی۔ کوئی چار ہزار دینار کہتا تو کوئی پانچ ہزار، کسی طرف سے چھ ہزار کی آواز آتی اور کہیں سے ۸ ہزار کی، الغرض اخیر میں سب سے زیادہ قیمت لگانے والا۔ وہ دُرِ بے بہا پا جاتا اور اپنے گھر چلا جاتا۔

یہ بھی قاعدہ تھا کہ (قدیم اہلِ رومہ کی طرح) غلاموں اور کنیزوں کو کسی بلند جگہ پر کھڑا کر دیتے اور لوگ آ آ کر انھیں دیکھتے اور ہاتھوں سے چھوتے۔ چونکہ یہ لوگ لونڈی غلاموں کے عیوب کو بالکل اسی طرح چھپاتے تھے۔ جیسے گھوڑوں کے عیوب چھپائے جاتے ہیں، اس لئے خریدار کو یہ حق بھی حاصل ہوتا تھا کہ وہ ان کو بالکل عریاں حالت میں دیکھ سکے۔

اہلِ عرب نے مختلف ممالک کی کنیزوں کی علٰحدہ علٰحدہ خصوصیات متعین کر کے اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں۔ چنانچہ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر نجابت کی جستجو ہے تو فارس کی لونڈیاں لی جائیں، اگر خدمت مقصود ہے تو رومہ کی کنیزیں تلاش کی جائیں، اسی طرح کھانا پکانے کے لئے حبش کی کنیزیں، اور بچوں کی تربیت و رضاعت کے لئے آرمینیا کی لونڈیاں مخصوص سمجھی جاتی تھیں۔ حُسن ظاہری کے لحاظ سے چہرہ ترکی کا، جسم رُوم کا، آنکھیں حجاز کی، اور کمریں یمن کی پسند کرتے تھے۔

حال ہی کی بات ہے کہ بردہ فروشی کے انسداد سے قبل آستانہ، دمشق، قاہرہ وغیرہ کے بازاروں میں سرکیشیا کی کنیزیں عام طور پر بالکل عریاں حالت میں فروخت کی جاتی تھیں۔ بعد کو جب ایک بین الاقوامی قانون اس تجارت کے خلاف ہر جگہ نافذ ہو گیا تو لوگوں نے خفیہ طور پر اپنے گھروں میں اس تجارت کو جاری رکھا۔

قدیم زمانہ میں بھی کوئی قوم بردہ فروشوں کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتی تھی۔ لیکن اسلام نے جس قدر اس پیشہ کی حقارت کی ہے شاید کسی نے نہیں کی۔ رسول اللہ کا ارشاد تھا کہ:- "التجارة فی الرقیق محقة" (یعنی بردہ فروشی قوم کو تباہ کر دینے والی ہے) کتاب الولید میں بردہ فروش اور شیطان کو ایک مرتبہ میں رکھا ہے۔ اسی لئے عساکر اسلامیہ کے ساتھ ان تاجروں کے رہنے کی سخت ممانعت تھی تاکہ وہ دشمن کے بچوں کو پکڑ کر غلام نہ بنائیں اور ان کی عورتوں کو اہلِ لشکر کے سامنے پیش نہ کر سکیں جیسا کہ اہلِ رومہ کا دستور تھا

جیسا کہ ہم پہلے بیان کر چکے ہیں، بغداد اس تجارت کا بہت بڑا مرکز تھا۔ اور جمیل ترین کنیزیں یہیں کے بازار میں آتی تھیں۔ اور نہایت گراں قیمت میں فروخت ہوتی تھیں۔ ان کنیزوں کی تعلیم و تربیت کا بڑا اہتمام کیا جاتا تھا۔ تاجر اور خصوصیت کے ساتھ اس عہد کے مشہور مغنی، کسی کنیز کو اس کا ذہن قیافہ دیکھ کر خرید لیتے، پھر اس کو قرآن حفظ کراتے، ادب و نحو کی تعلیم دیتے، منہ زبانی تہذیب سکھاتے، اشعار یاد کراتے، موسیقی کا ماہر بناتے، اور پھر بازار میں لاکر سو سے ہزار وصول کرتے۔ خوبصورت کنیزوں کو موسیقی کی تعلیم دینے کا بہت رواج تھا۔ کیونکہ وہ کنیزیں جن میں ان دونوں کا اجتماع ہوتا، بیش بہا چیز سمجھی جاتی تھیں۔ علی الخصوص مولدات (یعنی مکہ و طائف کی کنیزیں) کی نگرانی کی کوئی انتہا نہ تھی۔

ایک مرتبہ ہارون الرشید نے ایک کنیز کی قیمت ایک لاکھ دینار عطا کی (ابن خلکان، ص ۱۰۶، ج ۱) اسی طرح سلیمان بن عبدالملک کے بھائی سعید نے اپنی مشہور کنیز زلفاء کی قیمت ستر ہزار دینار ادا کی (الطبری ص ۱۳۳۳، ج ۲) جعفر برمکی نے ایک کنیز ۴۰ ہزار دینار میں خریدی (العقد الفرید، ص ۳۰۳، ج ۳)۔ ہارون الرشید نے عنان خلافت ہاتھ میں لینے کے بعد سب سے پہلا حکم یہ نافذ کیا کہ فلاں کنیز

ایک لاکھ دینار میں خرید کر لی جائے ۔ اس کے وزیر یحییٰ بن خالد نے عذر کیا، رشید اس پر برہم ہوا تو یحییٰ نے بیت المال کی تمام چیزوں کو فروخت کر کے ۵ لاکھ درہم کی صورت میں اس کمرہ کے اندر رکھوا دیا ۔ جہاں سے خلیفہ گزرا کرتا تھا ۔ اس ترکیب سے خلیفہ کو معلوم ہوا کہ اس نے کنیز کے خرید کرنے میں کتنا بیجا صرف کیا تھا ۔

ایک بار امین نے جعفر بن ہادی کو حکم دیا کہ ایک کنیز جس کا نام بذل تھا خرید کر لی جائے ۔ جعفر نے انکار کیا ۔ تو امین نے برہم ہو کر دوبارہ حکم دیا کہ سونے کے برابر اس کو وزن کر کے قیمت ادا کی جائے ۔ چنانچہ اس کی تعمیل ہوئی ۔ اور ۲ کرور درہم ادا کئے گئے ۔

عہد بنی امیہ و بنی عباس میں کنیزوں کا مرتبہ اس قدر بلند ہو گیا تھا اور اتنا زبردست اثر ان کا خلفاء پر قائم تھا کہ حکومت و سلطنت گویا انھیں کے ہاتھ میں تھی ۔

چنانچہ یزید بن عبدالملک کا عشق حبابہ کے ساتھ اور رشید کا ذات الخال کے ساتھ جیسی تاریخی شہرت رکھتا ہے سب پر ظاہر ہے رشید کی ماں خیزران خود کنیز تھی، اسی طرح خلیفہ مقتدر کی ماں سیدۃ التزکیہ لونڈی تھی ۔ لیکن جو اثر ان کا سیاسیات وقت پر تھا، وہ کسی سے مخفی نہیں ۔

الغرض عہد اسلام میں کنیزوں کے اثر و نفوذ اور قوت و اقتدار کا یہ عالم تھا کہ ان کے متعلق یہ کہنا کہ وہ خلفاء کی لونڈیاں تھیں، درست نہیں، بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ خود خلفاء اُن کے غلام تھے ۔

اعتبارات

کسی شہر میں ایک بادشاہ تھا بڑا صاحب اقتدار اور غیر معمی عقل و فراست رکھنے والا اس شہر کے وسط میں ایک کنواں تھا جس کے صاف و شیریں پانی سے شاہ و وزیر اور تمام شہر والے فایدہ اٹھاتے تھے کیونکہ وہاں صرف یہی ایک کنواں تھا ۔

ایک رات ساری بستی سو رہی تھی کہ کوئی ساحرہ چپکے سے آئی اور کنویں کے اندر سات قطرے کسی دوا کے ڈال کر بولی کہ " جو شخص اس کنویں کا پانی پئے گا دیوانہ ہو جائے گا " صبح ہوئی سب نے حسب معمول کنویں کا پانی پیا اور ساحرہ کے قول کے مطابق سب دیوانے ہو گئے ۔ لیکن بادشاہ اور اس کے وزیر نے پانی نہ پیا ۔

جب یہ خبر تمام شہر والوں کو معلوم ہوئی تو وہ ہر ہر گلی میں دیوانہ وار پھر پھر کر یہ آواز بلند کہنے لگے کہ " ہمارا بادشاہ اور وزیر دیوانے ہیں ان میں اب حکومت کی اہلیت باقی نہیں رہی، اس لئے ہمیں چاہئے کہ انھیں معزول کر دیں "

شام کو جب یہ خبر بادشاہ کے کانوں تک پہونچی تو اس نے حکم دیا کہ اُس کنویں کا پانی لایا جائے ۔ چنانچہ ایک کاسہ زمین وہ پانی لایا گیا ۔ بادشاہ نے پیالہ لیکر اپنے ہونٹوں سے لگا لیا اور جو باقی بچا تھا وہ وزیر کو پلا دیا ۔

شہر کی تمام آبادی مسرور ہے کہ ہمارا بادشاہ راہِ راست پر آگیا اور اب وہ ہم پر حکومت کرنے کا اہل ہے ۔

ایک صبح پہاڑ کی چوٹی پر یزدان و اہرمن کا اجتماع ہوا ۔ یزدان نے اہرمن کو مخاطب کر کے کہا، " کیسا مزاج ہے " ۔ اہرمن نے کوئی جواب نہ دیا ۔ یزدان نے کہا ۔ " کیا آج مزاج بہت مکدر ہے " ۔ اہرمن نے کہا " ہاں " میں بہت ملول ہوں کیونکہ اب انسان کا یہ عالم ہے کہ وہ میرے تیرے درمیان کوئی تمیز ہی نہیں کرتا اور اکثر و بیشتر مجھے تیرے ہی نام سے پکارتا ہے ۔

یزدان بولا ۔ " اے اہرمن، یہی تخلیق مجھے بھی ہے کہ اب لوگ اکثر مجھے تیرے نام سے پکارتے ہیں " ۔ ایک طرف اہرمن افسردگی کے عالم میں چلا گیا اور دوسری طرف یزدان گردن جھکائے ہوئے ۔

ایٹلانٹک سمندر سے ایک خط

بحر ایٹلانٹک - ۳۱ اکتوبر ۱۹۵۵ء

در جستجوئے مانہ کشتی زحمتِ سراغ
جائے رسید ایم کہ عنقا نمی رسد،

مولانائے محترم - سلام مسنون

یہ خط میں آپ کو ایک خاص جذبہ کے تحت ایٹلانٹک سمندر سے لکھ رہا ہوں - خیال تھا کہ ایران چھوڑنے سے پہلے آپ کو مفصل خط لکھوں گا - اور اپنے آیندہ پتہ سے مطلع کردوں گا - لیکن وقت کی تنگی اور مشغولیتوں کی زیادتی مانع رہی - مختصر سرگزشت یہ ہے کہ کم وبیش پانچ سال ایران میں ہندو مستانی سفارتخانہ کی خدمات انجام دینے کے بعد اب میرا تبادلہ امریکہ ہوگیا ہے اور میں وہیں جا رہا ہوں ؎

صد بیاباں بگذشت و دیگری در پیش است

ایران سے ۲۴ اکتوبر کو ہوائی جہاز سے روانہ ہوا - چار گھنٹہ میں لبنان کے مشہور شہر اور دارالسلطنت، بیروت آگیا - یہ مسافت اگر خشکی کے راستہ سے طے کرتا تو چار روز سے کسی طرح کم نہ صرف ہوتے - بیروت سے اٹلی آیا وہاں کے مشہور تاریخی مقامات یعنی نیپلس (جہاں پامپیائی کے کھنڈر ہیں) فلورنس اور روم دیکھے - پھر وہاں سے فرانس اور فرانس سے لندن آگیا - یہ ساری راہیں پانی کے جہاز اور ریل کے ذریعہ طے ہوئیں خلاصہ یہ ہے کہ اگر بیروت سے لیکر لندن اور پھر وہاں سے یہاں تک (کہ دس روز سے متواتر بحر ایٹلانٹک میں سفر کر رہا ہوں اور ۳۱ اکتوبر یعنی چند گھنٹوں کے بعد امریکہ کے معروف عالم شہر نیو مارک پہونچ جاؤں گا) کے حالات اور تجربات لکھوں تو اچھا خاصا سفرنامہ طیار ہوجائے - مگر میں نے اس وقت قلم اس نیت سے نہیں اٹھایا ہے - جو حکایت لکھنا چاہتا ہوں اس کی نوعیت کچھ اور ہے - جب ۲۲ اکتوبر کو لندن پہونچا تو تین دن کے بعد ہمارا بقیہ اسباب جسے ہم نے اٹلی کے نامی بندرگاہ جینوا میں ٹامس کک کمپنی کے حوالہ کردیا تھا، لندن آگیا - آپ بھاری سامان ساتھ لیکر یورپ کی ٹرینوں پر سفر نہیں کرسکتے - زیادہ سے زیادہ ایک یا دو متوسط سایز کے سوٹ کیس آپ اپنے ساتھ رکھ سکتے ہیں - چونکہ یہ اسباب مجھے لندن سے امریکہ بھیجنا تھا تو انھیں دوبارہ بک کرانے کے لئے واٹرلو اسٹیشن پر لایا - لندن میں دو تین روز سے رم جھم بارش ہورہی تھی، میرے جوتے بیحد کثیف ہوگئے تھے - سامان کی لعنت سے نجات پانے کے بعد خیال ہوا ذرا جوتا صاف کروالوں سامنے ہی ایک دستے دار کرسی نظر آئی جس پر "بوٹ پالش" لکھا ہوا تھا - میں بے تکلف جاکر اس پر بیٹھ گیا اور جوتا صاف کرنے والا اپنے کام میں مشغول ہوگیا اس نے اپنے دونوں گھٹنوں کے نیچے ایک نیم سا تکیہ رکھا اور نیم استادہ ہوکر جوتے سے گیلی گرد دور کرنے لگا - میں نے اپنی عادت کے مطابق اس سے باتیں شروع کردیں :-

"تم، کب سے بوٹ پالش کا کام کر رہے ہو ؟

"کوئی سات سال سے"

"اس سے پہلے کیا کرتے تھے ـــ ؟"

اس نے نہایت بے پروائی سے جواب دیا:۔ "موٹر بس چلایا کرتا تھا ــــ چالیس سال تک بس ڈرائیور تھا ــــ"
آئیں؟ موٹر بس کے ڈرائیور تھے اور اب تم نے یہ پیشہ اختیار کر لیا ہے اور وہ بھی اس عمر میں"۔ میں نے انتہائی تعجب سے پوچھا۔
"تو کیا ہوا، مجھے یہ پیشہ بس ڈرائیوری سے زیادہ آبرومندانہ اور مفید معلوم ہوتا ہے"۔ اُس نے اس طرح جواب دیا، جیسے وہ میرے تحیّر کو ایک بے معنی سی بات سمجھ رہا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

میرا ذہن ایک دوسرے ہی عالم کی سیر کرنے لگا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ایک قوم کی عظمت، بزرگی اور کامیابی کا حقیقی راز کیا ہے ــــ؟ کیا ہندوستان کا ایک عمر رسیدہ شخص جو بس یا موٹر کے ڈرائیور ہونے کا "اعزاز" حاصل کر چکا ہو، کبھی بھی جو تا صاف کرنے کا پیشہ رضا و رغبت کے ساتھ اختیار کر سکتا ہے؟۔ کیا ہماری قومی نکبت، ذلت اور فلاکت کا اصلی سبب ہمارا جھوٹا احساسِ وقار نہیں ہے؟۔ کیا ہماری سوسائٹی یا اجتماعی زندگی کی بنیاد بھی انھیں محکم، مضبوط، عاقلانہ اور پائدار اصولوں پر استوار ہے، جہاں پیشہ، پیشہ میں کوئی تخصیص، کوئی تفریق نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ جہاں اپنے بازوؤں سے کمانا اور اپنی محنت سے روٹی حاصل کرنا عزت کا حقیقی سرمایہ سمجھا جاتا ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ہم یورپی قوموں کو صرف شراب اور سؤر کے گوشت کے نقطۂ نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں، ہم صرف ان کی عورتوں کی "برہنگی" اور "بے حجابی" ہی کا مضحکہ اُڑانا اپنا سب سے بڑا اخلاقی فرض سمجھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن ہم نے کبھی اپنے ذہن کو یہ زحمت دینے کی ضرورت نہیں سمجھی کہ آخر ایک قوم کیوں امام الاقوام بن جاتی ہے اور کیوں زندگی کی بہترین راحتیں، آسایشیں، اور ترقیاں اُسے نصیب ہو جاتی ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میں نے بوٹ پالش کرنے والے سے گفتگو جاری رکھتے ہوئے پوچھا: "تمھاری کیا عمر ہوگی ــــ؟"

"تمھارا اندازہ کیا ہے" اس نے مسکراتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔

"یہی کوئی اٹھاون، ساٹھ کے لگ بھگ ہوگے"۔

وہ ہنس پڑا ــــ "نہیں ۔ میرا سن اس وقت بہتّر سال کا ہے"

مجھے سخت تعجب ہوا اس لئے کہ اس کا چہرہ بھرا بھرا اور سُرخ و سفید تھا۔ آنکھوں میں چمک تھی۔ کاٹھی بہت ہی مضبوط اور بدن سڈول تھا۔ ہندوستان کے ستّر سال کے مزدور بوڑھے کی تصویر میری نظر میں پھر گئی ۔ اللہ! کیا زمین و آسمان کا فرق ہے۔؟

"تمھارے کتنے بچے ہیں؟"

"پانچ ۔ تین بیٹے ۔ دو بیٹیاں، میرے تینوں بیٹے اچھی ملازمتوں پر ہیں اور کھانے پینے سے خوشحال ہیں"۔

مگر حیرت ہے کہ وہ اس عمر میں تمھاری مدد نہیں کرتے اور تمھیں اپنی روزی اپنی محنت سے کمانی پڑتی ہے ــــ؟ ۔ یہ وقت تمھارے آرام کرنے کا تھا ــــ"

"میں کبھی یہ پسند نہیں کر سکتا کہ میرے بیٹے میرا بوجھ اُٹھائیں"۔ اُس نے نہایت مضبوط لہجوں میں جواب دیا ۔ "دوسرے اُن کی اپنی ذمہ داریاں اور فرایض ہیں ۔ اس کے علاوہ ابھی میرے بدن میں کافی دم اور بازوؤں میں طاقت ہے ۔ میں اُن کا احسان کیوں اُٹھاؤں ۔ میری ایک بیوی ہے ۔ اس کو البتہ کام نہیں کرنے دیتا ۔ وہ کام کے قابل بھی نہیں"۔

"تمھارے بیٹے اپنی ماں کی بھی مدد نہیں کرتے"

"جب تک میں زندہ ہوں، اُنھیں یہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں"

"میں سمجھتا ہوں ۔ تمھاری اولاد کو کچھ کچھ تمھاری مدد ضرور کرنی چاہئے ۔ آخر تم نے اُنھیں پالا پوسا ہے، بڑا کیا ہے۔ انھیں اس کا احساس ہونا چاہئے"۔ میں نے ہمدردانہ لہجہ میں کہا۔

"میں اُن سے مدد لینی تو نہیں چاہتا ۔ ہاں یہ البتہ ہے کہ وہ مجھے پراگندہ حال اور بے پناہ نہیں دیکھ سکتے ۔ اگر بہت بُرا وقت آجائے تو وہ پہلو تہی نہیں کریں گے"

"لیکن حقیقت یہ ہے کہ اتنی اولاد کے ہوتے ہوئے جبکہ وہ مالی حیثیت سے خوشحال بھی ہیں، اب تمھیں اس سن میں آرام کرنا چاہئے یہ عمر تمھارے کام کرنے کا نہیں ہے۔"

"تم یقین کرو" اُس نے ہر ہر لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا: "کہ میں اس وقت تک آرام کرنا، یا دوسرے کا سہارا لینا نہیں چاہوں گا جب تک میرے بدن میں چلنے پھرنے اور کام کرنے کی صلاحیت باقی ہے"۔

میں نے دل میں کہا - یہی ایک قوم کی ترقی اور کامیابی کا راز ہے۔

مولانا — کیا عرض کروں — اس بوڑھے، بوٹ پالش والے کے اندر کتنی زبردست خود اعتمادی تھی جو اس کے قومی کیرکٹر کو پوری طرح واضح کر رہی تھی - واقعہ یہ ہے کہ اگر ایک قوم اُونچائی حاصل کرتی ہے اور دُنیا میں اپنے لئے ایک ممتاز جگہ حاصل کر لیتی ہے تو اس کے حقیقی اسباب کچھ اور ہوتے ہیں - ڈانس، ڈنر اور لپ اسٹاک کی رنگینی ایک قوم کو اونچا نہیں کرتی۔

میں نے سوئچا اگر لندن کے معروف سیر گاہ یا بہ اصطلاح تعیش گاہ، پیکیڈلی سرکس کے رنگین مناظر کا افسانہ سنانے کی فرصت اور ضرورت نہیں تو کم از کم اس واقعہ کا حال تو آپ کو لکھ کر بھیجدوں کہ سوئچ والوں کے لئے اس میں کافی سرمایہ حکمت و بصیرت موجود ہے۔

یہ خط میں نے ۵ بجے صبح کو لکھنا شروع کیا تھا - اب قریب ۷ کے ہو رہا ہے - جہاز جو ۲۲۰۰۰ ٹن کا بھاری سمندری جہاز ہے آہستہ آہستہ نیویارک کے ساحل تک پہونچ رہا ہے - ہندوستان میں اس وقت شام ہو رہی ہوگی۔

یہ خط میں آپ کو اپنے نیویارک کے سفارت خانہ سے بھیج رہا ہوں - نیویارک سیٹی ایک عظیم الشان شہر ہے - جس کی سربفلک عمارتیں ایسی ہیں کہ اگر انسان سر اُٹھا کر ان کی آخری چوٹی دیکھنا چاہے تو ٹوپی گر جائے۔ مکانات ستونی قسم کے ہیں گویا دیا سلائی کی ڈبیا میں جو ایک دوسرے پر رکھ کر آدھے آسمان تک پہونچا دی گئی ہیں - یہاں ایک عمارت بنام امپائر اسٹیٹ بلڈنگ ہے جو دُنیا کی سب سے بلند عمارت سمجھی جاتی ہے مگر آدمی نیم دقیقہ سے کم میں لیفٹ کے ذریعہ اس کی آخری چوٹی تک پہونچا دیا جاتا ہے - یہ بارہ سو پچاس فیٹ بلند عمارت ہے۔

گرانی کا حال بھی سُن لیجئے - جوتے کے ایک جوڑ فیتہ کی قیمت ۱۵ سنٹ یعنی ۱۲ پے آنے دینے پڑے جو شاید ہندوستان میں زیادہ سے زیادہ ۲ر میں مل جائے گا۔

میں نے ایک سوٹ کی صرف استری کرانے کے لئے ایک ڈالر یعنی کم و بیش ۵ روپے دئے - لیکن یہ بہت جلدی کا کام تھا - گھنٹہ بھر میں کپڑے استری ہو کر مل گئے - اگر تین گھنٹے لگتے تو شاید نصف یعنی ۲½ دینے پڑتے - ناشتہ میں کم سے کم ایک روپیہ آٹھ آنے خرچ ہوتے ہیں - دو سینڈوچ کے ۲۰ سنٹ یعنی ایک روپیہ - ایک پیالی کافی کے دس سنٹ یعنی آٹھ آنے - چاء کی پیالی سم آنے - یعنی ہوٹل یہاں ایسے ہیں جن کو اوٹومیٹ کہتے ہیں - یعنی لانبے لانبے خانے (چھوٹے پنجرہ) جیسے بنے ہوئے ہیں - ہر خانے میں طرح طرح کے سینڈوچ، کیک، روٹی مکھن رکھے رہتے ہیں - آپ کو جس طرح کی چیز مطلوب ہو اس کی قیمت لکھی رہتی ہے - آپ کو صرف اتنی قیمت شگاف میں ڈال دینی ہے - اور ایک معمولی سا ہینڈل جو شگاف سے لگا رہتا ہے اُسے گھما دینے سے، خانہ کا دروازہ خود بخود کھل جائے گا اور آپ کی مطلوبہ چیز آپ کے سامنے آجائے گی اسی لئے ایسے ہوٹلوں کو AVTOMAT کہتے ہیں - چاء یا کافی چاہئے تو شگاف میں سکہ ڈالئے - نیچے چھوٹی سی نلی ہے اس کے نیچے پیالی رکھ دیجئے دودھ اور کافی بہ یک وقت اُس پیالی کے ٹھیک کنارے تک بھر جائے گی، وہاں سے اُسے اُٹھا کر اپنی میز پر

خود لائیے اور پیجیے۔ نوکر کی ضرورت نہیں نہ وہاں کوئی "ہیٹرا" ہوتا ہے۔

نیویارک شہر میں تجارتی فضا مستولی رہتی ہے۔ ٹرافک (سواریوں) کا انتظام نہایت باقاعدہ ہے۔ سڑکوں کے نمبر بھی بہت ہی نظم و قاعدہ کے ساتھ دیئے ہوئے ہیں اگر آپ انگریزی جانتے ہیں تو پھر یہاں راہ کا گم کرنا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ ٹپس (بخشش) یعنی بخشش کا یہاں بیحد رواج ہے۔ ٹیکسی والے کو بھی اس کے کرایہ (میٹر) کے علاوہ کم از کم ایک روپیہ بخشش دینا پڑتی ہے۔ اگر نہیں دیں گے تو وہ آپ کو ایک بڑی تحقیر کی نگاہ سے دیکھتا ہوا چلا جائے گا۔ بعض تو باصرار وصول کر لیتے ہیں۔

ملل متحدہ کی عمارت نہایت متین مگر دیدہ زیب عمارت ہے۔ وہاں میں اپنے ملک کے علاوہ ایران کے ڈیلیگیٹوں سے بھی ملا۔ مسٹر نصراللہ انتظام جو ایران کے نمایندہ ہیں اُن سے دیر تک فارسی میں باتیں ہوتی رہیں۔ ایک "ہندی" کو نیویارک جیسے شہر میں "فارسی میں باتیں کرتے دیکھ کر" انھیں "بہت حیرت" ہوئی۔

آج یعنی ۲ نومبر کو میں اپنی جائے خدمت یعنی سانفرانسسکو جا رہا ہوں یہ نیویارک سے تین ہزار میل دور ہے اور بحر پاسفک کے کنارے واقع ہے۔ یہ مسافت میں ٹرین سے قطع کروں گا۔ تین روز لگیں گے۔ سانفرانسسکو، امریکہ کا "فردوس ارضی" سمجھا جاتا ہے۔ خود امریکنوں کا قول ہے کہ امریکہ کے تمام شہروں میں سانفرانسسکو سے بہتر شہر کوئی نہیں۔ ہوا وہاں ہمیشہ معتدل رہتی ہے۔ یعنی فردوسی کی زبان میں ؎

نہ گرم دگر نہ سرد و ہمیشہ بہار

سردست خدا حافظ

سید نظیر حسین

۲ نومبر ۱۹۵۵ء

حضرت مانی جائسی :-

دامنِ ذرہ میں ہے وسعتِ صحرا، لیکن — تو نہ دیکھے تو یہ کوتہ نظری تیری ہے
کیوں نہ ہر وقت نگاہوں میں پھرے صورتِ موت — جب میں بیمار ہوں اور چارہ گری تیری ہے
تیرا بالیں پہ گزر اور مرا مرجانا، — یہ خوشی ہے، ابھی میری تھی ابھی تیری ہے
دل کشی گیسوئے مشکیں کی دل افروزیِ رخ، — ظلمتِ شام و ضیائے سحری تیری ہے
دل میں کہرام ہے، میں پھر بھی ہنسوں گا اے دوست — اگر اس طرح کے ہنسنے میں خوشی تیری ہے

پیچ و خم تو رہِ ہستی کے عیاں ہیں مانی،
حیرت انگیز یہ بے راہ روی تیری ہے،

مشاعرۂ نگار

مصرعۂ طرح :- "کون ٹالے گا بھلا آپ کے فرمانے کو"

احسان دربھنگوی :-

ہم سنائیں گے کہانی تمھیں میخانے کی — ختم کرلو حرم و دیر کے افسانے کو
یہ ادائیں، یہ نگاہیں، یہ جوانی، یہ جمال — "کون ٹالے گا بھلا آپ کے فرمانے کو"
تم محبت بھری نظروں سے اُسے دیکھ تو لو — نیند کانٹوں پہ بھی آجاتی ہے دیوانے کو

اکرم دھولیوی :-

چوٹ اُبھر آئی اگر دل کی تو مشکل ہوگی — کیجئے یاد نہ بھولے ہوئے افسانے کو
شمع خاموش ہوئی چاند ستارے ڈوبے — اکرم اب ختم بھی کر درد کے افسانے کو

انجم انصاری دھولیوی :-

موت دُنیائے محبت میں ہے تجدیدِ حیات — زندگی کہتے ہیں ہم جی سے گزر جانے کو

حبیب آروی :-

جانے یہ کونسی منزل ہے محبت کی حبیب — خود تڑپنے لگا آیا تھا جو تڑپانے کو

رحمت - امروہوی :-

گھر کے بادل جو چلے آئے ہیں میخانے کو — کس نے ٹکرا دیا پیمانے سے پیمانے کو
فصلِ گل آئے کہ گلشن میں خزاں چھا جائے — اب تو راس آگیا صحرا ترے دیوانے کو

سالک انصاری نذر آبادی :-

شمع سے اپنی لگی خود ہی بجھائے نہ بنے — کون دے دادِ وفا بزم میں پروانے کو
غنچہ و گل کا ہو موسم کہ جنوں کا ہنگام — ایک لمحہ بھی سکوں اب نہیں دیوانے کو
نئے عنوان سے دو دعوتِ جلوہ ہم کو — ایک مدت ہوئی اب طور کے افسانے کو
دل شکستہ ہوں نہیں ضبط کی طاقت مجھ میں — کوئی دہرائے نہ گزرے ہوئے افسانے کو

شارق میرٹھی :-

آگئی یاد کسی کی نگہِ مست مجھے — ابھی ہونٹوں سے لگایا ہی تھا پیمانے کو
اب نہ ساغر کی ہوس ہے نہ تمنائے بہار — تیرے دامن کی ہوا مل گئی دیوانے کو
لذتِ تشنہ لبی یاد جو آئی شارق — رکھ دیا میں نے اُٹھا کر وہیں پیمانے کو

شفقت کاظمی :-

تیرے ملنے کی بھی صورت کوئی پیدا کرتی — یہ تو سمجھاتی ہے دُنیا مجھے سمجھانے کو
اپنی محفل سے اُٹھا کر نہ پشیماں ہو کہ ہم — آئے تھے جرمِ تمنا کی سزا پانے کو

مظہر عارف :-

تھا تو دامن کشِ دل عقل کا افسوں لیکن — شکر ہے وقت پہ ہوش آگیا دیوانے کو

انسان
(عہدِ حاضر میں)

(فضا ابن فیضی)

سحر گزر گئی خود روشنی کو ٹھکرا کر
پلی ہے رات مہ و کہکشاں کا غم کھا کر

سیاہ راتوں سے سورج ہیں مطمئن کتنے
سیاہیوں کی طرف مڑ گئے ہیں دن کتنے

جھلک رہا ہے لہو زرفشاں گلابوں میں
نمود فتنے کی ہوتی ہے خانقاہوں میں

خود آگہی و خودی کے ایاغ ٹوٹ گئے
ہوائے تند سے لڑ کر چراغ لوٹ گئے

غریقِ زہر ہلاہل ہوئے سفینۂ نوش
خضر کے بھیس میں ہیں کس قدر ضمیر فروش

وہ جس کا سینۂ روشن تھا مایہ دارِ علوم
وہی ہے اب نفسِ جبرئیل سے محروم،

دلوں کے کنج میں کینے کا سانپ بستا ہے
وہ آدمی ہی ہے جو آدمی کو ڈستا ہے

یہ فکرِ عیش یہ تہذیب و کفر کے ناسور
یہ بے نگاہ کلیم اور یہ خرابۂ طور

زمیں کے دوش پہ فکر و نظر کے یہ تابوت
یہ مقبرہ ہے الٰہی! کہ عالمِ ناسوت

تمام سعیِ کرم رائگاں ہوئی تیری
متاعِ سود سپردِ زیاں ہوئی تیری

نغمۂ نو

(حضرت دل شاہجہاں پوری)

بہار جلوے دکھا رہی ہے رباب نغمے سنا رہا ہے،
وہ مے نگاہوں سے ڈھل رہی ہے کہ زہر بھی جھومتا رہا ہے

چٹک چٹک کر ہر ایک غنچہ بہار اپنی دکھا رہا ہے
کوئی اِدھر مسکرا رہا ہے کوئی اُدھر مسکرا رہا ہے

اُداس سبزہ خموش غنچے نہال لرزاں صبا پریشاں
عجب فسانہ ہے وہ فسانہ مآلِ گل جو سنا رہا ہے

سرشک خوں ہیں کمالِ گریہ گدازِ دل ہے مآلِ گریہ،
کھنچے جو عشق و وفا کے نقشے اُنھیں یہ رنگیں بنا رہا ہے

سکوں شکن انقلاب یکسر تمام شورش تمام عبرت
ہمیں یہ ہنگامۂ زمانہ نئے فسانے سنا رہا ہے

سرورِ تسنیم کیفِ کوثر نشاطِ فردوس چشمِ ساقی
جو ہے کئی میکدوں کا حاصل وہ جام گردش میں آ رہا ہے

حیات اک واہمہ سمجھئے نگاہ رفتارِ زندگی پر
یہ جا رہا ہے وہ آ رہا ہے وہ آ رہا ہے یہ جا رہا ہے

وہ گل نشانی دمِ تکلم نشاط فردوس جس پہ قرباں
وہ اک تبسم جو حسن بن کر فضائے عالم پہ چھا رہا ہے

حریفِ اہلِ وفا زمانہ نئی نئی کروٹیں بدل کر،
ستم نصیبوں کی زندگی کے عجب فسانے سنا رہا ہے

یہی محبت کا مدعا ہے کہ خاکِ راہِ نیاز ہو جا،
زبانِ اہلِ نظر پہ اکثر بیانِ اہلِ وفا رہا ہے

سرورِ بادہ حیاتِ رنداں خمارِ بادہ ہے اک مصیبت
نگاہِ مستانہ ایک گردش کہ پھر اُنھیں ہوش آ رہا ہے

بہار نکھری چمن جواں، شگفتہ غنچے، نسیم خنداں
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے تو مسکرا رہا ہے

نہ جانے کیا مدعا ہے اے دل سحر سے تا شام دستِ قدرت
نئے نئے زندگی کے نقشے جو کھینچ کر پھر مٹا رہا ہے

مہتاب

(سیف جسن پوری)

ہمنشیں کتنا دل آویز ہے مہتاب کا حسن!

تیرگی خوف سے لرزاں ہے اسی کے باعث
رات کی مانگ میں افشاں ہے اسی کے باعث
شاہراہوں پہ چراغاں ہے اسی کے باعث
دشتِ گلزار بداماں ہے اسی کے باعث
ریگزاروں بہاراں ہے اسی کے باعث

معترف کون نہیں اس کی فسوں کاری کا!

لیکن اے دوست جو خورشید نہ ہو جلوہ فشاں
سیکڑوں دائرہ ہو جائے نگاہوں سے نہاں
ختم ہو جائے یہ سیّال بہاروں کا سماں
رات کی مانگ سے مٹ جائے شہابی افشاں
دیکھتے دیکھتے ہو جائے گلستاں ویراں

گھل کے رہ جائے بھرم اس کی ضیا باری کا!

اتفاقات کی ہے دستِ نگر اس کی بہار
یہ اُجالا، یہ تبسم، یہ جوانی، یہ نکھار،
اجنبی کرنوں پہ ہے اس کی سیاحت کا مدار
اس کو خورشید نے بخشی ہے یہ رونق، یہ وقار
ورنہ سیّارۂ تاریک تجلّی یہ کنار؟

کس قدر دلکش و معصوم ہے تابندہ جمال!

بعض کمیاب کتابیں

تاریخ اُردو مطبوعہ

قدیم ہنر و ہنرمندانِ اودھ مصور ---- اسرار حسین للّٰہ
احسن التواریخ - تاریخ صوبۂ اودھ مصور - منشی رام سہائے تمنا - مغہ
محل خانۂ شاہی - فدا علی منجر حالات محلات واجد علی شاہ -- ۳ے
آثار الصنادید - پہلا اڈیشن ۱۸۴۶ء - سرسید احمد خاں - بہ با کمال مصور ۳۵ے
تاریخ ڈھاکہ مصور ---- رحمان علی طیش ------ عغہ
تاج التواریخ مصور سہ جلد کامل - نصرت علی ---- ۵۰ے
دربار اکبری ---- محمد حسین آزاد ---------- معغہ
سلسلۂ آصفیہ - تاریخ دکن ۲ حصے - سید علی بلگرامی ۱۵ے

سوانح عمری اُردو مطبوعہ

آثارِ غالب ------ شیخ محمد اکرام ---------- مغہ
غالب -------- غلام رسول مہر ---------- مغہ
یادگار غالب ------ الطاف حسین حالی ------ مغہ
الغزالی -------- شبلی نعمانی ---------- ۲ے
حیات خسرو ------- 〃 ---------- ۲ے
حیات انیس ------ امجد علی اشہری -------- ۳ے
واقعات انیس ---- میر مہدی حسن احسن ------ ۲ے
البرامکہ - یحییٰ و جعفر برمکی کی سوانح - محمد عبدالرزاق عغہ

تذکرہ شعراء اُردو مطبوعہ

تذکرۂ گلِ رعنا ------- عبدالحئی ---------- عغہ
سخن شعراء ------ عبدالغفور خاں ------ ۵۰ے
تذکرۂ گلشن ہند ---- مرزا علی لطف ---------- عغہ
تذکرۂ آبِ بقا ---- عبدالرؤف عشرت ------- للّٰہ
تذکرۂ بہار سخن ---- سندر لال - ہند و شعراء کا تذکرہ - ۱۵ے
تذکرہ آبِ حیات --- محمد حسین آزاد ------ عغہ
مخزنِ نکات ------- شیخ قیام الدین قایم ------ ۵ے
چمنستانِ شعرا ---- رائے لچھمی نرائن شفیق ------ عغہ
جایزہ زبانِ اُردو ---- مرتبہ انجمن ترقی اُردو ---- ۵ے

خطبات گارسان دتاسی - لکچر ہندوستانی زبان پر شایع کردہ انجمن ترقی اُردو ۵ے
تذکرۂ ہندی ---------- مصحفی ---------- عغہ
عقدِ ثریا ---------- 〃 ---------- عغہ
نگارستان فارسی ---- محمد حسین آزاد ------ مغہ
تذکرہ دستور الفصاحت --- احمد علی خاں یکتا ------ ۵ے
پنجاب میں اُردو مع مقدمہ --- محمود شیرانی ------ عغہ

ادب اُردو مطبوعہ

دیوان میر حسن ---- میر حسن حسن ---------- ۸ے
خمخانۂ عشق ---- امیر احمد امیر ---------- ۱۰ے
مراۃ الغیب ---- 〃 〃 ---------- ۵ے
دیوانِ ذوق ---- شیخ ابراہیم ---------- ۴ے
کلیات ناسخ ---- امام بخش ---------- ۱۰ے
گلدستہ ------ مرزا محمد ہادی عزیز ---------- ۱۰ے
دیوانِ تاج سخن --- جلیل ---------- ۱۰ے
کلیات سودا ---- مرزا رفیع سودا ---------- ۱۰ے
مظہر معانی دیوانِ مجروح --- میر مہدی حسین ------ ۸ے
نظم دل افروز کلیات مسلیم - منشی امیر اللہ ------ للّٰہ
آیات وجدانی --- مرزا واجد حسین یگانہ ------ ۱۰ے
مجموعہ قصاید عزیز ---- مرزا محمد ہادی عزیز ---------- ۱۰ے
گلزار تعشق ---- مرزا تعشق لکھنوی ---------- عغہ
دیوان ثاقب --- ذاکر حسین ثاقب ---------- ۵ے
کلیات مومن ---- مومن خاں دہلوی ---------- مغہ
کلیات میر ---- میر تقی میر ---------- عغہ
دیوان ولی معہ دیباچہ حیدر ابراہیم ساسانی محمد ولی دکھنی ---- ۵ے
دیوان غالب ---- حسرت موہانی ---------- ۱۰ے
کلیات نظیر ---- نظیر اکبر آبادی ---------- ۱۰ے
کلیات نظیر اکبر آبادی -- مرتبہ عبدالباری آسی ------ عغہ
مراثی انیس - جلد اول و دوم و سوم و چہارم --- میر انیس ---- ۱۰۰ے

ان کتابوں پر کمیشن نہیں دیا جائے گا - قیمتیں علاوہ محصول ڈاک ہیں -

منیجر نگار - لکھنؤ

مکتوباتِ نیاز

(تین حصوں میں)

نیاز کے تمام وہ خطوط جو جذبات نگاری، سلاست بیان، دلگینی اور دلپذیری کے لحاظ سے فن انشا میں بالکل نئی چیز ہیں اور جن کے سامنے خطوط غالب بھی پھیکے معلوم ہوتے ہیں اڈیشنوں میں پہلے ایڈیشن کی غلطیوں کو دور کیا گیا ہے اور ۲۰ پونڈ کے کاغذ پر طبع ہوئی ہے۔ قیمت ہر حصہ کی چار روپیہ (علاوہ محصول)

نقاب اُٹھ جانے کے بعد

نیاز فتحپوری کے تین افسانوں کا مجموعہ جس میں بتایا گیا ہے کہ ہمارے ملک کے ادیان، مرتقیت و علمائے کرام کی اندرونی زندگی کیا ہے اور ان کا وجود ہماری معاشرت و اجتماعی حیات کیلئے باوجود شمہ قاتل ہے۔ زبان، پلاٹ، انشا کے لحاظ سے جو مرتبہ ان افسانوں کا ہے وہ دیکھنے سے تعلق رکھتا ہے۔ قیمت آٹھ آنے علاوہ محصول)

شاعر کا انجام

جناب نیاز کے عنوان شباب کا لکھا ہوا افسانہ جس عشق کی تمام نشہ بخش کیفیات اس کے ایک ایک جملہ میں موجود ہیں، یہ افسانہ اپنے پلاٹ اور انشا کے لحاظ سے اس قدر چیز ہے کہ دوسری جگہ اسکی نظیر نہیں مل سکتی۔ تازہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط، قیمت بارہ آنہ (علاوہ محصول)

مالہ و ماعلیہ

حضرت نیاز نے اس کتاب میں بتایا ہے کہ فن شاعری کس قدر مشکل فن ہے اور اس میدان میں بڑے بڑے شاعروں نے بھی ٹھوکریں کھائی ہیں، اور اس کا ثبوت دینے دور حاضر کے بعض اکابر شعراء مثلاً جوش، جگر، یماب وغیرہ کے کلام کو سامنے رکھ کر پیش کیا ہے۔ ملک کے نوجوان شاعروں کے لیے اس کا مطالعہ از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپیہ عار (علاوہ محصول)

شہاب کی سرگذشت

حضرت نیاز کا وہ عدیم المثال افسانہ جو اُردو زبان میں بالکل پہلی مرتبہ سیرت نگاری کے اصول پر لکھا گیا ہے، اس کی زبان، تخیل، اس کی نزاکت بیان، اس کی انشاء عالیہ سحر حلال کے درجہ تک پہونچتی ہے، یہ ایڈیشن نہایت صحیح اور خوشخط ہے۔ قیمت دو روپے عار (علاوہ محصول)

مذاکرات نیاز

[illegible] ڈائری جو ادبیات و تنقید عالیہ کا عجیب و غریب ذخیرہ ہے، ایک بار اس رسالہ کو شروع کیا پھر تک پڑھ لینا ہے۔ یہ جدید ایڈیشن [illegible] میں صحت و نفاست کا غذ و طباعت کا ایک [illegible] آنے علاوہ محصول

مذہب

[illegible] نے بتایا ہے کہ مذہب کی حقیقت [illegible] اور [illegible] کے بعد انسان [illegible] کیا [illegible] (علاوہ محصول)

انتقادیات

[illegible] کا مجموعہ فہرست مضامین یہ ہے، ایران و ہندوستان کا تاثر جس شاعری پر فارسی زبان کی پیدائش پر مورخانہ نظر، اردو شاعری پر تاریخی تبصرہ، [illegible] نقوشہائے رنگ رنگ (غالب کی فارسی غزل گوئی پر تبصرہ) ادبیات اور اصول انتقاد فنون ادبیہ و حقیقت نگاری قیمت چار روپے (علاوہ محصول)

فراست الید

[illegible] ایک شخص انسانی ہاتھ کی شناخت اجاسکی لکیروں کو دیکھکر اپنے یا دوسرے شخص کے مستقبل، سیرت، عروج و زوال، موت و حیات، صحت و بیماری، شہرت و [illegible] کر سکتا ہے۔ قیمت ایک روپیہ علاوہ محصول

مینجر نگار لکھنؤ

نگار کے خاص نمبر

سالنامہ ۱۹۴۲ء

(موسم نمبر) جو ختم ہو چکا تھا اور جس کی مانگ بہت زیادہ تھی دوبارہ شائع کیا گیا ہے، موسم کے مطالعہ کے لیے اس کا پڑھنا از بس ضروری ہے۔ قیمت دو روپے ۸/

جنوری ۱۹۴۳ء

اس نمبر میں، ریاض خیرآبادی مرحوم کے کلام پر ملک کے متعدد مشاہیر نے نقد و تبصرہ کر کے بتایا ہے کہ ریاض کی شاعری کا اصلی قیمت ایک روپیہ آٹھ آنے (علاوہ محصول)

فروری۔ مارچ ۱۹۴۶ء

جو فن انتقاد چند ملک کے بہترین اہل قلم و اہل نگار کے مضامین پر مشتمل ہے۔ قیمت دو روپیہ ۸/ (علاوہ محصول)

جنوری۔ فروری ۱۹۴۸ء

(پاکستان نمبر) نگار کا خاص نمبر جس میں دنیا کے سامنے اسلام کی عظمت رفتہ، تمدن اسلام کے بنیادی حقائق کو پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اپنے مستقبل کی تعمیر کے وقت اسلام کے دور زریں کو نہ بھول جائیں جس پر مسلم حکومت کی ترقی کی بنیاد قائم ہوئی تھی۔ قیمت دو روپے (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۴۹ء

نگار کا افسانہ نمبر جس میں تقریباً تمام اصناف کے بہترین اہل قلم کے شاہکار پیش کیے گئے ہیں اس سال نمبر کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے بآسانی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ افسانہ نگاری کے کتنے اسکول ہیں اور ہر اسکول کا معیاری افسانہ کیسا ہونا چاہیے۔ قیمت دو روپیہ (علاوہ محصول)

جنوری فروری ۱۹۵۱ء

اس سال کے نمبر میں پیش ہے (اس ہندی کی مشہور عالم کتاب، ایک سنگتیل کی تلاش کا ترجمہ اقتباس ہے۔ جس میں اس نے ایران، مصر، عراق، فلسطین وغیرہ ممالک اسلامیہ کی سیاحت کے بعد اس کی موجودہ اقتصادی زبوں حالی اور ویرانی کے اسباب پر روشنی ڈالی ہے اور اس کے ساتھ یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ان کا سنگتیل کتنا روشن ہے، اگر وہ ترقی کے لیے [illegible] سالنامہ کا دوسرا حصہ ایڈیٹر نگار کے تازہ کلب جس میں پہلی جنگ کے بعد مسلم حکومتوں کے انقلاب کی تاریخ اور اس کے اسباب کو ظاہر کیا گیا ہے۔ قیمت دو روپے ۸/ (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۲ء (حسرت نمبر)

جس میں ملک کے تمام نامور شاعروں اور ادیب نے حصہ لیا ہے اور انتخاب کلام حسرت اس انداز سے کیا گیا ہے کہ آپ کو کلیات حسرت کے دیکھنے کی ضرورت نہ ہوگی حسرت کو سمجھنا کام تھا معلوم کرنے کے لیے اس کا مطالعہ نہایت ضروری ہے قیمت دو روپے ۸/ (علاوہ محصول)

جنوری، فروری ۱۹۵۳ء

اداریہ نمبر جس میں تاریخ کے سوانح حیات کے بہت سے وہ پہلو پیش کیے گئے ہیں جو اس وقت تک سامنے نہ آئے تھے۔ اس نمبر میں [illegible] حیات عشقیہ پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے اور ان کے فن شعر گوئی پر ملک کے مشہور نقادوں نے اظہار خیال کیا ہے۔ قیمت دو روپے ۸/ (علاوہ

سالنامہ ۱۹۵۴ء

(خواں، رواں) اسلام نمبر یہ تاریخ اسلامی کا گنجینہ ہے جس میں ولادت نبوی سے لیکر اس وقت تک کی تمام مسلم حکومتوں کے شجرے دے کر ان کے عروج و زوال کو بتایا گیا ہے دراصل تاریخ کی کتاب ہے جو ہر پڑھے لکھے کے پاس ہونا چاہیے۔ قیمت چھ روپے سکے (علاوہ محصول)

سالنامہ ۱۹۵۵ء

(علوم اسلامی و علمائے اسلام نمبر) متوقع۔ جس میں اسلامی علوم و فنون پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ مسلم حکومتوں نے علوم و فنون کی ترقی میں کیا حصہ لیا۔ اس کے علاوہ تمام ممالک اسلامیہ کے اکابر علم و ادب کے مختصر حالات دے کر ان کی علمی خدمات اور تصانیف کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ قیمت چھ روپیہ آٹھ آنہ (علاوہ محصول)

منیجر نگار لکھنؤ

Muslim University Publications

BROWNING'S POETICS	*by O. P. Govil M.A., Ph.D.*	Rs. 3-00
PESSIMISM IN SWINBURNE'S EARLY POETRY	*by G. Singh M.A., Ph.D.*	Rs. 3-00
EARLY VICTORIAN POETRY OF SOCIAL FERMENT	*by A. Bose D. Phil (Oxon)*	Rs. 5-00
DONNE'S IMAGERY	*by Masoodul Hasan M.A. (Alig.)*	Rs. 4-00
SMALL-SCALE AND COTTAGE INDUSTRIES AS A MEANS OF PROVIDING BETTER OPPORTUNITIES FOR LABOUR IN INDIA	*by Q. H. Farooque*	Rs. 5-00
MONETARY NEGOTIATIONS IN THE WORLD ECONOMIC CONFERENCE 1933	*by Abdul Haseeb*	Rs. 6-00
THE LIFE AND TIMES OF SHAIKH FARIDUDDIN GANJ-I-SHAKAR	*by K. A. Nizami*	Rs. 12-00
WAQIAT-I-ALAMGIRI OF AQIL KHAN RAZI (PERSIAN TEXT) EDITED WITH ENGLISH TRANSLATION	*by Maulvi Zafar Hasan*	Rs. 6-00
THE SECRET HISTORY OF THE MONGOL DYNASTY	*by Kei Kwei Sun, M.A.,Ph.D.(Alig.)*	Rs. 13-00
WITHER NORTH AFRICA	*by Nicoal A. Ziadeh*	Rs. 5-00 or 7s. 6d.
POST-REVOLUTION PERSIAN VERSE	*by Dr. Munibur Rehman*	Rs. 5-00 or 7s. 6d.
MUGHAL RELATIONS WITH PERSIA AND CENTRAL ASIA	*by Dr. Abdur Rahim*	Rs. 7-[illegible]
PARTIES AND POLITICS AT THE MUGHAL COURT	*by Dr. Satish Chandra*	Rs.20-[illegible]
KHAIR-UL-MAJALIS OF HAMID QALANDER (PERSIAN TEXT WITH ENGLISH INTRODUCTION)	*by K. A. Nizami*	Rs.20-[illegible]

MEDIEVAL INDIA QUARTERLY

Volumes available

Vol. I	No. 1	Rs. [illegible]
Vol. I	No. 2	Rs. [illegible]
Vol. II	Nos. 1 & 2	Rs. [illegible]
Vol. III	Nos. 1 & 2	Rs. [illegible]
Vol. III	Nos. 3 & 4	Rs. 10-00